ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
Checked 1969
Checked 1978
ہماری دعوت
ادارہ الفرقان
مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ ۶ر
ششماہی ۳ر
فی کاپی ..... ۶۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ..... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک
سالانہ ..... ۱ پونڈ

جلد ۳۱	بابت ماہ شعبان ۱۳۸۳ھ مطابق جنوری ۱۹۶۴ء	شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ⊙ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں، نئے خریداروں کے لیے بھی یہی طریقہ ہے۔

تاریخ اشاعت:- رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ر تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ر تک اطلاع آجانی چاہیے۔

دفتر:- الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پروپرائٹر، ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ حکومت ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین نے مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کی تجویز واپس لیتے ہوئے پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ جبتک مسلمان ہی کسی ایسی تجویز کو پسند نہ کریں حکومت ان کے پرسنل لا میں تبدیلی کے لیے کوئی اقدام ہرگز نہیں کرے گی۔

وزیر موصوف نے یہ یقین دہانی مسلمانوں کے ساتھ کسی رعایت اور عنایت کے انداز میں نہیں کرائی تھی بلکہ ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے جو دستور کے بعض رہنما اصولوں کے حوالے سے ایسے اقدامات کو حکومت کا حق بلکہ فرض قرار دے رہے تھے موصوف نے کہا تھا کہ

"جہاں تک اقلیتی فرقوں کا تعلق ہے ان کی پرسنل لا میں اصلاح کی پیشقدمی کا آغاز انھیں کی جانب سے ہونا چاہیئے۔ حکومت ہند کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اقلیتی فرقوں کے معاملہ میں پیش دستی کے مقام پر لا کھڑا کرے"

(قومی آواز ۳۱ر اگست ۶۳ء)

اس صراحت کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ موجودہ حکومت کے نزدیک اقلیتوں کے پرسنل لا کو ایک تحفظ کا مقام حاصل ہے؟ اور اس صورت میں اس حکومت کے کسی فرد کے لیئے یہ کسقدر بے ضابطگی اور کس درجہ غیر ذمہ داری کی بات ہوگی کہ وہ مسلم پرسنل لا یا کسی بھی اقلیت کے شخصی قوانین کے اس تحفظ کو سرعام چیلنج کرے! لیکن حکومت ہند کے نئے وزیر تعلیم مسٹر محمد علی کریم چھاگلا نے ایک ماہر قانون کی حیثیت سے ذمہ دارانہ شخصیت رکھنے کے باوجود

بھی ارکانِ حکومت کی مشترک ذمہ داری کے اصول کو نہایت افسوسناک طریقہ سے پامال کرتے ہوئے مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں اس تحفظ کو سرِعام چیلنج کر ڈالا ہے۔

مستشرقین کی کانگریس منعقدہ نئی دہلی میں مسلم پرسنل لا پر ایک سمپوزیم کے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا سوائے اس کے کوئی مقصد ہی نہیں معلوم ہوتا کہ حکومت ہند نے مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے جس مسئلہ کو اٹھانے کے بعد مسلمانوں کے احتجاج کے نتیجہ میں اس صراحت کے ساتھ لپیٹ کر رکھ دیا تھا کہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کی شخصی قوانین میں مداخلت نہیں کی جا سکتی مسٹر چھاگلا اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے مسئلہ کو از سر نو زندہ کر دینا چاہتے ہیں۔

سمپوزیم میں پڑھے جانے والے مقالات کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس سمپوزیم کو ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی ترمیم اور عدم ترمیم کے مسئلہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کسی بھی خاص ملک کے سوال سے وسیع تر ایک خالص علمی مذاکرہ تھا جس کے پس منظر میں آج کے عالم اسلام کے اندر پائی جانے والی یہ اصولی کشمکش کارفرما تھی کہ مسلم پرسنل لا میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کا ضابطہ کیا ہو؟ اس خالص علمی، اصولی اور غیر مقامی مذاکرہ میں مسٹر چھاگلا نے بحیثیت صدر اول و آخر جو تقریر فرمائی نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایک خالص علمی مذاکرہ کو ہندوستان کے ایک خاص سیاسی ذہن کی تائید میں استعمال کرنے کی نہایت ہی ناروا کوشش تھی ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ سمپوزیم میں حصہ لینے والے اہل علم نے بلا کسی احتجاج کے اس کو برداشت کیسے کر لیا۔

بہرحال جناب چھاگلا نے اس سمپوزیم کی افتتاحی تقریر ہی سے اپنی اس قابل اعتراض اور قابل احتجاج کوشش کا آغاز کیا کہ اہل علم کی اس مجلس مذاکرہ کو ہندوستان میں مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کے اس مسئلہ کو پھر سے زندہ کرنے کا ذریعہ بنایا جائے جسے حکومت اپنے ہاتھوں سے لپیٹ کر رکھ چکی ہے۔ چنانچہ اخباری رپورٹ کے مطابق موصوف کی تقریر کا آغاز ہندوستانی ریاست کے موجودہ ڈھانچہ کے تعارف سے ہوا۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ

"یہاں کے رہنے والے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ووٹ کا حق حاصل ہے لہٰذا پارلیمنٹ کے انتخاب میں ان کا بھی حصہ ہے۔ اور اس بنا پر پارلیمنٹ کو ان کے لیے بھی شخصی قوانین بنانے کا پورا حق حاصل ہے" نیز انہوں نے ہندوستانی ریاست کے سیکولرزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہاں جو بھی قانون بنے وہ یکساں طور سے پوری سماج پر حاوی ہونا چاہیئے۔"

مقالات اور مباحثہ کی جو اخباری رپورٹ ہمارے سامنے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاگلا صاحب کو اپنے خاص مدعا کی تائید اس سے نہیں حاصل ہو سکی، لہٰذا آپ نے اختتامی تقریر میں ایک بار پھر اپنے موقف پر زور دیتے ہوئے اپنے دلائل اور نقطہ نظر کا اعادہ کیا . . . . اس سلسلہ میں آپ نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ "پریوی کونسل کے جج مسلم پرسنل لا کے مقدمات کا فیصلہ کرتے رہے ہیں" لہٰذا "ہندوستانی پارلیمنٹ کو مداخلت کا صرف حق ہی نہیں بلکہ سماجی انصاف اور یک جہتی کی خاطر اس کا فرض ہے کہ وہ مداخلت کرے۔"

مسٹر چھاگلا نے ایک نکتہ خاص طور سے مسلمانوں کے ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے اس تقریر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان کو غور کرنا چاہیئے کہ تعدد ازدواج کا قانون سماجی انصاف کی ان قدروں کے کسی قدر خلاف ہے جن کا اسلام داعی ہے۔"

مسٹر چھاگلا کی اس تقریر کے ذکر سے ہمارا اصل مقصد صرف یہ سوال اٹھانا تھا کہ جب وہ حکومت جس کے مسٹر چھاگلا اس وقت ایک رکن ہیں، ابھی چند مہینے پہلے مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے سوال پر اپنا یہ نقطہ نظر پوری صراحت کے ساتھ واضح کر چکی ہے کہ خود مسلمانوں کی مرضی کے بغیر وہ ان کے پرسنل لا کو ہاتھ لگانا صحیح نہیں سمجھتی تو اس حکومت کا رکن رہتے ہوئے مسٹر چھاگلا کے لیے کس طرح یہ بات مناسب تھی کہ وہ برسرعام اس سے مختلف نقطہ نظر کا اظہار کریں؟ اور پھر اگر ان کے اس طرز عمل پر سربراہ حکومت کی طرف سے مسٹر چھاگلا کو ٹوکا نہیں جاتا ہے تو ہم کیونکر یہ رائے نہ قائم کریں کہ حکومت کی طرف سے جو بیان پارلیمنٹ میں زیر قانون سنے دیا تھا وہ محض دکھاوے کی بات اور وقتی پالیسی تھی؟ ۔۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ مسٹر چھاگلا نے اپنے اس انتہائی قابل اعتراض اقدام کے لیے ایک خالص علمی

نوعیت کی مجلس مذاکرہ کو استعمال کرنے کا جواز نکاب کیا وہ بجائے خود قابل اعتراض اور ایک گھٹیا طریق کار کہلانے کے لائق ہے! لیکن مسٹر چھاگلا کی تقریر جب سامنے آ گئی ہے تو ضمناً اس کے نکات و دلائل پر تبصرہ بھی شاید بے محل نہ ہو گا۔

اس بات سے بالکل قطع نظر کہ مسٹر چھاگلا کو حکومت ہند کا ایک وزیر ہونے کی حالت میں مسلم پرسنل لا کے مسئلہ پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے تھا یا نہیں ہمیں بڑی حیرت ہے کہ مسٹر چھاگلا نے ایسا ٹیڑھا مسئلہ جس پر ان کی حکومت کو ایک قدم اٹھا دینے کے بعد بھی پیچھے ہی ہٹنے میں معقولیت نظر آئی کیا سوچ کر از سر اٹھانے کی جرأت کی، جبکہ ان کے پاس کوئی پُر مغز بات اور کوئی موثر استدلال اس معاملہ میں نہیں تھا! مسٹر چھاگلا ملک کے ایک نامور آدمی ہیں، ارباب علم و دانش میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اور ایک بلند پایہ ماہر قانون کی حیثیت سے دعویٰ اور دلیل کے رشتوں اور استدلال کی خامی اور پختگی کے شعور میں ایک ممتاز سطح کی توقع ہی ان سے کی جانی چاہیئے۔ لیکن کیسی خلاف توقع اور کس قدر مایوس کن بات ہے کہ ایک دعویٰ وہ انتہائی جزم و یقین بلکہ ساری جذباتی اور استدلالی مخالفتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے لہجہ میں کرتے ہیں۔ مگر دلیل کے میدان میں ان کا ذہن اسقدر الجھاؤ، ژولیدگی اور پریشاں فکری کا نمونہ پیش کرتا ہے کہ جیسے دعویٰ اور دلیل کے رشتوں کی نزاکت اور استدلال کی خامی اور پختگی کے فرق سے نابلد کوئی آدمی طبع آزمائی کر رہا ہو۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ہندپارلیمنٹ کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کا حق ہے کیونکہ پارلیمنٹ کے ڈھانچے میں پانچ کروڑ مسلمانانِ ہند کی بھی نمائندگی ہے۔ اس دلیل کا مطلب کیا ہوا؟ یہ کہ پارلیمنٹ کیلئے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا جواز پورے کے پورے پانچ کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کی بنیاد پر نکلتا ہے۔ یعنی یہ اصول تسلیم ہوا کہ اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کا اصل حق مسلمانوں ہی کو ہے۔ لیکن وہ دوسرے ہی سانس میں پارلیمنٹ کے اس حق کے لیے سکولرزم کو بنیاد بنا کر فرماتے ہیں کہ پارلیمنٹ کو صرف حق ہی نہیں بلکہ یکجہتی کی خاطر اس کا فرض ہے کہ مداخلت کرے۔

فرمائیے کہ کیا یہ دونوں دلیلیں ایک وقت میں صحیح ہو سکتی ہیں؟ اگر پارلیمنٹ کے حق مداخلت کی بنیاد مسلمانوں کی نمائندگی ہو تو پھر سیکولرزم کا ذکر مہمل۔ اور اگر سیکولرزم اس حق کی بنیاد ہے تو پھر مسلمانوں کی نمائندگی کا فلسفہ لایعنی! افسوس ہمارے ایک نامور جج کو، جس نے سیکڑوں مقدمات میں دعوے اور دلائل کی قسموں کے فیصلہ لکھے ہوں گے اتنا بھی شعور نہیں ہو سکا کہ وہ ایک دعوے کیلئے دو متضاد دلیلیں دے کر اچھے خاصے مضحکہ کا سامان کر رہے ہیں۔

اور پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ آپ کی پیش کردہ یہ نظیر ہے کہ "پریوی کونسل کے جج مسلم پرسنل لا کے مقدمات کا فیصلہ کرتے رہے ہیں"۔ پہلے تو اس کا ماتم کیجیے کہ آزاد جمہوریہ ہند کا ایک وزیر آزاد ہندوستان کے مسائل میں اس برطانوی قانون اور اقتدار کے دور کی نظیر لاتا ہے جس میں آزادی کا بنیادی انسانی حق مانگنے پر جیل اور کالے پانی کا فیصلہ صادر ہوتا تھا اور ان فیصلوں کی بنیاد پر گاندھی اور جواہر لال تک نے بار بار جیل کی ہوا کھائی ہو! تو کیا مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں پریوی کونسل کے اختیارات سے دلیل لانے والے صاحب یہ بھی کہیں گے کہ داعیانِ حریت کے مقدمات میں جو فیصلے ان دنوں صادر ہوتے تھے وہ صحیح تھے؟۔ خیر چھوڑیے اس پہلو کو اور بحیثیت نظیر ذرا غور کیجیے تو اس سے بھی زیادہ ماتم مسٹر چھاگلا کی قانون دانی کا کرنا پڑے گا کہ موصوف مسلم پرسنل لا میں غیر مسلموں کو ترمیم کا اختیار بخشوانے کے لیے نظیر بنا رہے ہیں مسلم پرسنل لا کے مقدمات میں غیر مسلم ججوں کے فیصلے تسلیم کئے جانے کو حالانکہ دونوں باتوں میں کوئی ڈھکا چھپا فرق نہیں بالکل کھلا اور بدیہی فرق ہے۔ ایک جگہ سوال قانون سازی کا ہے اور دوسری جگہ قانون کے ماتحت فیصلہ کا۔

مسٹر چھاگلا اور ان کے ہم ذہن لوگ مسلمانوں کو بدنام کرتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل میں ان کا اندازِ فکر جذباتی ہوتا ہے مگر مسٹر چھاگلا کے ساتھ یہ بڑی رعایت ہو گی کہ ہم ان کی اس تقریر کو جذباتیت پر مبنی قرار دیں۔ ورنہ پھر کہنا پڑے گا کہ اس تقریر کے پیچھے کوئی ذہنی خلوص نہیں ہے بلکہ کوئی خاص مقصد ہے جس کے حصول کی خاطر اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ حال یا تو کسی مسئلہ میں محض جذباتی فکر رکھنے والے کا ہوتا کہ

اس کی کاوشِ استدلال کسی اصولی بنیاد کی پابند نہیں ہوتی بلکہ جس بات سے بھی ذرا سا سہارا ملے، اسے دلیل بنا لیتا ہے یا پھر یہ کیفیت اس آدمی کی ہوتی ہے جس کے دعوے میں کسی ذہنی خلوص کے بجائے کسی خاص مقصد کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مسٹر چھاگلا کا اپنی اس تقریر میں (جیسا کہ اوپر کے مختصر سے جائزہ سے بخوبی عیاں ہوتا ہے) بالکل یہی حال ہے کہ ان کے دلائل میں کوئی یکسانیت اور کوئی اصولی ہم آہنگی نہیں ملتی، بلکہ استدلال کے منطقی ضابطہ تک کی پابندی مفقود نظر آتی ہے، ایک طرف وہ پارلیمنٹ کو مسلمانوں کا نمائندہ ثابت کرکے اس کو یہ حق دلوانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام معاملات میں دخیل ہو۔ اور دوسری طرف محض سیکولرزم کی بنیاد پر دعویٰ کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ حقدار ہی نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ تمام باشندگانِ ہند کو ایک مشترک سماجی ضابطہ کے تحت لائے، حالانکہ یہاں فوراً ہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمنٹ کا یہ فرض مسلّم ہے تو پھر مسلمانوں کی نمائندگی اور عدم نمائندگی کو اس مسئلہ میں کیا دخل رہ جاتا ہے اسی طرح استدلال کے منطقی ضابطہ سے بے نیازی کا نمونہ پریوی کونسل کے فیصلوں کی وہ نظیر ہے جو موصوف نے اس بارے میں پیش فرمائی اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہونچنے کے لیے مجبور ہیں کہ چھاگلا صاحب یا تو مسلم پرسنل لا میں تغیر یعنی اس کے خاتمہ کے مسئلہ میں محض جذباتی ہیں (یعنی ایک ذاتی پسند اور طبعی رجحان کے طور پر ان کے اندر شدید خواہش ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اپنی معاشرتی انفرادیت کو خیرباد کہہ دیں جس کے لیے مسلم پرسنل لا کا خاتمہ نہایت موثر قدم ہو) یا پھر اس مسئلہ میں جس نقطۂ نظر کا اظہار وہ کر رہے ہیں وہ کسی ذہنی خلوص اور فکری دیانت پر مبنی نہیں بلکہ کوئی ذاتی مقصد اور منفعت اس سے وابستہ ہے۔

ہم مسٹر چھاگلا کی نیت کو الزام دینا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ یہ ماننا مناسب سمجھتے ہیں کہ ان پر جذباتیت طاری ہو۔ وہ مسئلہ کو اپنے ذہنی رجحان کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور اس لیے انھیں احساس نہیں کہ مسئلہ کس انداز پر گفتگو چاہتا ہے، درانحالیکہ اسی تقریر میں انھوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ "یہ بے انتہا نازک الجھا ہوا بلکہ متنازعہ مسئلہ ہے"۔ اسی کے ساتھ ہمارا خیال ہے کہ وہ ایک اور مشکل میں بھی گرفتار ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان کے نزدیک سیکولرزم کا تصور یہ ہے کہ خالص عبادتی رسوم و اعمال میں تو لوگوں کو اپنے اپنے مذہبی طریقوں کی آزادی

حاصل رہے لیکن اس کے علاوہ جس طرح ملک کی سیاسی زندگی میں کسی مذہبی تفریق و امتیاز کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے اسی طرح معاشرتی زندگی میں بھی جہاں تک قانونی دائرہ کا تعلق ہے کسی مذہبی انفرادیت کو تسلیم نہیں کیا جانا چاہیئے۔

ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ چھاگلا صاحب کا یہ تصور صحیح ہے یا غلط البتہ ہم انھیں توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ملک کے دستور سازوں اور اس دستور پر مبنی حکومت کے ذمہ داروں نے آج تک برابر ملک کے سامنے اپنے سکولرزم کی تشریح سیاسی سکولرزم سے کی ہے جسکو دستور کی تدوین کے وقت سے لگائیے تو پندرہ سال ورنہ اس دستور کے اصولی خاکہ کے ان اعلانات کے وقت سے لگایا جائے جو کانگریس اپنی تحریک آزادی کے دوران کرتی رہی تھی تو پھر اس تشریح کو کم و بیش چالیس سال کا تسلسل حاصل ہو جاتا ہے ایسی صورت میں مسٹر چھاگلا اور ان کے ہم خیالوں کو سوچنا چاہیئے کہ ان کے یا کسی کے لئے بھی اس بات میں کوئی معقولیت اور اس کا کوئی جواز ہے کہ سیکولرازم کا جو تصور کبھی ہندوستانی عوام کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا اور اس کے لئے قطعًا ان کی مرضی حاصل نہیں کی گئی تھی اس کے مخصوص تقاضے یہ کہہ کر عوام پر تھوپنے کی کوشش کی جائے کہ یہ سیکولرزم کا تقاضا ہے؟ اگر مسٹر چھاگلا اس نکتہ پر غور کر لیں تو پھر غالبًا ان کی سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ پارلیمنٹ کو مسلمانوں کی نمائندگی کی بنیاد پر بھی اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ ان کی اپنی خواہش کے بغیر ان کے پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت کرے۔

تاخیر کی معذرت

بہت افسوس ہے کہ الفرقان کا یہ شمارہ کامل ایک ماہ کے انتظار کے بعد ناظرین کی خدمت میں پہونچ رہا ہے۔ اور اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کتابت کے معاملہ میں کاتب صاحبان کی معذوریوں نے بے بس بنا دیا ورنہ اس درجہ تاخیر سے خریداروں کی ذہنی کوفت کے علاوہ خود دفتر بعض پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ——— اس شمارہ میں ناظرین کچھ زیادہ صفحات پائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ۱۵ جنوری تک بھی پرچہ شائع نہیں ہو سکا تو یکم فروری کو دو ماہ کا مشترک نکالنے کی کوشش شروع کر دی گئی ہے مگر یہ پروگرام بھی کتابت کی دشواری نے پورا نہیں ہونے دیا تو پھر جتنے مضامین کی کتابت وقت کے اندر ہو گئی تھی اتنے استثنائی طور پر سب ہی ہدیہ ناظرین کر دینا اچھا معلوم ہوا اب انشاء اللہ یکم مارچ کا رسالہ رمضان اور شوال کی مشترک اشاعت کے طور پر شائع ہو گا۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

کتاب الصوم

توحید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے عناصرِ اربعہ ہیں ـــــ وہ حدیثیں اسی سلسلۂ معارف الحدیث کے بالکل شروع میں ذکر کی جا چکی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں چیزوں کو اسلام کے ارکان اور بنیادی ستون بتایا ہے۔ ان کے ارکان اور عناصر ہونے کا مطلب جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ اسلام اللہ کی فرمانبرداری والے جس طرزِ حیات کا نام ہے اس کی تخلیق و تعمیر اور نشو و نما میں ان پانچوں کو خاص الخاص دخل ہے ـــــ اس لحاظ سے نماز اور زکوٰۃ کی جو تاثیری خصوصیات ہیں وہ اپنے موقع پر ذکر کی جا چکی ہیں۔ روزہ کی اس تاثیر و خصوصیت کا ذکر خود قرآن مجید میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے ـــــ سورۂ بقرہ میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان فرمانے کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا گیا ہے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" یعنی اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو ـــــ یہ تقویٰ اسلام یعنی اللہ کی فرمانبرداری والی زندگی ہی کا دوسرا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانیت اور حیوانیت کا یا دوسرے الفاظ میں کہئے کہ ملکوتیت اور بہیمیت کا نسخہ جامعہ بنایا ہے، اس کی طبیعت اور جبلت میں وہ سارے مادی

اور سفلی تقاضے بھی ہیں جو دوسرے حیوانوں میں ہوتے ہیں، اور اسی کے ساتھ اس کی فطرت میں روحانیت اور ملکوتیت کا وہ نورانی جوہر بھی ہے جو ملاءِ اعلیٰ کی لطیف مخلوق فرشتوں کی خاص دولت ہے۔ انسان کی سعادت کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کا یہ روحانی اور ملکوتی عنصر بہیمی اور حیوانی عنصر پر غالب اور حاوی رہے اور اس کو حدود کا پابند رکھے، اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ بہیمی پہلو روحانی اور ملکوتی پہلو کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا عادی ہو جائے اور اس کے مقابلے میں سرکشی نہ کر سکے ____ روزہ کی ریاضت کا خاص مقصد و موضوع یہی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی حیوانیت اور بہیمیت کو اللہ کے احکام کی پابندی اور ایمانی و روحانی تقاضوں کی تابعداری و فرمانبرداری کا خوگر بنایا جائے۔ ____ اور چونکہ یہ چیز نبوت و شریعت کے خاص مقاصد میں سے ہے اسلیے پہلی تمام شریعتوں میں بھی روزہ کا حکم رہا ہے، قرآن مجید میں اس امت کو روزہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٥ (البقرہ۔ ع ۲۳)	اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے۔ (روزوں کا یہ حکم تم کو اس لیے دیا گیا ہے) تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

بہرحال روزہ چونکہ انسان کی قوت بہیمی کو اس کی ملکوتی اور روحانی قوت کے تابع رکھنے اور اللہ کے احکام کے مقابلہ میں نفس کی خواہشات اور پیٹ اور شہوت کے تقاضوں کو دبانے کی عادت ڈالنے کا خاص ذریعہ اور وسیلہ ہے اس لیے اگلی امتوں کو بھی اس کا حکم دیا گیا تھا، اگرچہ روزوں کی مدت اور بعض دوسرے تفصیلی احکام میں ان امتوں کے خاص حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کچھ فرق بھی تھا ____ اس آخری امت کے لیے جس کا دور دنیا کے آخری دن تک ہے سال میں ایک مہینے کے روزے فرض کیے گئے ہیں اور روزہ کا وقت طلوع سحر سے غروب آفتاب تک رکھا گیا ہے اور بلاشبہ یہ مدت اور یہ وقت مذکورہ بالا مقصد کے لیے

اس دور کے واسطے مناسب ترین اور نہایت معتدل مدت اور وقت ہے، اس سے کم میں ریاضت اور نفس کی تربیت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، اور اگر اس سے زیادہ رکھا جاتا مثلاً روزہ میں دن کے ساتھ رات بھی شامل کر دی جاتی اور بس سحر کے وقت کھانے پینے کی اجازت ہوتی یا سال میں دو چار مہینے مسلسل روزے رکھنے کا حکم ہوتا تو انسانوں کی اکثریت کے لیے ناقابل برداشت اور صحتوں کے لیے مضر ہوتا۔ بہر حال طلوع سحر سے غروب آفتاب تک کا وقت اور سال میں ایک مہینہ کی مدت اس دور کے عام انسانوں کے حالات کے لحاظ سے ریاضت و تربیت کے مقصد کے لیے بالکل مناسب اور معتدل ہے۔

پھر اس کے لیے مہینہ وہ مقرر کیا گیا ہے جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا اور جس میں بیحساب برکتوں اور رحمتوں والی رات (لیلۃ القدر) ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہی مبارک مہینہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہو سکتا تھا ـــــ پھر اس مہینہ میں دن کے روزوں کے علاوہ رات میں بھی ایک خاص عبادت کا عمومی اور اجتماعی نظام قائم کیا گیا ہے جو تراویح کی شکل میں امت میں رائج ہے ـــــ دن کے روزوں کے ساتھ ساتھ رات کی تراویح کی برکات مل جانے سے اس مبارک مہینہ کی نورانیت اور تاثیر میں وہ اضافہ ہو جاتا ہے جس کو اپنے اپنے ادراک و احساس کے مطابق ہر وہ بندہ محسوس کرتا ہے جو ان باتوں سے کچھ بھی تعلق اور مناسبت رکھتا ہے۔

ان مختصر تمہیدی اشارات کے بعد رمضان اور روزہ وغیرہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ذیل میں پڑھیے!

ماہِ رمضان کے فضائل و برکات:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَفِیْ رِوَايَةٍ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ۔

ـــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں۔

(اور ایک روایت میں بجائے "ابواب جنت" کے "ابواب رحمت" کا لفظ ہے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ـــــ اللہ کے صالح اور اطاعت شعار بندے رمضان میں چونکہ طاعات و حسنات میں مشغول و منہمک ہو جاتے ہیں، وہ دنوں کو روزہ رکھ کے ذکر و تلاوت میں گزارتے ہیں اور راتوں کا بڑا حصہ تراویح و تہجد اور دعا و استغفار میں بسر کرتے ہیں اور ان کے انوار و برکات سے متاثر ہو کر عوام مومنین کے قلوب بھی رمضان مبارک میں عبادات اور نیکیوں کی طرف زیادہ راغب اور بہت سے گناہوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو اسلام اور ایمان کے حلقے میں سعادت اور تقوے کے اس عمومی رجحان اور نیکی اور عبادت کی اس عام فضا کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ تمام طبائع جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے اللہ کی مرضیات کی جانب مائل اور شر و خباثت سے متنفر ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس ماہ مبارک میں تھوڑے سے عمل خیر کی قیمت بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوسرے دنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھا دی جاتی ہے تو ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور جہنم کے دروازے ان پر بند کر دیئے جاتے ہیں، اور شیاطین ان کو گمراہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہو جاتے ہیں۔

اس تشریح کے مطابق ان تینوں باتوں (یعنی جنت و رحمت کے دروازے کھل جانے، دوزخ کے دروازے بند ہو جانے اور شیاطین کے مقید اور بے بس کر دیے جانے) کا تعلق صرف اُن اہلِ ایمان سے ہے جو رمضان مبارک میں خیر و سعادت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے اور رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے مستفید ہونے کے لیے عبادات و

جنات کو اپنا شغل بناتے ہیں ـــــ باقی رہے وہ کفار اور خدا ناشناس اور وہ خدا فراموش اور غفلت شعار لوگ جو رمضان اور اس کے احکام و برکات سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتے اور نہ اس کے آنے پر ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی بشارتوں کا اُن سے کوئی تعلق نہیں، انھوں نے جب اپنے آپ کو خود ہی محروم کرلیا ہے اور بارہ مہینے شیطان کی پیروی پر وہ مطمئن ہیں تو پھر اللہ کے یہاں بھی ان کے لیے محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ اَوَّلُ لَیْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَ مَرَدَةُ الْجِنِّ وَ غُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ یُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ یُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَیُنَادِیْ مُنَادٍ یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ وَیَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذَالِكَ كُلَّ لَیْلَةٍ ـــــــــ رواہ الترمذی و ابن ماجۃ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات جکڑ دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے سارے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ بھی کھلا نہیں رہتا، اور جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اس کا کوئی دروازہ بھی بند نہیں کیا جاتا، اور اللہ کا منادی پکارتا ہے کہ اے خیر اور نیکی کے طالب قدم بڑھا کے آ، اور اے بدی اور بدکرداری کے شائق رک، آگے نہ آ! اور اللہ کی طرف سے بہت سے (گنہگار) بندوں کو دوزخ سے رہائی دیجاتی ہے (یعنی ان کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے) اور یہ سب رمضان کی ہر رات میں ہوتا ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

تشریح) اس حدیث کے ابتدائی حصہ کا مضمون تو وہی ہے جو اس سے پہلی حدیث کا تھا، آخر میں عالم غیب کے منادی کی جس ندا کا ذکر ہے اگرچہ ہم اس کو اپنے کانوں سے

نہیں سنتے اور نہیں سن سکتے۔ لیکن اس کا یہ اثر اور یہ ظہور ہم اس دنیا میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ رمضان میں عموماً اہلِ ایمان کا رجحان اور میلان خیر و سعادت والے اعمال کی طرف بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ بہت سے غیر محتاط اور آزاد منش عامی مسلمان بھی رمضان میں اپنی روش کو کچھ بدل لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ ملاء اعلیٰ کی اُس ندا اور پکار ہی کا ظہور اور اثر ہے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ وَكَانَ اَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ كَانَ جِبْرَئِيْلُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِيْ رَمَضَانَ يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْآنَ فَاِذَا لَقِيَهُ جِبْرَئِيْلُ كَانَ اَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ —— رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر کی بخشش اور خلق اللہ کی نفع رسانی میں اللہ کے سب بندوں سے فائق تھے اور رمضان مبارک میں آپ کی یہ کریمانہ صفت اور زیادہ ترقی کر جاتی تھی۔ رمضان کی ہر رات میں جبرئیل امین آپ سے ملتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو قرآن مجید سناتے تھے، تو جب روزانہ جبرئیل آپ سے ملتے تو آپ کی اس کریمانہ نفع رسانی اور خیر کی بخشش میں اللہ کی بھیجی ہوئی ہواؤں سے بھی زیادہ تیزی آجاتی۔ اور زور پیدا ہوجاتا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) گویا رمضان مبارک کا مہینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع مبارک کے لیے بہار اور بسط کا اور نشرِ خیر کی صفت میں ترقی کا مہینہ تھا۔ اور اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ اس مہینہ کی ہر رات میں اللہ کے خاص پیغام بر جبرئیل امین آتے تھے اور آپ اُن کو قرآن مجید سناتے تھے۔

رمضان کی آمد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ:-

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي آخِرِ يَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهِ وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهُ مِثْلُ اَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهِ شَيْئٌ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَاٰخِرُهُ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهِ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَاَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ ــــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا ــــ اس میں آپ نے فرمایا، "اے لوگو تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ افگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس

مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا۔ اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لیے) افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتشِ دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے ——— آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب اُس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلادے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض یعنی کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا ——— (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتشِ دوزخ سے آزادی ہے۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف اور کمی کردے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے دے گا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس خطبۂ نبوی کا مطلب و مدعا واضح ہے تاہم اس کے چند اجزاء کی مزید وضاحت کے لیے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ (۱) اس خطبہ میں ماہ رمضان کی سب سے بڑی اور پہلی عظمت و فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں ایک ایسی رات ہوتی ہے جو ہزار دنوں اور راتوں سے نہیں، بلکہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہ بات جیسا کہ معلوم ہے قرآن مجید سورۃ القدر میں بھی فرمائی گئی ہے بلکہ اس پوری سورۃ میں اس مبارک رات کی عظمت اور فضیلت ہی کا بیان ہے اور اس رات کی عظمت و اہمیت سمجھنے کیلئے بس یہی بات کافی ہے۔

ایک ہزار مہینوں میں قریباً تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں، اس لیلۃ القدر کے ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اور اس کے قرب و رضا کے طالب بندے اس ایک رات میں قرب الٰہی کی اتنی مسافت طے کر سکتے ہیں جو دوسری ہزاروں راتوں میں طے نہیں ہو سکتی۔ ہم جس طرح اپنی اس مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ تیز رفتار ہوائی جہاز یا راکٹ کے ذریعہ اب ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ میں اس سے زیادہ مسافت طے کی جا سکتی ہے جتنی پرانے زمانے میں سیکڑوں برس میں طے ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح حصول رضائے خداوندی اور قرب الٰہی کے سفر کی رفتار لیلۃ القدر میں اتنی تیز کر دی جاتی ہے کہ جو بات صادق طالبوں کو سیکڑوں مہینوں میں حاصل نہیں ہو سکتی وہ اس مبارک رات میں حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اور اسی کی روشنی میں حضورؐ کے اس ارشاد کا بھی مطلب سمجھنا چاہیے کہ اس مبارک مہینہ میں جو شخص کسی قسم کی نفلی نیکی کرے گا اس کا ثواب دوسرے زمانہ کی فرض نیکی کے برابر ملے گا، اور فرض نیکی کرنے والے کو دوسرے زمانہ کے ستر فرض ادا کرنے کا ثواب ملے گا — گویا "لیلۃ القدر" کی خصوصیت تو رمضان مبارک کی ایک مخصوص رات کی خصوصیت ہے۔ لیکن نیکی کا ثواب ستر گنا ملنا یہ رمضان مبارک کے ہر دن اور ہر رات کی برکت اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور ان سے مستفید اور متمتع ہونے کی توفیق دے۔

(۲) اس خطبہ میں رمضان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ صبر اور غمخواری کا مہینہ ہے۔

دینی زبان میں صبر کے اصل معنی ہیں اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس کی خواہشوں کو دبانا اور تلخیوں اور ناگواریوں کو جھیلنا، ظاہر ہے کہ روزہ کا اول و آخر بالکل یہی ہے، اسی طرح روزہ رکھ کر ہر روزہ دار کو تجربہ ہوتا ہے کہ فاقہ کیسی تکلیف کی چیز ہے، اس سے اُس کے اندر اُن غربا، اور مساکین کی ہمدردی اور غمخواری کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ جو بیچارے ناداری کی وجہ سے فاقوں پہ فاقے کرتے ہیں، اس لیے رمضان کا مہینہ بلاشبہ صبر اور غمخواری کا مہینہ ہے

(۳) یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اس بابرکت مہینہ میں اہلِ ایمان کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے" —— اس کا تجربہ تو بلا استثناء ہر صاحبِ ایمان روزہ دار کو ہوتا ہے کہ رمضان مبارک میں جتنا اچھا اور جتنی فراغت سے کھانے پینے کو ملتا ہے باقی گیارہ مہینوں میں اتنا نصیب نہیں ہوتا، خواہ اس عالم اسباب میں وہ کسی بھی راستے سے آئے، سب اللہ ہی کے حکم سے اور اسی کے فیصلے سے آتا ہے۔

(۴) خطبہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "رمضان کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا وقت ہے"۔

اس عاجز کے نزدیک اس کی راجح اور دل کو زیادہ لگنے والی توجیہ اور تشریح یہ ہے کہ رمضان کی برکتوں سے مستفید ہونے والے بندے تین طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ اصحابِ صلاح و تقویٰ جو ہمیشہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھتے ہیں اور جب کبھی ان سے کوئی خطا اور لغزش ہو جاتی ہے تو اسی وقت توبہ و استغفار سے اس کی صفائی و تلافی کر لیتے ہیں۔ تو ان بندوں پر تو شروع مہینہ ہی سے بلکہ اس کی پہلی ہی رات سے اللہ کی رحمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے —— دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے متقی اور پرہیزگار تو نہیں ہیں لیکن اس لحاظ سے بالکل گئے گزرے بھی نہیں ہیں، تو ایسے لوگ جب رمضان کے ابتدائی حصہ میں روزوں اور دوسرے اعمالِ خیر اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اپنے حال کو بہتر اور اپنے کو رحمت و مغفرت کے لائق بنا لیتے ہیں تو درمیانی حصہ میں ان کی بھی مغفرت اور معافی کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے —— اور تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے نفسوں پہ بہت ظلم کر چکے ہیں اور ان کا حال بڑا ابتر رہا ہے اور اپنی بداعمالیوں سے وہ گویا

دوزخ کے پورے پورے مستحق ہو چکے ہیں وہ بھی جب رمضان کے پہلے اور درمیانی حصہ میں عام مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھ کے اور توبہ و استغفار کر کے اپنی سیاہ کاریوں کی کچھ صفائی اور تلافی کر لیتے ہیں تو اخیر عشرہ میں جو دریائے رحمت کے جوش کا عشرہ ہے اللہ تعالیٰ دوزخ سے ان کی بھی نجات اور رہائی کا فیصلہ فرما دیتا ہے ـــــ اس تشریح کی بنا پر رمضان مبارک کے ابتدائی حصہ کی رحمتؔ، درمیانی حصہ کی مغفرتؔ اور آخری حصہ میں جہنم سے آزادیؔ کا تعلق بالترتیب اُمّتِ مسلمہ کے ان مذکورہ بالا تین طبقوں سے ہوگا۔ واللہ اعلم۔

روزہ کی قدر و قیمت اور اس کا صلہ:-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ يَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِیْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّیْ امْرُءٌ صَائِمٌ ـــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی فضیلت اور قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آدمی کے ہر اچھے عمل کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھایا جاتا ہے (یعنی اس اُمّتِ مرحومہ کے اعمالِ خیر کے متعلق عام قانونِ الٰہی یہی ہے کہ ایک نیکی کا اجر اگلی امتوں کے لحاظ سے کم از کم دس گنا ضرور عطا

ہوگا اور بعض اوقات عمل کرنے والے کے خاص حالات اور اخلاص وخشیت وغیرہ کیفیات کی وجہ سے اس سے بھی بہت زیادہ عطا ہوگا، یہاں تک کہ بعض مقبول بندوں کو اُن کے اعمالِ حسنہ کا اجر سات سو گنا عطا فرمایا جائے گا ـــ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس عام قانونِ رحمت کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا کہ) مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزہ اس عام قانون سے مستثنیٰ اور بالاتر ہے، وہ بندہ کی طرف سے خاص میرے لیے ایک تحفہ ہے اور میں ہی (جس طرح چاہوں گا) اس کا اجر و ثواب دوں گا. میرا بندہ میری رضا کے واسطے اپنی خواہشِ نفس اور اپنا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے (پس میں خود ہی اپنی مرضی کے مطابق اس کی اس قربانی اور نفس کشی کا صلہ دوں گا) روزہ دار کے لیے دو مسرتیں ہیں. ایک افطار کے وقت اور دوسری اپنے مالک و مولیٰ کی بارگاہ میں حضوری اور شرفِ باریابی کے وقت. اور قسم ہے کہ روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے. (یعنی انسانوں کے لیے مشک کی خوشبو جتنی اچھی اور جتنی پیاری ہے، اللہ کے ہاں روزہ دار کے منھ کی بو اس سے بھی اچھی ہے) اور روزہ (دنیا میں شیطان و نفس کے حملوں سے بچاؤ کے لیے اور آخرت میں آتشِ دوزخ سے حفاظت کے لیے) ڈھال ہے. اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ وہ بیہودہ اور فحش باتیں نہ بکے اور شور و شغب نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے گالی گلوج یا جھگڑا ٹنٹا کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں.

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے اکثر وضاحت طلب اجزاء کی تشریح ترجمہ کے ضمن میں کر دی گئی ہے. آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی کا روزہ ہو تو وہ فحش اور گندی باتیں اور شور و شغب بالکل نہ کرے، اور اگر بالفرض کوئی دوسرا اس سے الجھے اور گالیاں بکے جب بھی یہ کوئی سخت بات نہ کہے، بلکہ صرف

اتنا کہہ دے کہ "بھائی میرا روزہ ہے" ـــــ اس آخری ہدایت میں اشارہ ہے کہ اس حدیث میں روزہ کی جو خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان کی گئی ہیں یہ انہی روزوں کی ہیں جن میں شہوت نفس اور کھانے پینے کے علاوہ گناہوں سے حتیٰ کہ بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے بھی پرہیز کیا گیا ہو ـــــ ایک دوسری حدیث میں (جو عنقریب درج ہوگی) فرمایا گیا ہے کہ "جو شخص روزہ رکھے لیکن بُرے کاموں اور غلط باتوں سے پرہیز نہ کرے تو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی اللہ کو کوئی احتیاج نہیں ہے۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ بَابًا يُقَالُ لَهُ الرَّيَّانُ يَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَيْرُهُمْ يُقَالُ اَيْنَ الصَّائِمُوْنَ؟ فَيَقُوْمُوْنَ لَا يَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَيْرُهُمْ فَاِذَا دَخَلُوْا اُغْلِقَ فَلَمْ يَدْخُلْ مِنْهُ اَحَدٌ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے دروازوں میں ایک خاص دروازہ ہے جس کو "باب الریّان" کہا جاتا ہے۔ اس دروازہ سے قیامت کے دن صرف روزہ داروں کا داخلہ ہوگا۔ ان کے سوا کوئی اس دروازہ سے داخل نہیں ہو سکے گا ـــــ اس دن پکارا جائے گا کہ کدھر ہیں وہ بندے جو اللہ کے لیے روزے رکھا کرتے تھے اور بھوک پیاس کی تکلیف اُٹھایا کرتے تھے) وہ اس پکار پر چل پڑیں گے، ان کے سوا کسی اور کا اس دروازہ سے داخلہ نہیں ہو سکے گا، جب وہ روزہ دار اس دروازہ سے جنت میں پہونچ جائیں گے تو یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا، پھر کسی کا اس سے داخلہ نہیں ہو سکے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) روزہ میں جس تکلیف کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جو روزہ دار کی سب سے بڑی قربانی ہے وہ اس کا پیاسا رہنا ہے۔ اس لیے اس کو جو صلہ اور انعام دیا جائے اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور غالب پہلو سیرابی کا ہونا چاہیے۔ اسی

مناسبت سے جنت میں روزہ داروں کے داخلہ کے لیے جو مخصوص دروازہ مقرر کیا گیا ہے اُس کی خاص صفت سیرابی و شادابی ہے۔ رَیَّانَ کے لغوی معنی ہیں پورا پورا سیراب، یہ بھرپور سیرابی تو اس دروازہ کی صفت ہے جس سے روزہ داروں کا داخلہ ہوگا، آگے جنت میں پہونچ کر جو کچھ اللہ تعالیٰ کے انعامات ان پر ہوں گے ان کا علم تو بس اُس اللہ تعالیٰ ہی کو ہے جس کا ارشاد ہے کہ "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" بندہ کا روزہ بس میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کا صلہ دوں گا۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مُرْنِیْ بِاَمْرٍ یَنْفَعُنِیَ اللّٰہُ بِہٖ قَالَ عَلَیْکَ بِالصَّوْمِ فَاِنَّہٗ لَا مِثْلَ لَہٗ ــــــ رواہ النسائی

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کسی عمل کا حکم فرمائیے، جس سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ روزہ رکھا کرو۔ اس کی مثل کوئی بھی عمل نہیں ہے۔

(سنن نسائی)

(تشریح) نماز، روزہ، صدقہ، حج اور خلق اللہ کی خدمت وغیرہ اعمالِ صالحہ میں یہ بات مشترک ہونے کے باوجود کہ یہ سب تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں ان کی الگ الگ کچھ خاص تاثیرات اور خصوصیات بھی ہیں، جن میں یہ ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد ہیں ــــــ گویا، "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔

ان انفرادی اور امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ "اس کے مثل کوئی عمل نہیں ہے" ــــــ مثلاً نفس کو مغلوب اور مقہور کرنے اور اس کی خواہشوں کو دبانے کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس صفت میں کوئی دوسرا عمل روزہ کے مثل نہیں ہے ــــــ پس حضرت ابو امامہ کی اس حدیث میں روزہ کے بارہ میں جو فرمایا گیا ہے کہ "اس کے مثل کوئی عمل نہیں ہے"۔ اس کی حقیقت یہی سمجھنی چاہیے، نیز ملحوظ رہنا چاہیے کہ ابو امامہ کے خاص حالات میں اُن کے لیے زیادہ نفع مند روزہ ہی تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی کی ہدایت

فرمائی ـــــ اور اسی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ ابوامامہ نے یہ جواب پانے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ بھی عرض کیا کہ "مجھے کسی عمل کا حکم فرمائیے جس کو میں کیا کروں" تو دونوں دفعہ آپ نے روزہ ہی کی ہدایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ بس روزہ رکھا کرو، اس کے مثل کوئی دوسرا عمل نہیں ہے، یعنی تمھارے خاص حالات میں تم کو اسی سے زیادہ نفع ہوگا واللہ علم۔

روزے اور تراویح باعث مغفرت :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھیں گے انکے سب گذشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور ایسے ہی جو لوگ ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح وتہجد) پڑھیں گے اُن کے بھی سب پچھلے گناہ معاف کر دئیے جائیں گے، اور اسی طرح جو لوگ شب قدر میں ایمان واحتساب کے ساتھ نوافل پڑھیں گے اُن کے بھی سارے پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں رمضان کے روزوں، اس کی راتوں کے نوافل اور خصوصیت سے شب قدر کے نوافل کو پچھلے گناہوں کی مغفرت اور معافی کا یقینی وسیلہ بتایا گیا ہے بشرطیکہ یہ روزے اور نوافل ایمان واحتساب کے ساتھ ہوں ـــ یہ ایمان واحتساب

خاص دینی اصطلاحیں ہیں اور ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو نیک عمل کیا جائے اس کی بنیاد اور اس کا محرک بس اللہ و رسول کو ماننا اور اُن کے وعدۂ و وعید پر یقین لانا اور اُن کے بتائے ہوئے اجر و ثواب کی طمع اور امید ہی ہو، کوئی دوسرا جذبہ اور مقصد اس کا محرک نہ ہو۔ اسی ایمان و احتساب سے ہمارے اعمال کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جڑتا ہے، بلکہ یہی ایمان و احتساب ہمارے اعمال کے قلب و رُوح ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو پھر ظاہر کے لحاظ سے بڑے سے بڑے اعمال بھی بے جان اور کھوکھلے ہیں جو خدانخواستہ قیامت کے دن کھوٹے سکے ثابت ہوں گے۔ اور ایمان و احتساب کے ساتھ بندہ کا ایک عمل بھی اللہ کے ہاں اتنا عزیز اور قیمتی ہے کہ اس کے صدقہ اور طفیل میں اس کے برسہا برس کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایمان و احتساب کی یہ صفت اپنے فضل سے نصیب فرمائے۔

روزہ اور قرآن کی شفاعت:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَقُوْلُ الصِّیَامُ اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّہَوَاتِ بِالنَّہَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ فَیُشَفَّعَانِ۔

——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا) روزہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار، میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما) اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات کے

سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما)، چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا) اور خاص مراحم خسروانہ سے نوازا جائے گا) (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) کیسے خوش نصیب ہیں وہ بندے جن کے حق میں اُن کے روزوں کی اور نوافل میں اُن کے پڑھے ہوئے قرآنِ پاک کی سفارش قبول ہوگی، یہ ان کے لیے کیسی مسرت اور فرحت کا وقت ہوگا ـــ اللہ تعالیٰ اپنے اس سیاہ کار بندہ کو بھی محض اپنے کرم سے اُن خوش بختوں کے ساتھ کردے!۔

رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے کا نقصان ناقابل تلافی:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَفْطَرَ یَوْمًا مِّنْ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ رُخْصَةٍ وَلَا مَرَضٍ لَمْ یَقْضِ عَنْهُ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهٖ وَاِنْ صَامَهٗ ـــــ رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی والبخاری فی ترجمۃ باب۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! جو آدمی سفر وغیرہ کی شرعی رخصت کے بغیر اور بیماری (جیسے کسی) عذر کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑدے اگر اس کے بجائے عمر بھر بھی روزے رکھے تو جو چیز فوت ہوگئی وہ پوری ادا نہیں ہوسکتی۔ (مسند احمد جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی ـــــ اور صحیح بخاری میں بھی بغیر سند کے ایک ترجمہ باب میں اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے)

(تشریح) حدیث کا مدعا اور مطلب یہ ہے کہ شرعی عذر اور رخصت کے بغیر رمضان کا ایک روزہ دانستہ چھوڑنے سے رمضان مبارک کی خاص برکتوں اور اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص

رحمتوں سے جو محرومی ہوتی ہے، عمر بھر نفل روزے رکھنے سے بھی اس محرومی اور خسران کی تلافی نہیں ہو سکتی، اگرچہ ایک روزے کی قانونی قضا ایک ہی دن کا روزہ ہے، لیکن اس سے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جو روزہ چھوڑنے سے کھویا گیا ـــــ پس جو لوگ بے پروائی کے ساتھ رمضان کے روزے چھوڑتے ہیں وہ سوچیں کہ اپنے کو وہ کتنا نقصان پہونچاتے ہیں۔

روزہ میں معصیتوں سے پرہیز :-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ ـــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی روزہ رکھتے ہوئے باطل کلام اور باطل کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں روزہ کے مقبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کھانا پینا چھوڑنے کے علاوہ معصیات و منکرات سے بھی زبان و دہن اور دوسرے اعضاء کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی شخص روزہ رکھے اور گناہ کی باتیں اور گناہ والے اعمال کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے روزہ کی کوئی پروا نہیں۔

عشرۂ اخیرہ اور لیلۃ القدر

جس طرح رمضان مبارک کو دوسرے مہینوں کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے اسی طرح اس کا آخری عشرہ پہلے دونوں عشروں سے بہتر ہے اور لیلۃ القدر اکثر و بیشتر

اسی عشرہ میں ہوتی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت وغیرہ کا اہتمام اس میں اور زیادہ کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهٖ۔ ——— رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت وغیرہ میں وہ مجاہدہ کرتے اور وہ مشقت اٹھاتے جو دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَأَحْيٰى لَيْلَهٗ وَأَيْقَظَ أَهْلَهٗ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان کا عشرۂ اخیرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے اور شب بیداری کرتے (یعنی پوری رات عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے) اور اپنے گھر کے لوگوں (یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین) کو بھی جگا دیتے (تاکہ وہ بھی ان راتوں کی برکتوں اور سعادتوں میں حصہ لیں۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ۔

——— رواہ البخاری

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ شب قدر زیادہ تر عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں سے

کوئی ایک رات ہوتی ہے، یعنی اکیسویں یا تئیسویں یا پچیسویں، یا ستائیسویں یا انتیسویں شب قدر کی اگر اس طرح تعیین کر دی جاتی کہ وہ خاص فلاں رات ہے تو بہت سے لوگ بس اسی رات میں عبادت وغیرہ کا خاص اہتمام کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح مبہم رکھا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ قرآن شب قدر میں نازل ہوا، اور دوسری جگہ فرمایا گیا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ اس سے اشارہ ملا کہ وہ شب قدر رمضان کی راتوں میں سے کوئی رات تھی ـــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید نشاندہی کے طور پر فرمایا کہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اس کا زیادہ امکان ہے لہذا ان راتوں کا خاص اہتمام کیا جائے ـــــ اس مضمون کی حدیثیں حضرت عائشہ صدیقہ کے علاوہ دوسرے صحابۂ کرام سے بھی مروی ہیں ـــــ اور بعض صحابہ کا خیال تھا کہ شب قدر عموماً رمضان کی ستائیسویں ہی ہوتی ہے۔

عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ قَالَ سَأَلْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ إِنَّ أَخَاكَ ابْنَ مَسْعُوْدٍ يَقُوْلُ مَنْ يَّقُمِ الْحَوْلَ يُصِبْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَقَالَ رَحِمَهُ اللّٰهُ أَرَادَ أَنْ لَّا يَتَّكِلَ النَّاسُ أَمَا إِنَّهُ قَدْ عَلِمَ أَنَّهَا فِيْ رَمَضَانَ وَأَنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ وَأَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ ثُمَّ حَلَفَ لَا يَسْتَثْنِيْ أَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ فَقُلْتُ بِأَيِّ شَيْءٍ تَقُوْلُ ذَالِكَ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ قَالَ بِالْعَلَامَةِ أَوْ قَالَ بِالْآيَةِ الَّتِيْ أَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا تَطْلُعُ يَوْمَئِذٍ لَا شُعَاعَ لَهَا۔ ـــــ رواہ مسلم

زر ابن حبیش جو اکابر تابعین میں سے ہیں بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آپ کے دینی بھائی عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ جو کوئی پورے سال کی راتوں میں کھڑا ہوگا (یعنی ہر رات عبادت کیا کرے گا) اس کو شب قدر نصیب ہو ہی جائے گی (یعنی لیلۃ القدر سال کی کوئی نہ کوئی رات ہوتی ہے۔ پس جو اس کی برکات کا طالب ہو

اُسے چاہیے کہ سال کی ہر رات کو عبادت سے معمور کرے اس طرح وہ یقینی طور پر شب قدر کی برکات پا سکے گا ـــــ زر بن حبش نے حضرت ابن مسعود کی یہ بات نقل کر کے حضرت ابی بن کعب سے دریافت کیا کہ آپ کا اس بارہ میں کیا ارشاد ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ بھائی ابن مسعود پر خدا کی رحمت ہو ان کا مقصد اس بات سے یہ تھا کہ لوگ (کسی ایک ہی رات کی عبادت پر) قناعت نہ کرلیں ورنہ ان کو یہ بات یقیناً معلوم تھی کہ شب قدر رمضان ہی کے مہینہ میں ہوتی ہے اور اس کے بھی خاص آخری عشرہ ہی میں ہوتی ہے (یعنی اکیسویں سے انتیسویں یا تیسویں تک) اور وہ معین ستائیسوں شب ہے۔ پھر انھوں نے پوری قطعیت کے ساتھ قسم کھا کر کہا کہ وہ بلاشبہ ستائیسویں شب ہی ہوتی ہے (اور اپنے یقین و اطمینان کے اظہار کے لیے قسم کے ساتھ) انھوں نے انشاء اللہ بھی نہیں کہا (زر بن حبش کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ اے ابوالمنذر! (یہ حضرت اُبیؓ کی کنیت ہے) یہ آپ کس بنا پر فرماتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ میں اس نشانی کی بنا پر کہتا ہوں جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی تھی اور وہ یہ کہ شب قدر کی صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو اس کی شعاع نہیں ہوتی۔

(صحیح مسلم)

(**تشریح**) حضرت اُبیؓ بن کعب کے جواب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے جو قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی کہ شب قدر معین طور سے ستائیسویں شب ہی ہوتی ہے، یہ بات انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنی تھی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو ایک خاص نشانی بتائی تھی انھوں نے چونکہ وہ نشانی عموماً ستائیسویں شب کی صبح ہی کو دیکھی تھی اس لیے یقین کے ساتھ انھوں نے رائے قائم کر لی تھی ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تو یہ فرمایا کہ اس کو آخری عشرہ میں تلاش کرو، اور کبھی فرمایا کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو، کبھی عشرۂ اخیرہ کی پانچ طاق راتوں میں سے چار یا تین راتوں کے لیے فرمایا۔ کسی خاص رات کی تعیین آپ نے نہیں فرمائی، ہاں بہت سے

اصحاب ادراک کا تجربہ یہی ہے کہ وہ زیادہ تر ستائیسویں شب ہی ہوتی ہے ـــــ اس عدم تعیین کی بڑی حکمت یہی ہو کہ طالب بندے مختلف راتوں میں عبادت و ذکر و دعا کا اہتمام کریں۔ ایسا کرنے والوں کی کامیابی یقینی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِىْ كُبْكُبَةٍ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ۔

ـــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں نازل ہوتے ہیں اور ہر اُس بندہ کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں جو کھڑا یا بیٹھا اللہ کے ذکر و عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

شبِ قدر کی خاص دُعا:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ عَلِمْتُ اَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا اَقُوْلُ فِيْهَا قَالَ قُوْلِىْ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّىْ ــــ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے بتائیے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون رات شبِ قدر ہے تو میں اس رات اللہ سے کیا عرض کروں اور کیا دعا مانگوں، آپ نے فرمایا یہ عرض کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّىْ

اے میرے اللہ تو بہت معاف فرمانے والا اور بڑا کرم فرما ہو اور معاف کر دینا تجھے پسند ہے۔ پس تو میری خطائیں معاف فرما دے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر بہت سے حضرات کا یہ معمول ہے کہ وہ ہر رات میں یہ دُعا خصوصیت سے کرتے ہیں اور رمضان مبارک کی راتوں میں اور ان میں سے بھی خاص کر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اس دُعا کا اور بھی زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

اعتکاف :-

رمضان مبارک اور بالخصوص اس کے آخری عشرہ کے اعمال میں سے ایک اعتکاف بھی ہے،

اعتکاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر طرف سے یکسو اور سب سے منقطع ہو کر بس اللہ سے لو لگا کے اُس کے در پہ یعنی کسی مسجد کے کونہ میں پڑ جائے اور سب سے الگ تنہائی میں اسکی عبادت اور اسی کے ذکر و فکر میں مشغول رہے، یہ خواص بلکہ اخص الخواص کی عبادت ہے، — اس عبادت کے لیے بہترین وقت رمضان مبارک اور خاص کر اس کا آخری عشرہ ہی ہو سکتا تھا اسلیے اسی کو اس کے لیے انتخاب کیا گیا۔

نزولِ قرآن سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت مبارک میں سب سے یکسو اور الگ ہو کر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے ذکر و فکر کا جو بیتابانہ جذبہ پیدا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں آپ مسلسل کئی مہینے غار حرا میں خلوت گزینی کرتے رہے، یہ گویا آپ کا پہلا اعتکاف تھا اور اس اعتکاف ہی میں آپ کی روحانیت اس مقام تک پہونچ گئی تھی کہ آپ پر قرآن مجید کا نزول شروع ہو جائے۔ چنانچہ حرا کے اس اعتکاف کے آخری ایام ہی میں اللہ کے حاملِ وحی فرشتے جبرئیل سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتیں لے کر نازل ہوئے —— تحقیق یہ ہے کہ یہ رمضان مبارک کا مہینہ[1] اور اس کا آخری عشرہ تھا اور وہ رات شب قدر تھی۔ اس لیے بھی اعتکاف کے لیے رمضان مبارک کے آخری عشرہ کا انتخاب کیا گیا۔

---

[1] کما رواہ البیہقی واختارہ ابن اسحاق۔ راجع فتح الباری۔

رُوح کی تربیت و ترقی اور نفسانی قوتوں پر اس کو غالب کرنے کے لیے پورے مہینے رمضان کے روزے تو تمام افرادِ اُمّت پر فرض کیے گئے، گویا کہ اپنے باطن میں ملکوتیت کو غالب اور بہیمیت کو مغلوب کرنے کے لیے اتنا مجاہدہ اور نفسانی خواہشات کی اتنی قربانی تو ہر مسلمان کیلئے لازم کر دی گئی کہ وہ اس پورے محترم اور مقدس مہینے میں اللہ کے حکم کی تعمیل اور اسکی عبادت کی نیت سے دن کو نہ کھاوے، نہ پیوے نہ بیوی سے متمتع ہو، اور اسی کے ساتھ ہر قسم کے گناہوں بلکہ فضول باتوں سے بھی پرہیز کرے اور یہ پورا مہینہ ان پابندیوں کے ساتھ گزارے۔

بس یہ تو رمضان مبارک میں روحانی تربیت و تزکیہ کا عوامی اور کمپلسری نصاب مقرر کیا گیا اور اس سے آگے تعلق باللہ میں ترقی اور ملاءِ اعلیٰ سے خصوصی مناسبت پیدا کرنے کے لیے اعتکاف رکھا گیا۔ اس اعتکاف میں اللہ کا بندہ سب سے کٹ کے اور سب سے ہٹ کے اپنے مالک و مولا کے آستانے پر اور گویا اسی کے قدموں میں پڑ جاتا ہے اسکو یاد کرتا ہے اسی کے دھیان میں رہتا ہے اُس کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے، اُس کے حضور میں توبہ و استغفار کرتا ہے اپنے گناہوں اور قصوروں پر روتا ہے اور رحیم و کریم مالک سے رحمت و مغفرت مانگتا ہے، اسکی رضا اور اس کا قرب چاہتا ہے، اسی حال میں اسکے دن گزرتے ہیں اور اسی حال میں اس کی راتیں ــــ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی بندہ کی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے ــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہتمام سے ہر سال رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے تھے۔ بلکہ ایک سال کسی وجہ سے رہ گیا تو اگلے سال آپ نے دو عشروں کا اعتکاف فرمایا ــــ اس تمہید کے بعد اس سلسلے کی حدیثیں پڑھیے!

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهٖ ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، وفات تک آپ کا یہ معمول رہا، آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اہتمام سے اعتکاف کرتی رہیں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) ازواجِ مطہرات اپنے حجروں میں اعتکاف فرماتی تھیں، اور خواتین کیلئے اعتکاف کی جگہ اُن کے گھر کی وہی جگہ ہو جو انھوں نے نماز پڑھنے کی مقرر کر رکھی ہو، اگر گھر میں نماز کی کوئی خاص جگہ مقرر نہ ہو تو اعتکاف کرنے والی خواتین کو ایسی جگہ مقرر کر لینی چاہیئے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ فَلَمْ يَعْتَكِفْ عَامًا فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اِعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ ـــــــــ رواه الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، ایک سال آپ اعتکاف نہیں کر سکے تو اگلے سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حضرت انس کی اس روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ ایک سال اعتکاف نہ ہو سکنے کی کیا وجہ پیش آئی تھی۔ سنن نسائی اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت ابی بن کعب کی ایک حدیث مروی ہے اس میں تصریح ہے کہ ایک سال رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں آپ کو کوئی سفر کرنا پڑ گیا تھا اس کی وجہ سے اعتکاف نہیں ہو سکا تھا اس لیے اگلے سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے کہ جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال کے رمضان میں بھی آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا تھا یہ بیس دن کا اعتکاف غالباً اس وجہ سے فرمایا تھا کہ آپ کو یہ اشارہ مل چکا تھا کہ عنقریب آپ کو اس دنیا سے اُٹھا لیا جائے گا اس لیے اعتکاف جیسے اعمال کا شغف بڑھ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک — آتشِ شوق تیز تر گردد

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَلسُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَّا يَعُوْدَ مَرِيْضًا وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً وَلَا يَمَسَّ الْمَرْاَةَ وَلَا يُبَاشِرَهَا وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ اِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ

جامع ـــــــــــ رواہ ابو داؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا کہ معتکف کے لیے شرعی دستور اور ضابطہ یہ ہے کہ وہ نہ مریض کی عیادت کو جائے، نہ نماز جنازہ میں شرکت کے لیے باہر نکلے، نہ عورت سے صحبت کرے، نہ بوس و کنار کرے اور اپنی ضرورتوں کے لیے بھی مسجد سے باہر نہ جائے سوائے اُن حوائج کے جو بالکل ناگزیر ہیں (جیسے پیشاب پاخانہ وغیرہ) اور اعتکاف (روزہ کے ساتھ ہونا چاہیے) بغیر روزہ کے اعتکاف نہیں، اور مسجد جامع میں ہونا چاہیے اس کے سوا نہیں۔

(سنن ابی داؤد)

تشریح) اس سلسلۂ معارف الحدیث میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ صحابۂ کرام میں سے جب کوئی یہ کہے کہ "سنت" یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی مسئلہ یہ ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یا طرز عمل سے جانا ہے اس لیے یہ حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہوتا ہے، اس بنا پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں اعتکاف کے جو مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ نبوی ہدایات ہی کے حکم میں ہیں، اس کے بالکل آخر میں "مسجد جامع" کا جو لفظ ہے اُس سے مراد جماعت والی مسجد ہے یعنی ایسی مسجد جس میں پانچوں وقت جماعت پابندی سے ہوتی ہو ـــ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اعتکاف کے لیے روزہ بھی شرط ہے اور جماعت والی مسجد کا ہونا بھی

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ هُوَ يَعْتَكِفُ الذُّنُوْبَ وَيَجْرِيْ لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا ـــــــــــ رواہ ابن ماجۃ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ (اعتکاف کی وجہ سے اور مسجد میں مقید ہو جانے کی وجہ سے) گناہوں سے بندھا رہتا ہے اور اس کا نیکیوں کا حساب ساری نیکیاں کرنے والے بندے کی طرح

چلتا رہتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) جب بندہ اعتکاف کی نیت سے اپنے کو مسجد میں مقید کر دیتا ہے تو اگرچہ وہ عبادت اور ذکر و تلاوت وغیرہ کر کے اپنے لیے اپنی نیکیوں میں خوب اضافہ کرتا ہے لیکن بعض بہت بڑی نیکیوں سے وہ مجبور بھی ہو جاتا ہے، مثلاً وہ بیماروں کی عیادت اور خدمت کو نہیں جا سکتا، جو بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ کسی لاچار، مسکین، یتیم اور بیوہ کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا، جس کو حدیث میں جہاد کے درجہ کی نیکی کہا گیا ہے، کسی میت کو غسل نہیں دے سکتا، جو اگر ثواب کے لیے اور اخلاص کے ساتھ ہو تو بڑے اجر کا کام ہے، اسی طرح نماز جنازہ کی شرکت کے لیے نہیں نکل سکتا، میت کے ساتھ قبرستان نہیں جا سکتا جس کے ایک ایک قدم پر گناہ معاف ہوتے ہیں اور نیکیاں لکھی جاتی ہیں ـــــ لیکن اس حدیث میں اعتکاف والے کو بشارت سنائی گئی ہے کہ اس کے حساب اور اس کے صحیفۂ اعمال میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ سب نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں جن کے کرنے سے وہ اعتکاف کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔

کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۲۳) خواجہ ابراہیم قبادیانی کے نام۔

[اس بیان میں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنی ذات وصفات اور اعمالِ پسندیدہ و ناپسندیدہ کی اطلاع دی ہے، عقل کو اس بارے میں کوئی دخل نہیں ہے۔]

تمام حمد وستائش اللہ کے لیے ہے جس نے ہم پر طرح طرح کی نعمتوں سے انعام فرمایا اور دینِ اسلام کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہم کو امتِ سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل فرمایا ——— (واضح ہو کہ) انبیاء علیہم السلام، تمام اہلِ عالم کے لیے رحمت ہیں کیونکہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کی خبر انھیں بزرگوں کے ذریعے ہم ناقص عقل اور کوتاہ علم انسانوں کو دی ہے اور اپنے کمالاتِ ذاتیہ وصفاتیہ پر ہماری فہمِ کوتاہ کے مطابق اطلاع بخشی ہے، نیز اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں امتیاز قائم کر کے ہمارے منافعِ دنیوی و اخروی کو ہماری معزتوں سے ممتاز فرما دیا ——— اگر

ان بزرگوں (انبیاء علیہم السلام) کے وجود شریف کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں اثبات صانع حقیقی میں عاجز ہو جاتیں اور اللہ تعالیٰ کے کمالات کا ادراک کرنے میں ناقص و قاصر ثابت ہوتیں (دیکھو) قدمائے فلاسفہ (حکمائے یونان) جو اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے تھے ــــ منکر صانع تھے ــــ اور چیزوں کو اپنی بیوقوفی کی وجہ سے دہر (زمانے) کی طرف منسوب کرتے تھے ــــ نمرود بادشاہ کا مجادلہ، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے خالق ارض و سما کے اثبات میں ہوا تھا جو مشہور ہے اور قرآن میں مذکور ہے ــــ فرعون کمبخت کہتا تھا کہ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (میں اپنے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں جانتا) نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے کہا ہے لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (اگر تم نے میرے علاوہ کسی کو معبود بنایا تو تم کو ضرور بالضرور قید خانے میں ڈال دوں گا) پھر یہی بدقسمت فرعون اپنے وزیر، ہامان سے کہتا ہے ــــ يَا هَامَانُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ــــ (اے ہامان تو میرے واسطے ایک بلند عمارت بنوا، شاید میں آسمان تک جانے کی راہوں تک پہونچ جاؤں پھر (وہاں جا کر) موسیٰ کے خدا کو جھانکوں ۔ اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں)

میرا حاصل کلام یہ ہے کہ محض عقل اس دولت عظمیٰ (توحید) کے اثبات میں قاصر و کوتاہ ہے، اور بغیر ہدایت انبیاء علیہم السلام کے دولت خانۂ توحید کا سراغ نہیں مل سکتا ــــ پے در پے انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری ہے جب ان حضرات کی دعوت الی اللہ ـ جو کہ خالق زمین و زماں ہے (اس کی طرف دعوت) شہرت پا گئی اور ان بزرگوں کی بات اونچی اور کلمہ بلند ہوا پھر تو ہر زمانے کے کم عقل جو کہ ثبوت صانع میں تردد و شک رکھتے تھے اپنی بد اعتقادی اور غلطی پر مطلع ہو کر بے اختیار وجود صانع کے قائل ہو گئے اور چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے لگے ــــ یہ توحید ایک ایسا نور ہے جو انوار انبیاء سے حاصل ہوا ہے اور یہ ایسی نعمت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے دسترخوان سے بروئے کار آئی ہو۔

اللہ کی رحمتیں ہوں ان انبیاءؑ پر قیامت تک بلکہ ابدالآباد تک ــــــ اسی طرح تمام سماعی حقائق، تبلیغ انبیاءؑ کے ذریعے ہم تک پہونچے ہیں، مثلاً وجودِ صفات کمال واجب تعالےٰ، بعثتِ انبیاءؑ، عصمتِ ملائکہ، حشر و نشر، جنت و دوزخ کا وجود، اور جنت میں دائمی عیش و راحت، دوزخ میں دائمی عذاب، اور اس جیسے عقائد جن کو شریعت نے بیان کیا ہے۔ عقل ان باتوں کے ادراک سے قاصر ہے اور ان بزرگوں انبیاء (علیہم السلام) سے سُنے بغیر ان چیزوں کے ثابت کرنے میں عقل ناقص و غیر مستقل ہے ــــ جس طرح عقل کا راستہ حسِ ظاہری کے راستے سے اونچا ہے کہ جس بات کا ادراک، حواسِ ظاہری سے نہیں ہو سکتا، عقل اس کا ادراک کر لیتی ہے اسی طرح، طریقۂ نبوت، طریقۂ عقل سے بلند و بالا ہے۔ جو بات عقل کے ذریعے سمجھ میں نہیں آتی نبوّت کے توسّل سے وہ بات سمجھ میں آجاتی ہے ــــ جو شخص اثباتِ معرفتِ حق کے لیے راہِ عقل کے اوپر اور کوئی راستہ نہیں مانتا وہ درحقیقت، طریقۂ نبوت کا منکر ہے اور ایک کھلی ہوئی حقیقت کی مخالفت کرتا ہے ــــ پس وجودِ انبیاء کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں تاکہ وہ ــــ شکرِ مُنعم حقیقی کی طرف جو ازروئے عقل واجب ہے ــــ ہماری رہنمائی کریں ــــ اور تعظیم مُنعم حقیقی کا طریقہ ــــ جو کہ علم و عمل سے تعلق رکھتا ہے، ہم پر ظاہر فرمائیں ــــ اس لیے کہ جو طریقۂ تعظیم، خود اللہ تعالیٰ کے پاس سے حاصل نہ ہوا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مقبول ہونے کے لائق نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ عقلِ انسانی اس طریقۂ تعظیم کو براہِ راست خود معلوم کرنے سے عاجز ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان غیر تعظیم کو تعظیم سمجھ بیٹھتا ہے اور حمد سے ہجو کی طرف چل پڑتا ہے ــــ حق جل مجدہٗ کی تعظیم کا طریقہ حاصل کرنے کا راستہ طریقۂ نبوت پر موقوف اور تبلیغ انبیاءؑ پر منحصر ہے ــــ رہا اولیاء کا الہام یہ بھی انوارِ نبوت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ الہام متابعت انبیاءؑ کے فیوض و برکات میں سے ہے ــــ اگر عقل اس معاملہ میں کفایت کرتی تو فلاسفۂ یونان، جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدا و پیشوا قرار دیا ہے ــــ ضلالت و گمراہی کے میدان میں سرگرداں نہ ہوتے اور حق تعالیٰ کو سب لوگوں سے زیادہ وہی

پہچانتے، لیکن حال یہ ہے کہ ذات وصفاتِ واجبی کے بارے میں سب انسانوں سے زیادہ جاہل یہی فلاسفۂ یونان ہیں کیونکہ انھوں نے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو بے کار و معطل جانا ہے اور صرف ایک چیز (یعنی عقلِ فعّال) کے علاوہ اور کسی چیز کو اللہ تعالیٰ سے منسوب نہیں کرتے اور عقلِ فعّال بھی ان کے نزدیک اختیاری طور پر نہیں، بس یوں ہی اضطراری طریقہ سے اللہ تعالیٰ سے بن گئی ہے ــــ یہ عقلِ فعّال انھوں نے اپنی طرف سے تراشی ہے اور وہ تمام حوادث و واقعات کو خالقِ ارض وسما سے بے تعلق رکھ کر ــــ عقلِ فعّال کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اثر کی نسبت بجائے موثرِ حقیقی (جل مجدہٗ) کے عقلِ فعّال کی طرف کرتے ہیں ــــ ان فلاسفہ کے نزدیک، معلول، علتِ قریبہ کے اثر کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ علتِ بعیدہ کو معلول کے حاصل ہونے میں مؤثر ہی نہیں جانتے اور اپنی جہالت کے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف اشیاء کی نسبت نہ کرنا ہی اللہ تعالیٰ کا کمال تصور کیے ہوئے ہیں۔ اور اس کی تعطیل (بیکاری) کو ہی تعظیم سمجھ رکھا ہے، حالانکہ حضرت حق جل مجدہٗ (قرآن میں) اپنے کو خالقِ سموات وارض کہہ کر سراہتے ہیں اور اپنی مدح ربُّ المشرق والمغرب کہہ کر فرما رہے ہیں ــــ ان نادانوں کو اپنے زعمِ فاسد میں حق تعالیٰ کی کوئی احتیاج نہیں ہے اور اس ذاتِ اقدس سے نیازمندی کا کوئی تعلق نہیں ہے ــــ ان کو چاہیے کہ اضطرار و احتیاج کے وقت عقلِ فعّال ہی کی طرف رجوع کریں اور اسی سے اپنی حاجت پوری کرایا کریں کیونکہ وہ تمام معاملات کو اسی کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔

ــــ (مگر عجیب بات ہے کہ) عقلِ فعّال بھی ان فلاسفہ کے گمان میں اضطراری طور پر حوادث یومیہ صادر کرتی ہے خود مختار نہیں، لہٰذا اس بے چاری سے حاجت چاہنا بھی غیر معقول بات ہوگی (اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے) "منکرین کا کوئی بھی ناصر و مددگار نہیں" ــــ یہ عقلِ فعّال آخر ہوتی کون ہے جو اشیاء کا انتظام کرے اور حوادث اس کی طرف منسوب ہوں ــــ اس عقلِ فعّال کے نفسِ وجود اور ثبوت ہی میں ہزاروں شبہات موجود ہیں اس لیے کہ عقلِ فعّال کا تحقق و حصول ایسے غلط مقدمات پر موقوف ہے جو فلاسفہ کی طمع کاری کا بہترین نمونہ ہیں اور جو اصولِ حقّۂ اسلامیہ کے قواعد کی

رو سے (قطعی) ناتمام و ناقص ہیں ــــــ کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو اشیاء کو قادرِ مختار جل مجدہٗ سے بے تعلق قرار دے کر اس طرح کے ایک امر موہوم (عقلِ فعّال) کی طرف منسوب کردے ــــــ بلکہ اشیاء کو بھی اس بات سے انتہائی شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ فلسفی کی من گھڑت عقلِ فعّال کی طرف منسوب ہوں ــــــ اشیاء اپنے نابود ہونے کو پسند کریں گی اور ہرگز اپنے وجود کو نہ چاہیں گی اس بات کے مقابلے میں کہ وجود کی نسبت، سوفسطائی اور فلسفی کے من گھڑت عقلِ فعّال سے کی جائے اور اس طرح وہ قدرتِ قادرِ مختار کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم رہیں ــــــ

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ــــ (ان منکرین کی زبانوں سے جو بات نکل رہی ہے بڑی سخت ہے۔ یہ محض جھوٹ بول رہے ہیں) ــــ کفارِ دار الحرب، باوجود بُت پرستی، ان فلاسفہ سے اچھے ہیں کہ وہ تنگی و پریشانی میں حضرت حق کے سامنے ہی التجا کرتے ہیں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ایک وسیلۂ شفاعت قرار دیتے ہیں (اگرچہ اُن کی بھی بُت پرستی اور بتوں کے ساتھ یہ عقیدہ سراسر لغو و باطل اور شرک ہے) ــــ یہ بات عجیب تر ہے کہ (ان نادانیوں کے باوجود) ایک جماعت ان نادانوں کو حکماء قرار دیتی ہے اور حکمت کے ساتھ منسوب کرتی ہے حالانکہ ان کے اکثر احکام جھوٹے اور مخالفِ کتاب و سنت ہیں، خصوصاً الہٰیات کے اندر جو کہ بہت ہی اعلیٰ اور روشن مقصد ہے ــــــ

ان نادانوں پر جن کے حصّے میں سراسر جہلِ مرکب آیا ہے، حکماء کا اطلاق آخر کس اعتبار سے کیا جاتا ہے؟ شاید استہزاء اور مذاق کے طور پر ان کو حکماء کہا جاتا ہو، یا جس طرح نابینا کو بینا (اور بیوقوف کو عقلمند) کہہ دیتے ہیں ان بے حکمتوں کو بھی حکماء کہہ دیا جاتا ہو۔

ــــــ ان بیوقوفوں (حکماء) میں ایک جماعت ایسی ہے جس نے طریقِ انبیاء علیہم السلام کو لازم قرار دیئے بغیر اُن "صوفیہ الہیہ" کی تقلید میں جو کہ ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کے متبع رہے ہیں طریقِ ریاضت و مجاہدہ کو اختیار کیا ہے اور وہ اپنے "صفائے وقت" پر فریفتہ ہو گئے ہیں، نیز اپنے خواب و خیال پر اعتماد کیے ہوئے ہیں اور اپنے "کشوفِ خیالی"

کو اپنا مقتدا بنا بیٹھے ہیں (اس طرح) خود بھی گمراہ ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ہے۔ ان کو پتہ نہیں کہ یہ صفائی جو ان کو حاصل ہے محض صفائے نفس ہے جو گمراہی کی طرف راستہ کھولتی ہے، صفائے قلب ان کو حاصل نہیں ہے جو کہ دریچۂ ہدایت ہے — اس لیے کہ صفائے قلب متابعت انبیاءؑ پر موقوف ہے اور تزکیۂ نفس مربوط ہے، صفائے قلب اور نفس پر حکومت قلب سے — قلب جو کہ انوارِ الٰہیہ کے ظہور کا محل ہے اس قلب کی ظلمت کے باوجود جب نفس صفائی پیدا کرلیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے (اندھیرے میں) ایک چراغ جلائیں تاکہ چھپا ہوا دشمن جو گھات لگائے ہوئے ہے (یعنی ابلیس لعین) اس چراغ کی روشنی میں چھاپا مارے اور خوب تاراج و برباد کرے —

الغرض طریق ریاضت و مجاہدہ، نظر و استدلال کی طرح اُس وقت اعتبار و اعتماد پیدا کرتا ہو جب کہ وہ طریق انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے ساتھ ملا ہوا ہو — انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے تبلیغ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تائید ان کو حاصل ہے۔ ان بزرگو (انبیاء علیہم السلام) کا کارخانہ، ملائکہ معصومین کے نزول کی وجہ سے دشمن لعین (ابلیس) کے کید و مکر سے محفوظ ہوتا ہے۔ آیت قرآنی اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (بیشک میرے (خاص) بندوں پر اے ابلیس تیرا غلبہ نہیں ہوگا) ان انبیاء کے لیے نقد وقت ہے — دوسروں کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی ہے — اور شیطان لعین کے جال سے رہائی اس وقت تک متصور نہیں جب تک ان بزرگوں کی اتباع نہ کی جائے اور ان کے نقشِ قدم پر نہ چلا جائے ؎

محال است سعدی کہ راہِ صفا　　　تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ[1]

تعجب ہے کہ افلاطون جو کہ فلاسفہ کا سردار ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عہد نبوت پائے اور برکات نبوت سے بہرہ ور نہ ہو لیکن ہیچ ہے، مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ (اللہ تعالیٰ جس کے لیے نور مہیا نہ کرے اُس کے لیے کوئی نور نہیں ہے)۔

---

[1] اے سعدی، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے بغیر راہ صدق و صفا پر چلنا محال ہے۔

ــــ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ــــ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ــــ (البتہ سابق میں ہمارا وعدہ اپنے فرستادہ بندوں کے حق میں صادر ہو چکا ہے کہ بالتحقیق پیغمبر ہی مظفر و منصور ہیں اور ہمارا جو لشکر ہے وہی غالب ہے) ــــ عجیب معاملہ ہے کہ فلاسفہ کی ناقص عقلیں گویا کہ طریق انبیاء کی جانب ضد میں واقع ہیں مبدا میں بھی اور معاد میں بھی اور اُن فلاسفہ کے احکام، انبیاء علیہم السلام کے احکام کے مخالف ہیں، انھوں نے ایمان باللہ درست کیا ہے اور نہ ایمان بآخرت ــــ وہ عالَم کو قدیم کہتے ہیں حالانکہ تمام اہلِ ملت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عالَم اپنے اجزاء سمیت حادث ہے، اسی طرح فلاسفہ قیامت میں آسمان کے پھٹنے، ستاروں کے بکھرنے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور سمندروں کے مجتمع ہو کر بہہ پڑنے کے قائل نہیں ہیں، حالانکہ قیامت میں ان سب امور کے واقع ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ فلاسفہ حشرِ اجسام کا بھی انکار کرتے ہیں جس سے نصوصِ قرآنی کا انکار لازم آتا ہے ــــ فلاسفہ کے متاخرین جنھوں نے اپنے آپ کو زمرۂ اسلام میں داخل کر لیا ہے وہ بھی فلسفہ کے اُصول پر اتنے جمے ہوئے ہیں کہ آسمانوں اور ستاروں وغیرہ کے قدیم ہونے کے قائل ہیں، اور ان چیزوں کے عدم فنا کا حکم لگاتے ہیں۔ ان کی خوراک ہی یہ ہے کہ نصوصِ قرآنی کی تکذیب اور ضروریاتِ دین کا انکار کریں ــــ عجیب مومن ہیں کہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں مگر خدا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں اس کو نہیں مانتے۔ حماقت کی بھی انتہا ہوگئی ــــ ؎

فلسفہ[ؔ] چوں اکثرش باشد سفہ پس کل آں
ہم سفہ باشد کہ حکمِ کل حکمِ اکثر است

اس جماعتِ فلاسفہ نے اپنی عمر کو علمِ منطق کی تعلیم و تعلم میں صرف کیا ہے وہ علمِ منطق

؎ لفظ فلسفہ کے اکثر حروف س، ف، ہ (سفہ) ہیں جس کے معنیٰ بیوقوفی کے ہیں، پس فلسفہ کا کل بھی سفہ یعنی بیوقوفی ہی ہوگا اس لیے کہ اکثر کو کل کا حکم دیا جاتا ہے ــــ یعنی اکثر کا اور کل کا حکم ایک ہوتا ہے۔

جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جو خطائے فکری سے محفوظ رکھتا ہے اور اس فن میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں، مگر حال یہ ہے کہ جب یہ لوگ ذات وصفات خداوندی پر پہونچے جو کہ مقصد اعلیٰ ہے ــــ تو اپنے حواس کھو بیٹھے اور اس آلے کو اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا جس کو خطا سے بچانے والا کہتے تھے اور ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے گمراہی کے بیابان میں رہ گئے ــــ بالکل اس طرح کہ جیسے کوئی سپاہی سالہا سال آلات حرب کو تیار کرے اور جب جنگ کا وقت آجائے تو اس کے چھکے چھوٹ جائیں اور وہ اُن ہتھیاروں کو استعمال نہ کر سکے ــــ لوگ علوم فلسفی کو مکمل و صحیح اور غلطی و خطا سے محفوظ جانتے ہیں۔ ہم اس کو تسلیم بھی کرلیں تو یہ بات صرف ان علوم میں صادق آئے گی جن میں عقل کو استقلال و دخل حاصل ہو، اور ایسے علوم ہماری بحث سے خارج ہیں اور لایعنی و بے فائدہ کے دائرے میں داخل ہیں۔ یہ علوم، آخرت میں جو کہ دائمی ہے ــــ کارآمد نہیں ــــ اور نجات اخروی ان سے متعلق نہیں ہے ــــ کلام تو ان علوم میں ہو رہا ہے جن کو عقل سمجھنے سے عاجز ہوتی ہے اور جو طریقۂ نبوت سے وابستہ ہیں اور نجات اُخروی اُن سے مربوط ہے ــــ .... الٰہیات میں اور ذات وصفات و افعالِ واجب جلّ سلطانہٗ میں جو نادانیاں انھوں نے بگھاری ہیں، اور ایمان باللہ اور ایمان بیوم آخر میں جو جو مخالفتیں نصوصِ قرآنیہ کی انھوں نے کی ہیں اُن کا تھوڑا سا بیان اوپر گذر چکا ہے ــــ رہ گیا علم ہندسہ وغیرہ جو ان فلاسفہ سے یک گونہ مخصوص ہے اگر یہ علم تام و مکمل بھی ہو تو (آخرت میں) کیا کام آئے گا اور کون سا عذاب اور وبال آخرت یہ دور کرے گا...... اور جو علم، آخرت میں کام نہ آئے لایعنی ہے ــــ علم منطق جو کہ فکرِ صحیح اور فکرِ سقیم میں امتیاز کرنے کا ایک آلہ ہے اور جس کو خطا سے محفوظ رکھنے والا کہتے ہیں وہ علم منطق جب ان فلاسفہ کے ہی کام نہ آیا اور اس نے مقصد اعلیٰ میں اُن کو غلطی و خطا سے نہ نکالا تو پھر دوسروں کے کام کیسے آجائے گا اور دوسروں کو خطا سے رہائی کیسے دے گا؟ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (اے ہمارے رب ہمارے

دلوں کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کرنا اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرمانا، بیشک تو بڑا عطا کرنے والا ہے) بعض لوگ جو کہ علوم فلسفیہ کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور فلسفے کی ملمع کاری پر فریفتہ ہیں وہ اس جماعت فلاسفہ کو حکماء جانتے ہیں اور (نعوذ باللہ) انبیاء علیہم السلام کی مانند سمجھتے ہیں۔ بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ وہ ان کے علوم کاذبہ کو سچا جانکر کہیں شرائع انبیاءؑ پر ان علوم کاذبہ کو ترجیح نہ دے دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقیدۂ بد سے پناہ دے ـــــ ہاں ہاں جب ان کو حکماء جانیں گے اور ان کے علم کو حکمت کہیں گے تو ضرور اس (مذکورۂ بالا) بلا میں گرفتار ہوں گے ـــــ اس لیے کہ حکمت نام ہے کسی چیز کے علم کا جو مطابق نفس الامر ہو۔ اب جو علوم بھی ان حکماء کے علوم کے مخالف ہوں گے وہ لامحالہ (اُن کے گمان میں) نفس الامر سے مطابقت نہ رکھیں گے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ حکماء اور اُن کے علوم کی تصدیق کرنا انبیاء علیہم السلام اور اُن کے علوم کی تکذیب کرنے کے مرادف ہے اس لیے کہ دونوں علوم ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک کی تصدیق سے دوسرے کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ طریقۂ انبیاءؑ کو اختیار کرے اور جماعت حق میں شامل ہو کر اہل نجات میں سے ہو جائے اور جس کا جی چاہے وہ فلسفی بن جائے اور گروہ شیطان میں داخل ہو کر خائب و خاسر ہو جائے، اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے، بیشک ہم نے کافروں کے لیے آگ طیار کر رکھی ہے جس کے پردے کافروں کا احاطہ کر لیں گے، اگر وہاں وہ کافر فریاد کریں گے تو ایسا پانی پلایا جائے گا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا اور جو ان کا منھ جھلس دے گا۔ یہ برا پینا ہے اور دوزخ بری آرام گاہ ہے) والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

دینی تعلیم کیوں؟

(از جناب مولوی عُبَیدُ الرحمٰن صاحب وکیل، بستی)

ذیل کا مضمون جناب عبید الرحمٰن صاحب کے ایک غیر مطبوعہ خطبۂ استقبالیہ سے لیا گیا ہو جو موصوف نے ۳۰ نومبر ۶۲ء کو انجمن تعلیمات دین بستی کی ضلع کانفرنس میں پڑھا تھا ـــــ (ادارہ)

حضرات! اہل بصیرت سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو کہ لے دے کر ایمان ہی ہماری متاع عزیز رہ گئی ہے جسے ہم اللہ۔ رسول۔ کتاب۔ ملائکہ اور آخرت کے معتقداتی و فکری وظائف کی بدولت اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اور ملت اسلامیہ کے تاریخی انتشار اور خلافت اسلامیہ کے سیاسی اعتزال اور دینی اضمحلال کے گذشتہ تخمیناً سات سو سالہ عہد طویل میں بھی ہم نے اسلاف کی اس گرانقدر دیانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہو بھلے یا بُرے جس طرح بھی بن پڑا ہو ہم نے اس نادر سرمایہ کو اغیار کی ملحدانہ تگ و تاز اور کافرانہ طمطراق کے باوجود ان کے دستبرد سے مامون و محفوظ رکھا ہو اور وقتاً فوقتاً جو سیلاب بھی آیا ہے اس کا رُخ خود اعتمادی اور پامردی کے ساتھ موڑتے رہے ہیں۔ یہی امتحان ہمارے لئے کیا کم تھا کہ حالات کی ستم ظریفی سے اب ہمارے بلاد اسلامیہ ہی جن کی جانب ہم نے ہمیشہ دینی رہنمائی کے لئے آنکھ اٹھا کر دیکھا گذشتہ چند سالوں سے اپنی اپنی سیاسی آزادیاں حاصل کر کے بجائے آپس میں دینی تعلق کی بنیاد پر متحد و منسلک ہونے کے نہ صرف باہم دست و گریباں نظر آرہے ہیں بلکہ ان میں سے کچھ تو اپنا نسلی سلسلہ فراعنہ سے استوار کر کے اور بعض اپنا فکری رشتہ لینن اور کارل مارکس سے جوڑ کر ہمارے ملی وقار کو صدمہ پہنچا رہے ہیں اور انتہائی بے غیرتی و بے حمیتی کے ساتھ اسلام کی روحانی اور فکری کم مائگی کا بھی مظاہرہ کرتے

پھر سہے ہیں ؎

گر مسلمانی ہمیں ست کہ حافظ دارد وائے گر پس امروز بود فردائے

حضرات! ان ناساعد حالات سے ہمیں ہرگز بددل نہ ہونا چاہیے۔ یہ جو کچھ ہورہا ہے قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔ ایسا نہ ہوتا ہی حیرت و استعجاب کی بات ہوتی۔ بنو امیہ کی دور خلافت سے لیکر آج تک کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جب کبھی مسلمانوں نے اپنا سیاسی عروج تقویٰ و طہارت سے ہٹ کر محض مادی اصولوں پر حاصل کیا ہے تو ان کے معاشرہ میں دینی اضمحلال لازمی طور پر پیدا ہوگیا ہے اور دیکھتے دیکھتے ان کا سیاسی عروج انہیں مادی اصولوں کی راہ سے غائب بھی ہوگیا ہے ہم اسے نہیں بھول سکتے کہ ہمارے بزرگان دین کو جو روح فرسا آلام و مصائب برداشت کرنا پڑے ہیں وہ ایسے ہی نام نہاد مسلمان امراء، سلاطین اور خلفاء کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑے ہیں جنکی قہرمانی طاقت کا سرچشمہ طاغوتی عناصر و عوامل سے پاک نہ تھا۔ یہ اور بات ہو کہ ان میں سب کے سب بد نہاد نہ تھے۔ کچھ نیک طبع بھی گزرے ہیں مگر ان کی انفرادی نیک طبعی ان کی حکومت کی دستوری بدوضعی و دین کشی کو عملاً متاثر نہیں کرسکتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دین سے ہٹ کر مسلمان کا کوئی وجود ہی صحیح معنوں میں متعین نہیں ہوتا خواہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی شکل میں۔ ہم آج محض جذباتی تعلق کی بناء پر مصر۔ عراق۔ شام۔ ماوراء النہر۔ ترکی۔ ایران۔ مراکش۔ الجزائر۔ تیونس اور دیگر ممالک اسلامیہ کے حق میں نہ رہے دست بدعا رہتے ہیں اور ان کے آرام سے خوش اور ان کی تکلیف سے غمگین ہوتے ہیں کیونکہ اسلامی تاریخ کے درخشندہ کردار جن کے تاریخی کارناموں کے مطالعے سے نفسیاتی طور پر ہمارے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے انہیں سرزمینوں میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام نام ہے عقائد، اصول و اعمال کے مجموعہ کا نہ کہ شخصیتوں اور ملکتوں کا۔ ماسوا انبیاء علیہم السلام کے جن کی شخصیتیں اور بجز مملکت حجاز کے جس کے مخصوص خطہ ہائے ارضی تکوینی و تشریعی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لئے اصل الاصول کا درجہ رکھتے ہیں اور ان سے صرف نظر کرکے اس میں شبہ نہیں کہ دین کے بارے میں ہمارا تصور ناقص و نامکمل رہ جاتا ہو ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ اسلام اور مسلمان مقامی نہیں ہوسکتے۔ ان کی فطرت اور ساخت آفاقی ہے کیونکہ دنیا میں مسلمان ہی تنہا وہ "خیر امت" ہے جو احکم الحاکمین کی ازلی رضا کا رہو اور اسی کی حکومت پوری دنیا اور

ساری بنی نوع انسان پر صحیح دین کے ساتھ قائم کرنے کے لئے ہمیشہ سے کوشاں اور سرگرداں رہی ہو۔
اس مشاہدہ کا دوسرا رُخ بھی ایسا ہی ہمہ گیر ہے اور کلیہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ جب بھی مسلمانوں کی دنیوی حکومتوں کو زوال سے دوچار ہونا پڑا ہے تو دینی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی ہو اور اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد مستثنیات کو نظر انداز کرتے ہوئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بالعموم اسلامی معاشرہ میں شریعت و حکومت کی باہمی مطابقت کما حقہٗ مشکل ہی سے کبھی ہو پائی۔ دونوں اپنی اپنی الگ الگ راہیں چلتی رہیں۔ تاریخ عالم کا ہر طالب علم جانتا ہو کہ دنیائے عیسائیت میں چرچ (church) اور اسٹیٹ (state) کے اپنے اپنے جداگانہ تشخص و اصول کار کے باوصف اور پادشاہ و پاپا کی باہمی چشمکوں اور آویزشوں کے باوجود جب کبھی بھی پادشاہ کی پادشاہی کو جھٹکا لگا ہے تو پاپا کی پاپائی بھی سرنگوں ہو ہو گئی ہے حالانکہ منطقی طور پر ایسا ہونا نہیں چاہیئے تھا۔
وجہ اس کی یہ ہے کہ پاپائی میں کبھی داخلی اور روحانی طور پر اتنا دم نہیں رہا کہ وہ بلا حکومتی سہارے کے کھڑی رہ سکتی۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کا دینی معاشرہ اور ان کا تشریعی ڈھانچہ مسلمان سلاطین کی سیاسی ہزیمتوں سے نہ صرف غیر متاثر رہا بلکہ اس کی راہ سے بہت سارے روڑے خود بخود ہٹ گئے۔
یہ محض خوش عقیدگی ہی کی بات نہ ہوگی اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ دین اسلام کی بقاء اور ترقی دنیاوی ارباب اقتدار کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑی گئی بلکہ اسے کائنات کے مقتدر اعلیٰ نے اپنے ہی مخفی ہاتھوں میں ہمیشہ رکھا جس کا سامان روز بروز اور لحظہ بلحظہ ان بے شمار غلامانِ مصطفوی کے تقویٰ و تضرع اور تسبیح و تحمید کے ذریعہ بہم پہونچتا رہا ہو جو خیمہ و خرگاہ سے محروم اور خدم و حشم سے عاری ہی رہے ہیں اور اپنا گزران محض نان جویں پر کرتے رہے ہیں اور کبھی تو وہ بھی انھیں میسر نہیں ہوئی ہے۔ زمانہ حاضرہ کا ایک معروف اور نسبتاً غیر متعصب انگریز مفکر ایچ۔ اے۔ آر۔ گب (H. A. R. Gibb) اپنی تازہ ترین کتاب محمڈنزم (Mohammedanism) مصنفہ سنہ ۱۹۵۰ء کے نقش ثانی مطبوعہ سنہ ۱۹۵۴ء میں "توسیع اسلام" کے باب میں جو کتاب کا پہلا باب ہو صفحہ ۱۹ پر اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے تحیر کا اظہار حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہو:

ترجمہ — "لیکن مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ان کے معاشرہ میں دینی کمزوری نہیں پیدا ہوئی بلکہ جیسا اس سے قبل کہا جا چکا ہو ایک خاصی مدت سے حکومت اور

شریعت اپنی اپنی جدا گانہ راہیں بنا چکی تھیں اور ایسا لگتا ہو کہ گویا مسلمانوں کے سیاسی
زوال نے ان کے دینی معاشرہ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی ...."

کم وبیش یہی مشاہدہ علامہ اقبال کا بھی معلوم ہوتا ہے جس کو انہوں نے اپنی نظم "مومن کا زوال"
میں اپنے دلنشیں انداز میں یوں پیش کیا ہے ؎

سبب کچھ اور ہو تو جسکو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا — قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

صاحبان! کیا کہا جائے؟ خلافت راشدہ کے بعد ہماری تاریخ عروج و زوال کے جن منازل سے گذری ہے اور ہماری معاشرت جن انقلابات سے دوچار ہوتی رہی ہے اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ "شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا"۔ اس طویل دور ما بعد کا ہمارا سارا روحانی، فکری اور تمدنی سرمایہ کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہے جس کے مطالعہ سے ایک بات کھل کر سامنے آجاتی ہو اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت رفتہ رفتہ ایسے ہاتھوں میں منتقل ہوتی گئی جو دین کو دنیا کے تابع کرنے کے درپے رہے اور جنھوں نے فرضی دین تعمیر کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تاکہ ان کی طاقت کو مادی طور پر استحکام حاصل ہو اور جب خود مسلمانوں ہی کے معاشرہ میں دین اور دنیا کا معرکہ چھڑ گیا اور ان کی مادی سرپرستی ایسے دنیا دار سلاطین نے کی جنکو اپنی حکومت اللہ کی حکومت سے زیادہ عزیز رہی تو ہم آج کیوں متحیر ہوں اگر ہماری نظروں میں خوب ناخوب ہو چکا ہے اور قبح نے حسن کا درجہ پا لیا ہے غرض کہ سرے سے ہماری اعلیٰ قدریں ہی بدل چکی ہیں ہم ہمیشہ مسیحیت پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے رہے کہ وہاں تو دین و دنیا کی تفریق و تقسیم کر لی گئی۔ دین خدا کے سپرد کر دیا گیا اور دنیا قیصر کے حوالہ ہو گئی چنانچہ ایک کا دوسرے کے معاملہ میں کوئی دخل باقی نہیں رہ گیا لیکن ہمیں اپنے گریبان میں منھ ڈال کر اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیا یہی سب کچھ ہمارے یہاں رونما نہیں ہوا۔ وہ شیطان جو ان کے گھر میں کودا کیا اس نے ہماری دیواروں پر شیرہ نہیں لگایا؟ وہ تو ایک معنیٰ کر کے ہم سے اچھے ہی رہے۔ وہ دنیا چاہتے تھے دنیا ان کو مل گئی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد انہوں نے دین سے لگی لپٹی نہیں رکھی۔ مسیحیت کا عملی طور پر ٹاٹ ہی الٹ دیا اور ایک نیا دین ایجاد کر لیا جس کا نام "تہذیب مغربی" ہے اور وہ ہے نتیجہ قدیم رومائیت۔ یونانیت اور مسیحیت اور جدید افادیت کے

ناجائز اور ناہنجار اختلاط و مواصلت کا اور اس کا کام ہے رات کو دن کرنا۔ عورت کو مرد بنانا مرد کو عورت بنانا۔ داغ دھبوں کو پالش سے چھپانا۔ گرجاؤں اور دیگر عبادت گاہوں کو تفریح گاہوں میں منتقل کرنا۔ بینکوں کی عمارتوں کو عبادت گاہوں کا ظاہری درجہ عطا کرنا۔ سود کھانا۔ لہو پینا اور مساوات کی تعلیم دینا اور چونکہ فیضان سماوی سے وہ محروم ہے اس لئے اس کے فتوحات ہیں۔ "بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس" اور اس کے کمالات کی حد ہے "برق و بخارات"۔ اس نئی تہذیب کے علمبردار یکسوئی اور صفائی کے ساتھ تاویل و تحریف سے انجیل اور توراۃ کو مسخ کرکے اور خدا۔ رسول اور آخرت کے تصور سے بے نیاز ہو کر ایک طرف شیشہ گری کرتے ہیں اور دوسری طرف بے باکانہ ہالی ووڈ۔ ہائڈپارک اور ریویرا (Riviera) کی آرائش و تزئین کرتے اور بے محابا کرسٹائن کیلر کو ساتھ لے کر داد عیش دیتے ہیں۔ امت مسلمہ بھی اگر دین کے قید و بند سے آزاد ہونے کا فیصلہ کرلیتی تو اس کے لئے بھی عرف عام میں دنیاوی ترقی و اقتدار کی راہیں ویسی ہی ہموار ہو جاتیں جیسی کہ موسائیوں۔ عیسائیوں۔ آتش پرستوں اور اصنام پرستوں کے لئے ہو چکی ہیں۔ پھر کیا مشکل تھا کہ ہماری کانفرنس کے معزز مفتی و صدر بھی اپنی گرانقدر صلاحیتوں کو دین سے موڑ کر سائنسی موشگافیوں میں لگا دیتے اور بلا اس خیال کے کہ ان کے پیچھے چلنے والوں کی تاریک راتوں کی صبح بھی ہو گی یا نہیں اپنے تفحص سے آفتاب کی شعاعوں کو گرفتار کرکے دکھلا دیتے اور یہ بھی ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کہ ذرات کی مخفی طاقتوں کو خواہ مثبت ہوں یا منفی دریافت کرکے وہ بھی راکٹوں کے خلائی سفر کے ذریعہ چاند پر پہونچ کر وہاں اپنے بود و باش کا بندوبست کرلیتے یا اپنے دنیوی اسلاف کی معروف روایات کو قائم رکھتے ہوئے دوسری ایجادات کرکے دنیائے فکر و دانش میں ایک ہلچل مچا دیتے۔ لیکن ہمارے لئے مجبوری یہ ہے کہ از مہد تا لحد ہم اس ازلی اور ابدی ضابطۂ حیات سے بندھے ہوئے ہیں جو بنفسہٖ کائنات کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور جس کا دوسرا نام ہے قرآن شریف اور یہی وجہ ہے کہ وہ پیر دانا جن کا نام تھا شیخ سعدی علیہ الرحمہ مدتوں پہلے ہم سے سوال کر چکے ہیں ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ باآسماں نیز پرداختی؟

بزرگوار اور دوستو! انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ وہ پیٹ کی خاطر ہاتھ کی صفائی دکھلائے یا اپنے آرام و آسائش کی خاطر زمان و مکاں کو مسخر کرنے کے لئے دماغ کی ورزش کرے اور اس سلسلہ میں قدرت کے رازہائے سربستہ اور اس کی بے پناہ طاقتوں کے جتنے سربمہر ظروف معبود حقیقی نے ازل سے سینت کر رکھ چھوڑے ہیں ان کے سرپوشوں کو ایک ایک کرکے بلا ضرورت الٹتا پھرے اور اپنی نکتہ رسی اور دریافت کے ڈھول پیٹے۔ اس سے تو حیاتِ انسانی کا ایک بہت ہی محدود اور پست تصور سامنے آتا ہے۔ دنیوی علوم و فنون اور ان کی افادیت و ضرورت کی تنقیص مقصود نہیں۔ ان کا بھی حیات انسانی میں ایک مقام ہے لیکن ان کی خیر و برکت لعنت و عذاب میں تبدیل ہو جاتی ہے جب مقتضیات دینیہ سے آزاد ہو کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کی ایجاد اور ایٹمی توانائی کی دریافت ہوتی ہے۔ پھر تو سائنس کی یہ مفید ایجادات اکثر و بیشتر تخریبی ہی مصرف میں لائی جاتی ہیں ریڈیو خبروں اور اطلاعات کی تلبیس کرتا ہے اور غلط ذہن تیار کرتا ہے۔ ایٹمی توانائی سے موت کے ٹھکے تعمیر ہوتے ہیں اور ہوائی جہاز بم گولے برساتا ہے۔ حسد و ہوسناکی اور بغض و عناد کا دیو دنیا کی سیاسی طاقتوں کو کوڑے مار مار کر باہم سرپیکار کر دیتا ہے اور اس ابلیسی جنگ میں لاکھوں اور کروڑوں بے گناہوں کا خون اور تہذیب و تمدن کے بیش بہا آثار کا اتلاف ہوتا ہے اور اللہ کی یہ زمین دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہے۔ چاقو کی افادیت سے انکار نہیں لیکن جراح اس سے نشتر لگا کر خلق اللہ کی خدمت کرتا ہے اور بلوائی اس سے مردم کشی کرتا ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ طاقت و توانائی کا حاصل کر لینا ہی کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اسے معروف کا امر اور منکرات کی نہی نہ کرنے میں صرف کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا اور ہم میں اتنا ذہنی توازن اور تہذیب نفس نہیں ہے کہ حاصل کردہ توانائی کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے ممکن جائز مصرف میں لائیں تو اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ ہم ایسی توانائی ہی نہ حاصل کریں اور قدرت کے مخفی خزانوں کو ٹٹولتے نہ پھریں زمانۂ حال کا مفکر اقبال بھی اس معاملہ میں ہمارا ہم خیال ہے ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

روزی کمانے میں بھی آج کا انسان اپنی روز افزوں ضروریات کی وجہ سے جانور اور مشین کے

مثل ہو کے رہ گیا ہے۔ چوبیں گھنٹے وہ فکر معاش میں پریشاں و سرگرداں رہتا ہے لیکن اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ غیر مسلموں کی دُنیا ہم سے اس لئے بہتر ہے کہ وہ دینِ اسلام کے مکلف نہیں قدرت کے خالص تکوینی اصولوں کے ماتحت وہ پلتے اور کھوتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہو کہ ہم باوجود مسلمان ہونے کے اللہ کی رضاجوئی سے بے نیاز ہو کر "بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر" والی حالت کے ساتھ دنیا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ محنت زیادہ اور حاصل کم کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں نہ دین ہی کی برکت میسّر آتی ہو اور نہ دنیاوی ثمرات ہی ہمارے ہاتھ لگتے ہیں۔

برادرانِ ملت! بات یہ نہیں ہے کہ دُنیا چھوڑ دی جائے بلکہ سوال صرف تقدیم و تاخیر یا اوّلیت و ثانویت کا ہو ہمیں اپنا صحیح راستہ مسلمان رہتے ہوئے متعین کرنا ہے اور ایک بار ہمیشہ کے لئے طے کر لینا ہے کہ ہماری دُنیا وہ دُنیا ہرگز نہیں ہو سکتی جو غیر مسلموں کی ہو۔ نہ ہماری قدریں وہ قدریں ہو سکتی ہیں جو دوسروں کی ہیں اور نہ سود و زیاں کے ناپنے اور تولنے کا وہ ترازو اور پیمانہ ہی ہمارا ہو سکتا ہو جو اغیار کا ہے۔ ہم دنیا کو دین ہی کی راہ سے پا سکتے تھے لیکن ہماری شومیٔ قسمت کہ دین کو ثانوی درجہ دے کر ہم نے اپنی دُنیا بھی کھو دی ہے۔ آج ہم للچائی ہوئی نظروں سے دوسروں کی چیزوں کی طرف دیکھتے ہیں کیونکہ دین کی حیرت میں ڈال دینے والی طاقت ہم سے ہماری ہی غفلتوں کی بدولت زائل ہو چکی ہے اور مدتوں کی بیگانگی کے باعث ہم اسے بھول چکے ہیں۔ اپنے ملحدانہ یا کافرانہ طرزِ فکر سے ہم یہ تصور نہیں کر پاتے کہ مسلمانوں نے اپنے دین ہی کے بل بوتے پر اسی باد و خاک اور آتش و آب کی دُنیا میں رہ کر وہ کر دکھایا ہے جو انھیں کا طرۂ امتیاز تھا اور جس کو آج بھی عقل کی راہ سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہو
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس کی تصدیق نہ صرف تاریخ کی کتابیں کرتی ہیں بلکہ خود قرآن پاک کرتا ہو۔ افسوس کہ ہمارے مسلمان مؤرخین اور مستشرقین نے بھی اسلام کی عظمت کا جب بھی ذکر کیا ہے تو فنِ عمارت میں ان کے ادب و فلسفہ۔ ان کی تعمیر و مصوری اور ان کے ظروف و لباس ہی کو یا اسی نوعیت کے خالص فکری و فنی نمونوں ہی کو پیش کر سکے ہیں۔ جس عہد کو مسلمانوں کا عہد زریں قرار دیا ہو وہ خلیفہ

ہارون الرشید کا عہد ٹھہرا ہو اور جن مسلمانوں کو مثال میں کھڑا کر سکتے ہیں وہ ابو نصر فارابی۔ بو علی سینا۔ الکندی۔ ابن رشد۔ ابن باجا۔ ابن طفیل اور ابن العربی جیسے حکماء اور مفکرین ہی کی شخصیتیں نکلی ہیں چنانچہ انھیں کی حکایتوں کو خوب مزے لے کر بیان کیا ہے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا دیئے ہیں۔ وہ بیچارے اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ ایسے فنون وعلوم اور ایسے مفکرین بلکہ کبھی کبھار ان سے بھی بہتر غیر مسلموں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن جو خصائل محمودہ غیروں کے یہاں کہیں کسی زمانہ میں بھی نہیں ملتے ہیں وہ رہے ہیں مسلمانوں کے معاملات وعبادات، ان کا تقویٰ و طہارت حلم و عفو۔ ایثار و خطر پسندی، عدل و رحم، خشیتِ الٰہی و عشق رسول اور جذبۂ شہادت و جہاد اور جن عالی مرتبہ انسانوں کی نظیر دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی وہ رہے ہیں پیغمبر اسلام کے اصحاب کرام۔ تابعین و تبع تابعین۔ صالحین و مجاہدین اور اولیاء و اقطاب جن سے ان کی پوری تاریخ بھری پڑی ہو اور جنھوں نے زمین پر ہی نہیں بلکہ کائنات کے عناصر پر حکومت کی ہے، لیکن انھیں لائق اعتناء و تذکرہ نہیں سمجھا گیا بلکہ ژرف نگہی کے فقدان کے باعث ان خصائل حمیدہ کو فرسودہ اور آؤٹ آف ڈیٹ (out of date) تصور کیا گیا اور دین سے بے بہرہ ہونے کے نتیجہ میں ان عظیم شخصیتوں کو مجہولیت اور بیکاری کا نمونہ قرار دیا گیا۔ ہم اس موقع پر دنیا کے اس عظیم ترین انسان کو جو حقیقتاً سرور کائنات اور فخر موجودات تھا اور جس کی ذات گرامی موازنہ و مقابلہ سے بالاتر ہے اپنے دعویٰ کی دلیل میں سامنے لانے سے ادباً گریز کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اور جدید کتب خانوں میں دین بیزاری ہی کا سبق پڑھا اور مدتوں کی غلط تربیت و تعلیم کے نتیجہ میں اور مادہ پرستانہ تہذیب کے ذہنوں پر مستولی ہونے کے باعث یہ خیال عقیدہ کے طور پر راسخ ہو گیا کہ اسلام کو جو کچھ دنیا کو دینا تھی وہ دے چکا۔ اس کی افادیت عرصہ ہوا ختم ہو چکی اور ہم محض اپنی روایات پرستانہ ذہنیت سے اسے اب تک ڈھوئے چلے جا رہے ہیں۔ اسلام اور اسلامی طرز معاشرت کی نسبت ذہنوں میں شدید احساس کمتری پیدا ہو چکا ہو اور دین کے معاملہ میں ہمارا رویہ بالکل انفعالی ہو کر رہ گیا ہے۔ آخر یہ کہاں کی دانائی تھی کہ نہ تو ہم نے یکسو ہو کر اغیار کی طرح دنیا ہی کو اپنایا اور نہ روح دین ہی سے آشنا ہو سکے؟ نہ تو وہ روشن دماغی اور جرأت رندانہ ہی ہم اپنے اندر پیدا کر سکے جو بجلی کے قمقمے روشن کرتی ہے۔ فضائے آسمانی میں

انسانوں کو تیرنا سکھاتی ہے اور بستی جیسے پسماندہ اور بے نام و نشان گوشۂ ارضی میں ہمارے لئے بے رشتہ و تعلق لندن اور نیویارک جیسے دور دراز مراکز تمدن سے رسل و رسائل کی راہیں کھولتی ہے۔ اور نہ اس روشن ضمیری اور عبدیت و سپردگی ہی کو ہم اپنا شعار بنا سکے جس نے ہر امتحان کے موقع پر ہماری قلت کو کثرت پر اور ناتوانی کو توانائی پر غالب کیا ہے۔ فرشتوں کی فوجوں کو ہماری اعانت میں بروقت ضرورت غیب سے لاکھڑا کیا ہے۔ چڑیوں کی چونچوں سے گرائی ہوئی نازک اور بے وزن کنکریوں سے ہاتھیوں کو کچلوا کر چبائی ہوئی گھاس کے مانند کر دیا ہے۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے پانی کو چشم زدن میں پھاڑ کر ہمارے لئے راہ بنادی ہے۔ براہ راست آسمان سے من وسلویٰ کا ہمارے لئے نزول کر دیا ہے۔ شیروں کو روباہ کرکے انکو اپنی پیٹھوں پر لکڑی کے بوجھ لادنے پر مجبور کیا ہو اور اگر شہ کونین کی بزرگی اور برتری کی بات درمیان میں آپڑی ہے تو پھر کسی صاحب معجزہ پیغمبر سے نہیں بلکہ شہ کونین ہی کے ایک صاحب کرامت امتی کے "قم باذن اللہ" کیا، "قم باذنی" کی ایک ضرب سے پرانی قبر کے گڑے ہوئے مردے کو بھی اٹھ کھڑا کروایا ہے۔ غرضکہ ہماری ہر پاکیزہ خواہش کے احترام اور ہر جائز ارادہ کی تکمیل میں قدرت نے اپنا اٹل قانون بدل ڈالا ہو۔ فاصلہ کی دوریاں مختصر ہو گئی ہے اور وقت کی رفتار رک گئی ہے۔ آتش اپنے سوز۔ آب اپنے نم۔ خاک اپنے آرام اور باد اپنے دم سے دستکش ہو ہو گئی ہے۔ ملحدین کو ان تاریخی اور قرآنی مثالوں کو ضعیف الاعتقادی کے لطائف قرار دینے کا حق نہیں پہونچتا ہے جبکہ ان کی منطق سحر و طلسم کے روزمرہ کے ٹھوس نتائج اور محسوس اثرات کی بھی کوئی معقول توجیہ پیش کرنے سے آج تک قاصر ہو اور علی ہذا القیاس کفار و مشرکین کو بھی یہ رتبہ نہیں حاصل ہے کہ وہ خود ٹونوں اور ٹوٹکوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ٹونا اور ٹوٹکا کرنے والوں کے خالق کی قدرت و گیرائی سے انکار کر سکیں۔ افسوس اس پر آتا ہو کہ جی کھول کے ہم دنیا سے بھی نہیں لپٹ سکے رہا دین جو ہماری حیات ملی کا سرچشمہ ہے سو ہم اپنے شکوک و شبہات اور شریعت و طریقت کی کھینچا تانی میں اس سے بھی آنکھ مچولی ہی کھیلتے رہ گئے۔ کفر و ایمان کے قدیمی قصہ میں اور اگر خوش قسمتی سے ہم نے اس قضیہ کو طے بھی کر لیا تو علم و معرفت کی اسلامی نزاع میں ہمارے ذہنی انتشار و تذبذب کی سچی تصویریں علی الترتیب مرزا غالب اور علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کیں ہیں جنکی معنویت اور صداقت سے

انکار ممکن نہیں ہے

غالب { ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اقبال { اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

سبحان اللہ! غالبؔ جیسے رند مشرب اور بادہ پرست مسلمان شاعر کے دل میں بھی ہماری طویل معاشرتی ابتری کے باوجود والدین ہی کے راسخ کیے ہوئے ایمان کی ایک کھٹک باقی رہ گئی ہے جو بالآخر اس کا دامن پکڑتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایمان ہی کی ایک رمق ہے جو اسکی زبان سے بھی کہلوا کے رہتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

کاش کہ یہی ایک نکتہ دل و دماغ کی پوری رضا و رغبت اور تیاری و مستعدی کے ساتھ ذہن نشین کر لیتے کہ ذرہ باوجود اپنی تو دریافت حرارت اور توانائی کے مجموعہ محض ہے اور آفتاب باوصف اپنی معروف تپش و تابناکی کے تابع قانون خداوندی ہے اور دونوں میں سے کوئی بھی قابل پرستش نہیں بلکہ لائق حمد و ثنا وہ ذات باری تعالیٰ ہے جس کو سورہ فاتحہ میں رب العالمین کہا گیا اور جس نے سورۂ طٰہٰ میں نبی آخر الزماں کو کفار کے دنیاوی مال و متاع اور ان کی ظاہر افوقیت کی بے بضاعتی و بے ثباتی اور برخلاف اس کے مومنوں کی پرہیزگاری کی نیک انجامی ذہن نشین کرانے اور عبادت کی راہ سے ہی خوشی حاصل کرنے اور روزی کے معاملہ میں مطلق پریشان نہ ہونے بلکہ طمانیت و توکل رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کس شفقت اور سادگی کے ساتھ مخاطب فرمایا ہے:

"سو جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو آپ ان کی کفر آمیز باتوں پر صبر کیجیے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے۔ آفتاب کے طلوع و غروب سے پہلے اوقات شب میں اور دن کے اول اور آخر میں تسبیح کیا کیجیے تاکہ آپ اس سے خوش ہوں اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے بہرہ ور کر رکھا ہے کہ وہ محض دنیوی زندگی کی رونق ہے

اور آپ کے رب کا عطیہ جو آخرت میں ملے گا بدرجہا بہتر اور دیر پا ہے اپنے متعلقین
کو یعنی اہل خاندان کو اور مومنین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے اور خود بھی اسکے
پابند رہیے۔ ہم آپ سے اور دوسروں سے معاش کموانا نہیں چاہتے۔ معاش تو آپکو
ہم دینگے اور بہتر انجام تو پرہیز گاری ہی کا ہے"
یہی تھی وہ روح اسلام جسے ہم کھو چکے ہیں۔ ایثار لے کر خوش ہوتے تھے۔ ہم دے کر
مطمئن ہوتے تھے۔ لوگ دنیا سمیٹتے تھے اور ہم خالی الذہن ہوکر عبادت میں وقت گزارتے
تھے چنانچہ جب تک ذکر و شغل کا "اللہ دینی چراغ" ہمارے ہاتھوں میں رہا اس وقت تک اس کی
برکتوں سے فیضان سماوی کا سایہ ہمارے سروں پر رہا جس کی بدولت دنیاوی فتح و کامرانی
بھی ہمارے قدم چومتی تھی حتی کہ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں بحر ظلمات کی موجوں سے بھی آشنا رہیں
اور اس طور پر کہ انھیں پایاب کر کر کے دکھا دیا ہے ؎

خیال یار کبھی ذکر یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

لیکن جب سے یہ متاعِ بے بہا اپنی کور بصری و مردہ ذوقی سے ہم کھو بیٹھے اور اس حقیقتِ
روزگار کے اسوۂ حسنہ کو فراموش کر کے پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے لگے جس نے اپنی انسانیت
کو الوہیت میں ہمہ تن غرق کر کے اپنا سایہ بھی زمین پر نہ اترنے دیا اس وقت سے مایوسی و
محرومی ہی ہمارے حصہ کی چیز ہو کر رہ گئی ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

تف ہو سود و زیاں کے اس جدید معیار پر جو ہمسے اینٹ پتھر کے گھروں کو تو مزین و منور کروا تا
ہو لیکن دل کی بے بہا بستی کو ویران و تاریک ہی رکھوا تا ہے۔ ہم سے آسمان پر چلتی تو لگوا تا ہو لیکن
امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کا راز نہیں بتاتا۔ کیا اب بھی کسی دلیل و برہان سے قائل کرنے
کی ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ دین کی راہ سے اخوت و مساوات کا جو پیغام عرب کے ایک بوریہ نشین
آدمی نے دنیا کو دیا اسنے اپنی قبولیت سے ایک حبشی کو حضرت بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا عظیم مرتبہ

عطا کر دیا لیکن جب دین سے صرف نظر کر کے محض سیاسی اصولوں پر یہی پیغام فرانس کے ایک متمدن مفکر نے دیا تو وہ زبانی نعروں اور کھوکھلے نعروں سے آگے بڑھ کر ہماری زندگی کی گہرائیوں میں آج تک نہ اتر سکا اور اگر کسی مصلح یا حکمراں نے کالے گورے یا چھوٹے بڑے کا فرق مٹانے کی مخلصانہ جسارت کی تو اس کا وہی اندوہناک انجام ہوا جو ابھی ابھی امریکہ کے صدر مسٹر کینیڈی جیسے شریف انسان کا ہوا ہے۔

معزز مہمانان و محترم اکابرین! نہ تو یہ مناسب موقع تھا اور نہ اپنے رہنماؤں کی موجودگی میں ہمارا منصب ہی کہ ہم دین جیسے اہم اور مشکل مسئلہ پر لب کشائی کی جسارت کرتے۔ اس کے عروج و زوال کی تاریخی حیثیت سے تصویر پیش کرتے اور اس کے صحیح خدوخال کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرتے لیکن جو سمع خراشی ہم نے کی ہے اس کے پیچھے بس ایک ہی جذبہ کارفرما تھا اور وہ یہ کہ آج کے ناسازگار ماحول میں دینی تعلیمی تحریک کی ضرورت اور اس کے مطالبات اپنی پوری شدت اور افادیت کے ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آجائیں اور ہمارا دل و دماغ گواہی دینے لگ جائے کہ ہاں آج اگر کوئی کام لپیٹ کر کر ڈالنے کا ہے جس کے نہ کرنے کی سزا مستقبل قریب ہی میں خفت و خجالت کے سوا اور کچھ نہ ہوگی تو وہ ہے اپنے مرنے سے پہلے اپنی موجودہ نسلوں کو مسلمان بنائے رکھنا اور مرتے وقت وراثت میں بجائے مال و زر کے اپنی سعی و جہد سے ایک ایسا صالح اور پائدار نظامِ تربیت و تعلیم چھوڑ جانا جو ہمارے نہ رہنے پر بھی ہماری آنے والی نسلوں کی دینی تربیت کا ضامن ثابت ہو تاکہ اگر ہم واقعی کسی درجہ میں بھی مسلمان ہیں اور روز آخرت کا عقیدہ بھی ہمارا جزو ایمان ہے تو سوال و جواب کے وقت ہم اللہ تعالیٰ سے کہہ سکیں کہ اگر ہمارے ماں باپ نے ہمیں دیندار رکھنے کی فکر کی تو ہم نے بھی اپنے زمانہ کی مخصوص مشکلات کا حتی الوسع مقابلہ کرتے ہوئے اپنی اولاد کو مومن بنائے رکھا اور اس کا بھی معقول انتظام کر آئے تھے کہ ہماری نسل میں حالات کے دباؤ سے آئندہ چل کر کافر و مشرک یا مرتد نہ نمودار ہوں اور نہ ہمارے گھرانے کا "السلام علیکم" سلام کرنے کے خرافاتی طریقوں میں تبدیل ہو جائے گو ایرانی اور مغل تہذیب کے ملے جلے اثرات ہمیں کشاں کشاں "آداب" "بندگی" اور "کورنش" تک تو لے ہی آئے ہیں۔

ہماری نظروں میں دینی تعلیمی تحریک کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم ایک طرف سرکاری جبریہ تعلیم۔ حکومت اتر پردیش اور اس کے محکمہ تعلیم کی جارحانہ لسانی پالیسی اور غیر ایماندارانہ نصابی ہم اور مرکزی حکومت کے تمدنی اور ثقافتی شبخون پر نظر کرتے ہیں اور دوسری جانب اقتصادی بدحالی کے دباؤ کی وجہ سے اپنوں میں سے بعضوں کے مداہنت آمیز اور تملق صنعت اقدامات کو دیکھتے ہیں۔ ملاحظہ تو کیجئے کس کس طرح ہم پر مشق ستم کی جارہی ہے۔ یہ یانگ ویل ہندی کا تسلط اس طور پر ہو رہا ہے کہ اردو اپنے گھر اور اپنے ہی حلقہ سے نکالی جارہی ہے اور اس بیدردی کے ساتھ اس غریب کو دفتر تو دفتر اسکولوں میں بھی کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ کرپلانی کمیٹی نے اسلامی مکتبوں اور مکتب کمیٹیوں کی جس طور پر بیخ کنی کی ہے اور سہ لسانی فارمولا میں فارمولا کی منشاء کے صریحی خلاف خواہ مخواہ سنسکرت کو ٹھونس کر جو ناروا سلوک اردو کے ساتھ برتا ہے وہ ایک سیکولر نظام حکومت کے دامن پر بڑا ہی بدنما دھبہ ہے۔ اردو والوں نے اردو کی بحالی کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔ اتنی بڑی دستخطی مہم سر کر ڈالی لیکن ہمارے ارباب بست وکشاد میں سے کسی کے سر پر جوں نہیں رینگی۔ مسلسل چیخ پکار کے بعد اسکولوں کے ہدایت نامے اور گشتیاں چھٹیاں اردو کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے اور اردو والوں کی کٹی ہوئی زبان پر پھایا رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے بھیجی جاتی ہیں لیکن محکمۂ تعلیم کے منتظمین کی تنگ نظری، بیجا ضد، اور عدم تعاون اور بالآخر خود حکومت کی چشم پوشی کے آگے کسی کی چلنے نہیں پاتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ایک نسل کی نسل جس کی مادری زبان اردو ہے نفسیاتی طور پر مفلوج اور اپاہج اور ذہنی طور پر کج فہم بے مصرف اور بزدل ہوتی جارہی ہے اور یہ کسی ایک فرقہ کا نہیں بلکہ پوری ہندستانی قوم کا زیاں ہے۔ حالیہ اردو کانونشن لکھنؤ میں جناب آنند نرائن ملا سابق جج عدالت العالیہ الہ آباد کا صدارتی خطبہ اس باب میں حکومت اتر پردیش اور اسکی تحتی انتظامیہ کی شرمناک دھاندلی اور بددیانتی پر ایک ملامتی دستاویز ہے۔ دینی تعلیمی تحریک اردو میں اس معنی کر کے دلچسپی رکھتی ہے کہ مسلمانوں کا سارا دینی اور تمدنی سرمایہ اس زبان میں منتقل و محفوظ ہو چکا ہے اور اب یہی ایک زبان رہ گئی ہے جس کے توسط سے ہندستانی مسلمانوں اور ان کے بچوں کو اپنے دین اور اپنے اسلاف کے کارناموں کا کما حقہ علم

ہو سکتا ہے۔ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں کی مروجہ تعلیم نہ صرف یہ کہ مسلمان بچوں کو دین کی تعلیم سے بے بہرہ رکھتی ہے بلکہ دیانتداری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو اسی نتیجہ پر پہونچا جا سکتا ہے کہ انھیں بے دین بھی کر ڈالتی ہے۔ حقیقت میں مسلمان اپنے دینی لوازمات کے ساتھ ایک پہیلی ہو کر رہ گیا ہے جس کو بوجھنے کی ہمارے ملک میں صدیوں کے رہن سہن کے باوجود کوئی پرخلوص کوشش نہیں کی گئی بلکہ وہ اپنے بھائیوں کے ہاتھوں طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں ہی کا شکار ہوتا رہا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اسکی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اور باہمی بے اعتمادی کا ازالہ ہوگا۔ بہرحال بہ حالت موجودہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے بجز اس کے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے ہی قائم کئے ہوئے مکاتب و مدارس میں اور اپنے ہی تیار کردہ نصاب تعلیم کے ذریعہ انکی عمر کی اس ابتدائی منزل میں جبکہ ان کے ذہنوں کی سادہ لوح پر ہر نقش نقش کالحجر ہو جاتا ہو کوئی اور نشان پڑنے کے پہلے دین کی بات سے آشنا کر دیں اور انکی سادہ لوح پر دین ہی کا نقش مرتسم کر دیں تاکہ بہرحال وہ نقش مرتے دم تک قائم رہے۔

(بقیہ مضمون میقات صلا)

حضرت مولانا شبیر محمد صاحب مہاجر دامت فیوضہم کی عبارت ختم ہوئی، امید ہے کہ اہل علم اور اصحاب فتویٰ ممدوح کی اس تحقیق سے اتفاق فرمائیں گے ــــ یہ بات الفرقان میں پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ مفتی پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) اور ہندستان کے اکابر علماء میں سے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی سے اس عاجز نے اس مسئلہ میں رجوع کیا تو ان دونوں حضرات نے بھی اس بارہ میں اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا کہ ہندوستان یا پاکستان سے جانے والے حجاج کے لیے سمندر میں احرام باندھنا ضروری نہیں، جدہ پہونچ کر احرام باندھنا بھی صحیح ہے۔

ہندوستانی حجاج کیلئے میقات

از محمد منظور نعمانی

سطور ذیل میں اہل ہند کے میقات کے بارہ میں جو کچھ عرض کرنا ہے اسکو سمجھنے کے لئے پہلے میقات کی حقیقت معلوم کرلینی چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اپنا مقدس بیت اور اہل ایمان کا قبلہ قرار دیکر اس کی تعظیم و تکریم اہل ایمان کے لئے لازمی اور ضروری قرار دی ہے اور جو مسلمان وہاں پہونچنے کے ضروری وسائل رکھتے ہوں ان پر عمر میں ایک دفعہ وہاں پہونچ کر حج کرنا فرض کیا گیا ہے، اس کعبۃ اللہ کا طول و عرض اور رقبہ معین اور محدود ہے، اور وہ وہی ہے جس پر کعبہ کی غلاف پوش موجودہ مربع عمارت کھڑی ہے۔ اس کے ارد گرد مسجد حرام ہے یہ گویا کعبۃ اللہ کا چوطرفہ صحن ہے، اور اسی نسبت سے اس کے خاص احکام اور فضائل ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا رقبہ بہت چھوٹا تھا صرف اتنا جتنا کہ اب مطاف کا دائرہ ہے۔ آپ کے بعد اس میں وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی رہی۔ آخری توسیع ہمارے زمانہ میں سعودی حکومت نے کی ہے۔ اور اسکے مطابق تعمیر کا کام ابھی جاری ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق مسجد حرام کے رقبہ میں قیامت تک جتنا بھی اضافہ کیا جائے گا وہ سب کعبۃ اللہ کے صحن ہی میں اضافہ ہوگا اور اس کے وہی فضائل اور احکام ہوں گے جو کتاب و سنت میں مسجد حرام کے بتائے گئے ہیں۔

پھر اس کعبہ اور مسجد حرام کے ارد گرد شہر مکہ ہے جس کو بلد اللہ الحرام کہا جاتا ہے پھر اس شہر مکہ کے چاروں طرف کئی کئی میل تک کی زمین کو حرم قرار دیا گیا ہے،

اور اس کی حدیں معین کی گئی ہیں، یہ حدیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقرر کی تھیں بعد میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں ان کی تجدید فرمائی۔ ان حدوں کا فاصلہ کعبہ مکرمہ اور مسجد حرام سے یکساں نہیں ہے بلکہ مختلف ہے یعنی کسی سمت میں حرم کی حد مسجد حرام سے دس میل کے قریب ہے، کسی سمت میں نو میل کے قریب ہے، کسی سمت میں سات میل اور کسی سمت میں صرف تین میل ہے، ان حدوں پر خطوط کھینچنے سے ایک طویل وعریض مخمس علاقہ بنتا ہے، اس پورے علاقے کو اللہ تعالیٰ نے حرم یعنی واجب الاحترام قرار دیا ہے، اور اس کے خاص احکام ہیں مثلاً یہ کہ اس میں کسی جانور کا شکار نہیں کیا جاسکتا، کھڑے درختوں کی لکڑی نہیں کاٹی جاسکتی، ہری گھاس نہیں چھیلی یا اکھاڑی جاسکتی، وغیرہ وغیرہ اس علاقہ کی یہ عظمت و حرمت اور اس کے یہ احکام دراصل بیت اللہ ہی کی نسبت سے ہیں اور یہ سب کچھ دراصل اسی کا ادب واحترام ہے۔

پھر اس حرم کی حدوں سے بہت دور بیسوں پچاسوں میل دور مختلف سمتوں میں کچھ خاص مقامات مقرر کئے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ ان مقامات سے باہر رہنے والے ہیں وہ جب حج یا عمرہ کے لئے آئیں (بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی غرض سے بھی مکہ مکرمہ آئیں) تو ان کو احرام بند ہو کے ان مقامات سے آگے بڑھنا چاہئے۔ بغیر احرام کے ایک قدم آگے بڑھنا بھی ان کے لئے جائز نہیں ——— یہی مقامات میقات کہلاتے ہیں۔

یہ پانچ مقامات ہیں جو پانچ سمتوں سے مکہ معظمہ کی طرف آنے والوں کے لئے میقات قرار دیئے گئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ ذوالحُلَیْفَہ، جُحْفَہ، ذاتُ عِرْق، قَرْنُ المنازل، یَلَمْلَم۔

ذُوالحُلَیفَہ، مدینہ طیبہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، یہ مدینہ سے صرف ۵-۶ میل ہے اور مکہ معظمہ سے سب سے زیادہ بعید میقات یہی ہے، قریباً دوسو میل کے فاصلہ پر ہے۔[1]

جُحْفَہ، یہ شام وغیرہ مغربی علاقوں سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، موجودہ

---

[1] بلکہ آج کل والے راستہ سے قریباً ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر ہے۔

رابغ کے قریب یہ ایک معروف بستی تھی، اب اس نام کی کوئی بستی موجود نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ اس کا محل وقوع رابغ کے قریب تھا جو مکہ معظمہ سے قریباً سو میل کے فاصلے پر بجانب مغرب ساحل کے قریب ہے۔

ذاتِ عِرق، یہ عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، مکہ معظمہ سے شمال مشرق میں عراق جانے والے راستے پر واقع ہے، مسافت مکہ معظمہ سے ۵۰ میل کے قریب ہو گی۔

قَرنُ المَنَازِل۔ یہ نجد کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے۔ مکہ معظمہ سے قریباً تیس پینتیس میل مشرق میں نجد جانے والے راستہ پر ایک پہاڑی ہے۔

یَلَمْلَمْ۔ یہ یمن کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، یہ تہامہ کی پہاڑیوں میں سے ایک معروف پہاڑی ہے جو مکہ معظمہ سے قریباً چالیس میل جنوب مشرق میں یمن سے مکہ آنے والے راستہ پر پڑتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں راستوں سے آنے والے حجاج کے لئے ان پانچ مقامات کو صراحت اور تعیین کے ساتھ میقات قرار دیا ہے۔ فقہائے امت کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کے لئے ان مقامات میں سے کسی مقام کی طرف سے آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ احرام باندھ کے اس مقام سے آگے بڑھے، اگر بغیر احرام کے ایک قدم بھی آگے بڑھے گا تو بے ادبی کا مرتکب ہو گا، اور اگر کوئی شخص ایسے علاقے سے آئے کہ اس کے راستہ میں ان مقامات میں سے کوئی مقام بھی نہ پڑے تو وہ کہیں نہ کہیں ان کی محاذات سے ضرور گذرے گا، اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس مقامِ محاذات سے آگے بڑھنے سے پہلے احرام باندھ لے، اور اگر بالفرض اس کو مقامِ محاذات کا پتہ نہ چل سکے یعنی کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اس کے راستہ میں میقات کی محاذات کہاں ہوتی ہے تو اس صورت میں فقہاء نے اس کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے دو منزل پہلے (یعنی قریباً ۳۰۔۳۵ میل پہلے) احرام باندھ لے۔ یہ ہے مسئلہ کی اصولی نوعیت۔

اس تمہید کے بعد معلوم ہونا چاہیئے کہ قدیم زمانہ میں جب حج کا سفر بادبانی کشتیوں سے کیا جاتا تھا تو اہلِ ہند عموماً علاقہ یمن سے پہلے کی بندرگاہوں مسقط، مکلاّ، وغیرہ پر اترتے تھے اور آگے یمن کے راستہ سے مکہ معظمہ جاتے تھے، اسلئے ان کو یلملم سے احرام باندھنا ضروری ہوتا تھا کیونکہ علاقۂ یمن سے آنے والوں کے لئے وہی میقات ہے لیکن اب بحری دخانی جہاز جو حجاج کو لیکر جاتے ہیں وہ سیدھے جدّہ جاکر لنگر انداز ہوتے ہیں، اس لئے نہ تو یلملم ان کے راستہ میں آتا ہے اور نہ اس کی محاذات کے خط سے ان کو گزرنا پڑتا ہے، اس لئے جدّہ سے پہلے سمندر میں احرام کے ضروری ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ـــــ لیکن عمل یہ جاری ہے کہ جدّہ پہونچنے سے قریباً ایک دن رات پہلے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ پہلے جہاز کے کپتان کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ فلاں وقت جہاز یلملم پہاڑی کے سامنے سے گزرے گا لہٰذا حجاج اس سے پہلے احرام باندھ لیں، حجاج عام طور سے اس اعلان کے مطابق عمل کرتے ہیں، خود اس عاجز نے بھی اپنے بحری سفروں میں اسی پر عمل کیا، لیکن یہ کھٹک ہمیشہ رہی کہ یلملم کے سامنے سے گزرنے کا کیا مطلب ہے، اگر مطلب یہ ہو کہ دوربین جیسے آلات کے ذریعہ اس جگہ سے یلملم پہاڑی نظر آتی ہے جو وہاں سے یقیناً پچاسوں میل کے فاصلہ پر ہوتی ہے، تو اس نظر آنے کا مسئلہ محاذات سے کوئی تعلق نہیں اور اگر مطلب یہ ہے کہ اس جگہ سے پہاڑی تک سیدھا خط کھینچا جا سکتا ہے تو ایسا سیدھا خط ہر جگہ سے کھینچا جا سکتا ہے بہر حال اس عاجز کے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال رہا، اگرچہ سب کی طرح عمل خود بھی اسی پر کرتا رہا، اور اس لئے عمل کرتا رہا کہ یہاں سے احرام باندھنا ضروری ہو یا نہ ہو لیکن اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں بلکہ اگر کوئی شخص اس سے بھی پہلے بمبئی یا کراچی میں جہاز پر سوار ہوتے ہی احرام باندھ لے یا اپنے گھر ہی سے احرام باندھ کے چلے تو اس کا احرام بھی صحیح ہوگا، بلکہ اگر وہ احرام کی پابندیاں نباہنے پر قادر ہے تو فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اس کے لئے یہی افضل ہے اور بعض صحابہ کرام سے ایسا کرنا ثابت بھی ہے۔

الغرض ہندوستانی جہاز کپتان کے اعلان پر سمندر میں جس جگہ سے احرام باندھتے ہیں وہاں سے احرام کے صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، ہاں غور طلب یہ ہے کہ اس جگہ سے احرام باندھنا ضروری ہے یا نہیں؟ —— اب سے چودہ ۱۴ سال پہلے ۱۳۶۹ھ کے الفرقان کے "حج نمبر" میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے کہ "اہل ہند کے لئے سمندر میں احرام باندھنا ضروری ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ جدّہ پہونچکر احرام باندھنا بھی ان کے لئے صحیح ہونا چاہیئے"، حضرات اہل علم اور اصحاب فتویٰ کو توجہ دلائی تھی کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کر کے وہ ذہنوں کی صفائی اور یکسوئی کا سامان فراہم کریں —— مولانا مرحوم کی اس تحریر کے مطالعہ کے بعد سے برابر اس کا انتظار رہا کہ حج کے مسائل و مناسک پر جن علماء کرام کی نظر وسیع اور عمیق ہے وہ اس مسئلہ پر تفصیلی اور تحقیقی روشنی ڈال کر تشفی کا سامان کریں۔

گزشتہ سال ۱۳۸۲ھ کے حج کے موقع پر جب حجاز مقدس حاضری نصیب ہوئی تو جیسا کہ اسی الفرقان کے کسی شمارہ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے بعد فراغ حج مدینہ طیبہ میں حضرت مولینا شیر محمد صاحب سندھی مہاجر کی زیارت کی بھی توفیق ملی، ممدوح سے واقفیت رکھنے والے اکابر علماء کا اس پر گویا اتفاق ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ممدوح بالخصوص حج کے مسائل و مناسک کے امام اور مرجع ہیں، ان کی تصنیف "عمدة المناسک" (جو الفرقان کے اسی سائز کے پانچسو سے زیادہ صفحات پر ہے) اس موضوع پر نہایت محققانہ جامع اور مستند ترین کتاب ہے اس میں موصوف نے اہل ہند کے میقات کے اس مسئلے پر بھی بڑی تحقیق اور تفصیل سے کلام فرمایا ہے، اس کے علاوہ جب اس ناچیز نے ممدوح سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اپنی کتاب کا یہ مقام کھول کے اور حرمین شریفین کا ایک مطبوعہ تفصیلی نقشہ (خریطة الحرمين الشريفين) سامنے رکھ کے بہت تفصیل سے مسئلے پر روشنی ڈالی اور جو کچھ فرمایا گویا اس کو نقشہ میں دکھا دیا، حضرت مولانا ممدوح کی تحقیق کا حاصل یہی ہے کہ ہندوستان و پاکستان سے جدّہ آنے والے جہازوں کے راستہ میں نہ کوئی میقات آتا ہے نہ کسی میقات سے وہ محاذات ہوتی ہے جو شرعاً معتبر ہو

اس لئے اس راستہ سے آنیوالے حجاج کے لئے سمندر میں کسی جگہ بھی احرام باندھنا، ضروری نہیں یہ جدّہ پہونچکر بھی احرام باندھ سکتے ہیں۔ ممدوح نے یہ بھی ذکر فرمایا اور اپنی کتاب میں بھی نقل فرمایا ہے کہ ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری قدس سرہٗ مہاجر مدنی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی بعض تحریروں میں اس رائے کا اظہار فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی حجاج جدّہ پہونچکر بھی احرام باندھ سکتے ہیں۔

مولانا ممدوح نے اس مسئلہ کو سمجھانے کے لئے اپنی کتاب کے پورے ایک صفحہ پر حَرَم، حِلّ اور مَواقیت کا ایک نقشہ بھی دیا ہے، ناظرین کو اس مسئلہ کے سمجھنے میں اس نقشہ سے بہت مدد ملے گی اس لئے اس کو بھی ہم بجنسہٖ نقل کرینگے۔

آگے ہم اس مسئلے کے بارے میں مولانا ممدوح کی اصل عبارت بھی ان کی کتاب سے نقل کریں گے، لیکن اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ میقات کی حقیقت سمجھانے کے لئے اس مضمون کی تمہید میں جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کو آپنے سمجھ لیا ہو اور وہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہو — ہم وہاں ذکر کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کی جو حدیں مقرر کی ہیں ان کو خطوط کے ذریعہ گھیرنے سے ایک مخمّس بنتا ہے (اس کو آپ نقشہ میں دیکھ سکتے ہیں) یہ پورا علاقہ حرم ہے اور یہ خاصا طویل وعریض علاقہ ہے — پھر حرم کی ان سرحدوں سے بیسیوں پچاسوں میل دور (بلکہ مدینہ طیبہ کی جانب تو تقریباً دو سو میل دور) پانچ مقامات کو میقات مقرر کیا گیا ہے، جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، ان مقامات کو خطوط سے گھیرنے سے بھی سینکڑوں میل طویل وعریض ایک مخمّس علاقہ ہی بنتا ہے (اس کو بھی آپ نقشہ سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں) اس کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ حدودِ حرم سے باہر یا کہہ لیا جائے کہ حدودِ حرم کو گھیرنے والے خطوط سے باہر، مواقیت تک اور مواقیت کو احاطہ کرنے والے خطوط تک جو درمیانی علاقہ ہے اس کو فقہی اصطلاح میں حِلّ اور حِلِّ صَغِیر بھی کہا جاتا ہے۔ (مثلاً مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کی سمت تنعیم تک حرم ہے

اور وہاں سے ذوالحلیفہ تک قریباً دو سو میل کا جو علاقہ ہے وہ حِل ہے اور مواقیت سے باہر کی ساری دنیا کو آفاق اور حِل کے باہر کہا جاتا ہے۔ پس جو لوگ حدود حرم سے باہر اور مواقیت کے حدود کے اندر رہتے ہیں (یعنی حِل میں رہتے ہیں) اُن کے لئے تو حکم یہ ہے کہ وہ حج یا عمرہ کو جائیں تو حرم میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھ لیں، مثلاً جو لوگ مکہ کے شمال میں تنعیم اور ذوالحلیفہ کے درمیان کہیں رہتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ تنعیم سے احرام ضرور باندھ لیں، اور جو لوگ میقاتوں کی حدود کے باہر آفاق میں رہتے ہیں ان کو حکم ہے کہ وہ ان میقاتوں سے آگے بڑھنے سے پہلے احرام بندھ جائیں یعنی علاقہ حِل میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھ لیں۔ پس جو لوگ ان پانچوں میقاتوں میں سے کسی میقات سے گذر کے آئیں ان کا مسئلہ تو سیدھا ہے کہ وہ اس مقام سے آگے بڑھنے سے پہلے احرام باندھ لیں اور جن کے راستہ میں کوئی میقات نہ پڑے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس خط کو عبور کرنے سے پہلے احرام باندھ لیں جو ایک میقات سے دوسرے میقات تک پہونچ کر حِل اور آفاق کے درمیان کا خط فاصل بنتا ہے، یہی خط دراصل میقات کی محاذات کا خط ہے جب تک آدمی اس خط سے باہر ہے آفاق کے علاقہ میں ہے، جب اس کے اندر قدم رکھے گا تو حِل کی سرحد میں داخل ہو جائے گا اور آفاقی کے لئے احرام کے بغیر حِل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ـــــ اور اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جو شخص کسی ایسے راستے سے آئے جس میں کوئی میقات نہیں پڑتا اور اس کو اس کا بھی ٹھیک پتہ نہیں کہ حِل کی حد یعنی محاذات کا خط اس کے راستہ میں کہاں آتا ہے تو اس کے لئے حکم ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے دو منزل پہلے احرام باندھ لے۔

حضرت مولانا رشید محمد صاحب نے اپنی کتاب "عمدۃ المناسک" میں جو کچھ اس بارہ میں لکھا ہے اس کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے ـــــ مولانا کی زبان اور کتاب کی عبارت عام فہم اور واضح نہ ہونے کی وجہ سے عام ناظرین کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہوتا اس لئے متعلقہ اصطلاحات **حرم، حِل، آفاق، میقات**

محاذات، وغیرہ کی تشریح بھی کر دی گئی اور موصوف کی تحقیق کا حاصل بھی پہلے لکھ دیا گیا، امید ہے کہ اس کے بعد عام ناظرین کے لئے بھی ممدوح کی عبارت کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

مولانا ممدوح نے اس ناچیز سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کی کتاب میں سے کچھ شائع کیا جائے تو اس عبارت کو عام فہم کرنے کے لئے اس میں حسب ضرورت ترمیم کر دی جائے۔ چنانچہ آگے ممدوح کی کتاب کا جو اقتباس درج کیا جا رہا ہے اس میں مولانا کے حسب الحکم کہیں کہیں معمولی لفظی ترمیم بھی اس عاجز نے اس ضرورت کے تحت کر دی ہے،

مولانا نے مسئلہ سمجھانے کے لئے حرم، حل، اور مواقیت کا جو نقشہ اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اس کی بھی نقل پیش کی جا رہی ہے۔ اس کے بارہ میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے۔ کہ یہ نقشہ پیمائشی نہیں ہے اور نہ فنی باریکیوں کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد بس مسئلہ کو سمجھانا ہے اور یہ مقصد اس سے پورا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ناظرین کرام نقشہ اور مسئلہ کی تحقیق میں مولانا ممدوح کی اصلی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

اہل ہند و پاکستان کے میقات کے بارہ میں حضرت مولانا شیر محمد صاحب مہاجر مدنی کی تحقیق

مولانا ممدوح اپنی تصنیف —— "عمدۃ المناسک" میں لکھتے ہیں۔

"ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بمبئی یا کراچی سے جب سمندر کے راستہ سے جہاز میں سوار ہو کر حج کو آتے ہیں تو ان کو حقیقت میں خاص کسی میقات یا ان کی محاذ سے گزرنا نہیں ہوتا اور جہاز سمندر میں حدّ آفاق ہی میں سے گزرتا ہے اور وہ یلملم سے بہت دور باہر باہر آگے آفاق ہی میں جاتا ہے اور یلملم تہامہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑی ہے جو مکہ مکرمہ کے قریب واقع ہے اس لئے جہاز یا کشتی کا اگرچہ سمندر کے ساحل ہی سے آنا ہو، یلملم سے آگے حدِ حل میں بڑھ جانا ممکن ہی نہیں —— اور یہ جو حج کے بعض رسالوں میں لکھتے ہیں کہ "اس صورت میں ہم کو
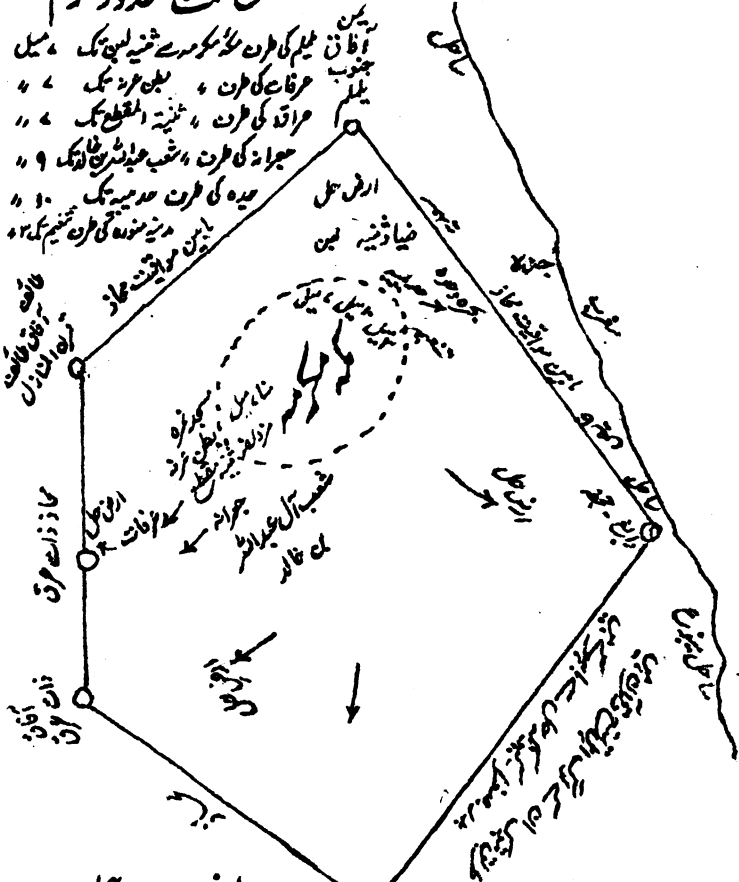
میقات کے محاذ کا علم نہیں ہو سکتا اور چونکہ کپتان اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں اس لیے ان کا قول معتبر نہیں" سو یہ اور بات ہے (اس کا مسئلہ سے کوئی خاص تعلق نہیں) کیونکہ اس معاملہ میں کسی کے قول کے معتبر یا نامعتبر ہونے کا سوال اس وقت پیدا ہوگا جبکہ حجاج عین میقات یا اس کے محاذ سے حل کی طرف بڑھنے لگیں اور ان کو میقات یا محاذ معلوم نہ ہو اس وقت میں جاننے والے مسلمان کا قول معتبر ہوگا اور غیر مسلم کا معتبر نہ ہوگا، لیکن یہاں تو صورت یہ ہے کہ جہاز کا میقات یا محاذ میقات سے نہ گزرنا یقینی طور پر معلوم ہے کیونکہ یلملم پہاڑی جہاز کے راستے سے پچاسوں میل دور یمن کے ملک سے بھی آگے مکہ معظمہ کے قریب دو منزل کے فاصلہ پر واقع ہے اس لیے سمندر میں جہاز کا گزر نہ تو یلملم پہاڑی سے ہوتا ہے اور نہ اس محاذات سے جو شرعاً معتبر ہے، کیونکہ سمندر میں کسی جگہ بھی وہ محاذات نہیں ہوتی، لہذا کپتان یا اس کے سوا کوئی اور یلملم کے سامنے ہونے کی خبر دیتا ہے تو اس کی وجہ سے حجاج پر احرام باندھنا لازم نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں کا تجاوز میقات معتبر نہیں ہے اگرچہ وہاں سے میقات کا آمنا سامنا ہونا صحیح طریق سے یقینی معلوم ہو جائے، اس لیے کہ مابین جہاز اور میقات کے بہت سی مسافت ہے وہ سب آفاق یعنی حلِّ کبیر ہی میں داخل ہے، اور اس محاذ سے آگے آفاق میں بڑھنا تجاوز نہ کہا جائے گا، اور ممنوع اور حرام تجاوز وہ ہے کہ میقات یا محاذ میقات سے بڑھ کر آگے حلِّ صغیر میں جو کہ میقات اور حرم کے بیچ میں کی زمین ہو) اس میں بلا احرام داخل ہو،..... (الغرض ہند و سندھ کے لوگوں کو سمندر میں کسی جگہ بھی احرام باندھنا ضروری نہیں کیونکہ سمندر سارا آفاق میں ہے) اور ہندوسندھ کے لوگوں کے لیے جو یلملم میقات مشہور ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے زمانہ میں کشتیوں سے سمندر کے ساحل سے آتے تھے اور ساحل کے بندروں مثلاً مسقط و مکلا وغیرہ ٹھہرتے ہوئے ملک یمن کے قریب آکر اترتے تھے اور اس سے آگے جب یلملم پر آتے تھے تو وہاں

سے احرام باندھتے تھے، اُس زمانہ میں یا اب بھی خشکی کے راستہ سے یمن کی طرف سے جو لوگ آتے ہیں تو اب بھی اسی طرح یلملم سے احرام باندھ کر آگے حل میں داخل ہوتے ہیں"

(عمدۃ المناسک صفحہ ٦۰-٦١)

اسی سلسلے میں آگے اہل ہند و پاکستان کے لیے جہاز سے اُتر کر جدّہ میں احرام باندھنے کا ذکر کرنے کے بعد مولانا ممدوح نے لکھا ہے کہ

"جدّہ اگرچہ خود میقات معینہ میں سے نہیں ہے اور نہ کسی میقات یا اس کے محاذ کے اندر واقع ہے، پس جو حاجی بحری راستے سے اس طرف سے آئیں جو کسی میقات معینہ یا اس کے محاذ کے اندر حل میں داخل نہ ہوتا ہوا آیا ہو، جیسے یہ جہاز آتا ہے تو یہ لوگ جدّہ ہی سے احرام باندھ لیں کہ یہ مکہ مکرمہ سے دو منزل دور ہے جیسا روایات سے معلوم ہوگا۔

پھر مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے لکھتے ہیں۔

"جاننا چاہیے کہ مکہ مکرمہ کے چوگرد حدّ حرم ہے، اس حد کے باہر حل شروع ہوتی ہے مواقیت تک۔ پس ایک میقات سے دوسرے میقات کے محاذ میں جو لکیریں نقشہ میں دیکھو گے یہ آفاق اور حل کے بیچ میں حد فاصل ہے، باہر آفاق اور اندر حل ہے۔ پس باہر آفاق سے آنے والوں کو میقات یا ان کے محاذ کی لکیروں سے اندر بلا احرام آنا حرام ہے[1]۔

---

[1] مناسک حج سے متعلق علامہ داملا آخون جان مرغینانی مہاجر کا رسالہ جو اپنے موضوع پر بہترین اور مستند ترین کتابوں میں سے ہے اور ملا علی قاری کی شرح مناسک کے حاشیہ میں جس کا جابجا حوالہ ہے اس کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"قال اصحابنا من المواقیت الی حد الحرم مکان واحد الا ان المواقیت لہا احکام خاصۃ فی حق الآفاقی بان لا یجوزہا بلا احرام لتعظیم البیت واجلالہ کما فی المشاہد فتحصل من ذالک ان حرم الحرم ای المواقیت مثل الحرم محیط بما فی جوفہ مثل الخطوط الممتدۃ

(باقی بر صفحہ آئندہ)

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ سمندر میں آنے والے حاجیوں کا جہاز جب جدّہ میں آکر لنگر ڈالتا ہے تو (سمندری راستہ میں) کسی بھی جگہ سے یلملم یا کسی اور میقات یا اس کے محاذ سے آگے نہیں گزرتا اور نہ سمندر کی خلیج کہیں ما بین میقاتین یا اس کے محاذ میں واقع ہے بلکہ سب مواقیت مع محاذ کے خشکی میں واقع ہیں۔ پس جہاز آفاق ہی میں آکر حدِ حل سے گویا باہر ہی اترتا ہے تو ان حاجیوں پر اسی محاذ سے احرام باندھنا واجب ہوگا جو یلملم اور جُحفہ کے درمیان محاذ کی لکیر ہے جو نقشہ سے معلوم ہو گی۔ ص ۶۲

اس کے بعد ص ۶۵ پر لکھتے ہیں:-

یہ یقینی بات ہے کہ جو بحری راستے سے جدّہ سے آئے تو اس کو سمندر میں میقات یا اس کے محاذ سے نہیں گزرنا پڑتا جیسا کہ نقشہ میں معلوم ہوگا اسلیئے سب کتابوں میں یہی لکھتے ہیں کہ جس کو کسی میقات یا محاذ سے گزرنا نہ پڑے اور اس کو میقات یا محاذ کے ہوتے ہوئے ان کا علم نہ ہو تو وہ دو منزل مکۂ مکرمہ سے پہلے سے احرام باندھ لے اور اس کے لیے جدّہ کی مثال دیتے ہیں۔...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ نے بھی یہی فرمایا ہے، امداد الفتاویٰ کے حصہ خامسہ کے صفحہ ۱۵۱ پر حضرت کی تحریر درج ہے ـــــــ سوال یہ کیا گیا ہے کہ حج بدل کا احرام کہاں سے باندھا جائے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ گزشتہ

بین النقاط فکما ان النقاط مواقیت فکذالک الخطوط بینها والا لما زالدخول الی الحرم بلا احرام من بین المیقاتین ویؤیدکون الکل حرم الحرم ما فی البحر العمیق وامداد الفتاح وغیرهما مما قالوا فی حکمته کون المواقیت متفاوتة قربًا وبُعدًا من انه اهبط الله الحجر الاسود من الجنة ووضع مکانه اضاء اطراف الحرم فکل مکان وصل الیه ضوءه صار میقاتًا۔" ـــــــ انتہی من رسالة علامه واملا آخون جان مرغینانی

حاشیہ عمدة المناسک ص ۶۴

تو جواب میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدّہ سے ہوگا۔ مناسک علی قاری میں عبارت موجود ہے "وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر" (لباب ص۵۶) اور یہ ظاہر ہے کہ اہل ہند کے لیے یلملم کی میقات کسی معتبر طریقہ سے معلوم نہیں ہوتی لہذا جدّہ بھی ان کے لیے میقات ہے۔ ۱۷ شعبان ۱۳۲۳ھ تصدیق شدہ حضرت ممدوح قدس سرہ .....

اسی طرح رسالہ "حقیقت حج" میں مولوی منظور علی صاحب نے بھی لکھا ہے جس پر بہت سے علماء کرام اور خصوصاً مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصدیق ہے۔ "میقات یلملم پر ایک بحث" کا عنوان قائم کر کے اس میں لکھتے ہیں۔

یلملم سے احرام باندھنے کا ایک اصلاح طلب مسئلہ ہے جس پر اس وقت تک کچھ غور نہیں کیا گیا، یمن کی طرف سے براہ خشکی آنے والوں کے لیے مقام یلملم میقات ہے جس کو "جبل سعدیہ" کہتے ہیں جو کہ مکہ مکرمہ سے ۳۶ میل جانب جنوب مشرق میں واقع ہے اور کنارہ سمندر سے اسی قدر دور ہے۔ یہ مقام یمن والوں کے لیے تو بہتر ہے مگر جو ہندوستان یا جاوا سے براہ سمندر آویں یا دیگر راستوں سے آنے والوں کے واسطے ہر جانب سے مقرر شدہ میقات یا ان کے درمیان سے احرام باندھنا چاہیے، یہ تمام میقات خشکی کے راستہ پر ہیں۔ اگر کوئی خشکی کے راستہ سے جاوے تو وہ میقات کی حدود کے پہونچنے پر احرام باندھ سکتا ہے، ہندوستان والوں کو جہاز پر سمندر میں ایسے مقام پر احرام باندھنا پڑتا ہے جہاں سے نہ تو یلملم کی پہاڑی نظر آتی ہے اور نہ وہاں سے کوئی بندرگاہ ہی قریب ہے۔ سیدھ کے معنی یہ نہیں جیسے کہ اس وقت تک کی سیدھ لی جاتی ہے حالانکہ جہاز وہاں سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ہوتا ہے۔ حد میقات یلملم سے (جدہ سے آگے گزرتی ہوئی) رابغ اور رابغ سے ذوالحلیفہ تک چلی گئی ہے۔ ص ۶۵-۶۶-۶۷

باقی ص ۵۸ پر

رمضان المبارک میں روزے رکھ کر آپ اپنے
ذہن، جسم اور رُوح کو پاکیزگی اور تزکیۂ نفس
کے ذریعے ایک نیا احساس عطا کرتے ہیں
سحری کے وقت آپ قوت اور توانائی کے لیے سنکارا
استعمال کیجیے۔ سنکارا کے استعمال سے آپ تمام دن روزہ کی
تھکاوٹ، پیاس اور عام نقاہت سے محفوظ رہیں گے۔ غروبِ آفتاب
کے وقت، جب آپ کا تمام خاندان افطار کے لیے جمع ہو
اس وقت بھی سنکارا استعمال کیجیے، جو جڑی بوٹیوں اور وٹامنز
کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے اور آپ کو روزہ کی دن بھر کی ماندگی
سے نجات دلا کر نئی توانائی اور قوت بخشتا ہے۔
سنکارا ہر روز استعمال کیجیے
سنکارا
دہلی ، کانپور ، پٹنہ

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
ادارۃ الفرقان
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

اعزازی خریداروں سے
سالانہ ...... ۵ روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ...... بارہ شلنگ
ہوائی ڈاک ایک پونڈ

شرح چندہ
ہندوستان و پاکستان سے
ششماہی - تین روپئے
فی کاپی ۶۰ نئے پیسے

اس شمارہ کی قیمت ایک روپیہ

جلد ۳۱ | بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۸۳ھ مطابق فروری و مارچ ۱۹۶۴ء | شمارہ ۹-۱۰

اگر اس دائرہ میں ( ) سرخ نشان ہو تو

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں! یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

—چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۳۱ مارچ تک پہونچ جانا چاہئے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں، ان کی اطلاع ۳۰ تاریخ تک اندر آنی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

مقام اشاعت:۔ دفتر ماہنامہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

کلکتہ کے فساد نے ایک دفعہ پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا ہے اور اپنے مستقبل کے بارہ میں غور و فکر کا ایک نیا سلسلہ ان میں شروع ہو گیا ہے ——— اس غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کا ایک انداز تو وہ ہو سکتا ہے جو انسانوں کے ان گروہوں اور طبقوں کا ہوتا ہے جو وحی و نبوت کی روشنی سے محروم ہوتے ہیں اور اُن کے دل اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی قدرت کی کارفرمائیوں اور اس کے مقرر کئے ہوئے قانونِ مکافات و مجازات پر ایمان و یقین سے خالی ہوتے ہیں، وہ صرف ظاہری اسباب اور مادی تدابیر ہی کو جانتے ہیں۔ اس لئے جب وہ ایسے حالات سے دوچار ہوتے ہیں جن سے مثلاً ہندوستان کے ہم مسلمان دوچار ہیں تو وہ صرف ظاہری سیاسی تدابیر اور مادی اسباب و عوامل کے نقطۂ نظر ہی سے غور کرتے ہیں اور ان کا سارا غور و فکر اور تمامتر کوشش اور جد و جہد اسی لائن پر اور اسی دائرہ میں ہوتی ہے ——— اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے عالمِ اسباب بنایا ہے اور اس میں ظاہری تدبیروں اور اسبابی کوششوں کے بھی نتائج نکلتے ہیں۔

بہرحال سوچنے کا ایک انداز اور ایک طریقہ وحی و نبوت کی روشنی سے محروم اور خدا سے ناآشنا مادہ پرستوں اور صرف ظاہری اسباب و تدابیر کی کارفرمائی پر یقین رکھنے والوں کا ہے۔ اور دوسرا طریقہ صاحب وحی و کتاب انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کا ہے وہ ظاہری سلسلۂ اسباب و تدابیر کی نفی نہیں کرتے،

لیکن اس عالم میں اصل عامل اور متصرف وہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیت اور اسکے ارادہ کو مانتے ہیں اور اس کے مقرر کئے ہوئے قانون مکافات پر بھی ایمان رکھتے ہیں ـــــ یعنی وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بھی کارفرما ہے کہ جو قوم خدا کی بندگی کے صحیح راستہ پر چل کے اور اچھے اعمال و اخلاق اختیار کر کے اپنے مقصد زندگی کو پورا کرے گی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی برکتوں سے نوازے گا اور اس کو عزت اور عافیت کی زندگی دے گا، اور اس کے برعکس جو قوم (بالخصوص اللہ و رسول سے تعلق ظاہر کرنے والی کوئی قوم) اگر خدا پرستی کے بجائے نفس پرستی اور بد اعمالی و بد اخلاقی کی روش اختیار کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنی دی ہوئی نعمتیں بھی چھین لے گا اور وہ دنیا میں ذلت کے عذاب میں مبتلا کی جائے گی (جیسا کہ قرآن مجید نے جا بجا بنی اسرائیل کا حال بیان کیا ہے ـــــ

بہرحال قوموں کے عروج و زوال، ترقی و انحطاط اور اُن کے اچھے برے حالات پر غور کرنے کا دوسرا طریقہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کا ہے۔ یہ حضرات جیسا کہ عرض کیا گیا ظاہری اسباب و تدابیر کی نفی نہیں کرتے لیکن بنیادی اہمیت ایمان اور اعمال و اخلاق کو دیتے ہیں ـــــ

اس اشاعت میں اس ورق کے بعد ہی رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک اہم مضمون شائع کیا جا رہا ہے، یہ مضمون دراصل اس ایمانی طریق فکر کی بنیاد پر ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے ایک پیغام اور ایک دعوتِ فکر و عمل ہے ـــــ ہماری گذارش ہے کہ مسلمانوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے گی ـــــ امید ہے کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے اس کو مستقل پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جائے گا۔

ناظرین کو معلوم ہے کہ قریباً دس سال سے الفرقان کی ادارت اور ترتیب و تیاری کی پوری ذمہ داری مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ سنبھالے ہوئے تھے اور میں اس طرف سے بالکل فارغ اور سبکدوش تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ قریباً سال سوا سال سے ان کی صحت کی خرابی کا سلسلہ جاری ہے ـــــ اس مدت میں وہ صاحبِ فراش بھی کم رہے، زیادہ دن اس حال میں گزرے کہ وہ چلتے پھرتے تھے اور معالجین کی رائے یہ تھی کہ وہ دماغی کام بالکل نہ کریں لیکن وہ کچھ لکھ پڑھ بھی لیتے تھے۔

دسمبر جنوری میں ان کی صحت زیادہ قابل اطمینان اور بہتر رہی، اسی لئے رمضان کے روزے قضا کرنے پر بھی وہ تیار نہ ہوئے۔ شعبان کا شمارہ ــــ جو شروع فروری (وسط رمضان) میں شائع ہو سکا تھا ــــ اس کی ترتیب و تیاری کا کام انھوں نے ہی کیا ــــ چودہ رمضان کو میں کلکتہ چلا گیا تھا، اور ایک ہفتہ کے بعد ۲۱ کو میری واپسی ہوئی۔ اسی دوران میں الفرقان ۱۶ رمضان کو تیار ہو کر ۱۷ کو روانہ ہو سکا۔ رسالہ کی روانگی کے دن دفتری کام بہت زیادہ ہوتا ہے، وہ افطار کے بعد تک اس میں شریک و منہمک رہے ــــ تراویح کے بعد اُن پر ضعفِ قلب کا ایک سخت قسم کا دورہ پڑا، پھر تین تین چار چار دن کے فاصلے سے دو تین دورے اور اسی قسم کے ہوئے، ان دوروں کے نتیجہ میں اتنا ضعف پیدا ہو گیا کہ بات کرنا مشکل ہوتا تھا اور نماز بھی اشاروں سے پڑھی جا سکتی تھی ــــ یہ سب کچھ رمضان کے آخری دو ہفتوں میں ہوا، اس کے بعد سے اب تک الحمد للہ دورہ نہیں ہوا ہے اور حالت کافی بہتر ہے ــــ ناظرین کرام سے دعائے صحت کی درخواست ہے اور اسی لئے ان کی علالت کی کیفیت تفصیل سے لکھ دی گئی ہے ــــ

احباب مخلصین بھی بس دعا ہی فرمائیں، اسی کی احتیاج ہے اور اسی سے انشاء اللہ اُن کو نفع ہو گا ــــ

دریافت حال کے لئے جواب طلب خطوط لکھنا اس ناچیز کے کام میں اضافہ کا باعث ہو گا۔

مسلمانانِ ہند سے

کچھ صاف صاف باتیں

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

مولینا سید ابو الحسن علی ندوی

سادی دنیا کے مسلمانوں کے حالات نے اس بات کی شدید ضرورت پیدا کردی ہے کہ ان سے بغیر رو رعایت اور بغیر کسی اشارہ کنایہ کے کچھ صاف صاف باتیں کی جائیں یہی ان کے ساتھ سب سے بڑا اخلاص اور سب سے بڑی ہمدردی ہے اور اسی میں اپنی اور تمام مسلمانوں کی حفاظت اور سلامتی کا راز مضمر ہے یہ فریضہ ہر جگہ اور ہر زبان میں ادا ہونا چاہیئے لیکن بہت سی سہولتوں کی بنا پر اس وقت روئے سخن ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے جن کے تازہ حالات نے انکو ایک طرف اپنے حالات کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے دوسری طرف ان میں حقائق و واقعات پر غور کرنے کی نئی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو گئی ہے مزید برآں خاص سیاسی و خارجی حالات نے ان کی صورت حال کچھ ایسی بنا دی ہے کہ ان کیلئے دین کی کھلی راہ اختیار کرنے اور نصرت الٰہی کے سایہ کے نیچے آنے کے سوا کوئی راہ نہیں ہے. قرآن مجید کے معجزانہ الفاظ میں ان کی صحیح تصویر یہ ہے ۔

حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ

(التوبہ ع ۱۴)

(یہاں تک کہ جب زمین اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی طبیعتیں گھٹنے لگیں اور وہ گمان کرنے لگے کہ اللہ سے صرف اللہ ہی کے دامن رحمت میں پناہ ہے)

ایک ذی ہوش صاحب ضمیر غیور اور جری قوم کی طرح ہمیں اپنے گرد و پیش کے حالات کا پورا جائزہ لینا چاہیے، اس سلسلے میں جو غلطی ملک کی جمہوری اور نا مذہبی حکومت کی طرف سے یا جو کوتاہی قومی اور ملکی اداروں سے ہو رہی ہو، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پوری طاقت اور صفائی کے ساتھ اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں کسی بدگمانی یا رشتہ دوانی سے نہیں ڈرنا چاہیے کہ یہی سچی حب الوطنی ہے۔ جمہوریتیں اسی طرح بنتی اور پھلتی پھولتی ہیں اور ملکوں کی سلامتی اور خوشحالی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اسی کی ہے کہ کسی کی راضی و ناراضی اور ذاتی یا گروہی مصلحتوں سے بالکل بے پرواہو کر سچی اور بے لاگ بات کہی جائے ہمارا اللہ سے عہد ہے کہ اس سلسلہ میں ہم کسی موقع پرستی یا مصلحت شناسی سے کام نہیں لیں گے اور خواہ ہماری آواز کیسی ہی "صدا بصحرا" ثابت ہو، ہم یہ آواز بلند کرتے رہیں گے

لیکن کوہ صفا کی صاف گوئی کی تقلید اور رہنمائی میں (جب ایک صبح دنیا کے سب سے انسان کی آواز پر "مکہ" کی وادی کے بسنے والے اس انتظار و اضطراب میں جمع ہو گئے تھے کہ کسی بیرونی خطرہ اور حملہ اور دشمن کی اطلاع دی جائے گی، لیکن ان کو بتایا گیا کہ دشمن ان کے باہر نہیں ان کے اندر ہے اور سب سے بڑا خطرہ وہ ہے جو ان کے غلط طرز زندگی کے نتیجے میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے) اس کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو خود اپنے حالات کا جائزہ لینے پر آمادہ اور اس خطرہ سے ہوشیار کیا جائے جو ان پر سایہ فگن ہے اس سلسلہ میں عقائد اور اعمال و اخلاق سے لے کر ملی فرائض، اجتماعی

ذمہ داریوں اور قوموں کے عروج و زوال کے لئے قرآنی اصولوں اور قوانین کے جائزہ کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کے لئے اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کافی ہیں، یہاں کسی تفصیل کا موقع نہیں ہے چند باتیں جو قرآن کے محدود مطالعہ کے نتیجے میں نظر میں آئیں لکھی جاتی ہیں حالات کی تبدیلی اور حقیقی حفاظت و نصرت کے لیے ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

(۱) قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسی قوم جو خدا کے پیغمبر پر ایمان لا چکی ہو اور اس کو آسمانی کتاب دی جا چکی ہو مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو جائے تو وہ خدا کی رحمت و نصرت سے دور اور ذلت و بے عزتی کا شکار ہو جاتی ہے، سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے صاف فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ (الاعراف ع ۷)

(جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اسی دنیوی زندگی ہی میں پڑے گی، ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں)

دوسری طرف توحید کامل پر صاف صاف عزت و سربلندی، دین کے غلبہ و استحکام اور امن و حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (النور ع ۷)

(تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لئے قوت دیگا اور ان کے اس خوف کے بعد اسکو مبدل با من کرے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں اور جو شخص اس وعدہ کے بعد ناشکری کرے گا تو یہ لوگ بے حکم ہیں)

نزول قرآن کے بعد جن لوگوں (صحابہ کرام) نے سب سے پہلے اور سب سے مکمل طریقہ پر اس شرط کو پورا کیا، ان کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں شہادت دی گئی اور تاریخ نے سر جھکا کر اس کی تصدیق کی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (الانفال ع ۱۶)

(اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم قلیل تھے زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے، اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم شکر کرو ——— (سورہ انفال ع ۴)

یہ حقیقت خواہ کتنی تلخ ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لئے نامانوس ہو مگر بہرحال حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد و اعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے اعتراف کے لیے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرات کی ضرورت ہے، اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور وہ عنقا کی طرح کوئی خیالی اور فرضی چیز نہیں اور اگر قوموں اور ملتوں کے لئے ایک ہی میزان عدل اور ایک ہی پیمانہ ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ احول سے متاثر ہو کر خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور عملی بے راہ روی میں مبتلا

ہو گئے ہیں جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے" اگر کسی کو اس میں شبہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی "مرجع خلائق" مزار پہ جا کر اور کسی عرس میں شریک ہو کر دیکھ لے، یا ان عقائد و خیالات کو سننے کی کوشش کرے جو بکثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیاء کرام بزرگان دین اور اپنے سلسلہ کے مشائخ کے متعلق قائم کر رکھے ہیں کہ "صفت خلق" (پیدا کرنے کی طاقت) "ایجاد عالم" اور تشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات و افعال الٰہی میں سے کون سی صفت اور کونسا فعل و تصرف ہے جو انھوں نے ان بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے اور سجدہ سے لے کر دعا و استعانت تک کون سا معاملہ (جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیئے) نہیں ہے جو انھوں نے ان کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے، قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی غالی مرکز میں چلے جایئے اندیشہ ہے کہ آپ کی زبان سے بھی بے اختیار قرآن کے یہ الفاظ نہ نکل جائیں کہ

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ

(اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں)

(یوسف ع ۵)

ایسی حالت میں خالص قرآن کی روشنی میں حفاظت اور نصرت و تائید الٰہی کی کیا امید کی جا سکتی ہے اور رہنمایان قوم کی خارجی تدبیریں کیا کارگر ہو سکتی ہیں؟ جب کہ امن و حفاظت تک کے لئے اس کی شرط کی گئی ہے کہ

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (النور ع ۷)

(بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شریک نہ کریں) ۱۳

اس سلسلہ میں علماء و واعظین و واقفین حال کا جو فرض ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور اس فرض کے "فرض کفایہ" کے درجہ میں بھی باقی نہ رہنے سے جس عمومی باز پرس اور مواخذہ کا خطرہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں،

(۲) دنیا میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون طبعی جاری و ساری ہے ہزاروں برس سے آگ جلاتی ہے پانی بجھاتا ہے، سنکھیا کام تمام کرتی ہے اور تریاق زہر کے اثر کو دور کرتا ہے

دوائیں، غذائیں، قوت، تعداد، اسلحہ، محنت، تنظیم اور زندگی گزارنے اور کامیابی حاصل کرنے کے آزمودہ اور معروف طریقے بحکم الٰہی اپنا اثر رکھتے ہیں، اسی طرح اس کا ایک اخلاقی قانونِ مکافات بھی ہے، اچھے برے اخلاق و اعمال افراد اور قوموں کی زندگی میں اپنا اثر اور خاصیتیں رکھتے ہیں قرآن مجید نے اقوام سابقہ کے تذکرہ میں ان کی تاثیر اور ان کے نتائج کا واضح طریقہ پر ذکر کیا ہے، اور ان افراد اور اقوام کا انجام بتایا ہے جنھوں نے ان اخلاق و اعمال کا مظاہرہ کیا، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، اور قوم شعیب کا حال دیکھ لینا کافی ہے، جن کے خاص امراض اور احوال و اخلاق (کیرکٹر) کی نشاندہی کی گئی ہے، اور ان کے ان اعمال و اخلاق کا انجام بتایا گیا ہے، حدیث شریف میں خاص خاص اخلاق و اعمال کا انجام اور دنیا وی زندگی میں ان کے اثرات اور خاصیتوں کا بہت صاف الفاظ میں تذکرہ ہے، کسی پر بے برکتی، کسی پر امراض اور پریشانیوں کی کثرت، کسی پر کثرت اموات، کسی پر ذلت و خواری، اور کسی پر بزدلی و مرعوبیت کا اعلان کیا گیا ہے، اس "طب نبوی" کا مطالعہ اس دور میں خاص طور پر بہت ضروری اور مفید ہے اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک پر اطلاع دی گئی ہے کہ دعائیں تک مقبول نہیں ہوں گی، اس کے برخلاف توبہ و انابت کی عمومی فضا پر آئے ہوئے عذاب کے ٹل جانے کی خبر دی گئی ہے[۱] فساد عقیدہ و فساد اعمال و اخلاق کے علاوہ مسلمانوں میں

---

[۱] سورۂ یونس (رکوع ۱۰) میں ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۝

ترجمہ:- کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ یقین لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم جب یقین لائے ہٹا دیا ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں، اور کام چلایا ان کا ایک وقت تک۔

ایک بڑی تعداد نفاق عملی و اخلاقی میں اور خواص و قائدین کی ایک تعداد نفاق اعتقادی تک میں مبتلا ہے، ایک بڑی تعداد فرائض کی تارک حتیٰ کہ اسلام کے رکن اعظم نماز سے غافل اور مستقل و علانیہ تارک صلوٰۃ ہے۔ ضرورت ہے کہ تمام سیاسی و اجتماعی تدبیروں کے ساتھ (اور حقیقتاً ان سے بیشتر اور ان سے زیادہ) اصلاح اعمال و اخلاق اور فرائض و ارکان دین کی پابندی کی دعوت دی جائے اور "جزاء الاعمال" کے اس الٰہی قانون کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ ان اخلاقی امراض اور عملی فسادات سے ملت کو ڈرایا جائے؟ جو بڑے مہیب اجتماعی و عمومی نتائج رکھتے ہیں، اور جن کے لئے قرآن و حدیث میں نص صریح موجود ہے اور بد قسمتی سے بہت سے مسلمان ان میں مبتلا ہیں۔

(۳) ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے اور ملی و اجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دور رس ہیں وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف و فضول خرچی، شہرت اور عزت کے حصول یا رسم و رواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر و فاقہ، اضطرار و اضطراب اور ان افسوسناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے جس میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، تعدد شادی کی محتاط و محدود زبان اور حلال و حرام کے معین حدود و احکام میں خواہ اس کے لیے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور کوئی لرزہ خیز لفظ نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکیم و عادل ذات اور اس کی ربوبیت و رحمت عامہ کی صفات کے لئے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول اور زمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا، اور برہنہ تن شریف مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو، ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں پچاس پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا جائے، شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی و اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا، کہ جب ہزاروں لاکھوں

افراد کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں لاکھوں افراد کو قوت لا یموت حاصل نہ ہو اور وہ جسم و جاں کا رشتہ بھی قائم نہ رکھ سکتے ہوں۔ ملت کے لاکھوں بچے فیس اور کتابوں اور ضروری مصارف کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہوں، ہزاروں ادارے جو ملت کے لیے روح کا حکم رکھتے ہیں اور بیسیوں منصوبے جن کی تکمیل کے بغیر اس ملت کا وجود مشکوک اور ان کا مستقبل تاریک ہے، موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں، ہمارے اہل ثروت تجار اور ذی حیثیت لوگ اپنی اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں اور "رسومات" کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں، اس زمانہ میں بہت سے تغیرات و انقلابات اور علم و ترقی کے باوجود مسرفانہ و شاہانہ شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انھوں نے جدید (ماڈرن) طرز اختیار کر لیا ہے اور سیاسی مصالح و مقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہو گئے ہیں، آج بھی ہماری بہت سی برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں ان تقریبات پر جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں مگر انھوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ و معبود بنا لیا ہے)

اور بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ ——— ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ایک راستہ پر اور ہم انھیں کے نقش قدم پر ٹھیک ہیں)۔ کا مصداق ہیں۔

حقیقتاً اس سلسلہ میں بہت سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ان فرائض و تقریبات کا تخیل و مفہوم یکسر بدلنے کی ضرورت ہے، اسکے خلاف اعلان جنگ اور اعلان بغاوت کی ضرورت ہے، اس بات کو صاف طریقہ پر واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لئے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لئے وبال و ادبار کا باعث ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ

کی رحیم و حکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام و نمود اور اس عارضی رونق و زینت یا کام و دہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سینکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی، ان کے سامنے یہ واقعہ آنا چاہیئے کہ مدینہ طیبہ کی محدود و مختصر آبادی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نکاح کرتے ہیں اور اس ذات گرامی کو اطلاع بھی نہیں ہوتی جس کی شرکت و موجودگی ہر بزم کے لئے باعث فخر و زینت تھی، خصوصاً ایک جلیل القدر صحابی اور مہاجر کے کاشانہ کا چراغ طور تھی جس نے ابھی ابھی اس نئے شہر میں قدم رکھا تھا اور جس کے سارے تعلقات اسی مہاجر برادری سے قائم تھے، اور یہ سب اسی ذات کے طفیل تھے جس سے ازدواجی زندگی کا یہ طریقہ اور اس کے احکام معلوم ہوئے تھے، آج دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کو یہاں تک کہ ان ملکوں سے جہاں پاسپورٹ اور ویزا ہے) مدعو کیا جاتا ہے، اور حضرت عبدالرحمٰن کی شادی کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت ہوتی ہے جب ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ملاحظہ فرمایا جاتا ہے، پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شادی کرلی ہے، اس وقت ولیمہ کے لئے ہدایت ہوتی ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان "حوصلہ مندیوں" پر جن کا ان مواقع پر اظہار کیا جاتا ہے ہمارا ذمہ دار طبقہ اپنی پوری ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرے اور کم سے کم ان کا مقاطعہ کرکے ہمت افزائی اور تعاون علی الاثم والعدوان سے بچا جائے، ان "حوصلہ مند" حضرات کو بھی سوچنا چاہیئے کہ ہندستان کے موجودہ حالات، مسلمانوں کی معاشی پستی اور بدحالی، بلکہ فلاکت و ہلاکت کے دور میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ کوئی ایک فرد اپنے یہاں کی کسی ایک تقریب پر اتنے مصارف کردے جس سے ایک برادری کی پرورش یا ایک مکمل ادارہ کا انصرام ہو سکتا ہے، ان کو آخرت کے مواخذہ اور حساب سے بھی ڈرنا چاہیئے جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا اور افراد و ملت کی ان شدید ضروریات کی موجودگی میں اس "دریا دلی" کا جواز پیش کرنا ہوگا جو اپنی ذات تک محدود تھی۔

(۴) قرآن مجید سے یہ بات صاف طریقہ پر ثابت ہوتی ہے کہ امت کے ملی اور اجتماعی

تقاضوں اور دین کی حفاظت و اشاعت کے مطالبہ اور اس کی ضرورتوں میں اپنا مال صرف کرنے سے آنکھیں بند کر کے افراد کا اپنے ذاتی کاروبار اور اپنی معاشی ترقی و استحکام کی فکر اور کوشش میں انہماک صریح خودکشی کے مرادف ہے' اور جو جماعت یہ غلط راستہ اختیار کرتی ہے وہ اپنے ہاتھوں ہلاکت کے غار میں گرتی ہے اور اس شاخ پر تیشہ چلاتی ہے جس پر اس کا آشیانہ ہے بلکہ کھلے لفظوں میں وہ اپنے ہاتھوں "زہرناب" کا پیالہ پیتی ہے۔

قرآن مجید کے صاف لفظ ہیں۔

وَاَنْفِقُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ)

(اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں)

اس آیت کے محرم راز میزبان نبوت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے انھوں نے قسطنطنیہ کے محاصرہ میں ان لوگوں کو ٹوکا جو اس سے دین کے راستہ میں قربانی اور خطرہ میں پڑنے کی مخالفت نکالتے تھے' اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس آیت کی رو سے جو کسی دینی مقصد کے لئے اپنی جان پر کھیل جائے یا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلے وہ خودکشی کا مرتکب ہے، انھوں نے فرمایا کہ یہ آیت ہم انصار کے بارہ میں نازل ہوئی تھی' جب ایک عرصہ کی مالی قربانیوں اور عملی سرفروشیوں کے بعد اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے اور اسلام کے سپاہی اور مجاہد پیدا ہو گئے تو ہم نے سوچا کہ اب کچھ روز کے لئے ہم اسلام کی نصرت اور خدمت (اور گویا اس سلسلے کے بے پایاں مصارف سے) عارضی رخصت لے کر کچھ عرصہ کے لئے اپنے ذاتی کاروبار' باغات' زراعت اور ان تجارتوں کو سنبھال لیں اور ان کی دیکھ بھال میں ہمہ تن مشغول ہو جائیں جو ہماری تبلیغی اور مجاہدانہ سرگرمیوں اور روز و شب کی مشغولیت کی وجہ سے سخت متاثر ہوئی تھیں' اور ان پر کاری ضرب پڑی تھی' حضرات انصار کے دل میں یہ وسوسہ بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ اسلام کی خدمت اور اس کی راہ میں قربانیوں سے مستقل طور پر سبکدوشی اور آزادی حاصل کر لیں' انہوں نے صرف وقتی طور پر یہ عارضی رخصت اور اجازت لینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ان صریح اور دھڑا دینے والے لفظوں میں ان کی تنبیہ کی گئی' اور بتلا دیا گیا کہ دین و ملت کی خدمت سے (عارضی) دستکشی اور انفرادی سرسبزی اور بہبود کا خیالی منصوبہ بھی کھلی خودکشی کے مرادف ہے' اس

سے غیر مشتبہ طریقے پر یہ ثابت ہو گیا کہ افراد کا وجود ملت سے ہے اور ملت ہی کی حفاظت و استحکام میں ان کی حفاظت و استحکام کا راز مضمر ہے، جس طرح ٹہنیوں کی سرسبزی و شادابی درخت سے وابستہ ہے، درخت سے جدا ہونے کے بعد کسی خارجی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی ذہانت اور صنعت سے بھی ان کو سرسبز و شاداب نہیں رکھا جا سکتا اسی طرح ملت کے افراد کی زندگی اور اس کا نمو وارتقاء بھی ملت ہی سے مربوط ہے، اور ہر دور میں ان کے لیے پیام ازلی اور قانون زندگی یہی ہے کہ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

افراد موج ہیں اور ملت ایک رواں دریا، دریا کے بغیر موجوں کا تصور بھی ممکن نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسی طرح ملت اسلامیہ کے افراد کسی ملک میں ملت سے کٹ کر اور اسکے ملی اور اجتماعی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض انفرادی خوشحالی معاشی ترقی، ذاتی سرمایہ اور تمول ذاتی منصب واعزاز و شخصی حفاظت و ضمانت پر کبھی زندہ و محفوظ اور باعزت و باوقار نہیں رہ سکتے، ملت کے کھلے ہوئے اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل سے افراد کا پہلو تہی کرنا اور ان کے بارہ میں تغافل سے کام لینا اور اپنے ذاتی کاروبار کی ترقی اور اپنے محدود خاندانوں کی بہبود و آسائش پر اپنی تمام توجہ مرکوز کر لینا اور اپنی خیالی جنت میں مست رہنا اور اسی کو حقیقی مسرت و کامیابی سمجھنا اپنے حق میں کانٹے بونا اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے ممالک اسلامیہ کی پوری تاریخ اور مسلمانوں کا سابق طرز عمل اس اعلان کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے جس نسل یا ملک کے مسلمانوں سے یہ غلطی ہوئی اور انھوں نے اس کوتاہ نظری اور کوتاہ اندیشی سے کام لیا وہ حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے اور ان کی زندگی کا تارپود بکھر کر رہ گیا۔ اندلس، بخارا اور سمرقند کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گزر رہے ہیں، یہاں ملت اسلامیہ ہندیہ کی بقا کے لئے ایک بڑی پر عزم لیکن دانشمندانہ جد و جہد کی ضرورت ہے

یہاں مسلمانوں کے ملی وجود، ان کی اجتماعی شخصیت و انفرادیت کی بقا کے لیے کچھ کاموں کی تکمیل ضروری ہے، وہ اس ملک میں مسلمان کی حیثیت سے زندہ محفوظ ہوں، باعزت ہوں، موثر اور فیصلہ کن ہوں، اپنی خصوصیات کے مالک ہوں، اپنے پیغام کے حامل ہوں، انسانیت اور اس ملک کے لیے مفید و مبارک ثابت ہوں، حالات اور تبدیلیوں سے عہدہ برا ہو سکیں، زمانہ اور ایک ترقی کرنے والے ملک کے قافلہ کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں، بلکہ ضرورت ہو تو ان کی رہنمائی اور کارواں سالاری کا فرض بھی انجام دے سکیں، قیادت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال سکیں، اور اس ملک کو مہیب خطرہ اور مہلک زوال سے بچا سکیں، اس کے لیے چند تعلیمی و تعمیری کوششوں اور تحریکوں اور عظیم اداروں اور فکری مرکزوں کی ضرورت ہے، ان تحریکوں اور اداروں کا وجود اور ان کا استحکام و ترقی اس ملت کے وجود کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو ہوا و پانی ایک زندہ انسان کے لیے، اگر یہ تحریکیں اور ادارے سرسبز توانا اور روبترقی ہیں تو ملت کا وجود محفوظ، اس کا مستقبل روشن اور ملک میں اس کا مقام معین ہے کسی اکثریت یا فرقے کا تعصب و تنگ نظری یا حکومت کی کمزوری و جانبداری اس کے وجود کو ختم یا اس کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتی، اور کوئی بڑے سے بڑا فرقہ وارانہ فساد اس کی قسمت پر مہر نہیں لگا سکتا۔

لیکن اگر اس ملت کے افراد اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر میں ہمہ تن مشغول و منہمک ہیں اس کے متمول اور با استطاعت افراد ملی تقاضوں اور ضرورتوں سے غافل ہیں، وہ اپنی "خواہشات" اور "حوصلہ مندیوں" پر تو بے دریغ اور شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ روپیہ صرف کر سکتے ہیں لیکن احیاء و بقائے ملت کی تحریکیں اور ادارے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں یا وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا حال وہ ہے جو شاعر نے اپنے دردمند دل کے متعلق کہا ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تو پھر یہ افراد خواہ سرمایہ کے لحاظ سے قارون وقت ہوں، ہر وقت خطرہ

سے دوچار ہیں، اللہ کی نگاہ میں ان کی پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، حالات کی کوئی خفیف سی تبدیلی، اور واقعات کی کوئی ہلکی سی لہر بھی ان کے ان چھوٹے چھوٹے مصنوعی حصاروں کو ریت کی دیواروں کی طرح بہا کرلے جائے گی، اور کسی دن جب ان کی آنکھ کھلے گی تو ان کو نظر آئے گا کہ وہ دفعتاً ہر چیز سے محروم ہوگئے ہیں، اور ایک تن آسان خدا فراموش اور فرض ناآشنا قوم کی طرح ان کا حال بھی یہی ہوگا۔

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ

(تو ان پر آیا اللہ (کا عذاب) ایسی جگہ سے کہ ان کو گمان بھی نہ تھا اور اللہ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب)

ہندوستان کی یہی صورت حال ان لوگوں کو (جن کی سنت اللہ اور آئین الٰہی پر ذرا بھی نظر ہے) لرزہ براندام کئے ہوئے ہے، ہندوستانی مسلمان ساری سیاسی تبدیلیوں اور معاشی انقلاب کے باوجود اب بھی اتنے سرمایہ کے مالک ہیں کہ یہاں احیاء و بقاء اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کی ہر تحریک اور یہاں کے مرکزی دینی و تعلیمی ادارے بخوبی چل سکتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے ان کو مالی بحران سے دوچار ہونے کی ضرورت نہیں نہ اپنے اصلاحی و تعمیری پروگرام میں اختصار یا التوا کی ضرورت ہے، لیکن کتنی تحریکیں ہیں جن کی کامیابی کے بغیر مسلمانوں کا تعلیمی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، کتنے ادارے ہیں جن کے بغیر مستقبل میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا ممکن نہ ہوگا کہ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

کتنے مرکز ہیں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نوجوانوں کو ذہنی و تہذیبی ارتداد سے (جو سیلاب کی طرح آرہا ہے) بچانے میں مدد دے سکتے ہیں، نوجوانوں کے ذہن میں اسلام اور اس کے مستقبل پر اعتماد (جس کو مغربی تعلیم و افکار نے متزلزل کر دیا ہو) بحال کر سکتے ہیں، مستشرقین مغرب کے پھیلائے ہوئے زہر کے بے (جو ان سب

دماغوں کو مسموم کر رہا ہے جن کے ہاتھ میں مسلم ممالک کی قیادت ہے اتریاق مہیا کر سکتے ہیں۔
اور ان کا علمی محاسبہ کر کے ان کو بے اثر بنا سکتے ہیں، کتنے مرکز ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے ابدی قانون اور زندگی کے رواں دواں قافلہ کے درمیان موافقت و مطابقت پیدا کر سکتے ہیں، اور اس طبقہ کو جو واقعات و حقائق سے دوچار ہے نئی رہنمائی نیا اعتماد اور نیا ایمان عطا کر سکتے ہیں، اور اس کام کو دوبارہ جاری کر سکتے ہیں جو متکلمین اسلام نے اپنے اپنے وقت میں انجام دیا۔ کتنے افراد و ادارے ہیں جو مغربی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی بولیوں میں اسلام اور قرآن و سیرت نبوی کا تعارف کرا سکتے ہیں اور ان سب سعید روحوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں جو حق کی جویا اور جمال جہاں آرائے نبوی کے نادیدہ عاشق ہیں؛ زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی حفاظت و تربیت کے لئے کتنے منصوبے ہیں جو ان کو الحاد و فساد کا لقمہ تر بننے سے بچا سکتے ہیں اور ان کے اندر ایمان کی چنگاری کی حفاظت کر سکتے ہیں، لیکن یہ سب تحریکیں اور ادارے یا تو وسائل کے فقدان کی وجہ سے ایک "خواب شیریں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے یا اگر کہیں وجود میں آگئے ہیں تو جیسا کہ عرض کیا گیا "مفلس کے چراغ" کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

دنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کسی ملک میں پانچ کروڑ کی ایک اقلیت پائی جاتی ہو جن میں لاکھوں کی تعداد میں بڑے سرمایہ دار اور لاکھوں کی تعداد میں اعلیٰ التعلیم یافتہ حضرات موجود ہوں، سیاسی حالات اور پچھلی تاریخ نے اسکے گرد تعصبات اور غلط فہمیوں کا جال پھیلا دیا ہو۔ سیاسی جماعتوں کی مصلحتوں اور تنگ نظر فرقہ پرستی نے اسکو کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہو، ہر وقت اس کے متعلق بڑی سے بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان ہو وہ اگر مظلوم و معصوم ہو تو اس کو ظالم و خونخوار ثابت کرنا ہو وہ اگر اپنی حفاظت خود اختیاری کا فرض بھی انجام نہ دے تب بھی اس کو دست درازی اور فتنہ کشی کا مجرم ٹھہرانا۔ وہ اگر مقتول ہو تو اس کو قاتل گردانا آسان ہو، اس کا مخالف پریس ہر وقت رائی کو پربت اور افسانے

کو حقیقت بنا سکے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس "ملت" کے پاس کوئی طاقتور پریس نہ ہو، اس برعظیم کے طول و عرض میں اس کا ایک بھی انگریزی روزنامہ نہ ہو، ہندی میں اس کی آواز پہونچانی مشکل ہو، ملک کے ذمہ دار و صاحب اختیار حلقے اور ارباب حکومت تک (ان کی مانوس زبان میں) حرف شکایت تک پہونچانا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بھی ممکن نہ ہو، لیکن ہر طریقہ سے اس ملت کی خوشحالی کا اظہار ہوتا ہو اور معاشی منصوبوں سے لے کر دینی شعبوں اور خیراتی کاموں تک وہ اپنی زندگی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیتی رہتی ہو، دینی جذبہ اور سیاسی شعور سے قطع نظر اس ملت کی عقل عام (common sence) کے متعلق کیا کہا جائیگا

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے　　ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

پھر اس ملت کو کسی دوسرے فرقہ کسی جماعت یا حکومت کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے اور کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر چیں بجبیں ہونے کا کیا موقع ہے؟

ملک کے کسی گوشہ میں فرقہ وارانہ فساد کا ہو جانا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اس پر جتنی توجہ کی جائے کم ہے مظلوم و متاثر مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد صرف دینی بلکہ اخلاقی و انسانی فرض ہے، مسلمان اپنا پیٹ کاٹ کر اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی اگر اس فساد زدہ علاقہ کی مدد کریں تو بیجا نہیں، جبل پور اور کلکتہ کے لئے ہندستانی مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض اور احساس فرض کی معمولی مثال ہے جس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے جو کچھ ہوا وہ کم ہے اس سے بھی زیادہ حمیت دینی اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔

لیکن یہ بات خواہ اس وقت کیسی ہی بے محل بھی جائے بہرحال حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ فساد زدہ علاقوں کی امداد کہیں خدانخواستہ ایک "سالانہ عرس" نہ بن جائے، جس میں مسلمانوں کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں مصروف ہو کر رہ جائیں ہمیں اس صورت حال کو کسی حال میں گوارا نہیں کرنا چاہیئے اور اس کو روایت نہیں بننے دینا چاہیئے، وہ ملت بڑی قابل رحم اور بڑی بدقسمت ہے

جو ایک طرف مجروح و مظلوم ہو دوسری طرف ملت کے سارے وسائل اس کی چارہ سازی میں صرف ہوں ایک طرف زخم لگے دوسری طرف سے مرہم لاکر رکھا جائے، یہ ملت ہرگز اس مسلسل عمل جراحی اور مسلسل مرہم گری کے لیے پیدا نہیں ہوئی، فسادات کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لئے ملت کے حالات میں مستقل تبدیلی کی ضرورت ہے ان ناکوں کو بند کرنے کی ضرورت ہے جن سے یہ فسادات ملت کے حصار میں داخل ہوتے ہیں، یہ ناکے بیرونی سے زیادہ اندرونی ہیں، ایسی فضا اور صورت حال کے پیدا کرنے کے لئے کہ فسادات کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے احیاء و بقاء اسلام اور حفاظت مسلمین کی ٹھوس، تعمیری، انقلاب انگیز، اور مستقل و مسلسل تحریکوں اور اداروں کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تحریکیں فروغ نہ پائیں گی اور اتنی طاقتور و موثر نہ بن جائیں گی کہ سپر کا کام دے سکیں اس وقت تک یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا۔

قریبی واقعات نے پھر ایک بار اس کا موقع پیدا کر دیا ہے کہ ہندستان کے مسلمان پوری صورت حال کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں موجودہ واقعات کے حقیقی اسباب تلاش کریں اور ان کے مستقل انسداد و ازالہ کے طریقوں پر غور کریں اور سطحی وقتی و جذباتی طریقوں کے بجائے اللہ کی کتاب سے رہنمائی حاصل کر کے صحیح طریق علاج اختیار کریں، مسلمانوں کا طریق فکر و نظر عام اقوام عالم کی طرح نہیں ہو سکتا نہ ان کی بیماریاں اور مصائب و پریشانیاں عام ملل و اقوام کی طرح محض تکوینی و طبعی ہیں نہ ان کا علاج محض طبعی و تکوینی ہے اس ملت کے بگاڑ کا سبب اور اس کی پریشانیوں کا سرچشمہ بھی الگ ہے اور اس کے انسداد کے طریقے بھی الگ۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا
بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ

معارف الحدیث

(مسلسل)

رویت ہلال۔

شریعت اسلامی نے خاص اعمال و عبادات کے لئے جو مخصوص اوقات یا دن یا زمانے مقرر کئے ہیں ان کی تعیین میں اس بات کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے کہ اُس وقت یا دن یا اس زمانے کا جاننا پہچاننا کسی علم یا فلسفے پر یا کسی آلہ کے استعمال پر موقوف نہ ہو بلکہ ایک عامی اور بے پڑھا دیہاتی آدمی بھی مشاہدہ سے اس کو جان سکے۔ اسی لئے نماز اور روزے کے اوقات سورج کے حساب سے مقرر کئے گئے۔ مثلاً فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک کا مقرر کیا گیا، ظہر کا وقت سورج کے نصف النہار سے ڈھل جانے کے بعد سے ایک مثل یا دو مثل سایہ ہو جانے تک اور عصر کا وقت اس کے بعد سے غروب آفتاب تک کا رکھا گیا ہے اسی طرح مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد سے شفق کے رہنے تک اور عشاء کا شفق کے غائب ہو جانے کے بعد بتایا گیا۔ ایسا ہی روزہ کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کا رکھا گیا ہے ــــــ ظاہر ہے کہ ان اوقات کے جاننے کے لئے کسی علم یا فلسفہ کی اور کسی آلہ کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر آدمی اپنے مشاہدہ سے ان کو جان سکتا ہے۔ اور جس طرح عوام کی سہولت کے پیش نظر نماز اور روزہ کے ان اوقات کے لئے سورج کے طلوع و غروب اور اتار چڑھاؤ کو معیار اور نشان قرار دیا گیا ہے اسی طرح زکوٰۃ اور حج اور روزہ وغیرہ اُن اعمال اور عبادات کے لئے جن کا تعلق مہینے یا سال سے ہے چاند کو معیار قرار دیا گیا۔ اور بجائے شمسی سال اور مہینوں کے قمری سال اور مہینوں کا اعتبار کیا گیا۔ کیونکہ عوام اپنے مشاہدہ

سے قمری مہینوں ہی کو جان سکتے ہیں۔ شمسی مہینوں کے آغاز پر کوئی ایسی علامت آسمان یا زمین پر ظاہر نہیں ہوتی جس کو دیکھ کر ہر عامی آدمی سمجھ سکے کہ اب پہلا مہینہ ختم ہو کر دوسرا مہینہ شروع ہو گیا، ہاں قمری مہینوں کا آغاز چونکہ چاند نکلنے سے ہوتا ہے، اس لئے ایک ان پڑھ دیہاتی بھی آسمان پر نیا چاند دیکھ کر جان لیتا ہے کہ پچھلا مہینہ ختم ہو کر اب اگلا مہینہ شروع ہو گیا۔

بہرحال شریعت اسلامی نے مہینے اور سال کے سلسلہ میں نظام قمری کا جو اعتبار کیا ہے اس کی ایک خاص حکمت عوام کی یہ سہولت بھی ہے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم سنایا تو یہ بھی بتایا کہ رمضان کے شروع یا ختم کا ضابطہ اور معیار کیا ہے۔ آپؐ نے بتایا کہ شعبان کے ۲۹ دن پورے ہونے کے بعد اگر چاند نظر آجائے تو رمضان کے روزے شروع کر دو اور اگر ۲۹ دیں کو چاند نظر نہ آئے تو مہینہ کے تیس دن پورے کر کے روزے شروع کرو، اور اسی طرح رمضان کے روزے ۲۹ یا ۳۰ رکھو ——— پھر آپؐ نے مختلف موقعوں پر رویت ہلال کے متعلق اور سب ضروری ہدایات دیں ——— اس تمہید کے بعد مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھئے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ ذَكَرَ رَمَضَانَ فَقَالَ لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ اُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے ایک موقع پر رمضان کا ذکر فرمایا اس سلسلہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کا روزہ اس وقت تک مت رکھو جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو اور روزوں کا سلسلہ ختم نہ کرو۔ جب تک کہ شوال کا چاند نہ دیکھ لو اور اگر (۲۹) کو چاند دکھائی نہ دے تو اس کا حساب پورا کرو (یعنی مہینہ کو ۳۰ دن کا سمجھو)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهِ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوْا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلٰثِيْنَ۔

رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے چھوڑ دو، اور اگر (۲۹ تاریخ کو) چاند دکھائی نہ دے تو شعبان کی ۳۰ کی گنتی پوری کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح ۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان کے شروع ہونے اور ختم ہونے کا دارومدار رویتِ ہلال یعنی چاند دکھائی دینے پر ہے ۔ صرف کسی حساب یا قرینہ قیاس کی بناء پر اس کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ۔ پھر رویت ہلال کے ثبوت کی ایک شکل تو یہ ہے کہ خود ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے نے دیکھ کے ہم کو بتایا ہو، اور وہ ہمارے نزدیک قابلِ اعتبار ہو، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بھی کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپؐ نے کسی دیکھنے والے کی اطلاع اور شہادت پر رویتِ ہلال کو مان لیا۔ اور روزہ رکھنے یا عید کرنے کا حکم دیدیا۔ جیسا کہ آگے درج ہونے والی بعض احادیث سے معلوم ہوگا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْصُوْا هِلَالَ شَعْبَانَ لِرَمَضَانَ۔

رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رمضان کے لحاظ سے شعبان کے چاند کو خوب اچھی طرح گنو۔

جامع ترمذی

تشریح ۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان کے پیش نظر شعبان کا چاند دیکھنے کا بھی خاص اہتمام کیا جائے اور اس کی تاریخیں یاد رکھنے کی خاص فکر اور کوشش کی جائے،

اور جب ۲۹ دن پورے ہو جائیں تو رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَفَّظُ مِنْ شَعْبَانَ مَالَا يَتَحَفَّظُ مِنْ غَيْرِهٖ ثُمَّ يَصُوْمُ لِرُؤْيَةِ رَمَضَانَ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْهِ عَدَّ ثَلٰثِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ صَامَ ——— رواہ ابو داود

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان کے دن اور اس کی تاریخیں جتنے اہتمام سے یاد رکھتے تھے اتنے اہتمام سے کسی دوسرے مہینے کی تاریخیں یاد نہیں رکھتے تھے پھر رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھتے تھے۔ اور اگر (۲۹ شعبان کو) چاند دکھائی نہ دیتا تو ۳۰ دن کی شمار پورا کر کے پھر روزے رکھتے تھے۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح ۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان مبارک کے اہتمام کی وجہ سے شعبان کا۔ چاند دیکھنے اور اس کی تاریخیں یاد رکھنے کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ پھر اگر ۲۹ شعبان کو رمضان کا چاند نظر آجاتا تو رمضان کے روزے رکھنے شروع فرماتے تھے اور اگر نظر نہ آتا تو شعبان کے ۳۰ دن پورے کر کے روزے رکھتے تھے۔

خبر اور شہادت سے چاند کا ثبوت :۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ رَاَيْتُ الْهِلَالَ يَعْنِيْ هِلَالَ رَمَضَانَ فَقَالَ اَتَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَتَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ يَا بِلَالُ اَذِّنْ فِي النَّاسِ اَنْ يَّصُوْمُوْا غَدًا ———

(رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ میں نے

آج چاند دیکھا ہے (یعنی رمضان کا چاند) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا، کیا تم "لا إله إلا الله" کی شہادت دیتے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں میں "لا اله الا اللہ" کی شہادت دیتا ہوں، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، اور کیا تم "محمد رسول اللہ" کی شہادت دیتے ہو؟ اس نے کہا ہاں میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں (یعنی میں توحید و رسالت پر ایمان رکھتا ہوں، مسلمان ہوں) اس تصدیق کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس کا اعلان کر دو کہ کل سے روزے رکھیں ——

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

تشریح :- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رویت ہلال کی شہادت یا اطلاع قبول کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شہادت یا اطلاع دینے والا صاحب ایمان ہو۔ کیونکہ وہی اس کی نزاکت اور اہمیت کو اور اس کی بھاری ذمہ داری کو محسوس کر سکتا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنِّي رَأَيْتُهُ فَصَامَ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ ——

(رواہ ابوداؤد والدارمی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں نے رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی (لیکن عام طور سے لوگ دیکھ نہیں سکے) تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بھی روزے رکھیں۔

(سنن ابی داؤد۔ مسند دارمی)

تشریح :- ان دونوں حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا چاند ثابت

ہونے کے لئے صرف ایک مسلمان کی شہادت اور اطلاع بھی کافی ہوسکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کے مشہور قول کے مطابق ایک آدمی کی شہادت اس صورت میں کافی ہوتی ہے جبکہ مطلع صاف نہ ہو، ابر یا غبار وغیرہ کا اثر ہو یا وہ شخص بستی کے باہر سے یا کسی بلند علاقہ سے آیا ہو، لیکن اگر مطلع بالکل صاف ہو اور چاند دیکھنے والا آدمی باہر سے یا کسی بلند مقام سے بھی نہ آیا ہو۔ بلکہ اس بستی ہی میں چاند دیکھنے کا دعویٰ کرے جس میں باوجود کوشش کے اور کسی نے چاند نہ دیکھا ہو تو ایسی صورت میں اس کی شہادت پر چاند ہو جانے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس صورت میں دیکھنے والے اتنے آدمی ہونے چاہئیں جن کی شہادت پر اطمینان ہو جائے۔ امام ابوحنیفہ رح کا مشہور قول یہی ہے لیکن ایک روایت امام صاحب سے یہ بھی ہے کہ رمضان کے چاند کے ثبوت کے لئے ایک دیندار اور قابلِ اعتبار مسلمان کی شہادت بہرحال کافی ہے اور اکثر دوسرے ائمہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

یہ جو کچھ ذکر کیا گیا اس کا تعلق رمضان کے چاند سے ہے۔ لیکن عید کے چاند کے ثبوت کے لئے جمہور ائمہ کے نزدیک کم سے کم دو دیندار اور قابلِ اعتبار مسلمانوں کی شہادت ضروری ہے۔ دارقطنی اور طبرانی نے اپنی اپنی سند کے ساتھ عکرمہ تابعی سے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ مدینہ کے حاکم کے سامنے ایک آدمی نے رمضان کا چاند دیکھنے کی شہادت دی، اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دونوں مدینہ میں موجود تھے۔ والیٔ مدینہ نے ان دونوں بزرگوں کی طرف رجوع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس ایک آدمی کی شہادت قبول کر لی جائے اور رمضان ہونے کا اعلان کر دیا جائے اور ساتھ ہی فرمایا کہ

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجَازَ شَهَادَةَ وَاحِدٍ عَلٰى رُؤْيَةِ هِلَالِ رَمَضَانَ وَكَانَ لَا يُجِيْزُ شَهَادَةَ الْإِفْطَارِ إِلَّا بِشَهَادَةِ رَجُلَيْنِ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رویت ہلال رمضان کی ایک آدمی کی شہادت کو بھی کافی مانا ہے اور عید کے چاند کی شہادت دو آدمیوں سے کم کی آپ کافی

نہیں قرار دیتے تھے۔

رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنے کی ممانعت:۔

شریعت اسلامیہ میں پورے رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں اور جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کا چاند دیکھنے کا خاص اہتمام کیا جائے بلکہ اس مقصد سے شعبان کا چاند دیکھنے کا بھی خصوصی اہتمام کیا جائے تاکہ کسی دھوکہ یا غفلت سے رمضان کا کوئی روزہ چھوٹ نہ جائے، لیکن حدود شریعت کی حفاظت کے لئے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کے ایک دو دن پہلے سے روزے نہ رکھے جائیں، اگر عبادت کے شوقین ایسا کریں گے تو خطرہ ہے کہ بے چارے ناواقف عوام اسی کو شریعت کا حکم اور مسئلہ سمجھنے لگیں۔ اس لئے اس کی ممانعت فرما دی گئی۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَتَقَدَّمَنَّ اَحَدُکُمْ رَمَضَانَ بِصَوْمِ یَوْمٍ اَوْ یَوْمَیْنِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ رَجُلٌ کَانَ یَصُوْمُ صَوْمًا فَلْیَصُمْ ذٰلِكَ الْیَوْمَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی رمضان کے ایک دو دن پہلے سے روزے نہ رکھے الا یہ کہ اتفاق سے وہ دن پڑ جائے جس میں روزہ رکھنے کا کسی آدمی کا معمول ہو تو وہ شخص اپنے معمول کے مطابق اس دن بھی روزہ رکھ سکتا ہے (مثلاً ایک آدمی کا معمول ہے کہ وہ جمعرات یا پیر کو روزہ رکھتا ہے تو اگر ۲۹۔۳۰ شعبان کو جمعرات یا پیر پڑ جائے تو اس آدمی کو اس دن روزہ رکھنے کی اجازت ہے۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ قَالَ مَنْ صَامَ الْیَوْمَ الَّذِیْ یُشَكُّ فِیْهِ فَقَدْ عَصٰی اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ——— رواہ ابوداؤد، والترمذی، والنسائی، وابن ماجہ والدارمی

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ جس آدمی نے شک والے دن کا روزہ رکھا اس نے پیغمبر خدا ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ــــــــ

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

تشریح: ــ "شک والے دن" سے مراد وہ دن ہے جس کے بارہ میں شک ہو کہ یہ شاید رمضان کا دن ہو۔ مثلاً ۲۹ شعبان کو مطلع پر ابر یا غبار ہو اور چاند نظر نہ آئے تو اگلے دن کے بارہ میں شک ہوتا ہے کہ شاید آج چاند ہو چکا ہو اور غبار یا ابر کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو اور اس لحاظ سے کل رمضان کا دن ہو ــــ تو شریعت میں اس شک اور وہم کا اعتبار نہیں ہے اور اس کی بنا پر اس دن روزہ رکھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور جیسا کہ اوپر درج ہونے والی بعض احادیث سے معلوم ہو چکا ایسی صورت میں شعبان کے ۳۰ دن پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔

سحور اور افطار کے بارہ میں ہدایات :ــ

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِي السَّحُوْرِ بَرَكَةً ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے ــــ

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح: ــ سحری میں برکت کا ایک ظاہری اور عمومی پہلو تو یہ ہے اس کی وجہ سے روزہ دار کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور روزہ رکھنا زیادہ ضعف کا باعث اور زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اور دوسرا ایمانی اور دینی پہلو یہ کہ اگر سحری کھانے کا رواج نہ رہے یا امت کے اکابر اور خواص سحری نہ کھائیں تو اسکا خطرہ ہے کہ عوام اسی کو شریعت کا حکم یا کم از کم اولیٰ و افضل سمجھنے لگیں اور اسطرح شریعت کے مقررہ حدود میں فرق پڑ جائے۔ اگلی امتوں میں اسی طرح تحریفات ہوئی ہیں۔ تو سحری کی ایک برکت اور اس کا ایک بڑا دینی فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ اس قسم کی تحریفات سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔ اور اس لئے وہ اللہ کو محبوب اور اس کی رضا و رحمت کا باعث ہے ــــ مسند احمد میں حضرت ابو سعید

خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ـــــ

اَلسَّحُوْرُ بَرَکَۃٌ فَلَا تَدَعُوْہُ وَلَوْ اَنْ یَّجْرَعَ اَحَدُکُمْ جُرْعَۃً مِّنْ مَّاءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی الْمُتَسَحِّرِیْنَ

سحری میں برکت ہے اسے ہرگز نہ چھوڑو، اگر کچھ نہیں تو اس وقت پانی کا ایک گھونٹ ہی پی لیا جائے، کیونکہ سحری میں کھانے پینے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے، اور فرشتے ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَصْلُ مَا بَیْنَ صِیَامِنَا وَصِیَامِ اَھْلِ الْکِتَابِ اَکْلَۃُ السَّحَرِ ـــــ رواہ مسلم

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق کرنے والی چیز سحری کھانا ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کے ہاں روزوں کے لئے سحری نہیں ہے اور ہمارے ہاں سحری کھانے کا حکم ہے۔ اس لئے اس فرق اور امتیاز کو عملاً بھی قائم رکھنا چاہیئے۔ اور اللہ کی اس نعمت کا کہ اس نے ہم کو یہ سہولت بخشی، شکر ادا کرنا چاہیئے۔

افطار میں تعجیل اور سحری میں تاخیر کا حکم۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَحَبُّ عِبَادِیْ اِلَیَّ اَعْجَلُھُمْ فِطْرًا۔

(رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ محبوب ہے جو روزہ کے افطار میں جلدی کرے (یعنی غروب آفتاب کے بعد بالکل دیر نہ کرے ـــــ (جامع ترمذی)

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ ——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تک میری امت کے لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے وہ اچھے حال میں رہیں گے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح:۔ اسی مضمون کی حدیث مسند احمد میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس میں "مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ" کے آگے "وَ اَخَّرُوا السَّحُوْرَ" بھی ہے یعنی اس امت کے حالات اس وقت تک اچھے رہیں گے جب تک کہ افطار میں تاخیر نہ کرنا بلکہ جلدی کرنا اور سحری میں جلدی نہ کرنا بلکہ تاخیر کرنا اس کا طریقہ اور طرز عمل رہے گا ——— اس کا راز یہ ہے کہ افطار میں جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر کرنا شریعت کا حکم اور اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اور اس میں عام بندگان خدا کے لئے سہولت اور آسانی بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نگاہ کرم کا ایک مستقل وسیلہ ہے۔ اس لئے امت جب تک اس پر عامل رہے گی وہ اللہ تعالیٰ کی نظر کرم کی مستحق رہے گی اور اس کے حالات اچھے رہیں گے اور اس کے برعکس افطار میں تاخیر اور سحری میں جلدی کرنے میں چونکہ اللہ کے تمام بندوں کے لئے مشقت ہے اور یہ ایک طرح کی بدعت اور یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اس لئے وہ اس امت کے لئے بجائے رضا اور رحمت کے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔ اس واسطے جب امت اس طریقہ کو اپنائے گی تو اللہ تعالیٰ کی نظر کرم سے محروم ہوگی اور اس کے حالات بگڑ جائیں گے۔ افطار میں جلدی کا مطلب یہ ہے کہ جب آفتاب غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر تاخیر نہ کی جائے، اور اسی طرح سحری میں تاخیر کا مطلب یہ ہے کہ صبح صادق سے بہت پہلے سحری نہ کھائی جائے، بلکہ جب صبح صادق کا وقت قریب ہو تو اس وقت کھایا پیا جائے، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اور دستور تھا۔

عَنْ اَنَسٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ تَسَحَّرْنَا مَعَ رَسُوْلِ

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ اِلَی الصَّلوٰۃِ قُلْتُ کَمْ کَمْ کَانَ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالسَّحُوْرِ قَالَ قَدْرُ خَمْسِیْنَ اٰیَۃً۔

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر (جلد ہی) آپؐ نماز فجر کے لئے کھڑے ہوگئے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ سحری کھانے اور فجر کی اذان کے درمیان کتنا وقفہ رہا ہوگا؟ انھوں نے فرمایا پچاس آیتوں کی تلاوت کے بقدر۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح:- صحت مخارج اور قواعد قرأت کے لحاظ کے ساتھ پچاس آیات کی تلاوت میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت صرف ہوتا ہے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سحری اور اذان فجر کے درمیان صرف چار پانچ منٹ کا فصل تھا۔

صوم وصال کی ممانعت:-

"صوم وصال" یہ ہے کہ بغیر افطار اور سحری کے مسلسل روزے رکھے جائیں اور دنوں کی طرح راتیں بھی بلا کھائے پئے گذریں چونکہ اس طرح کے روزے سخت مشقت اور ضعف کا باعث ہوتے ہیں اور اس کا قوی خطرہ ہوتا ہے کہ آدمی اتنا کمزور ہو جائے کہ دوسرے فرائض اور دوسری ذمہ داریوں کو ادا نہ کر سکے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس طرح روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال چونکہ یہ تھا کہ اس طرح روزے رکھنے سے آپؐ کی صحت اور توانائی میں کوئی خاص فرق نہیں آتا تھا اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی غیر مادی غذا اور روحانی قوت ملتی رہتی تھی اس لئے آپ خود ایسے روزے رکھتے تھے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِی الصَّوْمِ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ اِنَّکَ تُوَاصِلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ ——

—— رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے لوگوں کو منع فرمایا، تو ایک صحابی نے آپؐ سے عرض کیا کہ حضرت آپؐ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں، آپؐ نے فرمایا تم میں سے کون میری طرح ہے۔ (یعنی اس بارہ میں میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے جو دوسروں کے ساتھ نہیں ہے اور وہ یہ ہے) میری رات اس طرح گزرتی ہے کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ (یعنی مجھے عالم غیب سے غذا ملتی ہے اس لئے اس معاملہ میں اپنے کو مجھ پر قیاس نہ کرو۔)

(صحیح بخاری و مسلم)

تشریح :۔ اس مضمون کی حدیثیں الفاظ کے خفیف فرق کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت انس اور حضرت عائشہ صدیقہ سے بھی مروی ہیں۔ ان تمام روایات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس ممانعت کا مقصد اور منشا یہی تھا کہ اللہ کے بندے مشقت اور تکلیف میں مبتلا نہ ہوں اور ان کی صحتوں کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں تو یہ بات اور زیادہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ رَحْمَةً لَّهُمْ —— (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترحم اور شفقت کی بنا پر صوم وصال سے منع فرمایا، اور آگے درج ہونے والی حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث سے معلوم ہوگا کہ آپؐ نے صوم وصال کا شوق رکھنے والوں کو سحر تک کے وصال کی اجازت بھی دیدی تھی۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تُوَاصِلُوْا فَاَیُّکُمْ اَرَادَ
اَنْ یُّوَاصِلَ فَلْیُوَاصِلْ حَتّٰی السَّحَرِ قَالُوْا فَاِنَّکَ
تُوَاصِلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ اِنِّیْ
اَبِیْتُ لِیْ مُطْعِمٌ یُّطْعِمُنِیْ وَسَاقٍ یَسْقِیْنِیْ ـــــ

(رواہ البخاری)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ تم لوگ صوم وصال نہ رکھو اور جو کوئی (اپنے شوق اور دل کے داعیہ اور جذبہ کی بنا پر) صوم وصال رکھنا ہی چاہے تو وہ بس سحر تک رکھے (یعنی سحر سے سحر تک قریباً ۲۴ گھنٹے کا) بعض صحابہ نے عرض کیا کہ آپؐ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ (اس معاملہ میں) میرا حال تمہارا سا نہیں ہے، میں اس طرح رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے ـــــ

(صحیح بخاری)

(تشریح) ان حدیثوں میں صوم وصال کی راتوں میں اللہ تعالیٰ کے کھلانے اور پلانے کا جو ذکر ہے اس کی کوئی وضاحت اور خاص صورت احادیث سے معلوم نہیں ہوتی، بعض حضرات نے اس کو یہ سمجھا ہے کہ آپؐ کو صوم وصال میں خاص کر رات کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کا جو خاص الخاص قرب حاصل ہوتا تھا اس سے آپؐ کی روح اور قلب کو وہ طاقت اور توانائی ملتی تھی جو کھانے پینے کے قائم مقام ہو جاتی تھی۔ اسی کی تعبیر روحانی غذا سے بھی کی جا سکتی ہے ـــــ اور بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ صوم وصال کی راتوں میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت اور عالم غیب کے ماکولات و مشروبات کھلائے پلائے جاتے تھے ـــــ اس ناچیز کے نزدیک پہلی بات زیادہ دل کو لگنے والی ہے ـــــ واللہ تعالیٰ اعلم

افطار کے لئے کیا چیز بہتر ہے۔

عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ صَائِمًا فَلْيُفْطِرْ عَلَى التَّمْرِ فَإِنْ لَمْ يَجِدِ التَّمْرَ فَعَلَى الْمَاءِ فَإِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ — رواہ احمد و ابو داؤد والترمذی و ابن ماجہ والدارمی

حضرت سلمان بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ کھجور سے افطار کرے اگر کھجور نہ پائے تو پھر پانی ہی سے افطار کرلے اس لئے کہ پانی کو اللہ تعالیٰ نے طہور بنایا ہے۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) اہل عرب خاص طور سے اہل مدینہ کے لئے کھجور بہترین غذا تھی اور سہل الحصول اور ارزاں بھی تھی کہ غربا اور فقراء بھی اس کو کھاتے تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے افطار کی ترغیب دی اور جس کو بروقت کھجور بھی نہ ملے اس کو پانی سے افطار کی ترغیب دی اور اس کی یہ مبارک خصوصیت بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو طہور قرار دیا ہے۔ اس سے افطار کرنے میں ظاہر و باطن کی طہارت کی نیک فالی بھی ہے۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَى رُطَبَاتٍ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَتُمَيْرَاتٍ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تُمَيْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ — رواہ الترمذی و ابو داؤد

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز سے پہلے چند تر کھجوروں سے روزہ افطار فرماتے تھے۔ اگر تر کھجوریں بروقت موجود نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے افطار فرماتے تھے اور اگر خشک کھجوریں بھی نہ ہوتیں تو چند گھونٹ پانی پی لیتے تھے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

افطار کی دعا:۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ زُهْرَةَ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ اللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ ــــــ (رواہ ابوداؤد)

معاذ بن زہرہ تابعی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار فرماتے تھے تو کہتے تھے، اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ ــــــ
اے اللہ میں نے تیرے ہی واسطے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا ــــــ (سنن ابی داؤد)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْشَاءَ اللّٰهُ ــــــ (رواہ ابوداؤد)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار فرماتے تھے تو کہتے تھے ــــ "پیاس چلی گئی اور رگیں (جو سوکھ گئی تھیں وہ) تر ہو گئیں اور خدا نے چاہا تو اجر و ثواب قائم ہو گیا۔

(سنن ابی داؤد)

تشریح :ـ یعنی پیاس اور خشکی کی جو تکلیف ہم نے کچھ دیر اٹھائی وہ تو افطار کرتے ہی ختم ہو گئی ۔ اب نہ پیاس باقی ہے اور نہ رگوں میں خشکی اور انشاء اللہ آخرت کا نہ ختم ہونے والا ثواب ثابت و قائم ہو گیا ــــ یہ اللہ کے حضور میں آپ کا شکر بھی ہے اور دوسروں کو تعلیم و تلقین بھی کہ روزہ داروں کا احساس اور اذعان یہ ہونا چاہئے ــــ مندرجہ بالا دونوں دعاؤں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افطار کے بعد یہ کلمات کہتے تھے۔
بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم افطار کے وقت دعا کرتے تھے يَا وَاسِعَ الْفَضْلِ اِغْفِرْ لِيْ ــــ اے وسیع فضل و کرم والے مالک میری مغفرت فرما،

روزہ افطار کرانے کا ثواب :ـ

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا اَوْجَهَّزَ غَازِیًا فَلَہٗ
مِثْلُ اَجْرِہٖ۔۔۔۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان ورواہ محی السنۃ فی شرح السنۃ

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا یا کسی مجاہد کو جہاد کا سامان دیا (مثلاً اسلحہ وغیرہ) تو اس کو روزہ دار اور مجاہد کے مثل ہی ثواب ملے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی و شرح السنۃ للبغوی)

تشریح:۔ اللہ تعالیٰ کے کریمانہ قوانین میں سے یہ بھی ایک قانون ہے کہ کسی نیک عمل کی ترغیب دینے والے اور اس میں مدد دینے والے کو بھی اس عمل کے کرنے والے کا سا ثواب عطا فرماتے ہیں ۔۔۔ جو ناحقیقت شناس اللہ تعالیٰ کی شان کرم سے آشنا نہیں ہیں انہی کو اس طرح کی بشارتوں میں شکوک و شبہات ہوتے ہیں۔ اللّٰھم اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔

مسافت میں روزہ:۔

قرآن مجید سورۂ بقرہ میں جس جگہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان کیا گیا ہے وہیں مریضوں اور مسافروں کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ سفر اور بیماری کے بعد اپنے روزے پورے کریں اور وہیں بتا دیا گیا ہے کہ یہ اجازت اور رخصت بندوں کی سہولت اور آسانی کے لئے دی گئی ہے۔

ارشاد ہے۔۔۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	اور جو تم میں سے رمضان کا مہینہ پائے
فَلْيَصُمْهُ ط وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا	تو وہ اس پورے مہینے کے روزے
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ	رکھے، اور جو مریض ہو یا سفر میں ہو
اَيَّامٍ اُخَرَ ط يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ	تو اس کے ذمہ دوسرے دنوں میں

اَلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (البقرہ ع ۲۳)

رمضان کے دنوں کی گنتی پوا کرنا ہے اللہ کو تمہارے لئے سہولت اور آسانی منظور ہے وہ تمہارے واسطے دشواری نہیں چاہتا۔

اس آیت سے خود معلوم ہو گیا کہ یہ رخصت بندوں کی سہولت اور آسانی کے لئے اور تنگی اور دشواری سے ان کو بچانے کے لئے دی گئی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص سفر میں ہونے کے باوجود روزہ میں اپنے لئے کوئی خاص تکلیف اور دشواری محسوس نہ کرے تو وہ روزے رکھ سکتا ہے اور چاہے تو رخصت پر عمل کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل چونکہ امت کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے۔ اس لئے آپؐ نے کبھی سفر میں روزے رکھے اور کبھی قضا کئے تاکہ امتی اپنے حالات کے مطابق جس طریقہ پر چاہیں عمل کر سکیں ——— اس سلسلہ کے آپ کے ارشادات اور طرز عمل سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھنے سے اگر دوسرے ضروری کاموں کا حرج اور نقصان ہوتا ہو تو روزہ قضا کرنا بہتر ہے۔ اور اگر ایسی بات نہ ہو تو پھر روزہ رکھنا بہتر ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو الْاَسْلَمِيَّ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصُوْمُ فِي السَّفَرِ ——— وَكَانَ كَثِيْرَ الصِّيَامِ ——— فَقَالَ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمی نے ——— جو بہت روزے رکھا کرتے تھے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں سفر میں روزے رکھ لیا کروں ——؟ آپؐ نے فرمایا کہ چاہو تو رکھو اور چاہو نہ رکھو۔ (صحیح بخاری ومسلم)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ إِلَى مَكَّةَ فَصَامَ حَتَّى بَلَغَ عُسْفَانَ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَرَفَعَهُ إِلَى يَدِهِ لِيَرَاهُ النَّاسُ فَأَفْطَرَ حَتَّى قَدِمَ مَكَّةَ وَذَالِكَ فِي رَمَضَانَ ـــ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ قَدْ صَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَفْطَرَ فَمَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ أَفْطَرَ ـــــ

رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں آپ برابر روزے رکھتے رہے یہانتک کہ آپ مقام عسفان تک پہونچ گئے (وہاں سے آپ نے روزے رکھنے چھوڑ دئے۔ اور سب پر یہ بات واضح کر دینے کے لئے) آپ نے پانی منگوایا پھر آپ نے اس پانی کو ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا تاکہ سب لوگ دیکھ لیں (اس کے بعد آپ نے اس کو پیا) پھر مکہ پہنچنے تک آپ نے روزے نہیں رکھے اور یہ سب ماہ رمضان میں پیش آیا ـــــ تو ابن عباسؓ (اسی بنا پر) کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں روزے رکھے بھی ہیں اور قضا بھی کئے ہیں تو (گنجائش ہے) کہ جس کا جی چاہے (سفر میں روزے رکھے اور جس کا جی چاہے قضا کرے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں مکہ کے جس سفر کا ذکر ہے یہ فتح مکہ والا سفر تھا جو رمضان ۸ھ میں ہوا تھا۔ اس میں آپ شروع میں روزے رکھتے رہے جب مقام عسفان پہ پہنچے (جو مکہ معظمہ سے قریباً ۳۵-۳۶ میل پہلے ایک چشمہ پڑتا تھا) اور وہاں سے مکہ صرف دو منزل رہ گیا۔ اور اس کا امکان پیدا ہو گیا کہ قریبی وقت میں کوئی مزاحمت یا معرکہ پیش آجائے تو آپ نے مناسب سمجھا کہ روزے نہ رکھے جائیں اس لئے آپ نے روزہ قضا کر دیا۔ اور سب کو دکھا

کے پانی پیا تاکہ کسی کے لئے روزہ قضا کرنا گراں نہ ہو ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ جب تک روزہ قضا کرنے میں کوئی ایسی مصلحت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے، اسی لئے آپؐ نے عسفان تک برابر روزے رکھے، اگر بغیر کسی خاص مصلحت کے بھی سفر میں روزہ قضا کرنا ہی افضل ہوتا تو آپؐ شروع سفر ہی سے قضا کرتے۔

اسی واقعہ کے بارہ میں حضرت جابر کی بھی ایک روایت صحیح مسلم میں ہے، اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس طرح بالاعلان روزہ قضا کرنے اور سبکو دکھا کر پانی پینے کے بعد بھی روزے جاری رکھے، جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بات آئی تو آپؐ نے فرمایا کہ "یہ لوگ خطاکار اور گنہگار ہیں" (کیونکہ انھوں نے منشاء نبوی کے ظاہر ہونے کے بعد اس کی خلاف ورزی کی۔ اگرچہ نادانستہ اور غلط فہمی سے کی لیکن "حسنات الابرار سیأت المقربین۔"

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِسِتَّ عَشَرَ مَضَتْ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ فَمِنَّا مَنْ صَامَ وَمِنَّا مَنْ اَفْطَرَ فَلَمْ یَعِبِ الصَّائِمُ عَلَی الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَی الصَّائِمِ ـــــ رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جہاد کے لئے چلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سولھویں رمضان کو، تو ہم میں سے بعض نے روزے رکھے اور بعض نے رخصت سفر کی بنا پر قضا کئے تو نہ تو روزے رکھنے والوں نے قضا کرنے والوں پر اعتراض کیا اور نہ قضا کرنے والوں نے روزے رکھنے والوں پر اعتراض کیا۔ (یعنی ہر ایک نے دوسرے کے طرز عمل کو جائز اور شریعت کے مطابق سمجھا۔)

(صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی السَّفَرِ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا

فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ فَسَقَطَ الصُّوَّامُوْنَ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْأَبْنِيَةَ وَسَقَوُا الرِّكَابَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْأَجْرِ —— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو ہم میں سے بعضے روزے رکھتے تھے اور بعضے روزے قضا کرتے تھے تو ایک بہت سخت گرمی تھی ہم ایک منزل پر اترے تو روزے رکھنے والے تو گر گئے اور پڑ گئے اور جو روزے قضا کرنے والے تھے وہ اٹھے، انھوں نے سب کے لئے خیمے لگائے اور سب کی سواریوں کو یعنی سواری کے اونٹوں کو پانی پلایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج روزے قضا کرنے والے ثواب مارلے گئے۔ یعنی انھوں نے ثواب زیادہ کمالیا۔ ——

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَرَأٰى زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا؟ قَالُوْا صَائِمٌ فَقَالَ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ ——

—— رواہ البخاری ومسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے۔ آپؐ نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی اور ایک آدمی کو دیکھا جس پر سایہ کیا گیا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ صاحب روزہ دار ہیں (ان کی حالت غیر ہو رہی ہے اس لئے یہ سایہ کیا جا رہا ہے اور لوگ جمع ہو گئے ہیں) آپؐ نے فرمایا سفر کی حالت میں یہ روزہ تو کوئی نیکی کا

کام نہیں ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ جب سفر میں اللہ تعالیٰ نے روزہ قضا کرنے کی رخصت اور اجازت دی ہے اور میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں تو پھر مسلمانوں میں سے کسی کا ایسے حال میں روزہ رکھنا کہ خود بھی گر جائیں اور دوسرے لوگ بھی ان کی دیکھ بھال میں لگ جائیں کوئی نیکی کی بات نہیں ہے، ایسی حالت میں تو رخصت پر عمل کر کے روزہ قضا کرنا ضروری ہے اور اسی میں اللہ کی رضا ہے۔

گر طمع خواہد ز من سلطان دین
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

فرض روزوں کی قضا۔

عَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا قَالَتْ لِعَائِشَةَ مَا بَالُ الْحَائِضِ تَقْضِي الصَّوْمَ وَلَا تَقْضِي الصَّلٰوةَ قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ يُصِيْبُنَا ذٰلِكَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلٰوةِ ——— رواہ مسلم

معاذہ عدویہ (جو ایک تابعی خاتون ہیں) وہ بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ ایام حیض میں جو روزے قضا ہوتے ہیں اُن کی تو قضا کی جاتی ہے اور جو نمازیں قضا ہوتی ہیں ان کی قضا نہیں پڑھی جاتی؟ اُم المومنین رضؓ نے فرمایا کہ (بس اللہ و رسول کا حکم ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب ہم اس میں مبتلا ہوتے تھے (اور اس کی وجہ سے ان دنوں میں روزہ نماز کچھ نہیں کر سکتے تھے) تو ہم کو اُن دنوں کے قضا شدہ روزے رکھنے کا تو حکم دیا جاتا تھا اور قضا نمازیں پڑھنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ (صحیح مسلم)

نفس کی خواہش سے بلا عذر شرعی فرض روزہ توڑنے کا کفارہ:۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ

اللهِ هَلَكْتُ قَالَ وَمَا لَكَ قَالَ وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي وَ
أَنَا صَائِمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً تُعْتِقُهَا قَالَ لَا قَالَ فَهَلْ تَسْتَطِيعُ
أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ قَالَ لَا قَالَ هَلْ تَجِدُ
إِطْعَامَ سِتِّينَ مِسْكِينًا قَالَ لَا قَالَ اجْلِسْ وَمَكَثَ
النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَيْنَا نَحْنُ عَلَى ذٰلِكَ أُتِيَ
النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَقٍ فِيهِ تَمْرٌ وَالْعَرَقُ
الْمِكْتَلُ الضَّخْمُ) قَالَ أَيْنَ السَّائِلُ قَالَ أَنَا قَالَ خُذْ
هٰذَا فَتَصَدَّقْ بِهِ فَقَالَ الرَّجُلُ أَعَلَى أَفْقَرَ مِنِّي يَا
رَسُولَ اللهِ فَوَاللهِ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا (يُرِيدُ الْحَرَّتَيْنِ)
أَهْلُ بَيْتٍ أَفْقَرُ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى
اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى بَدَتْ أَنْيَابُهُ ثُمَّ قَالَ أَطْعِمْهُ
أَهْلَكَ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن جبکہ ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہلاک ہو گیا (یعنی میں ایک ایسا کام کر بیٹھا ہوں جس نے مجھے ہلاک و برباد کر دیا ہے) آپ نے فرمایا کیا ہو گیا ہے؟ اس آدمی نے کہا میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے صحبت کر لی (دوسری روایت میں ہے کہ یہ رمضان کا واقعہ ہے)۔ آپ نے فرمایا تو کیا تمہارے پاس اور تمہاری ملکیت میں کوئی غلام ہے جس کو تم اس غلطی کے کفارہ میں آزاد کر سکو؟ اس آدمی نے کہا کہ نہیں! آپ نے فرمایا تو پھر کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھو؟ اس نے عرض کیا کہ یہ بھی میرے بس کی بات نہیں! آپ نے فرمایا تو کیا تمہارے پاس اتنا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکو؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے اس کی بھی

مقدرت نہیں ـــــــ آپؐ نے فرمایا تو بیٹھے رہو (شاید اللہ تعالیٰ کوئی سبیل تمہارے لئے پیدا کرے۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی وہیں تشریف فرما تھے اور ہم لوگ بھی ابھی وہیں حاضر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھجوروں کا ایک بہت بڑا بورا آیا، آپؐ نے پوچھا کہ مسئلہ پوچھنے والا وہ آدمی کدھر ہے؟ اس آدمی نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں! آپؐ نے فرمایا اس بورے کو لے لو اور (اپنی طرف سے) صدقہ کردو، اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ایسے محتاجوں پر صدقہ کروں جو مجھ سے زیادہ حاجتمند ہوں؟ خدا کی قسم مدینہ کی دونوں طرف کی پتھریلی زمین کے درمیان (یعنی مدینہ کی پوری بستی میں) کسی گھر کے لوگ بھی میرے گھر والوں سے زیادہ حاجتمند نہیں ہیں، (اس کی اس بات پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (خلاف عادت) ایسی ہنسی آئی کہ آپؐ کے دائیں بائیں کنارے والے دانت (کچلیاں) بھی ظاہر ہو گئیں (حالانکہ عادت مبارکہ صرف تبسم کی تھی) پھر آپؐ نے اس آدمی سے فرمایا اچھا یہ کھجوریں اپنے اہل وعیال ہی کو کھلا دو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی رمضانؐ کے روزہ میں نفس کی خواہش سے ایسی غلطی کر بیٹھے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے کی مقدرت ہو تو غلام آزاد کرے اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو متواتر دو مہینے کے روزے رکھے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ـــ جمہور ائمہ و فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے، البتہ اس میں ائمہ کی رائے میں اختلاف ہو گیا ہے کہ یہ کفارہ کیا صرف اسی صورت میں واجب ہوگا جبکہ کسی نے رمضان کے روزہ میں جماع کیا ہو یا اس صورت میں بھی واجب ہوگا جب کسی نے دانستہ کچھ کھا پی کے روزہ توڑ ڈالا ہو، حضرت امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ کفارہ صرف جماع والی صورت کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے وہ جماع ہی کا ہے ـــــ لیکن امام ابو حنیفہ اور امام مالک اور سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک وغیرہ ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ کفارہ دراصل رمضان کے روزہ کی بے حرمتی کا ہے اور اس جرم کی سزا ہے کہ اس نے اپنے نفس کی خواہش کے مقابلہ میں رمضان کے روزہ کا احترام نہیں کیا اور اس کو توڑ ڈالا۔ اور یہ جرم دونوں صورتوں میں یکساں ہے اس لئے اگر کسی نے

دانستہ کھا پی کے روزہ توڑا تو اس پر بھی یہ کفارہ واجب ہوگا۔

اس واقعہ میں ایک عجیب و غریب بات یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن صاحب واقعہ صحابی کو کھجوروں کا جو پورا اس لئے عنایت فرمایا تھا کہ مساکین پر صدقہ کر کے وہ اپنا کفارہ ادا کریں، اُن کے اس کہنے پر کہ مدینہ بھر میں مجھ سے اور میرے اہل و عیال سے زیادہ حاجتمند کوئی بھی نہیں ہے۔ آپؐ نے اس کے بارے میں ان کو اجازت دیدی کہ اس کو اپنے ہی کام میں لے آئیں ——— اس کے بارہ میں جمہور ائمہ کی رائے یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح اُن کا کفارہ ادا ہو گیا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وقتی ضرورت اور حاجتمندی کا لحاظ کر کے اُن کھجوروں کو اپنے خرچ میں لے آنے کی ان کو اُس وقت اجازت دیدی اور کفارہ ان کے ذمہ واجب رہا ——— اور مسئلہ یہی ہے کہ اگر رمضان کا روزہ کوئی ایسا آدمی اس طرح توڑ ڈالے جو نہ تو فی الوقت غلام آزاد کر سکتا ہو، نہ دو مہینے متواتر روزے رکھ سکتا ہو اور نہ افلاس و غربت کی وجہ سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہو تو کفارہ اس کے ذمہ واجب رہے گا، وہ اس کی ادائیگی کی نیت رکھے اور جب کبھی اس کو استطاعت ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ——— اور امام زُہری وغیرہ بعض ائمہ کی رائے یہ ہے کہ عام شرعی قانون اور مسئلہ تو یہی ہے لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کے ساتھ ایک طرح کا استثنائی معاملہ کیا اور ان کا کفارہ اسی طرح ادا ہو گیا۔ یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی میں کسی قدر اختصار کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ بعض علمائے کبار نے (جن کو ہمارے اساتذہ اور شیوخ نے دیکھا ہے) ابو ہریرہ والی اس حدیث کی شرح دو جلدوں میں لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ اس حدیث سے ایک ہزار علمی فائدے اور نکتے پیدا ہوتے ہیں۔

کن چیزوں سے روزہ خراب نہیں ہوتا۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں شبہ ہو سکتا ہے کہ ان سے روزہ ٹوٹ

جاتا ہوگا یا اس میں کچھ خرابی آجاتی ہوگی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات یا عمل سے واضح فرما دیا ہے کہ ان چیزوں سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آتی اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَسِیَ وَهُوَ صَائِمٌ فَاَكَلَ اَوْشَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَهٗ فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ ـــــ

ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا لیا یا پی لیا تو (اس سے اس کا روزہ نہیں ٹوٹا اس لئے) وہ قاعدہ کے مطابق اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اس کو اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے (اس نے خود ارادہ کر کے) روزہ نہیں توڑا ہے اس لئے اس کا روزہ علیٰ حالہٖ ہے)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ لَا یُفَطِّرْنَ الصَّائِمَ الْحِجَامَةُ وَالْقَیْئُ وَالْاِحْتِلَامُ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا ـــ پچھنے لگوانا، اور قے ہو جانا اور احتلام ـــــ (جامع ترمذی)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُبَاشَرَةِ لِلصَّائِمِ فَرَخَّصَ لَهٗ وَاَتَاهُ اٰخَرُ فَسَاَلَهٗ فَنَهَاهُ فَاِذَا الَّذِیْ رَخَّصَ لَهٗ شَیْخٌ وَاِذَا الَّذِیْ نَهَاهُ شَابٌّ ـــــ

رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے روزہ کی حالت میں بیوی کیساتھ لیٹنے چپٹنے کے بارہ میں سوال کیا (کہ اس کی گنجائش ہے یا نہیں) آپؐ نے اُن کو بتایا کہ گنجائش ہے اور دوسرے ایک صاحب نے آکر آپؐ سے یہی سوال کیا، تو آپؐ نے ان کو ممانعت فرمادی (اور اجازت نہیں دی) تو جن کو آپؐ نے گنجائش بتلائی تھی، وہ بوڑھی عمر کے آدمی تھے اور جن کو ممانعت فرمائی وہ جوان تھے۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) فرق کی وجہ ظاہر ہے، جوان آدمی کے لئے چونکہ اس کا قوی خطرہ ہوتا ہے کہ نفس کی خواہش اس پر غالب آجائے اور وہ روزہ خراب کر بیٹھے اسلئے آپؐ نے جوان سائل کو اجازت نہیں دی اور بوڑھا آدمی چونکہ اس خطرہ سے نسبتاً مامون ہوتا ہے اس لئے بوڑھے سائل کو آپؐ نے رخصت اور گنجائش بتلادی۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِشْتَكَيْتُ عَيْنَيَّ اَفَاَكْتَحِلُ وَاَنَا صَائِمٌ قَالَ نَعَمْ ——— رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوے اور دریافت کیا کہ میری آنکھ میں تکلیف ہے تو کیا میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگا سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں لگا سکتے ہو۔———

(جامع ترمذی)

(تشریح) معلوم ہوا کہ آنکھ میں سرمہ یا کسی دوا کے لگانے سے روزہ پر اثر نہیں پڑتا۔

عَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَا اُحْصِيْ يَتَسَوَّكُ وَهُوَ صَائِمٌ ———

——— رواہ الترمذی و ابو داؤد

حضرت عامر بن ربیعہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی دفعہ کہ

میں شمار بھی نہیں کر سکتا، روزہ کی حالت میں مسواک کرتے ہوئے دیکھا ہے ــــ

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ يُصُبُّ عَلٰى رَأْسِهِ الْمَاءَ وَهُوَ صَائِمٌ مِنَ الْعَطَشِ اَوْ مِنَ الْحَرِّ ــــــــ رواہ مالک وابوداؤد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام عرج میں دیکھا آپ روزہ سے تھے اور پیاس یا گرمی کی (شدت) کی وجہ سے سر مبارک پر پانی بہا رہے تھے ــــــــ

(مؤطا امام مالک، سنن ابی داؤد)

(تشریح) معلوم ہوا کہ روزہ کی حالت میں پیاس یا گرمی کی شدت کم کرنے کے لئے سر پر پانی ڈالنا اور اس قسم کی دوسری تدابیر کرنا جائز ہے اور یہ روزہ کی روح کے بھی خلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس طرح کے بعض اعمال اس لئے بھی کرتے تھے کہ اس طرز عمل سے اپنی عاجزی ظاہر ہوتی ہے جو بندگی کی روح ہے ــــــ نیز امت کے لئے آپ سہولت کا نمونہ قائم کرنا چاہتے تھے، ــــــ اللہ کی رحمتیں ہوں آپ پر اور اُس کا سلام۔

عرج، مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے تین منزل پر ایک آباد موضع تھا اس لئے یہ واقعہ کسی سفر کا ہے، ہو سکتا ہے کہ فتح مکہ والے سفر ہی کا ہو جو رمضان مبارک میں ہوا تھا اور آپ نے مقام عُسفان پہنچنے تک برابر روزے رکھے تھے ــــــ

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ هَشَشْتُ فَقَبَّلْتُ وَاَنَا صَائِمٌ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَنَعْتُ الْيَوْمَ اَمْرًا عَظِيْمًا قَبَّلْتُ وَاَنَا صَائِمٌ قَالَ اَرَاَيْتَ لَوْ مَضْمَضْتَ مِنَ الْمَاءِ وَاَنْتَ صَائِمٌ قُلْتُ لَا بَاْسَ قَالَ فَمَهْ! ــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب

رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ (روزہ کی حالت میں) میرے اندر سخت تقاضا اور جذبہ پیدا ہوا، اور میں نے (اپنی بیوی کا) بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آج مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا، میں نے روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیا، آپؐ نے فرمایا بتاؤ اگر تم پانی منہ میں لے کر کلی کرو۔ (تو کیا اس سے تمہارے روزہ میں خرابی آئے گی؟) میں نے عرض کیا اس سے تو کوئی خرابی نہ آئے گی، آپؐ نے فرمایا تو پھر (خالی بوسہ لینے سے) کیا ہوا ——— (سنن ابی داؤد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب سے صرف یہ جزئی مسئلہ ہی نہیں معلوم ہوا کہ خالی بوسہ لینے سے روزہ میں خرابی نہیں آتی بلکہ ایک اصول اور قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا اور وہ یہ کہ در اصل روزہ کو توڑنے والی چیز کھانا پینا اور جماع ہے اور جس طرح کھانے پینے کی کسی چیز کا صرف منہ میں رکھنا (جو کھانے پینے کا گویا مقدمہ اور دیباچہ ہوتا ہے) روزہ کو نہیں توڑتا۔ اسی طرح بوس و کنار وغیرہ (جو جماع کے صرف مقدمات ہوتے ہیں) روزہ کو خراب نہیں کرتے ——— ہاں جس آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ خواہش اور تقاضے سے مغلوب ہو کر کہیں جماع میں مبتلا نہ ہو جائے اس کو اس قسم کی باتوں سے روزہ میں پورا پرہیز کرنا چاہئے ——— جیسا کہ اوپر کی بعض حدیثوں سے معلوم ہو چکا۔

(بقیہ صفحہ ۱۷ کا)

اپنی تقصیرات پر نظر کرنا چاہئے کہ جناب قدس خداوندی میں ہر ساعت واقع ہوتی رہتی ہیں (پھر بھی) اللہ تعالے ان تقصیرات کے مواخذے میں تعجیل نہیں فرماتا اور رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا ہے ——— تصحیح عقائد اور احکام فقہیہ کی ادائیگی کے بعد اپنے اوقات کو ذکر الٰہی میں مستغرق رکھنا چاہئے اور جس طریقے پر ذکر کو اخذ کیا ہے اسی طرح ذکر کرنا چاہئے، ذکر کے منافی جو چیز بھی ہو اس کو اپنا دشمن سمجھ کر اس سے اجتناب لازم ہے۔

ہر چہ جز ذکرِ خدائے احسن است [1] گر شکر خوردن بود جاں کندن است

تم سے تمہاری حاضری کے موقع پر کہدیا گیا ہے کہ امور شرعیہ میں جتنی احتیاط مدنظر رکھی جائے گی مشغولیٔ ذکر میں افزائش ہو گی اور اگر احکام شرعیہ میں کوتاہی کرو گی تو ذکر کی حلاوت برباد کرو گی ——— وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ

---

[1] خداوند قدوس کی یاد کے سوا جو کچھ ہے اگر مٹھائی کھانا بھی ہے تو بس جان برباد کرنا ہے۔ ۱۲

تجلیات مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۲۴) ملا مراد کشمیؒ کے نام [آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام کی دینی عظمت اور ان کی باہمی محبت مودت کے بیان میں]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ——— مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الیٰ قولہ تعالیٰ) لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ———
(سورۃ الفتح)

عہ آپ میر محمد نعمان اکبرآبادیؒ کے مریدین میں سے تھے۔

عہ ترجمہ ——— محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پیغمبر ہیں اور ان کے جو ساتھی ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ اے مخاطب تو ان کو دیکھتا ہے (بقیہ صفحہ آئندہ)

حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے ان آیتوں میں تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اُن کی باہمی کمالِ مہربانی و محبت پر فرمائی ہے اس لئے کہ رَحِیْم جو کہ رُحَمَاءُ کا واحد ہے اپنے اندر انتہائی مہربانی کے معنیٰ رکھتا ہے ——— پھر چونکہ رَحِیْم صفت مشبہ ہے اس لئے استمرار و دوام پر بھی اس کی دلالت ہے (اس بناء پر) ضروری ہے کہ ان کی باہمی مہربانی ہر زمانہ میں صفت استمرار و دوام پر ہو، خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا زمانہ ہو۔ خواہ آپؐ کی وفات کے بعد کا زمانہ ——— نیز ضروری ہے کہ جو باتیں تحکم یک دیگر منافیٔ مہربانی ہیں وہ بھی ان بزرگوں سے دائمی طور پر منفی ہوں اور باہمی بغض، کینہ، حسد اور عداوت بھی ان اکابرین سے استمرار و دوام کے طور پر منتفی ہونے چاہئیں ——— جب تمام صحابہؓ (عمومی طور پر) اس پسندیدہ صفت (مہربانی و محبت) کے ساتھ موصوف ہوئے جیسا کہ کلمۂ وَالَّذِیْنَ کا یہی تقاضا ہے ——— کیونکہ الّذین عموم و استغراق کے صیغوں میں سے ہے ——— تو پھر کیا کہنا ہے اکابر صحابہؓ کا وہ تو اس صفت میں (اور بھی)

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رکوع کرنیوالا اور سجدہ کرنے والا (یعنی اکثر اوقات نماز میں مشغول رہنے والا) وہ طلب کرتے ہیں خداوند تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی اللہ کے ساتھ ان کے سچے تعلق اور بندگی کا نشان ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے اثر سے۔ یہ جو مذکور ہوا ہے ان کی صفت [illegible] ت میں۔ اور ان کی صفت انجیل میں یہ ہے کہ وہ مانند ایک کھیتی کے ہیں کہ اس نے اپنا نرم و نازک اکھوا نکالا پھر اس [illegible] توانائی اور سختی آئی پھر وہ موٹی اور مضبوط ہوگئی پھر وہ اپنے تنوں پر قائم ہوگئی۔ خوشی ہوتی ہے اس سے کسانوں کو ——— اصحاب محمدؐ کی اس ترقی اور فروغ کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ کفار کے دل ان کی وجہ سے جلتے ہیں ——— اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان کے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اچھے اعمال کئے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا ———

اتم و اکمل ہوں گے ــــــــ

اسی بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں) فرمایا ہے ــــــــ اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْ بَکْرٍ (میری امت میں ابو بکر سب سے زیادہ مہربان اور درد مند ہیں میری امت کے) ــــــــ اور حضرت فاروق اعظمؓ کی شان میں آپؐ نے فرمایا ہے ــــــــ لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ ــــــــ (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے) یعنی وہ لوازم و کمالات جو نبوت میں درکار ہیں وہ سب حضرت عمرؓ اپنے اندر رکھتے ہیں لیکن چونکہ منصب نبوت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ اس لئے حضرت عمرؓ منصب نبوت کی دولت سے مشرف نہ ہوئے ــــــــ لوازم نبوت میں سے ایک لازمہ خلق خدا پر کمال شفقت و مہربانی بھی ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اور وہ رذائل جو کہ منافیٔ شفقت و مہربانی ہیں۔ اور ذمائم اخلاق میں سے ہیں مثلاً حسد، اور بغض و عداوت۔ (یہ اخلاق بد) اس جماعت صحابہؓ کے حق میں کیسے متصور ہو سکتے ہیں جس کو (براہ راست) صحبت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہے ــــــــ یہ صحابہؓ تو تمام امت محمدیہ ہیں ــــــــ جو کہ خیر الامم ہے ــــــــ بہترین امت ہیں اور اس ملت بیضا کے ــــــــ جو کہ تمام ادیان کی ناسخ ہے ــــــــ سابق ترین یہی صحابہ ہیں۔ ان کا زمانہ (بارشاد آنحضرتؐ) بہترین زمانہ ہے ــــــــ ان کے پیغمبر (جن کو انھوں نے براہ راست حالت ایمان میں دیکھا اور جن کی صحبت اٹھائی) ــــــــ تمام انبیاء و مرسلین میں افضل ہیں ــــــــ اگر (خدانخواستہ) صحابہ کرامؓ اُن مکروہ صفات کے ساتھ موصوف ہوں جن کے اتصاف سے اس اُمت کا ادنیٰ فرد بھی عار و شرم رکھتا ہے ــــــــ تو پھر یہ اس اُمت کے بہترین کیسے قرار پائیں گے؟ اور یہ امت کس طریقے سے خیر الامم ہوگی؟ نیز ایمان لانے میں سبقت اور مال و جان کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی اولیت سے ان صحابہؓ کو کیا فضیلت حاصل ہو سکے گی؟ خیریتِ قرن (زمانہ) کی کیا تاثیر مانی جائے گی اور فضیلتِ صحبت خیر البشر صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا اثر ثابت ہوگا؟ ــــــــ جو جماعت

اس امت کے اولیاء کی صحبت میں زندگی گزارتی ہے وہ بھی ان خراب عادات سے نجات پالیتی ہے ـــــ پھر جس جماعت نے افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اقدس میں اپنی عمر گزاری ہو اور تائید و نصرت دین محمدی کی خاطر اپنے مالوں اور جانوں کی قربانی کی ہو ان حضرات کے حق میں ان ذمائم (حسد و بغض وغیرہ) کا کیا توہم ہو سکتا ہے؟

ہاں اگر عیاذاً باللہ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور تاثیر صحبت کا کوئی منکر ہو اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو ایک ولی امت کی صحبت سے بھی ناقص تو سمجھے (تو وہ صحابہؓ کے اندر ذمائم کا توہم کر سکتا ہے) ـــــ یہ بات مُسَلَّم ہے کہ کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہونچ سکتا۔ پھر نبی کے مرتبے کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ ـــــ شیخ شبلی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے ـــــ "جس نے اصحاب رسول اللہؐ کی تعظیم نہ کی وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم پہ ایمان نہیں لایا۔" ....

مکتوب (۲۵) ملّا طاہر کے نام

[ذکر اور ملازمت کے آثار اور ان کی وجہ سے ترقی درجات کا بیان]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اس راہ کے مبتدی طالب کے لئے بغیر ذکر کے چارہ نہیں، اس لئے کہ اس کی ترقی ذکر ہی سے متعلق ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ذکر کو کسی شیخ کامل و مکمّل سے حاصل کیا ہو، اگر یہ شرط ملحوظ نہ رہی تو بسا اوقات وہ ذکر "ادرادِ ابرار" کے قبیل سے ہوگا، جس کا ثواب تو ملے گا مگر وہ ذریعہ قرب نہ بن سکے گا۔ اور اس مقام تک نہ پہنچا سکے گا جہاں اس کے ذریعہ مقربین پہنچ جاتے ہیں۔

ـــــ ویسے (شاذ و نادر طور پر) یہ ہو سکتا ہے کہ فضل خداوندی کسی شیخ کے توسط کے بغیر بھی کسی طالب کی ترتیب فرمادے اور تکرار ذکر اس کو مُقرّب بنادے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر تکرار ذکر کے اس کو مراتب قرب سے مشرف فرمادے اور اپنے اولیاء میں شامل کرلے ـــــ لیکن یہ شرط (شیخ کامل) اکثر کے لحاظ سے ہے اور حکمت و عادت خداوندی کے موافق ہے ـــــ جب فضلِ خداوندی سے وہ معاملہ جو ذکر سے وابستہ ہے

مکمل ہو جاتا ہے اور ہوائے نفسانی کے جھوٹے معبودوں سے رہائی میسر آجاتی ہے نیز نفس امارہ، نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اُس وقت ذکر سے ترقی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ذکر "اوراد ابرار" کا حکم رکھتا ہے ــــــ اُس وقت تو مراتبِ قرب تلاوتِ قرآن اور ادائے نماز بطول قرأت سے حاصل ہوتے ہیں، پہلے جو ذکر کرنے سے حاصل ہوتا تھا، اب وہ تلاوت قرآن سے حاصل ہوتا ہے خصوصًا جبکہ تلاوتِ قرآن، نماز کے اندر ہو ــــــ حاصل کلام یہ ہے کہ انتہا میں ذکر اُس تلاوتِ قرآن کا حکم پیدا کر لیتا ہے جو ابتدا میں کی جاتی تھی اور جو (زیادہ سے زیادہ) از قبیل "اورادِ ابرار" تھی۔ اور تلاوت اس ذکر کا حکم پیدا کر لیتی ہے جو کہ ابتدا و توسط میں مقربات میں سے تھا ــــــ عجیب معاملہ ہے کہ اس وقت (انتہا میں) اگر ذکر کی تکرار بعنوان قراءتِ قرآن ہو یعنی "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" سے ذکر شروع ہو تو اس سے وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے جو تلاوت قرآن سے میسر ہوتا ہے .... ہر عمل کا ایک موقع اور ایک موسم ہے اگر اس موقع و موسم میں اس کو کیا جائے تو حسن و ملاحت پیدا کرتا ہے اور اس موقع و موسم میں ادا نہ کیا جائے تو بسا اوقات وہ خطا بن جاتا ہے اگرچہ نیک عمل ہو قرأت فاتحہ کو دیکھو۔ تشہد کے موقع پر سورہ فاتحہ پڑھنی خطا ہے، اگرچہ سورۂ فاتحہ امّ الکتاب ہے ــــــ بس راہنما مرشد اس راہ میں ضروریات سے ہوا اور اس کی تعلیم و ہدایت بھی اہم مہمات سے ہوئی .... وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

مکتوب (۲۷) ملا علی کشمی کے نام

بندے کو چاہیے کہ اپنی مراد سے بالکلیہ دست بردار ہو کر اپنے مولائے حقیقی کی مراد پر راضی رہے نیز مرض ذاتی و مرض عرضی کا بیان

بندے کو چاہیے کہ اس کی مراد سوائے مولائے حقیقی جل سلطانہٗ کے اور کوئی نہ ہو اور سوائے مراد مولا کے مراد بندہ کچھ نہ ہو، اگر ایسا نہیں تو وہ بندگی سے اپنے کو باہر نکال لے گا۔ اور (مولائے حقیقی کی) قید غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کر لے گا ــــــ جو بندہ اپنی مرادات میں گرفتار ہے اور اپنے ہوا و ہوس پر فریفتہ ہے وہ اپنے نفس کا بندہ ہے اور اطاعت شیطان لعین میں لگا ہوا ہے۔ یہ دولت (کہ کوئی مراد بجز مولائے حقیقی کے باقی نہ رہے)

حصولِ ولایتِ خاصہ سے متعلق ہے۔ اور ولایتِ خاصہ، فنائے اتم اور بقائے اکمل سے وابستہ ہے ——

اگر سوال کیا جائے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آرزوئیں اور خواہشیں کاملین سے بھی ظہور میں آتی ہیں اور مطالب متعددہ کے حصول کی آرزوئیں ان بزرگوں سے بھی محسوس ہوتی ہیں —— (چنانچہ) امام انبیاء و سلطان اولیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام (کھانے پینے میں) سرد و شیریں کو پسند فرماتے تھے اور ہدایتِ اُمت کی جو حرص آپؐ کو تھی وہ قرآن مجید سے ظاہر ہے، اس طرح کی آرزوؤں کی بقا ان بزرگوں میں کیوں تھی؟ —— جواب یہ ہے کہ بعض خواہشات کا صدور طبیعت سے ہوتا ہے —— جب تک طبیعت باقی ہے خواہشیں قائم ہیں —— گرمی کے وقت طبیعت بے اختیار سردی کی طرف مائل ہوتی ہے اور سردی کے وقت گرمی کی رغبت ہوتی ہے —— اس قسم کی خواہشیں منافی عبودیت اور ہوائے نفس کی گرفتاری کا سبب نہیں ہیں اس لئے کہ ضروریاتِ طبیعت دائرہ تکلیف سے خارج اور ہوائے نفس امارہ سے باہر ہیں —— خواہشات نفس کا تعلق (یا فضولِ مباح (زائد از ضرورت) سے ہے یا مشتبہ سے یا حرام سے، اور جو ضروری ہے اس سے نفس کا کوئی تعلق نہیں ہے —— پس گرفتاری و بدکرداری پیدا ہوتی ہے (فضولیاتِ افعال سے اگرچہ از قسم مباح ہو اس لئے کہ فضولِ مباح (زائد از ضرورت) کا حرام سے پڑوس کا تعلق ہے۔ اگر بندہ اپنے لعین دشمن شیطان کے بہکانے سے فضولِ مباح سے آگے قدم رکھے گا تو ایک دن محرمات میں گرے گا —— پس مباح ضروری پر انحصار ضروری ہوا کہ اگر اس مقام سے لغزش ہوئی تو (زیادہ سے زیادہ) فضولِ مباح میں آکر گرے گا اور اگر فضولِ مباحات میں مقام ممکن ہے تو لغزشِ قدم واقع ہونے پر ناچار محرمات میں گر پڑے گا —— بعض خواہشات ایسی ہیں کہ اُن کا حصول خارج سے ہوتا ہے ...... اور خارج یا واعظ حضرت رحمٰن ہے جو کہ القائے خیرات کرتا ہے اس لئے کہ (حدیث کی رو سے) ہر مومن کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک واعظ موجود ہے۔ —— یا وہ خارج شیطان ہے کہ اس کا القاء، شر اور عداوت ہے —— (فراق مجید)

میں ارشاد فرمایا گیا ہے) شیطان وعدہ کرتا ہے ان سے (اپنے متبعین سے) اور ان کو آرزوؤں میں مبتلا کرتا ہے اور شیطان ان سے نہیں وعدہ کرتا ہے مگر دھوکے کا ——

سکونتِ قلعہ گوالیار کے زمانے میں ایک دن فقیر فجر کی نماز کے بعد بطریق سکوت —— کہ اس طریقۂ علیہ کا قاعدہ ہے —— بیٹھا تھا، یکایک آرزوہائے بے فائدہ کے ہجوم نے بے حلاوت کر دیا اور جمعیت خاطر سے باز رکھا، ایک لمحہ کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے جمعیت خاطر حاصل ہوئی تو دیکھا کہ وہ آرزوئیں بادل کے ٹکڑوں کی طرح باہر آگئیں اور القا کرنے والے کے ساتھ ساتھ چلی گئیں نیز خانۂ قلب کو خالی کر گئیں اس وقت معلوم ہوا کہ یہ خواہشات، باہر سے آئی تھیں اندر سے نہیں ابھری تھیں (اندر سے اُبھرتیں تو) اس صورت میں وہ منافیٔ بندگی تھیں —— بالجملہ ہر وہ فساد جس کا منشا اور مولد نفس امارہ ہے —— مرض ذاتی، سمّ قاتل اور منافیٔ مقام بندگی ہے اور ہر وہ فساد جو باہر سے آئے اگرچہ القائے شیطانی ہو عارضی امراض سے ہے جو معمولی علاج سے زائل ہو سکتا ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (بیشک شیطان کا مکر کمزور ہے) ہمارا نفس ہمارے لئے بڑی بلا ہے اور ہمارا دشمن جانی ہمارا ہی برا ساتھی ہے —— باہر کا دشمن اسی کی مدد سے ہم پر غلبہ پاتا ہے۔ وہ اسی نفس کی اعانت سے ہم کو ہمارے مقام سے ہٹاتا ہے۔ جاہل ترین شے نفس امارہ ہے جو اپنا ہی بدخواہ ہے، اس کا نصب العین خود کو ہلاک کرنا ہے اور اس کی بڑی تمنا حضرت رحمٰن کی معصیت کرنا ہے جو کہ اس کا اور اس کی نعمتوں کا مالک ہے —— نیز اطاعت شیطان، نفس امارہ کو مطلوب ہے۔ وہ شیطان جو کہ اس کا دشمن جانی ہے —— جاننا چاہئے کہ مرض ذاتی اور مرضِ عارضی نیز فساد داخلی اور فساد خارجی کے درمیان تمیز کرنا بہت دشوار ہے —— اس خوف سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناقص اپنے زعم باطل کی بنا پر خود کو کامل سمجھ کر اپنے مرضِ ذاتی کو مرض عارضی سمجھ بیٹھے۔ میں اس راز کے لکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا اور اس حقیقت کا اظہار مناسب نہیں سمجھتا تھا —— سترہ سال کے قریب ہو گئے ہیں خود اشتباہ میں تھا اور فساد ذاتی کو فساد عارضی سے مخلوط کئے ہوئے تھا —— اب حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے حق کو

باطل سے جدا کر کے دکھا دیا اور مرضِ ذاتی کو مرض عارضی سے متمیز کرا دیا ــــ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اِس نعمت پر اور اس کی تمام نعمتوں پر ــــ

اس قسم کے اسرار کے اظہار کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ کوئی کوتاہ نظر کسی کامل کو آرزوہائے بیرونی کے وجود کی بنا پر ناقص نہ سمجھ لے اور اس کی برکات سے محروم نہ رہے ــــ دولتِ تصدیقِ انبیاءؑ سے کفار کی محرومی کا سبب ــــ انبیاء کے اندر اس قسم کی صفات کا موجود ہونا ہی تھا ــــ (قرآن مجید میں ہے) فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا ــــ (کافروں نے تعجب سے کہا کہ کیا ایک بشر ہم کو ہدایت کرتا ہے پس انھوں نے انکار کیا) ــــ اور یہ جو بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ عارف کو اس کی مرادات و خواہشات کے زائل ہونے کے بعد صاحب ارادہ کر دیتا ہے اور اختیار اس کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ اس بات کی تفصیل پھر کبھی بعنایتِ خداوندی کی جائے گی۔ یہ وقت اس تفصیل کی مساعدت نہیں کرتا ــــ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالْتَزَمَ مُتَابَعَةَ الْمُصْطَفٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ مِنَ الصَّلٰوتِ وَالتَّسْلِيْمَاتِ اَتَمُّهَا وَاَكْمَلُهَا۔

مکتوب (۴۹) سیادت پناہ میر محب اللہ مانک پوری کے نام ــــ

[فہم بعضِ کلماتِ قرآنی کے بیان میں]

سابق میں جبکہ قصور فہم کے باعث بعض کلمات قرآنی میں مجھے شبہ و تردد پیدا ہوتا تھا اور میں تطبیق میں عاجز رہتا تھا۔ اُس وقت وسوسوں کے رفع کرنے کے لئے بعنایت خداوندی اس سے بہتر علاج نہیں پاتا تھا کہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا تھا کہ ان کلمات قرآنی کو تو کلام خداوندی تسلیم کرتا اور ان پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ایمان نہیں رکھتا تو تو کافر ہے اور بحث سے خارج ہے اور اگر ایمان رکھتا ہے تو پھر یہ شک تیری سمجھ کا قصور ہے۔ نظم قرآنی میں کوئی نقص نہیں وہ اس خالق ارض و سمٰوٰت کا کلام ہے جو عقول و ادراکات

کا موجب ہے ۔ چونکہ بفضلِ خداوندی کلامِ ربانی کی حقانیت پر ایمان حاصل تھا۔ اس لئے وہ وسوسہ اس تدبیر سے مضمحل اور ناپید ہو جاتا تھا اور شک و شبہ سے نجات مل جاتی تھی

——— اِس زمانے میں اللہ کے فضل سے کامیابی یہاں تک حاصل ہوئی ہے کہ نظم قرآنی میں جو مقام، قصور ادراک کی بنا پر گنجائش تردد و شبہ رکھتا ہے وہی مقام قرآن پر زیادتِ ایمان کا باعث اور وہ شبہ ظہور اعجاز فرقان کا ذریعہ بن گیا ہے ——— (اب) اس دشوار مقام کو شاخہائے اعجاز سے تصور کرتا ہوں اور اس اشکال کو کمالِ بلاغت و فصاحتِ قرآن پر محمول کرتا ہوں، ایسی فصاحت و بلاغت کہ بشر اس کے فہم سے عاجز ہے

——— جس قدر ایمان قرآن کے (بعض مقامات) نہ سمجھنے میں حاصل ہوتا ہے، اتنا سمجھنے میں نہیں حاصل ہوتا اس لئے کہ نہ سمجھنے میں اعجاز کی طرف وہ راستہ کھلا ہوا ہے جو سمجھنے کی صورت میں نہیں ——— سبحان اللہ کیا عجیب بات ہے) یہی نہ سمجھنا ایک جماعت کے لئے ضلالت کی طرف لے جاتا ہے اور کلام حق تعالیٰ کے انکار تک پہونچاتا ہے اور بعض کے حق میں یہی نہ سمجھنا قرآن پر کمال ایمان کا سبب بن جاتا ہے اور ہدایت کے راستے پر لاتا ہے۔

——— يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ———

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔

——— والسّلام ———

مکتوب (۳۱) ملا بدر الدین کے نام [عالم ارواح، عالم مثال اور عالم اجساد کی تحقیق میں]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ———

——— تم نے لکھا تھا کہ روح، بدن کے تعلق سے پہلے عالم مثال میں تھی اور مفارقتِ بدن کے بعد پھر عالم مثال میں جائے گی پس عذاب قبر عالم مثال میں ہوگا۔ جیسا کہ عالمِ مثال کے اندر خواب میں درد و تکلیف کا احساس کیا جاتا ہے ——— یہ بھی لکھا تھا کہ یہ بات بہت سی شاخیں رکھتی ہے اگر اس کو قبول کر لیا جائے تو اس سے بہت سے مسائل فروعیہ بر آمد

عہ بہت سوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے۔

ہوں گے ——— جاننا چاہئے کہ اس قسم کے خیالات سچائی سے کم حصہ پائے ہوئے ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خیالات تم کو غلط راستے پر ڈالدیں ——— چند کلمات، ضرورت کی بنا پر باوجود موانع کے اس بحث کی تحقیق میں لکھے جاتے ہیں ——— وَاللہُ سُبْحَانَہٗ الْهَادِیْ اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ (اللہ تعالیٰ ہی سیدھے راستے کا ہدایت کرنے والا ہے)

برادرم، عالم ممکنات کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) عالم ارواح (۲) عالم مثال (۳) عالم اجساد۔ عالم مثال کو برزخ بھی کہتے ہیں۔ یہ عالم مثال یا برزخ، عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان ہے، نیز کہا گیا ہے کہ عالم مثال باقی دونوں عالم کے معانی و حقائق کے لئے ایک آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجساد و ارواح کے معانی و حقائق عالم مثال میں لطیف شکلوں کے اندر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس عالم مثال میں ہر معنی و حقیقت کے مناسب ایک جداگانہ صورت و ہیئت ہے۔ عالم مثال فی حد ذاتہ صورتوں، ہیئتوں اور شکلوں کو اپنے اندر نہیں رکھتا صورتیں اور شکلیں دوسرے عالم سے منعکس ہو کر اس میں ظہور پذیر ہوتی ہیں جیسے آئینہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے وہ کوئی صورت اپنے اندر لئے ہوئے نہیں ہے اس میں جو صورت موجود ہے وہ باہر سے آئی ہوئی ہے ——— جب یہ بات معلوم ہو گئی تو جاننا چاہئے کہ روح، بدن کے تعلق سے پہلے اپنے عالم (عالم ارواح میں تھی) جو کہ عالم مثال کے اوپر ہے اور تعلق بدن کے بعد اگر روح نیچے اتری ہے تو عالم اجساد میں علاقہ جسمی کی وجہ سے اتری ہے۔ (غرضکہ) اس کو عالم مثال سے کوئی واسطہ نہیں ہے نہ تعلق بدن سے پہلے نہ تعلق بدن کے بعد ——— اس سے زیادہ نہیں کہ بعض اوقات بتوفیق خداوندی وہ اپنے بعض حالات کو عالم مثال کے آئینے میں مطالعہ کرلیتی ہے اور اس کو اپنے احوال کا حسن و قبح، عالم مثال سے معلوم ہو جاتا ہے، چنانچہ کشف و خواب میں یہ حقیقت واضح ہے........ بعد از مفارقت بدن اگر روح، علوی ہے تو اوپر کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور سفلی ہے تو پستی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ الغرض عالم مثال سے اس کو کوئی سروکار نہیں ——— عالم مثال تو "از برائے دیدن" (دیکھنے کے لئے) ہے نہ کہ "از برائے بودن" (رہنے کے لئے) روح کے رہنے کی جگہ یا تو عالم ارواح ہے یا عالم اجساد۔ عالم مثال کی حیثیت ان ہر دو عالم کیلئے آئینے کی ہے اس سے

زیادہ نہیں جیساکہ اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے ـــــ اور خواب کے اندر جو تکلیف عالم مثال میں محسوس ہوتی ہے وہ اس عقوبت و سزا کی ایک صورت و شکل ہے جس کا مستحق دیکھنے والا ہوتا ہے ـــ تنبیہ کیلئے یہ بات اس پر ظاہر کردی جاتی ہے ـــ عذاب قبر اس قبیل سے نہیں ہے وہ تو حقیقتِ عقوبت ہے صورتِ عقوبت نہیں ہے ـــ نیز وہ تکلیف جو خواب میں محسوس ہوتی ہے اگر بالفرض اپنے اندر حقیقت بھی رکھتی ہو تو وہ دُنیوی تکلیفوں کی قسم سے ہوگی اور عذاب قبر، عالم عذابِ اُخروی سے ہے ـــ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ـــــ کیونکہ عذابِ دُنیوی کی عذابِ اُخروی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں پناہ بخدا ـــــ آتش دوزخ کی اگر ایک چنگاری دنیا میں آجائے تو ساری دنیا کو بالکلیہ سوختہ اور نابود کردے ـــــ عذاب قبر کو خواب کی طرح ماننا صورتِ عذاب اور حقیقتِ عذاب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہے ـــــ اور یہ اشتباہ یوں بھی پیدا ہوتا ہے کہ عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت کی مجانست و مماثلت کا توہم ہوجاتا ہے حالانکہ یہ بات باطل ہے اور کیسی کچھ باطل بالکل کھلی ہوئی باطل۔

اگر یہ سوال ہو کہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا* الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح کا قبض کرنا جس طرح موت میں ہوتا ہے خواب میں بھی ہوتا ہے پھر ایک کی (یعنی خواب کی) تکلیف کو دنیا کی تکلیفوں میں شمار کرنا اور دوسرے کی (یعنی موت کی) تکلیف کو عذاب ہائے آخرت سے کہنا کس وجہ سے ہے؟ ـــــ جواب یہ ہے کہ توفّیٔ نوم، اِس طرح کی ہے جیسے کوئی اپنے وطنِ مالوف سے شوق و رغبت کے ساتھ سیر و تماشا کے لئے کہیں باہر جائے تاکہ فرحت و سرور حاصل کرے اور پھر شاداں و فرحاں اپنے وطن کی طرف واپس ہوجائے ـــــ اُس کی (توفّیٔ نوم کی) سیرگاہ، عالم مثال ہے جس میں عجائبِ ملک و ملکوت ہیں ـــــ لیکن توفّیٔ موت ایسی نہیں ہے وہاں تو وطنِ مالوف کا انہدام اور بنائے معمور کی تخریب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ توفّیٔ نوم میں محنت و کلفت

---

* خدائے تعالیٰ قبض ارواح کرتا ہے ان نفسوں کی موت کے وقت اور وہ نفس جو ابھی مرا نہیں ہے اُس کو نیند کی حالت میں قبض کرتا ہے۔

حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ فرح و سرور کو متضمن ہوتی ہے برخلاف توفی موت کے اُس میں شدت و کلفت ہے پس متوفائے نومی کا وطن، دنیا ہوتا ہے اُس سے جو معاملہ ہوگا معاملاتِ دنیا میں سے ہوگا۔ اور متوفائے موتی اپنے وطنِ مالوف کی تخریب کے بعد آخرت کی طرف انتقال کرتا ہے اس کا معاملہ معاملاتِ اُخروی سے ہو گیا ــــ "مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ" (جو مر گیا اُس کی قیامت قائم ہو گئی) اس حدیث کو تم نے سنا ہوگا ــــ خبردار ــــ کشوفِ خیالی اور ظہورِ مثالی کی وجہ سے اہلِ سنت وجماعت کے اعتقادات کو ہاتھ سے نہ دینا اور اپنے خواب وخیال پر مغرور نہ ہو جانا۔ نجات اس فرقۂ ناجیہ کی متابعت کے بغیر متصور نہیں ــــ اگر آرزوئے نجات رکھتے ہو تو خوش طبعی کی باتیں چھوڑ کر جان و دل سے بزرگانِ اہلِ سنت وجماعت کے اتباع کی کوشش کرو خبر کرنا شرط ہے ــــ قاصد کی ذمہ داری پیغام پہونچانے کی ہے اور بس ــــ تمہاری عبارت کے "انبساط" نے مجھ کو اس توہم میں ڈالدیا کہ اس کا بڑا امکان ہے کہ یہ تخیلات تم کو اکابرِ اہلِ سنت کی تقلید سے باہر اور اپنے ذاتی کشف کا تابع کر دیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ سبحانہ منہا وَمِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ــــ شیطان دشمن قوی ہے، خبردار ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو صراطِ مستقیم اور شاہراہِ حق سے ہٹا کر (تنگ) گلیوں میں ڈالدے ــــ ہم سے جدا ہوئے تمہیں ایک سال بھی نہیں گزرا پھر یہ کیا ہو گیا؟ وہ احتیاطیں کدھر گئیں جو تم التزامِ متابعتِ سنت و اہلِ سنت میں کیا کرتے تھے اور نجات کا دارومدار ان بزرگوں کی تقلید میں سمجھا کرتے تھے۔ شاید اُن سب باتوں کو فراموش کر دیا جو اپنے تخیلات کو اپنا مقتدیٰ بنا لیا اور شاخیں نکالنی شروع کر دیں ــــ ہماری ملاقات بحیثیت ظاہر بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ بس اب (خود) اس طرح زندگی گزارو کہ رشتۂ امید نجات نہ ٹوٹنے پائے ــــ

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ــــ

والسَّلامُ علیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدیٰ

مکتوب (۳۴) والدہ میر محمد امین

(یعنی زوجہ خواجہ میر محمد نعمان اکبر آبادیؒ) کے نام

[ذکر الٰہی کی ترغیب اور اجتناب از محبت دنیا کی نصیحت]

نصیحت جو کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اوّل علمائے اہل سنت و جماعت ــــ جو کہ فرقۂ ناجیہ ہیں ــــ کی آراء کے مطابق تصحیح عقائد ہو بعد از تصحیح عقائد احکام فقہیہ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ضروری ہے ــــ (شریعت کی طرف سے) جس کا حکم دیا گیا ہے اُس کی بجا آوری اور جس سے باز رکھا گیا ہے۔ اس سے اجتناب کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ــــ پانچ وقت کی نماز بغیر سستی و نقصان کے اس کے شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اور تعدیل ارکان کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کی جائے ــــ سونا چاندی نصاب کے مطابق ہو تو ادائے زکوٰۃ بھی ضروری ہے ــــ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے عورتوں کے زیور میں بھی زکوٰۃ دینے کو فرمایا ہے ــــ اپنے اوقات کو لہو و لعب میں صرف نہ کرنا چاہئے اور لایعنی امور میں عمر گرامی کو ضائع نہ کیا جائے ــــ چہ جائے کہ ان امور میں زندگانی صرف کی جائے جن کے کرنے سے (بہت زیادہ) منع کیا گیا ہے اور جو (صریح طور پر) ممنوعات شرعیہ میں سے ہیں ــــ سرود و نغمہ کی طرف رغبت نہ کرنی چاہیئے اور نہ اس کی لذت پر فریفتہ ہوا جائے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا زہر ہے جو شہد اور شکر میں ملا ہوا ہے ــــ غیبت اور چغلخوری سے اپنے کو محفوظ رکھیں اس لئے کہ شرعی وعیدیں ان ہر دو بد اخلاقیوں کے ارتکاب پر وارد ہوئی ہیں۔ جھوٹ بولنے اور بہتان باندھنے سے بھی اجتناب ضروری ہے اس لئے کہ یہ دونوں خراب عادتیں تمام ادیان میں حرام ہیں اور ان کے مرتکبین کیلئے بہت سی وعیدیں وارد ہوئی ہیں ــــ مخلوق کے عیبوں اور گناہوں کو دبانا اور چھپانا اور ان کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا عزائم امور (کارہائے ہمت) سے ہے۔ غلاموں، کنیزوں، اور نوکروں پر شفقت اور مہربانی کی جائے اور (خدمت کی انجام دہی میں) ان کی تقصیرات میں مواخذہ نہ کرنا چاہیے۔ موقع بے موقع ان بے چاروں کو مارنا، برا بھلا کہنا اور تکلیف و اذیت پہونچانا ــــ غیر مناسب بات ہے۔

(باقی برص ۴۸)

از جناب وحید الدین خانصاحب (اعظم گڈھ)

(یہ مقالہ بزم سلیمانی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ایک مجلس میں ۳ر اکتوبر ؁ کو پڑھا گیا)

"پچاس سونے والے بہہ گئے" ــــــ یہ خبر ایک مرتبہ اخبار میں چھپی۔ خبر میں ایک مقام پر بارش اور طوفان کی تفصیلات بتائی گئی تھیں اور اس ضمن میں کہا گیا تھا کہ پانی ریلوے لائن کے اوپر تک پہونچ گیا اور پچاس سونے والے بہہ گئے۔

یہ خبر کچھ عجیب سی تھی۔ ذہن نے جاننا چاہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ انگریزی اخبار دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اصل میں خبر تھی "پچاس سلیپر بہہ گئے" یہی لفظ اردو اخبار میں ترجمہ کی غلطی سے "سونے والے" بن گیا۔ سلیپر (SLEEPER) کے لفظی معنی بیشک سونے والے کے بھی ہیں۔ مگر اس خبر میں ظاہر ہے کہ یہ لفظ ریلوے لائن میں استعمال ہونے والے اس لکڑی کے کندے کے لئے تھا جس کے اوپر لوہے کی پٹریاں بچھائی جاتی ہیں۔ نہ کہ سونے والے آدمی کے لئے۔

اس قسم کی غلطیاں کتنی ہی بار آپ کے سامنے آئی ہوں گی۔ ان غلطیوں کا سبب ہمیشہ علم کی کمی ہوتا ہے اور ان سے بچنے کے لئے اتنا کافی ہے، کہ آدمی علم حاصل کرلے۔ مگر غلطیوں کی ایک اور قسم، اس سے زیادہ سنگین قسم ہے جس کا تعلق علم سے نہیں معرفت سے ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لئے صرف صاحب علم ہونا کافی نہیں بلکہ حقیقت آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص معرفت کی دولت سے محروم ہو وہ محض علم کی بدولت ان غلطیوں سے مامون نہیں رہ سکتا۔ معرفت کیا چیز ہے اور علم اور معرفت میں کیا فرق ہے، یہ ایک نہایت نازک سوال ہے۔

اجمالی طور پر ہم میں سے ہر شخص اس فرق کو سمجھتا ہے مگر متعین تعریف کرنی ہو تو کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تاہم سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم کا مطلب ہے جاننا اور معرفت کا مطلب ہے پہچاننا۔ مثال کے طور پر واشنگٹن ایک شہر ہے یہ ہم سب لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی روز یہ واقعہ پیش آئے کہ ایک شخص رات کے وقت بے خبر سو رہا ہو اور اسی حالت میں کسی تیز رفتار سواری کے ذریعہ آہستگی کے ساتھ اس کو لے جا کر دور کے ایک مقام پر اس طرح اتار دیا جائے کہ جب آنکھ کھلے تو وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی شہر میں پائے، تو اس کے لئے یہ سمجھنا یقیناً ناممکن ہو گا کہ یہ واشنگٹن ہے جہاں وہ اس وقت اپنے آپ کو پا رہا ہے۔ اس کے برعکس یہی واقعہ اگر اپنے جانے پہچانے شہر میں پیش آئے تو ہم میں سے ہر شخص پہلی نظر میں سمجھ جائے گا کہ وہ کہاں ہے —— اس مثال میں آپ جاننے اور پہچاننے یا علم اور معرفت کا فرق بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔

معرفت علم کی روشنی ہے۔ آنکھ اور روشنی میں جو نسبت ہے وہی نسبت علم اور معرفت میں ہے اگر سرے سے روشنی نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر روشنی موجود ہو مگر کم ہو، تو اسی کے بقدر کم دکھائی دے گا جتنا روشنی میں کمی ہے۔ اس اعتبار سے معرفت حاصل ہونے اور معرفت حاصل نہ ہونے کے ہزار درجے بن جاتے ہیں۔ میں چند مثالوں سے اسکو واضح کروں گا۔

۱۔ کیڑے مکوڑے (INSECTS) ہماری ایک جانی بوجھی حقیقت ہیں۔ یہ نہایت کثرت سے انڈے بچے کرتے ہیں اور ان کے اندر بڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بھڑ کو اگر مسلسل زندہ رہنے اور نشو و نما پانے کا موقع ملے تو وہ شیر کی مانند جسامت حاصل کر سکتی ہے۔ غور کیجیے کہ اس قسم کے کیڑوں کی ہزاروں صورتیں اگر شیر اور بھیڑیے کی طرح بڑی ہو کر چلنا پھرنا شروع کر دیں تو زمین پر انسان کے لئے زندگی گذارنا کس قدر مشکل ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے اُس قسم کے پھیپھڑے نہیں رکھتے جیسے کہ آدمی رکھتا ہے۔ وہ خاص طرح کی ہوائی نالیوں (AIR-TUBES) کے ذریعہ سانس لیتے ہیں جب کیڑے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی یہ سانس کی نالیاں ان کے بڑھتے ہوئے جسم کی نسبت سے نہیں بڑھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا زیادہ بڑا نہیں ہونے

پاتا۔ بڑھنے پر یہ حد بندی ان کو شیر اور بھیڑیے کی جسامت حاصل کرنے سے روکے رہتی ہے مگر یہ قدرتی روک موجود نہ ہوتا تو زمین پر انسان کے لئے قیام کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اگر دل کے اندر ایمان کی معرفت موجود ہو تو یہ واقعہ خدا کے وجود پر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے، وہ اس کے لئے خدا کی گواہی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عیسائی عالم کریسی مارسین (CRESSY MORRISON) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عالم فطرت کا یہ نظم و نسق (ECONOMY) ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی اعلیٰ ذہن کام کر رہا ہے، کیونکہ:

ONLY INFINITE WISDOM COULD HAVE FORESEEN

AND PREPARED WITH SUCH ASTUTE HUSBANDRY

یعنی صرف لا محدود عقل اتنے زیرک انتظام کو پیشگی تصور میں لا سکتی تھی اور اس کا اہتمام کر سکتی تھی (ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۰ء)

مگر معرفت سے محروم ذہن کے لئے یہی واقعہ بالکل برعکس مفہوم کا حامل بن گیا۔ جولین ہکسلے (J. HUXLEY) اس زمانے کا بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس کی ایک کتاب ہے۔ MAN IN THE MODERN WORLD یعنی انسان دور جدید میں۔ اس کتاب کے ایک حصے میں اس نے ارتقاء کے ذیل میں مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور کیڑے مکوڑے کے فرق کو سمجھنے کے لئے کسی ارادۂ الٰہی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیڑے اور انسان دونوں ہی بعض سادہ اور ابتدائی جرثومۂ حیات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ انسان کو مخصوص اسباب سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع ملا ہے اس لئے وہ ذہن و دماغ رکھنے والی ہستی بن گیا۔ اور کیڑے مکوڑوں کو بعض مانع اسباب نے یہ مواقع فراہم نہیں کئے، اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا چیز تھی جس نے کیڑوں کو ترقی کرنے سے روک دیا۔ اس کا جواب کیڑوں کے سانس لینے کے طریقے (BREATHING MECHANISM) میں چھپا ہوا ہے۔ زمینی کیڑوں نے سانس لینے کیلئے ہوائی ٹیوب کا طریقہ اپنایا ہے جن کو حیاتیاتی اصطلاح میں (TRACHEAE) کہتے ہیں۔ اندر جا کر اس نالی کی نہایت چھوٹی چھوٹی شاخیں

ہو جاتی ہیں جن کو صرف خوردبین کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی نالیاں گیسوں کو جسم کے اندر نسیج (TISSES) تک لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان اور دیگر جانداروں میں دہرا طریقہ پایا جاتا ہے۔ یعنی گیسیں پھیپھڑے سے ہوکر خون کی نالیوں تک پہونچتی ہیں۔ گیسوں کے نفوذ و انتشار کا قانون کچھ ایسا ہے کہ نالیوں کے ذریعہ سانس لینا چھوٹے کیڑوں کیلئے تو بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر جسامت کے بڑھنے کے ساتھ وہ مشکل ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ چوہیا کے بقدر جسامت حاصل کرنے سے پہلے ہی یہ نالی نا قابل استعمال ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا کبھی دوسرے ریڑھ دار جانوروں کے لحاظ سے اوسط درجہ کی جسامت بھی حاصل نہ کر سکا۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہی سبب اس بات کا بھی ہے کہ کوئی کیڑا کبھی ذہین نہیں بنا ایک خاص جسامت میں محدود ہونے کی وجہ سے کیڑوں کو بہت کم اعصابی ریشے درکار ہوتے ہیں۔ جبکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ اب چونکہ کیڑے اس درجہ کی جسامت تک نہیں پہونچتے، اس لئے وہ اعلیٰ ذہانت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

دیکھئے۔ ایک ہی واقعہ کا علم ایک شخص کے لئے کائنات میں ایک ذہین تخلیقی ارادے کی موجودگی کا ثبوت بن گیا اور اسی واقعہ سے دوسرے شخص نے یہ پہلو نکال لیا کہ موجودات کی توجیہہ کے لئے کسی تخلیقی ارادے کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کے بغیر ہی ہم تمام موجودات کی توجیہہ کر سکتے ہیں۔ علم کی حد تک دونوں شخص یکساں ہیں مگر معرفت کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔

۲۔ انجیل کا ایک فقرہ ہے:

"تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

متی ۵: ۱۳

اس فقرے میں دراصل بنی اسرائیل کے آخری نبی نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا ہو کہ تم صاحب کتاب ہونے کی وجہ اہل دنیا کے لئے روشنی کا ذریعہ تھے، تمھاری حیثیت ہادی اور رہنما کی تھی۔ مگر تم نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنا مقام کھو دیا اور اس طرح خود ہی اپنے کو اس کا مستحق بنا لیا کہ دوسروں سے تمھیں ذلیل کیا جائے۔

مگر اس قانون الٰہی کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک امریکی ماہر کیمیا (ELMER W. MAURER) نے اس کی عجیب غریب تاویل کی ہو۔ وہ ایک کیمیا واں ہو۔ اس لئے اس نے علم کیمیا کی روشنی میں اسکو دیکھا تو اس کا ذہن ایک اور ہی سمت چلا گیا۔ وہ لکھتا ہو کہ تحقیق کے بعد میں اصل راز کو پا گیا:

"وہ یہ کہ رومی ارض مقدس کے رہنے والوں سے نمک بطور محصول وصول کرتے۔ اہل فلسطین کو نمک کی سب سے زیادہ یافت بحیرۂ مردار یا بحیرہ نمک سے ہوتی۔ یہ محصول اتنے ظالمانہ تھے کہ لوگ نمک میں ریت وغیرہ کی آمیزش کرنے پر مجبور تھے۔ حکومت اس نمک کو پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں ڈال دیتی۔ جب نمک پانی میں گھل جاتا تو نمکین پانی اوپر سے نکال لیا جاتا اور ملاوٹی مادہ ناقابل تحلیل ہونے کی وجہ سے تہ نشیں ہو کر حوض میں رہ جاتا۔ اس طرح نمک نے اپنا ذائقہ کھو دیا تھا۔ وہ اب نمک باقی نہیں رہا تھا، وہ اسی قابل تھا کہ پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

وہ مزید لکھتا ہو:

"یہی ایک طریقہ نہیں تھا جس سے نمک اپنا ذائقہ کھو دیتا۔ بحیرۂ مردار (DEAD SEA) کی سطح کا پانی دیگر اجزا کے ساتھ ۳۱ فی صد سوڈیم کلورائڈ، ۱۳ فی صد کیلشیم کلورائڈ اور ۴۸ فی صد میگنیشیم کلورائڈ رکھتا ہو۔ کیلشیم اور میگنیشیم کلورائڈ ہوا سے پانی جذب کرنے کی خاصیت رکھتے ہیں اور اس بنا پر جب نمک کے ساتھ شامل ہوتے ہیں تو اسے تحلیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ناخوشگوار آمیزہ تیار ہو جاتا ہو۔ رواج تھا کہ وہ لوگ اس قسم کے نمک کے لئے بڑے بڑے ذخائر ان گھروں میں محفوظ کر لیتے جن کا فرش مٹی کا ہوتا۔ بعض اوقات زمین کے ساتھ نمک کی جو تہیں بیٹھ جاتیں، وہ نمی

کی وجہ سے خراب ہو جاتیں۔ چونکہ یہ ذخیرہ نمک ملا ہوا ہونے کی وجہ سے زرخیز
زمینوں کے لئے مضر ہوتا تھا اس لئے کوئی شخص بھی اسے کھیت میں پھینکنے کی اجازت
نہ دیتا، اس بنا پر اسے صرف گلیوں ہی میں پھینکا جاتا جہاں چلنے والے لوگ اسے
اپنے پاؤں کے نیچے روندتے۔"

THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE

Edited by JOHN CLOVER MONSMA

(N.Y. 1958) P. 205

انجیل کے فقرے کی یہ توجیہ ظاہر ہے کہ لال بجھکڑ کی روایتی کہانیوں سے زیادہ اہمیت
نہیں رکھتی۔ وہ نہ تو بجائے خود صحیح ہے اور نہ وہ متعلقہ فقرے پر کسی طرح منطبق ہوتی۔ مگر
ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے ایسی بچکانہ غلطی کا ارتکاب صرف اس لئے کیا کہ اس نے سائنس
کا علم تو حاصل کیا تھا مگر دین کی حقیقتوں سے وہ ناآشنا تھا۔ وہ اس نمک سے واقف تھا جو
علم کیمیا میں زیر بحث آتا ہے اور لیبارٹری میں جس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "نمک"
کی ایک اور قسم ہے جس سے دل و دماغ کو چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے زندگی میں خدا پرستی
کا ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ "نمک" کا لفظ دیکھ کر اس کا ذہن کیمیائی نمک کی طرف چلا گیا اور اپنے
معروف نمک کے مطابق اس نے ایک تشریح کر ڈالی۔

اس کے باوجود اس کیمیا داں کو اپنے تصور پر اس قدر یقین ہے کہ وہ اس کے بعد
لکھتا ہے:

"یہ صرف ایک نمونہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بائبل اپنی جزوی تفصیلات
تک میں سائنسی طور پر بالکل صحیح ہے۔" (صفحہ ۲۰۵)

۳۔ ایک صاحب جو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں، انھوں نے ریسرچ میں اپنے
مقالہ کے لئے اسلام کے معاشی نظریات (THE ECONOMIC DOCTRINES OF ISLAM)
کا عنوان لیا۔ ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی سرگرمیوں
میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اپنے مقالے کے ایک حصے کو تیار کرنے کے لئے انھیں یہ معلوم کرنا تھا کہ

اسلام نے پیدائش دولت کے کن وسائل کی طرف اپنے پیروؤں کو متوجہ کیا ہے۔ اس مقصد سے انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں تو بالکل لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا کا معاملہ ہے۔ پیدائش دولت کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس کی طرف انھیں کتاب الٰہی میں "اشارہ" نہ مل گیا ہو۔

اس حیرت انگیز انکشاف کی بنیاد کیا تھی، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن میں موسیٰ اور فرعون کی کش مکش کے جو واقعات ہیں، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا:

فاوقد لی یاھامان علی الطین فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الی الٰہ موسیٰ (قصص)

اے ہامان! مٹی کے گارے کو جلا اور میرے لئے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں

اس آیت کو پڑھتے ہی موصوف اچھل پڑے۔ انھوں نے کہا، یہ تو ترابیاتی صنعت (CERAMIC INDUSTRIES) کی تعلیم ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس فقرے کا ترابیاتی صنعتوں کے قائم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف فرعون کے تمرد کو بتا رہا ہے جو اس نے خدا کے نبی کے سامنے ظاہر کیا۔

اسی طرح جہاں کہیں کوئی ایک لفظ مل گیا، خواہ وہ جس سیاق میں بھی آیا ہو، انھوں نے فوراً اس سے ایک معاشی مفہوم نکال لیا ——— ومامن دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ (انعام) ان کے نزدیک مرغبانی اور پرندپروری کی تعلیم دینے والی آیت تھی، واوحی ربک الی النحل (نحل) شہد کی مکھیاں پالنے اور شہد کی تجارت کرنے کے ہم معنی تھا، ولباسھم فیھا حریر میں کرم پروری اور سلک انڈسٹری کی طرف اشارہ تھا، واصنع الفلک (ہود) جہاز سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا پیغام تھا، وحلوا اساور من فضۃ (دہر) میں زیور سازی کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی تھی۔ اسی طرح محض "سرسری فہرست بندی" میں انھوں نے سو سے بھی زائد ایسی مصنوعات کا پتہ لگایا تھا جن کی طرف قرآن میں "اشارے" کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ قرآن سے جن صنعتی کاموں کی فہرست وہ بنا رہے ہیں، اس میں اصنام،

تماثیل، نحر اور صوامع جیسی چیزیں بھی شامل ہیں۔

مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے اور ان کو فروغ دینے کے بارے میں اس قرآنی استدلال کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہو کہ موصوف کو عربی الفاظ کے معانی کا علم تو تھا مگر قرآن کی حکمت سے وہ آشنا نہیں تھے۔ اس لئے انھیں محسوس نہیں ہوا کہ جن آیات کے حوالے سے وہ اپنا استدلال کھڑا کر رہے ہیں، اُن آیات کا صنعت و تجارت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ استدلال صریح طور پر قرآن کی روح کو مجروح کر رہا ہے۔

آپ کو یہ سن کر مزید حیرت ہو گی کہ ایک مخصوص حلقہ میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کے ایک پروفیسر نے اس کو عظیم تصنیف (GREAT WORK) سے تعبیر کیا۔ اور کیمبرج یونیورسٹی کے انگریز پروفیسر MR. KRENKO نے لکھا:

"The work is a Diligent and Scientific Study"

یعنی یہ تصنیف محنت اور علمی مطالعہ کا ایک نمونہ ہے۔

۳۔ مشہور حدیث جبریل کا ایک فقرہ ہے:

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک[1]

کئی سال پہلے کی بات ہے، ایک شخص نے مجھ سے اس فقرہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا، بعض لوگوں کا خیال ہو کہ اس میں کسی قسم کی "رویت" کا ذکر نہیں ہو۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہو کہ خدا کی بندگی یہ سمجھ کر کی جائے کہ خدا جو علیم و بصیر ہے، وہ یقیناً ہم کو دیکھ رہا ہو گا۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

احسان یہ ہو کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے دیکھ نہیں رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

---

[1] یہی مفہوم بعض دوسری روایات میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:
أن تخشى اللہ کانک تراہ (تم اللہ سے اس طرح ڈرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) — البخاری، جلد اول

" جو لوگ حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں، انھوں نے خدا کو نہیں دیکھا، اگر وہ دیکھتے تو ایسا ترجمہ نہ کرتے"۔۔۔۔ یہ میرا جواب تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص خدا کا عینی مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا مشاہدہ صرف آخرت میں ممکن ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہو کہ بندہ جب خدا کی یاد اور اس سے خوف ومحبت کے جذبات میں غرق ہوتا ہو تو اس پر شبہہ رویت کی سی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کو ایسا محسوس ہوتا ہو گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہو۔

ہمارے اور خدا کے درمیان محض ایک نظریاتی نسبت نہیں ہے بلکہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی ربط ہے۔ عام انسانوں میں یہ ربط چھپا رہتا ہے مگر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں، ان کا یہ ربط اسی طرح ابھر آتا ہے جیسے دوسری فطری صلاحیتیں نکاس کا راستہ پانے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور ایسا نہ ہو تو دبی پڑی رہتی ہیں۔ بندہ جب اپنے آپ کو بالکل خدا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو خدا بھی اس کے انتہائی قریب آجاتا ہے، خالق اور مخلوق کے درمیان جو امکانی ربط ہو وہ بالفعل قائم ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدا کا تصور آدمی کی فکر ونظر میں اس طرح سما جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کو خدا کی یاد دلانے والی بنجاتی ہے۔ اس پر ایسے لمحات گزرتے ہیں جب خدا کے سوا اور کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ہوتی وہ شوق اور اشتیاق کے شدید جذبات کے ساتھ خدا کی طرف لپکنے لگتا ہے۔ اس کو ایسی کیفیت سے بھری ہوئی دعائیں نصیب ہوتی ہیں جیسے کہ وہ عین اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہو۔ اسکو ایسے سجدے نصیب ہوتے ہیں جب ایسا محسوس ہوتا ہو کہ اس نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں ڈالدیا ہے اور اس کے آگے زمین پر پڑا ہوا ہے، اس کو ایسے اعمال کی توفیق ملتی ہے گویا کہ وہ عین خدا کے حضور میں ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے سرگرم ہے ۔۔۔۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندگی اپنے انتہائی معراج پر پہونچ جاتی ہو۔ اسوقت بندہ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہونے کے باوجود، اپنے احساس کے اعتبار سے خدا کے قریب ہو جاتا ہے، نہ دیکھنے کے باوجود وہ خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہو کہ اس حدیث میں عبادت کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ پہلا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندے کے قلب وروح پر خدا کا خیال اس طرح چھا جائے کہ اس پر حضوری

کی کیفیت طاری ہونے لگے، اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اس تصور کو جمائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اسی تصور کے تحت خدا کی عبادت کرے۔ اسی لئے حدیث کے پہلے ٹکڑے میں "رویت" کی نسبت بندے کی طرف کی گئی ہے اور دوسرے ٹکڑے میں رویت کی نسبت خدا کی طرف۔ اس اعتبار سے فقرے کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث میں عبادت کے دو "مراتب" مراد لئے ہیں۔ ایک "اعلیٰ" اور دوسرا اس سے "فروتر"۔ مرتبہ اعلیٰ یہ کہ بندہ ــــ در مشاہدۂ معبود و حضور ذات اقدس وے مستغرق باشد" اور اس سے فروتر مرتبہ "آگاہ بودن است از نظر الٰہی و علم وے تعالیٰ بحال بندہ" اس کے بعد انہوں نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

احسان عبادت کردن است خدا تعالیٰ راچناں کہ گویا می بینی اورا، پس اگر نیستی تو بایں حال کہ گویا می بینی اورا، عبادت کن او را بایں صفت کہ حاضر باشی از یں کہ می بیند وے ترا دریں صورت

اشعۃ اللمعات، جلد اول، صفحہ ۳۵

احسان کا مطلب خدا کی عبادت اس طرح کرنا ہے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، پس اگر تمھاری یہ کیفیت نہ ہو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، تو تم اس طرح عبادت کرو کہ یہ خیال تمھارے ذہن میں موجود رہے کہ خدا تم کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

اشار فی الجواب الی حالتین: ارفعھما ان یغلب علیہ مشاھدۃ الحق بقلبہ حتیٰ کانہ یراہ بعینہ ...... والثانیۃ ان یستحضر ان الحق مطلع علیہ یری کل ما یعمل

فتح الباری، جلد اول، صفحہ ۱۱۱

"احسان کیا ہے" کے سوال کا جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اس میں دو حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ ان میں بلند حالت یہ ہے کہ عابد کے دل پر مشاہدۂ حق کا اس قدر غلبہ ہو گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس خیال کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے کہ خدا اس سے باخبر ہے اور وہ اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اوپر جو چند مثالیں میں نے دیں، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے ساتھ معرفت کس قدر ضروری ہے۔ اگر معرفت یا دوسرے لفظوں میں اشیاء کی پہچان نہ پیدا ہوئی ہو اور آدمی کو ان حقیقتوں سے آشنا ہونے کا موقع نہ ملا ہو تو محض علم کافی نہیں ہو سکتا۔ ظاہری معلومات رکھنے کے باوجود آدمی طرح طرح کی بے خبری میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا، وہ پڑھتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔

علم حقیقت میں وہی علم ہے جس کے ساتھ معرفت کی گہرائیاں شامل ہوں۔ جس نے "غم" کا لفظ ڈکشنری میں دیکھا ہو، مگر اسکو تڑپنا نصیب نہیں ہوا، وہ غم کا مطلب نہیں جانتا، ایسا شخص بس ترجمہ کرنے والی مشین ہے جو ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں سے ادا دیتی ہے، مگر نہیں جانتی کہ اسکا مطلب کیا ہے۔ جس نے کتاب الٰہی میں لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ پڑھا، مگر قرآن نے خود اسکے اوپر نازل ہو کر اسکے دل کے ٹکڑے نہیں کئے، وہ نہیں جانتا کہ اس آیت میں کون سی حقیقت بتائی گئی ہے۔ جس نے اسلام کے معاشی قوانین پر عبور حاصل کر لیا، مگر اس پر ابھی ایسا معاشی واقعہ نہیں گذرا کہ وہ ایک صاحب حاجت کو اپنی جیب کے پیسے دے اور دوسری طرف اسکی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں والذین یؤتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ کی تفسیر جھلک رہی ہو، اسوقت تک وہ اسلام کی معاشیات سے بے خبر ہے۔ جس نے نماز کے مسائل جان لئے مگر نماز سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہوئیں، نماز اس کے لئے خدا سے سرگوشی نہیں بنی، وہ ابھی نماز سے نا آشنا ہے۔ جس نے حدیث کی کتابیں ختم کر ڈالیں، مگر اس کے آنسوؤں نے کتاب کے اوراق نم نہیں کئے، وہ حدیث کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ جس کو دنیا نے اسلام کے مقرر کا خطاب دیا ہو، اس کی تقریر اس وقت تک اسلامی تقریر نہیں بنتی جب تک وہ خدا سے دعاؤں اور التجاؤں کے نتیجے میں نہ ابلی ہو۔ جس کو لوگ اسلام کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں، اس کی تصنیف اس وقت تک اسلامی تصنیف نہیں ہے جب تک اس پر یہ حالت نہ گزری ہو کہ وہ بے قرار ہو کر سجدے میں سر رکھدے اور کہے کہ خدایا! تو میرا قلم بن جا جس سے میں لکھوں، تو میرا دماغ بن جا جس سے میں سوچوں۔

جاننے والو! جانو، کیوں کہ تم ابھی نہیں جانتے، پڑھنے والو! پڑھو، کیوں کہ تم نے ابھی نہیں پڑھا۔

امت مسلمہ کا مقام و منصب

اس کا

موجودہ مرض اور علاج

(از:۔ مولانا محمد تقی امینی)

یہ مقالہ مولانا موصوف نے ایک ملی اجتماع میں پڑھنے کے لئے لکھا تھا۔ لیکن بعض اہم مصروفیتوں کی وجہ سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے سفر نہیں کیا جا سکا، اس لئے نہ وہ وہاں پڑھا جا سکا اور نہ اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔ اب اس کا تمہیدی حصہ جو اس اجتماع کی خصوصیات سے متعلق تھا حذف کر کے اس کو ہدیۂ ناظرین الفرقان کیا جا رہا ہے۔

ایڈیٹر ــــــــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کے نام سے جس نئی قوم کی تنظیم فرمائی تھی وہ نہ رنگ و نسل کی بنیاد پر تھی اور نہ زبان و وطن کی بنیاد پر۔

اس سے آپؐ کا مقصد نہ کھانے پینے والی قوموں میں ایک اور قوم کا اضافہ تھا اور نہ بھوکی ننگی آبادی میں ایک اور آبادی کو بڑھانا تھا۔

بلکہ اس امت کی یہ نئی تشکیل و تنظیم محض اس لئے تھی کہ زندگی میں نورانی صفات پیدا کرکے اور اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ سسکتی ہوئی انسانیت اور دکھ کی ماری دنیا پر یہ واضح کر دے کہ

اگر اس کو جام حیات کی تلاش ہے اور نسخہ شفا کی ضرورت ہے تو یہ اسی راستہ پر چلنے سے حاصل ہو سکتے ہیں جس پر یہ چل رہی ہے۔

رسول اللہ کی زندگی اس کے لئے نمونہ تھی اور یہ ساری دنیا کے لئے نمونہ بن کر آئی تھی جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (پ۲)

اسی طرح ہم نے تمہیں نہایت معتدل امت بنایا تاکہ تمام انسانوں کے لئے (سچائی) کی شہادت دینے والے تم ہو اور تمہارے لئے اللہ کا رسول شہادت دینے والا ہو۔

اس نمونہ والی جماعت کو جو کچھ حاصل ہوا وہ بھی سن لیجئے۔

ایک طرف اس کا دل اللہ کی جلوہ گاہ بنا۔

لا یسعنی الا قلب مومن (الحدیث)

میری سمائی بجز قلب مومن کے اور کہیں نہیں ہو سکتی ہے۔

اس کی نگاہ میں اللہ کا نور سمایا۔

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله۔ (الحدیث)

مومن کی فراست سے ہوشیار رہو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس کی زندگی میں اللہ کی صفات کا "پرتو" پڑا۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ۔ (الحدیث)

اللہ جیسے اخلاق پیدا کرو۔

اور دوسری طرف اللہ نے اپنے وعدہ کے مطابق صلاحیت وکارکردگی کی بنا پر وہ سب کچھ عطا فرمایا جو زیادہ سے زیادہ کسی قوم کو کبھی دیا گیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اس نئی قوم نے مشرق میں سندھ وچینی ترکستان تک اور مغرب میں ہسپانیہ تک اپنے انتظام میں لے لیا۔

علوم و فنون کی ترقی کے لحاظ سے مدتوں ساری دنیا پر اپنی فوقیت و برتری کا سکہ چلایا اور ذہنی و دماغی لحاظ سے صدیوں ایسی حکومت کی کہ اپنے پاور ہاؤس سے پرانی دنیا کے تینوں براعظموں کو روشنی پہونچاتی رہی (امریکہ کی دریافت بعد میں ہوئی ہے)

نمود اس کی، نمود تیری، نمود اس کی
خدا کو تو آشکار کر دے، خدا تجھے آشکار کر دے

لیکن آج یہ وہی قوم ہے جس کا دل غبار آلود اور آنکھیں بے نور ہیں۔ جس کا دماغ جامد اور بازو شل ہیں۔ اس کی زندگی کا قافلہ لٹ چکا ہے اور کوئی خبر لینے والا نہیں ہے۔ اس پر فلاکت و ادبار مسلط ہے اور کوئی آگاہ کرنے والا نہیں ہے، وہ موت کی نیند سو رہی ہے اور کوئی جگانے والا نہیں ہے۔ وہ خواب و خیال کی دنیا میں مگن ہے اور کوئی احساس دلانے والا نہیں ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

حضرات! اس صورت حال سے سرسری نہ گذر جایئے بلکہ اس کا حل اس ماہر طبیب (رسول اللہؐ) کی تعلیم میں تلاش کیجئے، جو مردہ قوموں کو زندہ کرنے اور بیمار قوموں کو شفا دینے کے لئے آیا تھا۔ اور وہی دوا اور غذا استعمال کیجئے جو وحی الٰہی کی روشنی میں مریض کے مزاج کی رعایت اور موسم کی حرارت و برودت کے لحاظ سے تجویز کی گئی تھی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک ایسا دور آئے گا کہ دنیا کی دوسری قومیں امت مسلمہ پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے برتن میں "تر نوالہ" کیلئے بھوکوں کے ہاتھ پڑتے ہیں۔ صحابۂ کرام نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا ہم لوگ اس وقت تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا "نہیں" بلکہ تم لوگ زیادہ ہوگے لیکن "جھاگ" کی طرح بے وزن ہو جاؤگے۔

صحابہؓ نے پوچھا ہماری یہ حالت کیوں ہو جائے گی؟ آپؐ نے فرمایا، تم میں "وَھَن" پیدا ہو جائے گا، سوال کیا گیا وَمَا الوَھَنُ (وہن کیا چیز ہے) آپ نے فرمایا۔

حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ [1]

(دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری۔)

یعنی تمھیں دنیا سے رغبت و محبت پیدا ہو جائے گی جس سے عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کے کام نہ ہونے پائیں گے اور موت سے ناگواری اور کراہیت پیدا ہونے لگے گی جس کی بنا پر اعلاء کلمۃ اللہ اور حق کی سربلندی کی راہ میں جانبازی کا جوہر باقی نہیں رہیگا۔

امت مسلمہ کے مرض کی یہ تشخیص ایسے "طبیب" کی ہے جس کے پرواز کی ابتدا وہاں سے ہوتی تھی جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے۔ اور تجویز و تشخیص کے ہر مرحلہ میں ذرہ کائنات کے خالق و مالک سے رہنمائی حاصل کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس میں نہ غلطی کا احتمال ہو سکتا اور نہ ہوا و ہوس کے دخل انداز ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۵۳)

آپؐ جو بولتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے۔ اپنی خواہش سے آپؐ کچھ نہیں بولتے ہیں۔

مذکورہ تشخیص سے اس مغالطے میں پڑنے کی گنجائش نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدانخواستہ امت مسلمہ کو تارک الدنیا بنا کر بھوکوں اور ننگوں کی ایک "کالونی" آباد کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ مذہب اسلام کی غلط ترجمانی سے کبھی اس کا شبہ ہوتا ہے۔ آپؐ کا مقصد دنیا سے بے رغبت بنا کر عزم و شجاعت اور اقدام کے جذبات کو ابھارنا تھا تاکہ اہل دنیا دیکھ لیں کہ جس کو انھوں نے اپنی توجہات کا مرکز سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس با مقصد جماعت کی نظر میں اس قابل بھی نہیں ہے کہ وہ اس کو منہ لگائے اور اپنے دل میں جگہ دے بلکہ اس کا مطمحِ نظر اور نصب العین اس سے بہت بلند ہے۔

کیا اتنی موٹی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جس مکان کا مکین دنیا کا خالق و مالک ہو دنیا خود اس کے گرد چکر لگانے اور اس کے پاس رہنے میں اپنی عزت و سعادت سمجھے گی اس کا احسان

---

[1] ابو داؤد، بیہقی۔ مشکوٰۃ باب تغیر الناس۔

نہ ہوگا کہ وہ ہمارے پاس آئی ہے بلکہ ہمارا احسان ہوگا کہ ہم نے اس کو اپنے پاس جگہ دی۔

غرض ترک دنیا اور شے ہے اور دنیا سے بے رغبتی اس سے بالکل مختلف شئی ہے کسی عارف نے اس حقیقت کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد
اگر دارد برائے دوست دارد

محترم حضرات! مرض کی طرف ٹھیک نشاندہی ہو جانے کے بعد اب اس کے علاج کی طرف توجہ دیجئے۔ باہر کی کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جس حاذق طبیب نے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے اسی نے مزاج کی مناسبت سے گرمی سردی کا لحاظ کر کے آپ کے لئے نسخۂ شفا بھی مہیا کیا ہے۔ اس کو استعمال کیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح مردہ جسم میں جان پڑتی ہے؟

پہلے نسخہ کو سمجھ لیجئے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ (پ۱۳)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا تو اپنی سمائی کے مطابق وادیاں بہہ نکلیں۔ اور میل کچیل سے جھاگ بن بن کر پانی کی سطح پر اٹھا تو سیلاب کی رو اسے بہا لے گئی اور اسی طرح کا جھاگ (میل کچیل) اس وقت بھی اٹھتا ہے جب لوگ زیور یا کوئی اور چیز بنانے کے لئے دھاتوں کو آگ میں تپاتے ہیں، حق اور باطل کے معاملہ کی مثال ایسی ہی سمجھو جو اللہ بیان کر دیتا ہے بس (میل کچیل کا) جھاگ (جو کسی کام کا نہیں ہوتا) رائیگاں جاتا ہے اور جس چیز میں انسان

کے لئے نفع ہوتا ہے وہ زمین میں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ (لوگوں کی سمجھ بوجھ کے لیے) مثالیں بیان کر دیتا ہے۔

پانی، سونا، چاندی اور دوسری دھاتیں چونکہ انسانوں کے کام آنے والی اور نفع دینے والی چیزیں ہیں اس لئے وہ باقی رہتی ہیں اور اوپر آئی ہوئی "جھاگ" چونکہ غیر نافع اور بے سود ہے اس لئے وہ فنا ہو جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ دنیا میں مجموعی حیثیت سے جو نافع ہوتا ہے اس کو پائداری حاصل ہوتی ہے اور جو غیر نافع ہوتا ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے (بقائے انفع کا یہی مطلب ہے)

اس کے بعد قرآن حکیم نے وہ اعمال و اخلاق گنائے ہیں جن سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہونچتا ہے اور یہ اشارہ کیا ہے کہ قیام و بقا کا اصل سنگ بنیاد انہی اعمال و اخلاق پر رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اخلاق ہی کی شان ایسی ہے جس میں مالک تعالےٰ کی نیابت کا رنگ پایا جاتا ہے اور جو قوم اپنی زندگی میں نیابت کی شان پیدا کرلے گی اسی کو کائنات کی امانت سپرد ہوگی اور وہی حقیقی معنوں میں اللہ کی مخلوق کے لئے نافع بنے گی۔

جن اخلاقی اوصاف کا تذکرہ قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر ملتا ہے ان کی تفصیل یہ ہے ــــــ

اطاعت حق، ضمیر کی آزادی، شجاعت و بہادری، سچائی، انصاف، رحم، رواداری، ایفائے عہد، امانت و دیانت، عفو و درگذر، دشمن سے اچھا برتاؤ، مساوات، ایثار و قربانی، توکل و اعتماد، اطمینان و خودداری۔ شیریں کلامی۔ میانہ روی۔ عزم و استقلال، امید و پیش بینی۔ احتساب نفس، ذمہ داری کا احساس، ہر کام میں ایمانداری، حیا، و شرافت، عفت و پاک دامنی، محبت و مروت، صبر و ثبات۔ اخلاص و بے نفسی، نیکی سے الفت اور برائیوں سے نفرت، بے غرضی کے ساتھ دوسروں کی خدمت کا جذبہ وغیرہ۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وحی الٰہی جس قسم کا اخلاق قوم میں پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اور جس پر وہ ترقی کی بنیاد رکھتی ہے اس کی حیثیت اس اخلاق جیسی نہیں ہے جو قومی ترقی و سربلندی کے لئے صرف قومی پیمانہ پر اپنایا جاتا ہے کہ اس کا اثر صرف اپنی قوم کے دائرہ تک محدود ہوتا

ہے اور دوسری قوموں کے لئے وحشت و بربریت کا مظاہرہ بدستور جاری رہتا ہے۔ بلکہ یہ اخلاق عالمگیر افادیت اور عمومی رحمت پر مبنی ہونے کے ساتھ اس نظریہ کے ماتحت ہے کہ۔

الخلق کلھم عیال اللہ۔ 		کل مخلوق اللہ کی عیال ہے۔

(الحدیث)

النّاس کلھم اخوۃ۔ 		تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔

(الحدیث)

یہ اخلاق روحانی ضرورت اور ایمانی تقاضوں کے طور پر اپنایا جاتا ہے اور نیابت الٰہی کی شان پیدا کرتا ہے اور قومی اخلاق مصلحت اور پالیسی اور قومی عصبیت و منافرت کے پیمانہ پر قبول کیا جاتا ہے اور دوسروں سے نفرت و حقارت کی تخم ریزی کرتا ہے۔ اِس کی بنیاد خدا پرستی ور روحانی پاکیزگی پر ہوتی ہے اور اُس کی بنیاد قوم پرستی و وطن پرستی پر رکھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں کی وسعت و گہرائی میں کس قدر فرق ہوگا؟ اور دونوں کی افادیت میں کتنا نمایاں تفاوت ہوگا؟

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری "مردنی و شکستگی" کو دور کرنے کے لئے اور قیام بقاء کی جد و جہد میں کامیاب بنانے کے لئے جو نسخہ مہیا فرمایا ہے اس میں انھیں اعمال و اخلاق کو مرکزیت حاصل ہے جن کے ذریعہ ہم اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکیں اور ہمارے اندر ایثار و قربانی کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ خود کو فنا کر کے دوسروں کے بقاء کا سامان فراہم کریں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی 		تم کمال نیکی نہیں حاصل کر سکتے ہو
تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (پ۴) 		یہاں تک کہ اپنی محبوب ترین چیزیں خرچ کرو

بدقسمتی سے بلند و بانگ دعووں کے باوجود عرصہ سے مذہب کی نمائندگی جس قسم کی ہو رہی ہے اس میں وہی اعمال و اخلاق نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ جن کا تعلق "نافع" بننے اور بنانے سے ہے اور جو قیام و بقاء کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس دور میں اگر واقعی مذہب کی خدمت کرنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کی افادیت و صلاحیت کے پہلو کو عملاً اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو واپس لانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اور پھر اس کے ملنے والوں کا جو حشر ہو گا وہ حقیقت بیں نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ دراصل دنیا ایک باغ ہے اور مالک کے سامنے باغ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کا ایک نقشہ اور خاکہ ہے۔ مالک کو ایک ایسے باغباں کی تلاش ہے کہ جس نے اس نقشہ کے مطابق باغ کو مفید بنانے کی مشق کی ہو، جب تک ایسا باغباں نہ ملے گا عارضی طور پر حسب حیثیت و صلاحیت باغ کی سپردگی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اگر منشار کے مطابق باغباں مل جائے گا تو حق صاحب حق تک پہونچانے میں تامل نہ ہو گا۔

حقیقی مذہب میں مالک کی منشار کے مطابق باغ کی بناوٹ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اب یہ مذہب کے ماننے والوں کا کام ہے کہ باغبانی کی صحیح تربیت حاصل کر کے اس منشار کو پورا کریں اور مالک کے روبرو اس انداز سے پیش ہوں کہ وہ اپنے وعدہ و اعلان کے مطابق خوش آمدید کہنے میں مسرت محسوس کرے۔

"باغ" کو مقصود نہ بنائیں بلکہ منشار کے مطابق باغبانی کے فرائض انجام دے کر اس کو مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھیں۔ اگر بالفرض قیام و بقار کی جدوجہد میں باغبانی یا باغ کو مقصود بنا لیا گیا تو زندگی کی تربیت نہ ہو سکے گی اور آزمائش کی کسوٹی پر آنے کے بعد ہی اندر کی اصل حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اپنے فرائض ادا کرنے اور اپنی اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسئلہ اجتہاد کا ایک تحلیلی جائزہ

اور

مستقبل میں اس کا کردار

از ــــــ استاذ مصطفےٰ احمد الزرقاء (دمشق)

ترجمہ ــــــ مولانا سعید الرحمن اعظمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی فقہ میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اجتہاد نے اس خلاء کو پر کیا، اور اس طرح شریعت محمدی کی خدمت میں اس نے اپنا بہترین کردار ادا کیا۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو قرآن کریم کی کئی سو آیتیں اور اسی طرح کئی سو حدیثیں احکام سے متعلق موجود تھیں۔ قرآن وحدیث کے یہ نصوص اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھے، مگر ان میں عمومیت، لچک اور مسائل کا استیعاب، ان کی علت کا بیان اور شریعت کے بنیادی اور اہم اصول کا اثبات کچھ اس طرح پایا جاتا تھا کہ ان سے فقہ اسلامی اور اجتہاد کے لئے قواعد اور قانونی نظریات و احکام کے مستنبط کرنے میں بڑی مدد ملی بلکہ وہ اجتہاد کے لئے ایک بہترین بنیادی پتھر ثابت ہوئے ــــــ

مثال کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ — اے ایمان والو اپنے عہدوں اور قول و قرار کو پورا کرو۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد۔

لا ضرر ولا ضرار۔ نہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ ضرر کا مقابلہ ضرر پہنچا کے کیا جائے

"ضرار" کا مطلب یہ ہے کہ ضرر کا مقابلہ ضرر سے کیا جائے، یعنی اگر کسی نے کسی کا کوئی مال تلف کر دیا تو اس کے مقابل میں ضرر پہونچانے والے کے مال کو تلف نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کے عوض میں تلف شدہ مال کا بدل جو اس کے برابر ہو دلوایا جائے گا۔ اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہ تین دور ایسے گذرے ہیں جن میں مجتہدین و فقہاء جزیرۂ عرب اور دوسرے تمام مفتوح اسلامی ملکوں میں بکثرت موجود تھے۔ اور احکام و مسائل کے استنباط کرنے، نصوص کے سمجھنے اور ان پر نئے حالات کو منطبق کرنے میں ان تمام مجتہدین کے کچھ خاص اصول و نظریات تھے جو کبھی ایک دوسرے سے متفق اور کبھی مختلف ہوتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں ادوار میں جتنے مجتہدین اور فقہاء پیدا ہوئے تقریباً اتنے ہی اجتہادی مذاہب بھی سامنے آئے۔ اس لئے کہ ہر مجتہد کا ایک مسلک تھا جو شرعی مسائل میں اس کے فقہی نظریات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یعنی ہر مذہب شریعت کے تمام مباحث و مسائل میں ایک مکمل شرعی قانون کا حامل ہوتا تھا۔

ان فقہی مذاہب میں بعض مذاہب کے ماننے والے جب مفقود ہو گئے تو عملی دنیا میں ان مذاہب کا بھی خاتمہ ہو گیا اور بجز کچھ متفرق مسائل کے جو فقہی اختلافات کی کتابوں میں نقل کئے جاتے ہیں ان مذاہب میں سے کچھ بھی باقی نہیں ہا لیکن جن مذاہب کے ماننے والے زیادہ پائے گئے اور انھوں نے اپنے مذاہب کے اماموں سے جو کچھ سنا اور سیکھا تھا اس کو محفوظ رکھا اور اس کو مدون کیا اور اس کو حسب ضرورت پھیلا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تو لوگوں نے اس کو پوری عقیدت سے سیکھا، اور ان مذاہب کو دوام حاصل ہوا۔ اور نسلاً بعد نسلٍ ان کی تدوین و توسیع ہوتی رہی، میری مراد ان سے مذاہب اربعہ ہیں۔

پھر جوں جوں ان اجتہادی مذاہب کو استقرار و کمال حاصل ہوتا گیا اور ان کی فقہی تصنیفات بڑھتی گئیں اور زمانے کے ساتھ بتدریج مسلمانوں کی بڑی تعداد شریعت اور لغت کے ان علوم میں کمال اور تبحر حاصل کرنے سے دور ہوتی گئی جن سے اجتہاد کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ ان مذاہب اربعہ کے مقلدین اور ان کے ماننے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ اور عباسی دور کے عروج کے بعد سے عالم اسلام کے تمام اقطار میں انہی مذاہب میں سے کسی ایک کو سیادت و برتری حاصل ہوتی رہی اور اسی کے قاضی اور مفتی رہے۔

رفتہ رفتہ ان مذاہب اربعہ میں ان کے اکابر علماء کی کوششوں سے تفریع و تخریج اور تصنیفات کا سلسلہ بڑھتا رہا اور وہ اس حد پر پہونچ گیا کہ ان مذاہب کے متبعین نے دیکھا کہ بقدر ضرورت یہ کام انجام پاگیا اور اجتہاد مطلق کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ بہت ہی نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ تو اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں جمہور امت کی قوت تمیز اتنی مدھم نہ پڑ جائے کہ وہ اجتہاد کی صلاحیت اور اس کے شرائط کو نہ سمجھ سکے اور نااہل بھی ان کے سامنے اجتہاد کا دعویٰ کر کے انھیں دھوکے میں ڈال سکیں اور ان کے دین میں خلل اور فساد پیدا کر دیں۔ اسی اندیشہ کے ماتحت ان مذاہب کے علماء نے چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق کا دروازہ بند کئے جانے کا فتویٰ دے دیا۔

لیکن ان مذاہب کے اصول کے ضمن میں اجتہادِ مقید کا سلسلہ جاری رہا اور بڑے بڑے علماء مختلف زمانوں میں اپنے اصول فقہ کے مطابق نئے مسائل کے اجتہادی حل پیش کرتے رہے۔ جن میں وہ زیادہ تر اپنے مذاہب کے مسائل پر قیاس یا استحسان یا مصالح مرسلہ کے اصول سے استدلال و استناد کرتے رہے۔

چنانچہ اسی طریقہ سے پانچویں صدی ہجری میں سود کی مشکلات سے نجات پانے کے لئے مذہب حنفی میں بیع وفا کے احکام جاری کئے گئے۔ اسی طرح بعض مذاہب کے متاخرین فقہاء نے ایسے قرضدار کے وقف اور اس کے تمام تصرفات مالی کے عدم نفاذ کا فتویٰ دیا جس کا قرض اس کے تمام املاک و اموال پر حاوی ہو، جب تک کہ قرضخواہ اس بات پر راضی نہ ہو، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرضدار اس طریقہ سے وقف یا ہبہ کو حیلہ بنا کر قرضخواہ سے اپنے اموال و املاک کو بچانے کی کوشش نہ کرے۔ ایسے استحسانی مسائل کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہ اجتہاد مقید بھی صلاحیتوں کے انحطاط اور علمی سطح کے گرنے کی وجہ سے زمانے کے ساتھ ساتھ مدھم پڑتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ اسلامی اپنے اس آخری دور میں کسی بھی نئی بحث اور نئے مسائل کے بیان کرنے سے قاصر رہی، اور محض پرانے مسائل و مباحث کا حفظ و تکرار بن کر رہ گئی، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ بہت سے علماء اور فقہاء نے فقہ کی تعلیم میں مذہبی آراء و احکام کی دلیلوں سے بحث کرنا بھی ایک ناپسندیدہ امر تصور کیا۔

اِدھر عثمانی دور کے اواخر سے یہ بات دیکھی جا رہی ہے کہ عالم اسلام کے ارباب حکومت یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلامی شریعت اور فقہ تک کی اس لازمی قانون سازی کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے جو ہمہ دم بدلنے والے اور تغیر پذیر عصری تقاضوں کی تنظیم کے لئے ضروری ہے، اسی خیال کے ماتحت انھوں نے بلا تکلف غیر اسلامی قوانین کو اپنانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں فقہ اسلامی بے اعتنادی کا شکار ہو گئی۔ اور تمام طبقوں میں وہ علم و عمل دونوں لحاظ سے دفن ہو کر رہ گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نتیجہ کے آثار ابن قیم رحمہ کے زمانے ہی میں ظاہر ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" اور "اعلام الموقعین" میں ایک وسیع نفسیاتی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس گفتگو میں اہل مذاہب کے جمود اور شریعت کے سرچشموں اور اس کے وسیع آفاق کو تنگ کرنے پر تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اہل مذاہب کی اس تنگ نظری نے سربراہان حکومت، امراء اور بادشاہوں کو دقتی اور غیر اسلامی قوانین کے نافذ کرنے پر مجبور کیا، اس لئے کہ فقہی احکام کو انھوں نے اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ وہ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ تنگ نظری شریعت میں نہیں ہے بلکہ خود اہل مذاہب تنگ نظر ہیں۔

اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اجتہاد کے دروازے کا بند کرنا ایک بڑا سانحہ تھا جو اسلامی شریعت اور اس کی فقہ کے ساتھ پیش آیا۔

اجتہاد کے دروازے کو بند کرنا دراصل کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے جب تک کہ اسلام اپنی خصوصیات کے ساتھ قائم ہے، یہاں تک کہ مذاہب اربعہ کے بالغ النظر متاخر علماء اپنی کتابوں

نیز یہ تصریح کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کے مرتبہ کو پہونچ گیا بایں طور کہ اس کے تمام شرائط اور صلاحیتیں اس کے اندر موجود ہیں تو اس کے لئے کسی خاص مذہب کی تقلید کرنا روا نہیں ہے لیکن عملاً یہ لوگ بھی کسی کے لئے اس طریقہ تک پہونچنا تسلیم نہیں کرتے۔

یعنی اجتہاد کے دروازے کو کھولنا ان کے نزدیک ممنوع نہیں ہے۔ البتہ اس کے قفل کی کنجی ان کی نظر میں مفقود ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے جلیل الشان شافعی المسلک فقیہ علامہ عزالدین بن عبد السلام کہتے ہیں کہ ـــــ

"لوگوں نے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے پر کئی طرح سے کلام کیا ہے، حالانکہ یہ سارے اقوال لغو ہیں، صحیح یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا نیا مسئلہ پیش آتا ہے جس کے متعلق کوئی نص صریح موجود نہیں ہے یا اس میں اسلاف کے مابین اختلاف ہے تو اس مسئلہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہتا ہے تو بلا شبہ وہ بکواس ہے۔ [1]

اس مسئلہ پر منصفانہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے بلکہ اجتہاد موقوف ہو گیا ہے۔ ہم ایک تحلیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں جو ماضی میں اجتہاد کے مزاج و کردار اور اس کی نوعیت پر مشتمل ہے۔

ماضی میں اجتہاد کی نوعیت اور اس کا مزاج۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اجتہاد کا امتیازی وصف شوریٰ تھا۔ یعنی مشورہ سے مسائل کو حل کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سارے قانونی اور سیاسی اہم مسائل میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کرتے تھے اور ان مسائل کے سیاسی اور شرعی حل کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ وہ لوگ قرآن کریم کی آیت شوریٰ کی رہنمائی میں جو تمام امور میں شوریٰ کی ہدایت

[1] رسالۃ الاجتہاد والتقلید۔ از شیخ عبدالوہاب الخلاف ص ۱۶

دیتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرتے تھے جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے جب کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے متعلق کوئی نص صریح کتاب وسنت میں موجود نہ ہو تو وہ کیا کریں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اہل علم کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرو۔ اور کسی ایک فرد کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

پھر بعد کی صدیوں میں اجتہاد انفرادی ہو گیا۔ یعنی ہر مجتہد اپنے اجتہاد میں خود اپنی مستقل رائے رکھنے لگا۔ وہ اپنی فہم و فراست کے مطابق مسائل کا استنباط کرتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام اسلامی فتوحات کے بعد مختلف ملکوں میں پھیل گئے، جس کی وجہ سے ان کا اکٹھا ہونا اور آپس میں مشورہ کرنا بہت دشوار ہو گیا۔

اجتہاد کے ماضی پر غور کرتے ہوئے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اسلام کی ابتدائی عہد میں لوگ چونکہ اسلام سے نئے نئے متعارف ہوئے تھے اور اس کا اثر ان کے دلوں پر بالکل تازہ تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تیسری صدی میں برابر تعلیم و تعلم اور روایت کے ذریعہ لوگوں تک منتقل ہوتی رہیں، اس لئے ایک بہت بڑی تعداد قرآن و حدیث کے مطالعہ اور تفقہ فی الدین نیز عربی زبان سیکھنے میں اپنی زندگی وقف کئے ہوئے تھی اور وہ اس میدان میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لئے انتہائی محنتیں کرتے تھے، اور پوری پوری عمریں علم کی تحصیل میں گذار دیتے تھے۔ اس لئے علماء میں اہل و نااہل اور اجتہاد کے حقدار اور ناحق دار اور مدعی کے قابل و ناقابل کا پہچانا جانا اس زمانہ میں آسان تھا، لیکن زمانہ جوں جوں گذرتا گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد جو مشعل اسلام اور مینارۂ نور تھا۔ دور ہوتا گیا۔ اور عالم و غیر عالم کے درمیان بہت کم تفاوت باقی رہ گیا۔ اور لوگوں کی صلاحیتوں اور ان کی علمی استعداد میں کمی واقع ہو گئی تو چوتھی صدی ہجری میں اہل مذاہب کو اس بات کا اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ایسے لوگ نہ پیدا ہو جائیں جو اجتہاد کا جھوٹا دعوی کر کے گمراہی اور دین میں تحریف و بدعات کے پیدا ہونے اور پھیلنے کا موجب بنیں اور شریعت کے اصول و قواعد میں فساد برپا کریں، اس بنا پر انھوں نے اس زمانے میں رائج مذاہب اربعہ کے مسائل و مباحث

کو ضرورت کے لئے کافی سمجھتے ہوئے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے کا فتویٰ صادر کیا۔

ماضی میں اجتہاد کے مزاج اور اس کے کام کے اس مختصر تجزیہ کی روشنی میں ہم آسانی کیساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انفرادی اجتہاد کا کام جو فقہ اسلامی کی تاسیس کے ابتدائی دور میں اس زمانہ کے مجتہدین کے ہاتھوں انجام پایا۔ وہ اس امت کے لئے بڑے خیر کا باعث بنا اس لئے کہ اس کی وجہ سے امت کے عزائم بلند ہوئے، اس کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اور اساطین علم وفقہ نے شریعت کے نصوص و قواعد کی روشنی میں قانونی نظریات کی تاسیس اور قواعد کے استنباط میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں پوری محنتیں کیں، جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ تھا کہ فقہی مسائل و مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آگیا جس میں اصول و نظریات اور جزئی احکام سبھی کچھ موجود تھا۔ اس ذخیرہ نے ہمیشہ کے لئے ایک ایسا فقہی سرچشمہ عطا کیا جس کی مثال کسی قوم اور امت میں نہیں مل سکتی اور اگر یہ انفرادی اجتہاد ابتدائی تین صدیوں میں نہ انجام پاتا تو اتنے بڑے فقہی سرمایہ کا وجود بالکل ناممکن تھا۔

پھر یہ بھی ایک بہت بڑی مصلحت تھی کہ اس کے بعد انفرادی اجتہاد کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ تاکہ اس کی وجہ سے جو اندیشے پیدا ہو گئے تھے، وہ دور ہو جائیں اور فقہ و شریعت کا معاملہ افراتفری اور لاقانونیت کا شکار ہو کر نہ رہ جائے۔ البتہ غلطی صرف یہ ہو گئی کہ اجتہاد کو مطلقاً موقوف کر دیا گیا۔ جو شریعت اور فقہ اسلامی پر تنگ نظری اور جمود کے الزام کا باعث بنا، اس لئے یہ ضروری تھا کہ اجتہاد کی اس لاقانونیت کو دفع کرنے کے لئے اجتہاد کی حرمت کا فتویٰ نہ دیا جاتا۔ بلکہ اس کو افراد کے ہاتھوں سے لے کر جماعت کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا جاتا۔ اور اس کی تنظیم کی جاتی۔ اجتہاد کا یہی وہ کردار ہے جو مستقبل میں لازمی طور پر اس کو انجام دینا ہوگا۔

مستقبل میں اجتہاد کا کردار۔

اجتہاد کے بارے میں ماضی کی تاریخ اور اس کی غلطیوں کو جان لینے کے بعد مستقبل میں اجتہاد کا واجبی کردار بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اگر ماضی میں انفرادی اجتہاد ماضی کی ایک ضرورت تھی تو آج انفرادی اجتہاد ایک ست

بڑا اہتمام رہے۔ اس لئے کہ چوتھی صدی ہجری میں انفرادی اجتہاد کی وجہ سے جن خطرات کے واقع ہونے کا اندیشہ تھا وہ آج نہ صرف موجود ہیں بلکہ اب وہ ایک امر واقع بن چکا ہے۔

چنانچہ دین کی سوداگری کرنے والے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو خوب پڑھے لکھے ہیں، بلکہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو علم و مطالعہ اور تحریر و تقریر میں شاید صالح اور متقی علماءِ دین کے مقابلہ میں بھی فائق ہوں —— آج ازہر کے فضلاء میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ایسی ایسی کتابیں اور فتاویٰ شائع کئے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انھوں نے اپنا علم و دانش دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں بیچ ڈالا ہے۔ اور وہ اسلام کی اس طرح بیخ کنی کر رہے ہیں کہ اس کے کھلے دشمن اتنا نہیں کر سکتے تھے۔ علم دین کے یہ تاجر بلا شبہ دین سے خارج ہو چکے ہیں زیادہ منافق اور خائن ہیں جو اجتہاد اور آزادیٔ رائے کی آڑ لے کر دین کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ اور اپنے اس کاروبار کے ذریعہ وہ دنیا کے بڑے بڑے منافع اٹھا رہے ہیں اور دولت کما رہے ہیں اور اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کی طرف سے بالکل بے پروا ہیں۔

پس ان حالات میں اگر ہم چاہتے ہیں کہ شریعت اور فقہ اسلامی میں اس اجتہاد کے ذریعہ روح اور زندگی پیدا ہو جس کا جاری رہنا امت میں شرعاً ضروری ہے، اور جو وقتی مسائل کے شرعی حل تلاش کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور جس کے بغیر اب شریعت کے وقار کو بچایا نہیں جا سکتا تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم اجتہاد کے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھیں، یعنی انفرادی اجتہاد سے قطع نظر کر کے اجتماعی اجتہاد کو رائج کریں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اجتہاد کا صحیح مزاج اور اس کا وہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں موجود تھا ——

اس وقت اس اجتماعی اجتہاد کو بروئے کار لانے کا طریقہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مجلس قائم کی جائے بالکل اسی طرز پر جس پر علمی اور ادبی اکاڈیمیاں قائم ہوتی ہیں، اور اس کے لئے ہر اسلامی ملک سے ایسے راسخ العلم اور بالغ نظر مشاہیر علماء منتخب کئے جائیں جو ایک طرف شریعت کے علوم اور وقتی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوں، اور دوسری طرف سیرت و تقویٰ کا ایک پاکیزہ نمونہ ہوں ——

ان علماء و فقہا کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے چند ایسے ماہرین بھی ہونے چاہئیں جن کے دین پر بھی پورا اعتماد کیا جا سکتا ہو، اور جو ضروری عصری علوم مثلاً اقتصادیات، اجتماعیات، قانون اور طب میں ایسی دستگاہ رکھتے ہوں کہ علماء اور فقہا کو اپنی فنی مہارت کی وجہ سے صائب مشورے دے سکیں، اور ان کے کام میں پوری مدد کر سکیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ فقہ اسلامی کی اس مجلس کے ممبران اس اہم ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے بالکل یکسو اور فارغ ہوں ان کے پاس ایک وسیع لائبریری ہو ان کو معقول وظائف اور تنخواہوں کے ذریعہ فکر معاش سے بالکل فارغ کر دیا جائے تاکہ اجتہادی مسائل پر غور کرنے کے لئے اور نئے نئے مسائل اور عصری مشکلات میں اسلام کے موقف کو معلوم کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو وقف کر دیں اور بالکل یکسو ہو کر اس ذمہ داری کو انجام دے سکیں۔ ان کو اپنے مباحث کے لئے ایک مجلہ کی بھی ضرورت ہوگی اور فقہ کی ایک انسائکلوپیڈیا ڈکشنری کے طرز پر مرتب کرنی ہوگی جس طرح قانونی انسائکلوپیڈیا مرتب ہوتی ہیں۔ اسی طرح حروف تہجی کے اعتبار سے فقہ کی امہات الکتب اور مصادر و مراجع کی ایک فہرست تیار کرنی ہوگی تاکہ کام کرنے والوں کے لیے مراجعت آسان ہو۔

اس منصوبہ کے لئے ایک وسیع بجٹ بنانا پڑے گا۔ اور بہت بڑا سرمایہ فراہم کرنا ہوگا جس کو صرف دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ایک مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے عوامی چندہ سے، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ باہمی انتشار و تفرق اور عامۃ المسلمین میں دینی شعور کی کمی اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام سے بے تعلقی اور دینی بے حسی کی وجہ سے اس میں کامیابی کا بہت کم امکان ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایک اسلامی حکومت یا متعدد اسلامی حکومتیں مل کر اس ذمہ داری کو قبول کریں اور اس کو اپنے بجٹ کی ایک مد بنائیں۔

اس قسم کی ایک فقہی مجلس قائم کرنے کا فیصلہ دو اسلامی کانفرنسوں میں جو

کراچی میں ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی تھیں ہوا بھی تھا۔ اور میں بھی ان دونوں کانفرنسوں میں شریک تھا لیکن افسوس کہ وہ تجویز کاغذ ہی پر رہی۔ ہماری اسلامی حکومتیں ہر کام میں بے دریغ روپیہ صرف کر سکتی ہیں لیکن اسلام کی کسی صحیح خدمت کے لیے ان کو کچھ صرف کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون ۝

قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني وان هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله

چاند کے بارہ میں ریڈیو کی خبر

[مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر]

اس سال ہندوستان کے بہت سے مقامات پر یہ واقعہ پیش آیا کہ ۲۹ر رمضان کو چاند نظر نہیں آیا لیکن دو ڈھائی گھنٹے کے بعد دہلی اور مختلف صوبوں کے ریڈیو اسٹیشنوں نے بتایا کہ فلاں فلاں علاقوں اور شہروں میں (مثلاً کلکتہ، حیدر آباد اور مدراس میں) چاند دیکھا گیا ہے اور کل ان مقامات پر عید ہے۔ اس کی بناء پر بہت سے مقامات پر مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا۔ ایک طبقہ نے ریڈیو کی خبر کو قابل اعتبار مان کر شنبہ کو عید کرنی چاہی، دوسروں نے اس کو کافی نہیں سمجھا اور انھوں نے شنبہ کو روزہ رکھنا ضروری سمجھا۔ بعض مقامات پر اس اختلاف کے نتیجہ میں دو دو عیدیں ہوئیں اور سخت خلفشار پیدا ہوا ــــــ کئی جگہوں سے اس سلسلہ میں دفتر الفرقان سے بھی استفسار کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے دینی اور علمی حلقے ایسے مسائل کے بارہ میں بھی جن سے ہر سال سابقہ پڑتا ہے کوئی ایسا اجتماعی فیصلہ نہیں کر سکے جس سے اس قسم کے اختلافات کا کچھ سد باب ہو سکتا ــــــ عوام کا حال بھی یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ان چیزوں کو علماء پر چھوڑ دیں خود ہی فیصلے کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ کی وہ کوششیں ــــ ہمارے علم میں ہیں جو امارت شرعیہ صوبہ بہار اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہوئی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجلس تحقیقات شرعیہ (جو اس قسم کے مسائل ہی کے حل کے لئے قائم ہوئی ہے) اس وقت جن مسائل پر غور کر رہی ہے ان میں یہ

یہ مسئلہ بھی شامل ہے ——— خدا کرے کہ ان سب محنتوں کے نتیجہ میں اور سب کے اشتراک و تعاون سے ایسے اجتماعی فیصلے سامنے آئیں جو اجتماعیت کے وزن کی وجہ سے اس قسم کے اختلافات کے انسداد میں مؤثر ہوں۔

اب سے قریباً دس سال پہلے بھی بالکل اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا جس طرح کا اس سال پیش آیا اور بہت سی جگہوں پر دو دو عیدیں ہوئی تھیں، اُس وقت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم سے بھی اس بارہ میں استفسار کیا گیا تھا، مولانا نے جو جواب دیا تھا وہ ضلع مونگیر (بہار) کے ایک صاحب (چودھری مسعود الحسن صاحب) کے پاس محفوظ تھا، کچھ عرصہ ہوا موصوف نے وہ الفرقان میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا ان کے شکریہ کے ساتھ وہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (انشاء اللہ آئندہ اس مسئلہ پر الفرقان میں کچھ تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ کوئی اور صاحبِ علم تحریر فرمائیں تو الفرقان کے صفحات حاضر ہیں) ———

مولانا گیلانی مرحوم کا جواب بہت مختصر اور اصولی ہے۔ لیکن اس میں وہ بات پوری طرح آگئی ہے جو اس مسئلہ پر غور کرنے والے اہل علم کے لئے بنیاد کا کام دے سکتی ہے ——— مولانا کے جواب کی بنیاد اس تنقیح پر ہے کہ "ریڈیو کی خبر" رویت ہلال کی "شہادت" یا "قاضی کا فیصلہ" نہیں ہے، بلکہ وہ رویت ہلال کے بارہ میں مسلمانوں کے فیصلہ کی خبر اور اس کی نشانی ہے اور اس سے "ظن غالب" حاصل ہو جاتا ہے ——— اس لئے "شہادت" اور "حکم قاضی" کی شرائط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ———

مولانا نے جس سوال کا یہ جواب لکھا تھا وہ خود جواب سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) ریڈیو سے خبر چاند کے طلوع یا عدم طلوع کی نہیں دی جاتی۔ بلکہ مسلمانوں کے فیصلہ کی خبر دی جاتی ہے۔ مثلاً دلی کے مسلمانوں میں طے ہو گیا کہ عید کا چاند دیکھا گیا، عید کی نماز کل ہوگی،

پس یہ خبر مسلمانوں کے فیصلہ کی ہے نہ کہ رویت ہلال کی۔

(۲) خبروں پر اعتماد کرنے کا فقہ میں بھی وہی طریقہ لکھا ہے جو فطرت کا اقتضا ہے اور جو عام طور پر مروج ہے، قبلہ کی جہت کا پتہ مسافر کو اگر نہ چلے تو لکھا ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم کے متعلق بھی مسئلہ یہی ہے کہ ـــــــ

اخبارہ فیما ھو من امر الدیانات مالم یغلب علی الظن صدقہ۔	دینی معاملات میں اس وقت تک (غیر مسلم کی خبر پر بھروسہ نہ کیا جائے گا جب تک کہ اس کے سچے ہونے کا گمان غالب نہ ہو۔
(شامی ص ۴۰۱ ج ۱)	

مطلب جس کا یہی ہے کہ ظن غالب اگر غیر مسلم آدمی کی اطلاع سے پیدا ہو تو اس کی خبر پر بھی بھروسہ کر کے اسی سمت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لینی چاہیئے جسے قبلہ کی سمت غیر مسلم آدمی کی اطلاع میں قرار دیا گیا ہو۔

اب اس سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ ریڈیو اور تار وغیرہ کی خبروں پر لوگ کاروبار کرتے ہیں، کسی کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو عام طور پر یہی احساس پیدا ہوتا ہے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ تار ملتا ہے کہ فلاں عزیز آپ کا بیمار ہے آپ روانہ ہو جاتے ہیں، روپیہ خرچ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ ظن ریڈیو اور تار کی خبروں سے پیدا ہوتا ہے بلکہ غلبۂ ظن کے لئے آدمی کا بھی ہونا فقہاء کے نزدیک ضروری نہیں۔ شامی کا مشہور مسئلہ ہے کہ۔

یلزم اھل القری الصوم بسماع المدافع او رویۃ القنادیل من المصر لانہ علامۃ ظاھرۃ تفید غلبۃ الظن و غلبۃ الظن حجۃ موجبۃ للعمل۔	شہر سے توپوں کی آواز آئے یا قندیلوں کی روشنی دکھائی دے[1] تو دیہات والوں پر روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے کیونکہ توپ کی آواز یا قندیلوں کی روشنی کھلی ہوئی علامت ہے جس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے اور ظن غالب ایسی دلیل ہے جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔
(شامی ص ۱۲۵ ج ۲)	

---

[1] دستور تھا کہ چاند کی رویت ثابت ہو جانے پر مصر وغیرہ مرکزی شہروں میں توپیں داغی جاتی تھیں اور بلند میناروں پر قندیلیں روشن کی جاتی تھیں، دیہات والوں کیلئے ان توپوں کی آوازوں کا سننا اور قندیلوں کا دیکھنا فقہاء کے نزدیک ثبوت رمضان و عید کے لئے کافی تھا [illegible]

بہرحال ریڈیو یا تار وغیرہ کی خبروں سے "ظن غالب" کسی وجہ سے اگر نہ پیدا ہوتا ہو تو اس وقت بلاشبہ اعتماد نہ کرنا چاہیے لیکن جب تک لوگ ریڈیو اور تار کی خبروں پر اعتماد کر رہے ہیں صرف اس خبر پر کہ "فلاں جگہ کے مسلمانوں نے کیا فیصلہ رویت ہلال، یا نماز عید کے متعلق کیا" محض اس پر اعتماد نہ کرنا بظاہر فقہی جزئیات کے خلاف ہے ــــــ فقط

فقیر سید مناظر احسن گیلانی غفر اللہ لہ ولمن ربّاہ

۲۸ر جولائی ۵۳ء

سوانح حضرت مولینا عبدالقادر رائپوری رح

(از مولینا سید ابوالحسن علی ندوی)

اس دور کے عارف ربانی، شیخ المشائخ حضرت رائپوری (۱۳۸۲ء) کے مفصل حالات زندگی، اوصاف خصوصیات، مجاہدات و ریاضات، ہدایت و ارشاد کا دلآویز تذکرہ جس کے مطالعہ میں آپ انشاء اللہ بزرگوں کی صحبت کا اثر پائیں گے۔ صفحات ۳۲۴۔ مجلد مع گرد پوش، عمدہ کاغذ و طباعت ۵ روپیہ (5/-/-)

اعلان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

مطابق فارم ۴ رول ۸

مقام اشاعت	کچہری روڈ لکھنؤ
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر پبلشر اڈیٹر و مالک کا نام	محمد منظور نعمانی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ

میں (منظور نعمانی) تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اندراجات میرے علم اور یقین کی حد تک بالکل درست ہیں ــــ منظور نعمانی (پرنٹر و پبلشر)

قابل مطالعہ کتابیں

رحمۃ للعالمین :۔ از۔ قاضی سلیمان منصور پوری مکمل مجلد دو جلدوں میں -/۲۰

رسول اللہ کی سیاسی زندگی ۔ از ڈاکٹر حمید اللہ -/۸

اسلام (اس کا آغاز اور ارتقا) از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

حضرت ابو بکر و فاروق اعظم (از ڈاکٹر طہٰ حسین (جلد) ۱/۹ دونوں ایک جلد میں ۶/۷۵

تاریخ الخلفاءؒ (از علامہ سیوطی مترجمہ اقبال الدین احمد خلفائے راشدین سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کے دور کی مکمل تاریخ قیمت -/۱۲

ائمہؒ اربعہ (از رئیس احمد جعفری) چاروں اماموں کی سوانح حیات اور اجتہادی خدمات مجلد -/۱۰

حیات امام ابن القیم بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبد العظیم کے قلم سے، مترجمہ سید رشید احمد ارشد -/۱۲

فقہ الاسلام ۔ از حسن احمد الخطیب مترجمہ ایضاً ارشد صاحب :۔ فقہ اسلامی کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ اور دور جدید کے پس منظر میں اصول شریعت پر گفتگو مجلد -/۱۲

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (مکمل) -/۲۱

فتاویٰ رشیدیہ (یعنی مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کا مجموعہ) -/۸

تذکرۃ الرشید :۔ حضرت مولانا گنگوہی رحؒ کی مکمل سوانح حیات ۲ جلد -/۸

سوانح قاسمی :۔ حضرت مولانا محمد قاسم بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی مکمل سوانح حیات از مولانا گیلانی مرحوم ۳ جلد، مجلد -/۱۵

حیات انور :۔ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی سوانح حیات -/۴

نقش حیات :۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات مکمل (دو جلدوں میں) غیر مجلد ۸/۵۰، مجلد ۱۰/۵۰

مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول -/۶ جلد دوم -/۶ جلد سوم ۴/۵۰

ارشادات مولانا مدنیؒ ۳/۵۰

مکتوبات سلیمانی (مرتبہ مولانا عبد الماجد دریا بادی) مجلد -/۵

مولانا دریا بادی کی تفسیری کتابیں

قصص و مسائل -/۲

قرآنی شخصیتیں ۲/۲۵

حیوانات قرآنی -/۲

جغرافیہ قرآنی ۱/۲۵

بشریت انبیاء (قرآن مجید کی روشنی میں) ۲/۲۵

کتاب الصلوٰۃ ۔ از مولانا عبد الشکور صاحب لکھنویؒ جس میں نماز کی اہمیت و خصوصیات، پر قرآن مجید کی ایک سو آیات اور احادیث نبوی اور اقوال ائمہ سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔ مجلد ۔ ۲/۵۰

مجلس تحقیقات و نشریات کی کتابیں

مقالات سیرت ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ۴/۵۰

طوفان سے ساحل تک ۔ از محمد اسد لیوپولڈ -/۵

اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ۔ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ۴/۵۰

ہندوستانی مسلمان ۔ از مولانا ندوی -/۳

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ (یوپی)

سلسلہ تجدید دین

از مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ

تجدید دین کامل۔ -/۵
تجدید تصوف و سلوک -/۵
تجدید معاشیات -/۵
تجدید تعلیم و تبلیغ -/۳
نظام صلاح و اصلاح ۳/۵۰
اصلاح رسوم و تردید بدعات کے سلسلہ کی کتابیں
بہشتی زیور اختری مکمل مدلل ۱۳/۵۰
اصلاح الرسوم — از مولانا تھانوی ۱/۷۵
تعلیم الدین 〃 〃 ۱/۷۵
کیا ہم مسلمان ہیں ۲/۲۵
رد بدعت ۱/۲۵
بدعت کیا ہے -/۳
چالیس بدعتیں -/۶۲
براہین قاطعہ (نیا ایڈیشن)
تحقیق مذاہب ۵/ (بریلوی حضرات کے الزامات کا جواب)
وحید دماغ ۲/
(شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ) -/۱
تعزیر علماء اسلام کی نظر میں -/۲۷
ہدایت الشیعہ (از مولانا گنگوہی رح) -/۱

تاریخ دعوت وعزیمت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتاب

جلد اول : پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک کے مجددین کا تذکرہ —— ۶/

جلد دوم — آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہ اور اُن کے تلامذہ کے کارنامے — ۶/۵۰

جلد سوم :۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء اور خواجہ شرف الدین یحییٰ منیری رح کے دینی کمالات اور ایمانی کارناموں کا مفصل تذکرہ۔ قیمت -/۵

(مجلدیں فی جلد ایک روپیہ کا اضافہ)

تصانیف شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ

فضائل قرآن مجید۔ -/۶۰
نماز -/۷۰
فضائل رمضان -/۵۵
فضائل تبلیغ -/۳۰
فضائل ذکر ۱/۶۰
حکایات صحابہ ۱/۵۰
تبلیغی نصاب مکمل مجلد چرمی ۶/۵۰
〃 معمولی جلد ۵/۷۵
فضائل صدقات کامل مجلد ریگزین ۶/-
〃 〃 〃 چرمی ۶/۵۰
خصائل نبوی (شرح شمائل ترمذی)

حج کے موضوع پر چند اہم کتابیں ۶/
فضائل حج ۲/۵۰
معلم الحجاج ۲/۷۵
حج کا مسنون طریقہ ۱/۲۵
رفیق حج ۱/۵۰
حجۃ الوداع ۱/۵۰
آپ حج کیسے کریں (جدید ایڈیشن) ۲/-
آسان حج -/۵۰
سفر حجاز۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ۵/
سفرنامہ حجاز۔ مولانا رفیع الدین صاحب مرادآبادی ۱/۵۰
اعیان الحجاج ۳/۵۰

تذکرہ مجدد الف ثانی رح

شیخ احمد سرہندی رح کا وہ خاص کارنامہ جس کی وجہ سے آپ کو "مجدد الف ثانی رح" کا عظیم لقب اختصاصاً ملا، اس کارنامہ کو پوری تین سو سال کے بعد "الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ" نے طشت از بام کیا تھا — یہ نمبر لوگوں کو آج تک یاد ہے۔ اسی کے اہم مقالے "تذکرہ مجدد الف ثانی رح" کے نام سے از سر نو شائع کئے گئے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں شیخ احمد سرہندی رح کے حالات کا مطالعہ بڑی گرانقدر روشنی بخشتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجدد رح کا دورِ تجدید شاید ابتک جاری ہے۔ قیمت ۳/- سے ۴/-

مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی رح

حضرت مجدد رح کی مسند اصلاح و ولایت کو آپ کے بعد جس ہستی نے سنبھالا، اور سلطنت مغلیہ میں آپ کے ڈالے ہوئے دینی رنگ کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، وہ آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم رح، آپ کے مکتوبات بھی آپ کے والد ماجد کے شہرۂ آفاق مکتوبات کی طرح عظیم مصلحانہ کاوشوں اور عرفانی علوم وحقائق کے آئینہ دار ہیں۔ اصل زبان فارسی ہے۔ فارسی کے اس خزانے کو مولانا نسیم احمد فریدی نے تلخیص و انتخاب کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے —— قیمت : -/۴

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

ادارہ الفرقان

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔ ۔ /۶/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت .... /۷/۰

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم رمضان، اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل، برکات اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت /۱۲/۰

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہو، پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور مومن کامل بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ ان شاء اللہ کافی ہے۔ زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے، کتابت طباعت بھی اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۰ پونڈ چکنا مجلد ۲/۸/۰ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد ۱/۸/۰

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپیہ ۳/۰/۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۳/۰/۰

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت .... صرف /۶/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۸/۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت /۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ...... قیمت /۰/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور اکثریت کی طرف سے بے غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے ...... قیمت /۱۰/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت /۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت /۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری [illegible] آخری تحقیق

.... ۱/۶/۰

سالانہ چندہ
اعزازی خریداروں سے
۱۵/-
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ
قیمت فی کاپی
۶۰ نئے پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۱ | بابتہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق اپریل و مئی ۱۹۶۴ء | شمارہ ۱۱-۱۲

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ "سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں" اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہمکو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اسکی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

پہلے یہ سطریں ملاحظہ فرمالیجئے

مولوی عتیق الرحمٰن کی علالت کی وجہ سے جس کا سلسلہ قریباً سوا سال سے قائم ہے "الفرقان کے پورے نظام پر بہت زیادہ اثر پڑا کیونکہ اسکی ترتیب تیاری اور اشاعت کے ذمہ دار قریباً دس سال سے وہی تھے۔ راقم سطور تھوڑا بہت بوجھ اٹھا سکتا تھا لیکن مسلمانان ہند کے موجودہ حالات کی وجہ سے دوڑ دھوپ اور سفروں کا کئی مہینے سے تانتا بندھا ہوا ہے اور وہ سکون و اطمینان بالکل ہی مفقود ہے جو اس قسم کے کاموں کے لیے ضروری ہے تاہم انہی حالات میں اس سے پہلا شمارہ مرتب کیا تھا جو رمضان و شوال کا مشترکہ تھا اور یہ شمارہ بھی اسی بھاگ دوڑ کے درمیان مرتب ہوا ہے جو ذیقعدہ و ذی الحجہ کا مشترکہ شمارہ ہے ___ ان دونوں شماروں میں ظاہر و باطن اور صورت و معنی کے لحاظ سے جو کمی رہی جس کا شاید سب سے زیادہ راقم سطور کو احساس ہے اسکے لیے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا، یہی غنیمت ہے کہ یہ شمارے شائع ہو گئے اور الفرقان کی اکتیسویں جلد جو ذی الحجہ پر مکمل ہو جانی چاہیئے تھی اس شمارہ پر ذی الحجہ ہی میں کسی طرح مکمل ہو گئی ___ اب اگلے شمارہ سے ان شاء اللہ بتیسویں جلد شروع ہو گی۔

مولوی عتیق الرحمٰن کی صحت بفضلہ تعالیٰ اب پہلے سے بہتر ہے۔ اور امید ہے کہ چند روز کے بعد وہ الفرقان کا کام اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے۔ ایک بہت اچھے صاحب علم اور صاحب قلم کا کچھ وقت بھی الفرقان کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو امید ہے کہ ان شاء اللہ ظاہر و باطن ہر حیثیت سے اسکو مزید بہتر اور زیادہ مفید بنایا جا سکے گا۔

حال ہی میں الفرقان کو ایک اچھے منیجر بھی مل گئے ہیں جن سے امید ہے کہ دفتری کاموں میں سستی اور بے قاعدگی کی وجہ سے جس قسم کی زحمتیں اور شکایتیں خریداروں کو پیدا ہوتی تھیں ان شاء اللہ ان میں بہت کمی ہو جائے گی۔

محمد منظور نعمانی

شرح چندہ کے سلسلہ میں بعض تبدیلیاں

گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے قیمتوں اور اجرتوں میں جو اضافہ ملک میں ہوا ہے اور آئندہ کیلئے بعض مستقل اخراجات کا جو اضافہ ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا ہے اسکو پورا کرنے کیلئے الفرقان کے چندہ کے سلسلہ میں ہم نے مندرجۂ ذیل تبدیلیوں کا مجبوراً فیصلہ کیا ہے:

(۱) اسوقت ہندوستان کی طرح پاکستان کیلئے بھی سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔ لیکن پاکستان سے چندہ کی رقوم چونکہ بنک کے ذریعہ منتقل ہوتی ہیں اور بنک کمیشن کے علاوہ اس سلسلہ میں دفتر الفرقان کو بعض اور اخراجات بھی ادا کرنا پڑتے ہیں جنکے بعد الفرقان کو پانچ روپے کے قریب بچتا ہے اسلئے آئندہ سال ۱۳۸۴ھ کے شروع سے پاکستان کے لیے چندہ سات روپے کر دیا گیا ہے لہذا پاکستانی احباب آئندہ سال کا چندہ سات روپے روانہ فرمائیں۔

(۲) ششماہی چندہ جو ابتک دونوں ملکوں کیلئے تین روپے تھا ہندوستان کیلئے ساڑھے تین اور پاکستان کیلئے چار کر دیا گیا ہے۔

(۳) ششماہی کے لیے رسالہ وی۔ پی نہیں کیا جائے گا، اس کا چندہ دستی یا منی آرڈر پیشگی آنا چاہیے۔

(۴) جو حضرات وعدہ پر رسالہ جاری کراتے ہیں ان کو صرف ایک مہینہ کی مہلت دی جائے گی۔ دوسرے مہینے کا پرچہ اطلاع دے کر وی۔ پی روانہ کیا جائے گا۔

ہمارے پاکستانی خریدار

"ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ لاہور کو چندہ بھیجنے کے بعد صرف سادہ کارڈ سے اس کی اطلاع ہم کو دے دیں ڈاکخانہ کی ابتدائی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

منیجر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

اسلامی ممالک، خاص کر بعض عرب ملکوں میں جو حکومتی تبدیلیاں پچھلے چند سالوں میں ہوئیں، وہ زیادہ تر خونی انقلابات کی شکل میں ہوئیں، اور ان میں سے بعض میں تو ایسی سفاکی اور بربریت کے مظاہرے ہوئے جن کو دنیا بھر کے مسلمانوں نے اپنے لیے باعث رسوائی سمجھا، کیونکہ جن ملکوں میں وہ ہوئے اور جو لوگ ان کے ذمہ دار تھے وہ بدقسمتی سے اپنے کو اسلام سے منسوب کرتے تھے۔

عرصہ کے بعد ایک اسلامی عرب ملک (سعودی عرب) میں حکومت کی ایک ایسی تبدیلی کی روداد سامنے آئی ہے جو صرف خوشگوار ہی نہیں بلکہ اس دور فساد میں نہایت مسرت بخش اور لائق فخر بھی ہے ——— اس تبدیلی کی اجمالی اطلاع تو اپنے ملک کے اخبارات میں پہلے ہی شائع ہو چکی ہے، لیکن تفصیلی حال بعد میں سعودی عرب کے اخبارات سے معلوم ہوا جس میں اہل دین کے لیے مسرت اور شکر کا اور زیادہ سامان ہے۔

ملک حجاز و نجد شاہ سعود اور ان کے بھائی امیر فیصل کے درمیان (جن کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی) اقتدار کی جو کشمکش عرصہ سے چل رہی تھی واقفین اس سے باخبر ہیں، اب سے دو سال پہلے شوال ۱۳۸۱ھ میں شاہ سعود نے ایک فرمان کے ذریعہ عارضی طور پر اپنے اختیارات امیر فیصل کی طرف منتقل کر دیئے تھے اور اُس وقت سے حکومت کا کاروبار گویا وہی چلا رہے تھے ——— ادھر کچھ عرصہ سے شاہ سعود کے بعض لڑکوں اور حکومت سے تعلق رکھنے والے

بعض عناصر نے یہ کوشش شروع کر رکھی تھی کہ ملک پھر سے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں، اور اس کے بالمقابل شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد اور وزراء اور اہل حکومت کا ایک بڑا عنصر شاہ سعود کی مسلسل علالت وغیرہ کے باعث ملک اور اہل ملک کی مصلحت کے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتا تھا کہ سارے اختیارات اور ملک کا سارا کاروبار امیر فیصل ہی سے متعلق رہے، خواہ ضابطہ کے "ملک" شاہ سعود ہی رہیں۔

پچھلے چند مہینوں میں یہ کشمکش کافی بڑھ گئی تھی، اور اس کا خطرہ تھا کہ خدانخواستہ یہ کسی خون ریز خانہ جنگی کی شکل اختیار نہ کرلے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ملک اور اہل ملک پر رحم فرمایا، اور دونوں فریقوں کو نیکی کی توفیق دی۔ ملک کے اکابر علماء نے مسئلہ اپنے ہاتھ میں لیا، پہلے گزشتہ شعبان میں ان حضرات نے ایک درمیانی حل نکالا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ درمیانی حل اختلاف کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تو ذیقعدہ میں پھر مجلس علماء نے اس پر غور کیا اور ایک دوسری فیصلہ کن قرارداد مرتب کی یا یوں کہا جائے کہ ایک فتویٰ جاری کیا (جو سعودی عرب کے اخبارات میں فتوے ہی کے عنوان سے شائع ہوا ہے) اور اسی کے مطابق فیصلہ ہو کر اس کشمکش کا الحمدللہ خاتمہ ہوگیا۔

ہم ذیل میں اس فتوے کا پورا متن پیش کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامین۔ وبعد

جلالۃ الملک سعود اور ان کے بھائی امیر فیصل کے درمیان جو اختلافات ہیں اُن کے بارے میں غور کرنے کے لیے اب سے تین مہینے پہلے شعبان ۸۳ھ میں ہم جمع ہوئے تھے اور اس وقت کافی غور و خوض کے بعد ہم نے اس کے بارہ میں ۹ر شعبان کو ایک قرارداد تیار کی تھی اور ہمیں امید تھی کہ اس سے یہ اختلافات حل ہو جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہماری وہ تجویز اختلافات کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، اور چونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اختلافات

کی یہ خلیج اور زیادہ وسیع ہو کر خدانخواستہ کسی بڑے شر اور فتنہ کی شکل اختیار کر سکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ملک کا نظام اور امن و امان درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی ایسا حل سوچیں جس سے اس اختلاف کے قطعی خاتمہ کی توقع ہو۔ بنا بریں علیہ ہم دستخط کنندگان نے کئی نشستوں میں اس مسئلہ پر غور کیا اور تازہ صورت حال اور جلالۃ الملک کی خرابیٔ صحت اور اس حالت کا پورا جائزہ لیا جس کی وجہ سے اب حکومت کے اہم معاملات کا بوجھ اٹھانے کی ان میں طاقت نہیں رہی ہے اور وہ ان کا حق ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے مصلحت عامہ کے تقاضہ سے ہم سب مندرجۂ ذیل فیصلہ پر متفق ہوئے ہیں۔

(۱) جلالۃ الملک سعود حسب سابق "شاہ" رہیں گے اور اس حیثیت سے ان کا وہی احترام و اکرام کیا جائے گا جو اب تک کیا جاتا رہا ہے۔

(۲) امیر فیصل (جو ولی عہد اور رئیس مجلس وزراء ہیں) ملک کی موجودگی و عدم موجودگی میں حکومت کے تمام داخلی و خارجی معاملات کے ذمہ دار اور مختار ہوں گے۔ اور وہ کسی معاملہ میں ملک کے سامنے جواب دہ نہ ہوں گے اور نہ کسی بات کے لیے ملک کی طرف رجوع کرنے کی ان کو ضرورت ہوگی

ہم نے یہ فیصلہ اُن نصوص شرعیہ کی رہنمائی اور پیروی میں کیا ہے جن میں مصالح عامہ کی رعایت و نگہداشت کا حکم ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دُعا ہے کہ وہ اُمتِ مسلمہ کے دین کی حفاظت فرمائے۔ اور اپنی مرضیات پر اتحاد و اتفاق اور اشتراک عمل کی توفیق دے۔ اور اس کے حکمراں طبقہ کو اس راہ کی طرف رہنمائی فرمائے جس میں اُمت کی صلاح و فلاح ہو۔ وصلی اللہ علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

اس فتوے پر سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ محمد ابن ابراہیم اور گیارہ دوسرے اکابر و مشاہیر علماء نجد کے دستخط ہیں، یہ گویا سعودی عرب کی مجلس علماء کا فیصلہ اور متفقہ فتویٰ ہے جو ۱۶ ذیقعدہ کو جاری ہوا تھا ——

اگلے دن ۱۷ ذیقعدہ کو مجلس وزراء نے اس فتوے کی بنیاد پر اور اسی کا حوالہ دیتے ہوئے اسی کے مطابق قرارداد پاس کی اور اس طرح خوبصورتی اور خوشگواری کے ساتھ یہ کشمکش الحمدللہ ختم ہوگئی — خدا کرے اس کے بعد کوئی ایسی خبر نہ آئے جو اس خوشی کو مکدر کرے۔

جنوری میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے دوسرے مقامات کے مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی وہاں کے ہزاروں یتیموں، بیواؤں اور لاکھوں مصیبت کے ماروں کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے اور تباہ شدہ مظلوموں کی امداد بحالی کا کام دس فیصدی بھی نہیں ہوا تھا کہ گزشتہ مہینے مارچ کے آخر میں بنگال سے ملی ہوئی دوسری دو ریاستوں بہار اور اڑیسہ کی بہت سی بستیوں اور مرکزی شہر جمشید پور اور راوڑکیلا وغیرہ کے مسلمانوں پر اس سے کئی گنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑی — ان مقامات کے بعض جاننے والے مسلمانوں نے وہاں کی بربادی اور مظلومیت کا جو حال لکھا تھا وہ خود اپنے اندازہ اور قیاس سے باہر اور اتنا دردناک تھا کہ خود ہمیں شبہ ہوا کہ شاید ان لکھنے والوں نے کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن اسی ہفتے (اپریل کے تیسرے ہفتہ میں) مسٹر فرینک انتھونی نے (جو اینگلو انڈین فرقہ کے لیڈر اور پارلیمنٹ کے آزاد ممبر ہیں) پارلیمنٹ میں جو تقریر ان فسادات کے متعلق اور عام ہندوستانی مسلمانوں کے عدم تحفظ کے بارہ میں کی ہے اور ہندوستان میں انصاف کے علمبردار اور سرودے لیڈر مسٹر جے پرکاش نارائن نے بعض فساد زدہ مقامات کا دورہ کرنے کے بعد جو خط پارلیمنٹ کے ممبران کے لیے ان فسادات ہی کے بارہ میں لکھا ہے (جو اسی ہفتے کے اخبارات میں شائع ہوا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے ہم کو خطوط لکھے تھے انھوں نے مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا — مسٹر جے پرکاش نرائن کے خط کا ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ "جمشید پور کے تباہ شدہ مسلمانوں کے کیمپوں میں صرف دیکھنے کے بعد میں اس قابل نہیں رہا کہ اور کیمپوں کو دیکھ سکتا" حکومت کے ذمہ داروں نے بھی حقیقت حال کو چھپایا اور ایوان حکومت سے تعلق رکھنے والے کسی مسلمان کو بھی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اصل واقعہ کے بارہ میں کچھ بتاتا یا کم از کم سوال ہی کرلیتا۔ توفیق ملی تو مسٹر انتھونی اور جے پرکاش نرائن کو۔ ع

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

الفرقان کے اسی شمارہ میں جناب وحید الدین صاحب (اعظم گڑھ) کا ایک مضمون "حالات بدل سکتے ہیں" شائع ہو رہا ہے، موصوف نے مضمون کے ساتھ تحریر فرمایا تھا کہ "اگر الفرقان میں اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا جائے تو بلا کسی حذف و ترمیم کے شائع کیا جائے کیونکہ میرے خیالات یہی ہیں" — ہم نے اس فرمائش کا احترام کرنا ضروری سمجھا، اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو ہم اس کے ابتدائی تمہیدی حصہ میں جو "سیاسی تدابیر کے جائزہ" سے متعلق ہے کہیں کہیں کچھ ترمیم کرتے۔ کیونکہ ہمارا احساس یہ ہے کہ غالباً شدت احساس کی وجہ سے بعض واقعات کی تعبیر میں اور اسی طرح نتائج کے استنباط میں محترم مضمون نگار سے کئی جگہ مبالغہ ہوگیا ہے — لیکن مضمون کا جو مقصدی حصہ ہے اور جو اس کا اصل مدعا اور پیغام ہے اُس سے ہمیں پورا اتفاق ہے اور موجودہ حالات میں وہ الفرقان کی اصل دعوت ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

معارف الحدیث

(مسلسل)

کتاب الحج

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اسلام کے پانچ ارکان میں سے آخری اور تکمیلی رکن "حج بیت اللہ" ہے۔

حج کیا ہے؟ ـــــ ایک معین اور مقرر وقت پر اللہ کے دیوانوں کی طرح اس کے دربار میں حاضر ہونا اور اس کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی اداؤں اور طور طریقوں کی نقل کر کے اُن کے سلسلے اور مسلک سے اپنی وابستگی اور وفاداری کا ثبوت دینا اور اپنی استعداد کے بقدر ابراہیمی جذبات اور کیفیات سے حصہ لینا اور اپنے کو ان کے رنگ میں رنگنا۔

مزید وضاحت کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ذوالجلال والجبروت، احکم الحاکمین اور شہنشاہِ کل ہے اور ہم اس کے عاجز و محتاج بندے اور مملوک و محکوم ہیں۔ اور دوسری شان اس کی یہ ہے کہ وہ اُن تمام صفات جمال سے بدرجۂ اتم متصف ہے جن کی وجہ سے انسان کو کسی سے محبت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے وہ ـــــ بلکہ صرف وہی ـــــ محبوب حقیقی ہے۔ اس کی پہلی حاکمانہ اور شاہانہ شان کا تقاضا یہ ہے کہ بندے اس کے حضور میں ادب و نیاز کی تصویر بن کر حاضر ہوں۔ ارکانِ اسلام میں پہلا عملی رکن نماز اسی کا خاص مرقع ہے اور اس میں یہی رنگ غالب ہے۔ اور زکوٰۃ بھی اسی نسبت کے

ایک دوسرے رُخ کو ظاہر کرتی ہے ــــ اور اس کی دوسری شانِ محبوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ بندوں کا تعلق اس کے ساتھ محبت اور والہیت کا ہو، روزہ میں بھی کسی قدر یہ رنگ ہے، کھانا پینا چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشات سے منھ موڑ لینا عشق و محبت کی منزلوں میں سے ہے، مگر حج اس کا پورا پورا مرقع ہے، سلے کپڑوں کے بجائے ایک کفن نما لباس پہن لینا، ننگے سر رہنا، حجامت نہ بنوانا، ناخن نہ ترشوانا، بالوں میں کنگا نہ کرنا، تیل نہ لگانا، خوشبو کا استعمال نہ کرنا، میل کچیل سے جسم کی صفائی نہ کرنا، چیخ چیخ کے لبیک لبیک پکارنا، بیت اللہ کے گرد چکر لگانا، اس کے ایک گوشے میں لگے ہوئے سیاہ پتھر (حجر اسود) کو چومنا اس کے در و دیوار سے لپٹنا اور آہ و زاری کرنا، پھر صفا و مروہ کے پھیرے کرنا، پھر مکہ شہر سے بھی نکل جانا اور منیٰ اور کبھی عرفات اور کبھی مزدلفہ کے صحراؤں میں جا پڑنا، پھر جمرات پہ بار بار کنکریاں مارنا، یہ سارے اعمال وہی ہیں جو محبت کے دیوانوں سے سرزد ہوا کرتے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام گویا اس رسمِ عاشقی کے بانی ہیں ــــ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادائیں اتنی پسند آئیں کہ اپنے دربار کی خاص الخاص حاضری حج و عمرہ کے ارکان و مناسک ان کو قرار دے دیا۔ انہی سب کے مجموعہ کا نام گویا حج ہے اور یہ اسلام کا آخری اور تکمیلی رکن ہے۔

اس سلسلہ "معارف الحدیث" کی پہلی جلد کتاب الایمان میں وہ حدیثیں گزر چکی ہیں جن میں اسلام کے ارکانِ پنجگانہ کا بیان ہے اور اُن میں آخری رکن "حج بیت اللہ" بتایا گیا ہے۔

حج کی فرضیت کا حکم راجح قول کے مطابق ۹ھ میں آیا ہے اور اس کے اگلے سال ۱۰ھ میں اپنی وفات سے صرف تین مہینے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی بہت بڑی جماعت کے ساتھ حج فرمایا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسی حجۃ الوداع میں خاص عرفات کے میدان میں آپ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین
دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ	مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا
نِعْمَتِيْ الآية (المائدہ ع ۱)	اتمام کر دیا۔

اس میں اس طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ حج اسلام کا تکمیلی رکن ہے۔

اگر بندہ کو صحیح اور مخلصانہ حج نصیب ہو جائے جس کو دین و شریعت کی زبان میں "حج مبرور" کہتے ہیں اور ابراہیمی و محمدی نسبت کا کوئی ذرہ اس کو عطا ہو جائے تو گویا اس کو سعادت کا اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا اور وہ نعمت عظمیٰ اس کے ہاتھ آگئی جس سے بڑی کسی نعمت کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کو حق ہے کہ تحدیث نعمت کے طور پر کہے اور مست ہو ہو کر کہے۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کہ دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس مختصر تمہید کے بعد حج کے متعلق ذیل کی حدیثیں پڑھیے!

حج کی فرضیت اور فضیلت :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَیْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا فَقَالَ رَجُلٌ اَكُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَسَكَتَ حَتّٰی قَالَهَا ثَلٰثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَكْتُكُمْ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰی اَنْبِیَاۗءِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ فَاْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاِذَا نَهَیْتُكُمْ عَنْ شَیْءٍ فَدَعُوْهُ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں فرمایا اے لوگو تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے۔ لہذا اس کو ادا کرنے کی فکر کرو ——— ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہر سال حج کرنا ہم پر فرض کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سکوت فرمایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اس شخص نے تین دفعہ اپنا وہ سوال دوہرایا تو آپ نے (ناگواری کے ساتھ) فرمایا کہ اگر میں تمہارے اس سوال

کے جواب میں کہہ دیتا کہ "ہاں ہر سال حج کرنا فرض کیا گیا" تو اسی طرح فرض ہو جاتا اور تم ادا نہ کر سکتے ــــ اس کے بعد آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ کسی معاملہ میں جب تک میں خود تم کو کوئی حکم نہ دوں تم مجھ سے حکم لینے (اور سوال کر کر کے اپنی پابندیوں میں اضافہ کرنے) کی کوشش نہ کرو ــــ تم سے پہلی امتوں کے لوگ اسی لیے تباہ ہوئے کہ وہ اپنے نبیوں سے سوال بہت کرتے تھے اور پھر ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے ــــ لہٰذا (میری ہدایت تم کو یہ ہے کہ) جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اُس کی تعمیل کرو اور جب میں تم کو کسی چیز سے منع کر دوں تو اس کو چھوڑ دو۔ (صحیح مسلم)

(**تشریح**) جامع ترمذی وغیرہ میں قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج کی فرضیت کا یہ اعلان اور اس پر یہ سوال و جواب جو حضرت ابوہریرہ کی مندرجہ بالا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے آل عمران کی اس آیت کے نازل ہونے پر پیش آیا تھا۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔	اللہ کے واسطے بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے اُن لوگوں پر جو اسکی استطاعت رکھتے ہوں۔
(آل عمران ع ۱۰)	

حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث میں اُن صحابی کا نام مذکور نہیں ہے جنھوں نے حضورؐ سے سوال کیا تھا کہ "کیا ہر سال حج کرنا فرض کیا گیا ہے؟" لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ کی اسی مضمون کی حدیث جس کو امام احمد اور دارمی اور نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے اس میں تصریح ہے کہ یہ سوال کرنے والے اقرع بن حابس تمیمی تھے۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا، ان کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ابھی پورا موقع نہیں ملا تھا اسی لیے ان سے یہ لغزش ہوئی کہ ایسا سوال کر بیٹھے اور جب حضورؐ نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر دوبارہ اور پھر سہ بارہ سوال کیا ــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا واجب ہوجاتا" اس کا منشا اور مطلب یہ ہے کہ سوال کرنے والے کو سوچنا اور سمجھنا چاہیئے تھا کہ میں نے حج کے فرض ہونے کا جو حکم سنایا تھا اس کا تقاضا اور مطالبہ عمر بھر میں بس ایک حج کا تھا اس کے بعد ایسا سوال کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا (اور ظاہر ہے کہ آپ ہاں جب ہی کہتے جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا) تو ہر سال حج کرنا فرض ہوجاتا اور امت سخت مشکل میں پڑ جاتی ـــــ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگلی امتوں کے بہت سے لوگ کثرت سوال اور قیل وقال کی اسی بری عادت کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے نبیوں سے سوال کر کر کے شرعی پابندیوں میں اضافہ کرایا اور پھر اس کے مطابق عمل کر نہیں سکے۔

حدیث کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی اہم اور اصولی بات فرمائی آپ نے ارشاد فرمایا کہ ـــــ

"جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اس کی تعمیل کرو اور جس چیز سے منع کروں اس کو ترک کردو"

مطلب یہ ہے کہ میری لائی ہوئی شریعت کا مزاج سختی اور تنگی کا نہیں ہے بلکہ سہولت اور وسعت کا ہے، جس حد تک تم سے تعمیل ہو سکے اس کی کوشش کرو، بشری کمزوریوں کی وجہ سے جو کمی کسر رہ جائے گی اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اس کی معافی کی امید ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَلَكَ زَادًا وَّرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ اِلٰى بَيْتِ اللهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا وَذَالِكَ اَنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ـــــ رواہ الترمذی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس سفر حج کا ضروری سامان ہو اور اس کو سواری میسر ہو

جو بیت اللہ تک اس کو پہونچا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج فرض ہے اُن لوگوں پر جو اس تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

(جامع ترمذی)

تشریح) اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید ہے جو حج کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کریں۔ فرمایا گیا ہے کہ ان کا اس حال میں مرنا اور یہودی یا نصرانی ہو کر مرنا گویا برابر ہے۔ (معاذ اللہ) یہ اسی طرح کی وعید ہے جس طرح ترکِ نماز کو کفر و شرک کے قریب کہا گیا ہے ۔۔۔۔ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے "اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ" (الروم ع ۵) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکِ صلوٰۃ مشرکوں والا عمل ہے۔

حج فرض ہوتے کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو مشرکین کے بجائے یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دینے کا راز یہ ہے کہ حج نہ کرنا یہود و نصاریٰ کی خصوصیت تھی کیونکہ مشرکین عرب حج کیا کرتے تھے لیکن وہ نماز نہیں پڑھتے تھے اس لیے ترکِ نماز کو مشرکوں والا عمل بتلایا گیا۔

اس حدیث میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کے لیے جو سخت وعید ہے اس کے لیے سورۂ آلِ عمران کی اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کی سند پیش کی گئی ہے، جس میں حج کی فرضیت کا بیان ہے (یعنی "لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا") لیکن معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے صرف حوالہ کے طور پر آیت کا یہ ابتدائی حصہ پڑھنے پر اکتفا کیا، یہ وعید آیت کے جس حصہ سے نکلتی ہے وہ اس کے آگے والا حصہ ہے یعنی "وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ" (جس کا مطلب یہ ہو کہ اس حکم کے بعد جو کوئی کافرانہ رویہ اختیار کرے یعنی باوجود استطاعت کے حج نہ کرے تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں وہ ساری دنیا اور ساری کائنات سے بے نیاز ہے۔) ۔۔۔۔ اس میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کے رویہ کو "مَنْ كَفَرَ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور "اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ" کی وعید سنائی گئی ہے، اس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسے ناشکرے اور نافرمان جو کچھ بھی کریں اور جس حال میں مریں اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں ۔۔۔۔

قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث مسند دارمی وغیرہ میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا یُوْجِبُ الْحَجَّ قَالَ الزَّادُ وَالرَّاحِلَۃُ۔

رواہ الترمذی وابن ماجۃ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا کہ کیا چیز حج کو واجب کر دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا سامانِ سفر اور سواری۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) قرآن مجید میں فرضیت حج کی شرط کے طور پر "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً" فرمایا گیا ہے یعنی حج ان لوگوں پر فرض ہے جو سفر کر کے مکہ معظمہ تک پہونچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ____ اس میں جو اجمال ہے غالباً سوال کرنے والے صحابی نے اس کی وضاحت چاہی اور دریافت کیا کہ اس استطاعت کا متعین معیار کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک تو سواری کا انتظام ہو جس پر مکہ معظمہ تک کا سفر کیا جا سکے اور اس کے علاوہ کھانے پینے جیسی ضروریات کے لیے اتنا سرمایہ ہو جو اس زمانہ سفر کے گزارہ کے لیے کافی ہو ____ فقہائے کرام نے اس گزارہ میں ان لوگوں کے گزارہ کو بھی شامل کیا ہے جن کی کفالت جانے والے کے ذمہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس آدمی نے حج کیا اور اس میں نہ تو کسی شہوانی اور فحش بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جیسا اُس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسکو جنا تھا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ"، اس آیت میں حج کرنے والوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ خاصکر زمانۂ حج میں وہ شہوت کی باتوں اور اللہ کی نافرمانی والے سارے کاموں اور آپس کی جھگڑے بازی سے بچیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اس ہدایت پر عمل کرنے والوں کو بشارت سنائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو شخص حج کرے اور ایام حج میں نہ تو شہوت کی باتیں کرے اور نہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی کوئی ایسی حرکت کرے جو فسق کی حد میں آتی ہو تو حج کی برکت سے اس کے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور وہ گناہوں سے بالکل ایسا پاک و صاف ہو کر واپس ہوگا جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے دن بے گناہ تھا ـــــ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ دولت نصیب فرمائے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ ـــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک کفارہ ہو جاتا ہے ان کے درمیان کے گناہوں کا ـــ اور "حج مبرور" (پاک اور مخلصانہ حج) کا بدلہ تو بس جنت ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَاِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ اِلَّا الْجَنَّةُ ـــــــ رواہ الترمذی والنسائی

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پے در پے کیا کرو حج اور عمرہ کیونکہ حج اور عمرہ دونوں فقر و محتاجی اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح لوہار اور سنار کی

بھٹی لوہے اور سونے چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے اور "حج مبرور" کا صلہ اور ثواب تو بس جنت ہی ہے۔ (جامع ترمذی سنن نسائی)

(تشریح) جو شخص اخلاص کے ساتھ حج یا عمرہ کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں غوطہ لگاتا اور غسل کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ گناہوں کے گندے اثرات سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ دنیا میں بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوتا ہے کہ فقر و محتاجی اور پریشاں حالی سے اس کو نجات مل جاتی ہے اور خوشحالی اور اطمینان قلب کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور مزید برآں "حج مبرور" کے صلہ میں جنت کا عطا ہونا اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ الْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللهِ اِنْ دَعَوْهُ اَجَابَهُمْ وَاِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَ لَهُمْ ــــــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ اگر وہ اللہ سے دعا کریں تو وہ اُن کی دعا قبول فرمائے، اور اگر وہ اُس سے مغفرت مانگیں تو وہ اُن کی مغفرت فرمائے۔ (سنن ابن ماجہ)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَقِيْتَ الْحَاجَّ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَصَافِحْهُ وَمُرْهُ اَنْ يَّسْتَغْفِرَ لَكَ قَبْلَ اَنْ يَّدْخُلَ بَيْتَهُ فَاِنَّهُ مَغْفُوْرٌ لَهُ ــــــــــ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی حج کرنے والے سے تمہاری ملاقات ہو تو اس کے اپنے گھر میں پہونچنے سے پہلے اس کو سلام کرو اور مصافحہ کرو اور اس سے مغفرت کی دعا کے لیے کہو کیونکہ وہ اس حال میں ہے کہ اُس کے گناہوں کی مغفرت کا فیصلہ ہو چکا ہے (اس لیے اس کی دعا کے قبول ہونے کی خاص توقع ہے) (مسند احمد)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ مَنْ خَرَجَ حَاجًّا اَوْ مُعْتَمِرًا اَوْ غَازِیًا ثُمَّ مَاتَ فِیْ طَرِیْقِهٖ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اَجْرَ الْغَازِیْ وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ۔

——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ اللہ کا جو بندہ حج یا عمرہ کی نیت سے یا راہِ خدا میں جہاد کے لیے نکلا، پھر راستہ ہی میں اس کو موت آگئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے واسطے وہی اجر و ثواب لکھ دیا جاتا ہے جو حج و عمرہ کرنے والوں کے لیے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے لیے مقرر ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کے اس کریمانہ دستور و قانون کا اعلان خود قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا	اور جو بندہ اپنا گھر بار چھوڑ کے
اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ	ہجرت کی نیت سے نکل پڑے اللہ و
الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ	رسول کی طرف پھر آجائے اس کو موت
عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا	(راستہ ہی میں) تو مقرر ہو گیا اس کا اجر
رَّحِیْمًا ۝	اللہ کے ہاں، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے
(النساء۔ ع ۱۴)	والا اور بڑا مہربان ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی بندہ اللہ کی رضا کا کوئی کام کرنے کے لیے گھر سے نکلے اور اُس کے عمل میں آنے سے پہلے راستہ ہی میں اس کی زندگی ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس عمل کا پورا اجر اس بندہ کے لیے مقرر ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت کا تقاضا ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

تجلیات مجددِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۳۵) مرزا منوچہر کے نام　　(تعزیت و نصیحت)

حضرت حق سبحانہ، وتعالیٰ برخوردار سعادت اطوار کو خوش وقت و مطمئن رکھے۔ اور اندوہِ گزشتہ کی باحسن وجوہ تلافی فرمائے ———

اے فرزند اقبال آثار! جوانی کا زمانہ جس طرح ہوا و ہوس کا وقت ہے تحصیل علم و عمل کا بھی وقت ہے ——— اس زمانۂ شباب میں باوجودِ غلبہ موانع شہویہ و غضبیہ جو عمل بھی بمقتضائے شریعت وجود میں آتا ہے وہ دوسرے زمانے کے مقابلے میں زیادہ فوقیت اور اعتبار رکھتا ہے۔ اس لئے کہ مانع کا وجود جو کہ باعث رنج و محنت ہے عمل کے مرتبے کو آسمان پر لے گیا ہے اور عدمِ مانع نے جو کہ عدم رنج و مشقت کو مستلزم ہے عمل کے مرتبے کو پست کر دیا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ خواصِ بشر، خواصِ فرشتہ سے افضل ہیں کیونکہ طاعت بشر، موانع کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور عبادت فرشتہ، بے مزاحمت موانع ہے ———

——— سپاہیوں اور فوجیوں کی خدمات کے اعتبار و شمار کا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ دشمنوں کا غلبہ ہو اس لئے کہ دشمن مزاحمِ دولت و حکومت ہوتے ہیں، اُس وقت کی تھوڑی سی جد و جہد بھی بہت کچھ فوقیت اور اعتبار رکھتی ہے بمقابلہ اس جد و جہد کے جو ایسے ہنگامی دور کے

علاوہ کسی اور وقت ہو ـــــ یہ نہیں معلوم ہے کہ ہوا و ہوس اللہ کے دشمنوں یعنی نفس و شیطان کے پسندیدہ ہیں۔ اور علم و عمل بمقتضائے شریعت، حضرت رحمان جل سلطانہ، کو مرغوب ہیں ـــــ عقلمندی و ہوشیاری سے یہ بات دور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو راضی کیا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ جو بے شمار نعمتوں کا بخشنے والا ہے ناراض ہو جائے ـــــ

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ الْمُوَفِّق ـــــ

مکتوب (۳۶) میر محمد نعمان اکبرآبادی کے نام

[منکرین عذاب قبر کے رفع شبہات میں]

الحمد للّٰہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ ایک گروہ عذاب قبر کے بارے میں ـــ جس کا ثبوت احادیث صحاح مشہورہ بلکہ آیت ہائے قرآنی سے بھی ہے ـــ تردد بلکہ قریب قریب محال ہونے کا یقین رکھتا ہے ـــ اُن کا سب سے بڑا شبہہ یہ ہے کہ غیر مدفون (مثلاً دریا میں ڈوبے ہوئے، آگ میں جلے ہوئے درندوں کے پھاڑے ہوئے) مُردوں کے حالات ایک نہج اور طرز پر ہوتے ہیں۔ اُن میں استقامت ہوتی ہے، اضطراب نہیں ہوتا اور یہ بات تعذیب و ایلام کے منافی ہے تعذیب و ایلام کے لوازم میں سے جنبش و اضطراب ہے۔ (اس سے اُنھوں نے مدفون مردوں کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ قبر میں تعذیب و ایلام کا معاملہ نہ ہوگا)۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حیاتِ عالمِ برزخ ـــ حیاتِ دنیوی کی جنس سے نہیں ہے کہ اُس کو حرکتِ ارادی اور احساس دونوں لازم ہیں۔ دُنیا کا انتظام، حرکتِ ارادی اور احساس ہی سے وابستہ ہے ـــ حیاتِ برزخ میں کوئی حرکت درکار نہیں ہے بلکہ حرکت، عالمِ برزخ کے مُنافی ہے۔ وہاں فقط احساس ہوگا اور یہی کافی ہے کہ جس سے الم و عذاب کو محسوس کرے۔ پس حیاتِ برزخ گویا کہ نصفِ حیاتِ دُنیوی ہے (اس لئے کہ حیاتِ دُنیوی میں حرکتِ ارادی بھی ہے اور احساس بھی، اور حیاتِ برزخی میں حرکت نہیں ہے صرف احساس ہے) اور اسی طرح حیاتِ برزخی میں بدن سے رُوح کا تعلق، اُس تعلق کا نصف ہے جو رُوح کو بدن سے دنیا میں تھا۔ پس روا ہے کہ مُردگانِ غیر مدفون (غرق

شدہ، سوختہ شدہ، دریدہ شدہ) حیاتِ برزخی میں احساسِ عذاب و الم تو کریں اور کوئی حرکت و اضطراب اُن سے وجود میں نہ آئے اور جو کچھ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہی (بلاشک و شبہہ) صادق ہو ۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہوں اور اس اشکال کا اور اس قسم کے دوسرے اشکالات کا بالکل قلع قمع ہی کئے دیتا ہوں کہ طور و طریقۂ نبوت بالائے طور و طریقۂ عقل و فکر ہے ۔۔۔ وہ اُمور جن کے ادراک سے عقل قاصر ہوتی ہے اُن کا ادراک طور و طریقِ نبوت سے کیا جاتا ہے۔ عقل کافی ہو جایا کرتی تو پھر انبیاء علیہم السلام کیوں مبعوث ہوتے اور عذابِ اُخروی کو اُن کی بعثت سے کیوں مربوط و متعلق کیا جاتا؟ ۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا ۔۔۔ (ہم نہیں ہیں عذاب کرنے والے یہاں تک کہ رسول کو بھیجیں) عقل ہر چند حجت ہے لیکن حجتِ بالغہ نہیں ہے اور وہ حجیت کے اندر کامل نہیں۔ حجتِ بالغہ، بعثتِ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ متحقق ہوئی ہے۔ اسی بعثتِ انبیاء نے مکلفین کی زبانِ عذر کو بند کر دیا ہے۔ (چنانچہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۔۔۔ (ہم نے بھیجا رسولوں کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر تا کہ نہ رہے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ پر الزام پیغمبروں کے بھیجنے کے بعد ۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے) ۔۔۔ اور جب ادراکِ عقل کی کوتاہی بعض اُمور میں ثابت ہو گئی پس جمیع احکامِ شرعیہ کو میزانِ عقل میں تولنا اچھی بات نہیں ہو گی ۔۔۔ جمیع احکامِ شرعیہ کو عقل کی ترازو میں تولنا استقلالِ عقل کا حکم لگانا اور طورِ نبوت کا انکار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے ۔۔۔ سب سے پہلے رسول پر ایمان لانے کی فکر اور اُن کی رسالت کی تصدیق کرنا چاہیئے تا کہ تمام احکام میں اُن کو صادق سمجھا جائے اور اس ذریعے سے ظلماتِ شکوک و شبہات سے خلاصی میسر آئے ۔۔۔ اصل کو معلوم کرنا چاہیئے تا کہ فروع بے تکلف دبے دشواری معقول و معلوم ہو جائیں کسی فرع

کو اُس کی اصل کے ثابت کیے بغیر معلوم کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اور اس تصدیق رسالت کی منزل تک پہنچے۔ نیز اطمینانِ قلب کے حصول کا نزدیک ترین راستہ ذکرِ الٰہی ہے ــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ــــ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (آگاہ ہو کہ ذکرِ خدا سے اطمینان حاصل کرتے ہیں دل۔ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اُن کی حالت اچھی ہوگی اور اُن کی بازگشت بھی اچھی ہوگی)

(محض) نظر و استدلال کے راستے سے اس مطلبِ عالی تک پہنچنا بہت بعید ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود ﴿عـہ﴾ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(اور اگر استدلال ہی مطلوب ہے تو) انبیاء علیہم السلام کا مقلد اُن کی نبوت کے اثبات کے بعد اور اُن کی رسالت کی تصدیق کے بعد (خود) استدلال کرنے والوں میں سے ہے۔ اُن اکابر کے اقوال کی تقلید اس وقت (یعنی بعد تصدیق و اثباتِ نبوت) عین استدلال ہے۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ اُس نے ایک اصل کو دلیل سے ثابت کیا ہو۔ اب جو فروع بھی اس اصل سے نکلیں گے سب اُسی استدلال سے ثابت ہو جائیں گے۔ اور اصل کے استدلال کی وجہ سے وہ شخص تمام فروع کے اثبات میں استدلال کرنے والا سمجھا جائیگا۔ ــــ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ﴿عـہ﴾ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ط ــــ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

عـہ فقط استدلال پر اکتفا کرنے والوں کے پاؤں لکڑی کے ہیں اور ظاہر ہے کہ لکڑی کے پاؤں بودے ہوتے ہیں۔

عـہ سپاس و حمد خداوندِ کریم کے لئے ہے کہ اُس نے ہم کو اس کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہم ہرگز راستہ نہ پا سکتے اگر خداوندِ کریم ہم کو راہ نہ دکھاتا۔ بے شک ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے پیغمبر حق و راستی کے ساتھ آئے۔

مکتوب (۳۸) مُلّا ابراہیم کے نام [حدیث ستفترق اُمتی الخ کے معنیٰ اور درجۂ اربابِ فقر کی تحقیق]

جاننا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ تفرّق اُمت... میں کلھم فی النّارِ اِلّا واحدۃً جو فرمایا ہے اُس میں (اُن بہتّر فرقوں کا) آتشِ دوزخ میں داخل ہونا اور عذاب میں رہنا مُراد ہے۔ خلود و دوامِ عذاب مُراد نہیں اس لئے کہ خُلود و دوام مُنافیِ ایمان اور مخصوص بہ کفار ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ چونکہ اُن کے اعتقادہائے مذمومہ اُن کے دُخولِ نار کا سبب ہیں۔ ناچار وہ سب کے سب داخلِ نار ہوکر اپنے خباثتِ اعتقاد کی بقدر معذّب ہوں گے۔ برخلاف فرقۂ ناجیہ کے جس کے معتقدات عذابِ نار سے نجات دینے والے اور سببِ فلاح ہیں ــــ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ فرقۂ ناجیہ کے بعض افراد اگر اعمالِ غلط کے مرتکب ہوں گے اور وہ اعمال (دنیا میں) توبہ کے ذریعے اور (آخرت میں) شفاعت کے ذریعے معاف نہ ہوئے ہوں گے تو جائز ہے کہ گناہ کی بقدر عذابِ نار میں وہ بھی مبتلا ہو جائیں اور دخولِ نار اُن کے لئے بھی متحقق ہو ــــ پس دوسرے (بہتّر) فرقوں میں دُخولِ نار تمام افراد کے حق میں ہے اگرچہ خلود و دوام نہ ہو اور فرقۂ ناجیہ کے اندر دخولِ نار بعض افراد کے ساتھ مخصوص ہے جنھوں نے اعمالِ سوء کا ارتکاب کیا ہو گا ــ کلمہ کلّھم میں اسی بیان کی طرف اشارہ ہے جو مخفی نہیں ہے۔ چونکہ یہ (بہتّر) بدعتی فرقے اہلِ قبلہ ہیں اس لئے اُن کی تکفیر میں دلیری نہیں کرنا چاہیئے تا وقتیکہ وہ ضروریاتِ دینیہ کا انکار نیز متواتراتِ احکامِ شرعیہ کا رد نہ کریں۔ اور دین کی یقینی و ضروری باتوں کو قبول کرتے

ع‌ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ــــ "بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں متفرق ہوئے اور میری اُمت میں ۷۳ فرقے ہوں گے، اُن میں سوائے ایک کے جو کہ ناجی ہو گا باقی سب ناری ہوں گے۔" صحابہؓ نے عرض کیا "وہ نجات یافتہ فرقہ کون سا ہو گا؟" فرمایا۔ "جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر ہو گا۔"

رہیں ـــــ علماء نے فرمایا ہے کہ اگر (کسی شخص کی بات میں) ننانوے وجوہ کفر ظاہر ہوں اور ایک وجہ اسلام پائی جائے تو اُس ایک وجہ کو صحیح رکھا جائے اور حکم کفر نہ لگایا جائے۔ ـــــ واللہ سبحانہٗ اعلم ـــــ

نیز یہ بات بھی جاننا چاہیئے کہ حدیث میں جو یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ اس اُمت کے فقراء، اغنیاء سے نصف یوم پہلے بہشت میں جائیں گے تو اس نصف یوم سے مراد دُنیا کے پانسو[۵] سال ہیں اس لئے کہ یوم نزدِ حق تعالیٰ ہزار سال ہے آیت اِنَّ یومًا عِندَ رَبِّکَ کَاَلفِ سَنَۃٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ـــــ اس معنیٰ کی گواہ ہے ـــــ اور اس مدت کی مقدار، علم الٰہی کے سپرد ہے بغیر اس کے کہ روز و شب اور سال و ماہ متعارف (وہاں) متحقق و موجود ہوں ـــــ فقیر سے مُراد وہ فقیر صابر ہے جو احکام شرعیہ کی بجا آوری اپنے اوپر لازم کئے ہوئے ہے اور ممنوعات سے پرہیز کرتا ہے ـــــ

فقر میں درجات مراتب ہیں، بعض بعض کے اوپر ہیں اور سب سے بڑا مرتبہ مقام فنا میں ظہور پذیر رہتا ہے اور وہ (مقام فنا) یہ ہے کہ سوائے حق جلّ شانہٗ کے سب کو ناچیز قرار دے اور فراموش کر دے اور جو شخص تمام مراتب فقر کا جامع ہے وہ افضل ہے بمقابلہ اُس کے جو اُن مراتب میں سے بعض رکھتا ہے اور بعض نہیں رکھتا پس جو شخص مقامِ فنا کے ساتھ ساتھ فقرِ ظاہر بھی رکھتا ہے وہ افضل ہے اُس شخص سے جو درجۂ فنا تو رکھتا ہے مگر ظاہری فقر نہیں رکھتا ـــــ اس بات کو خوب سمجھ لیا جائے۔

---

۵ اللہ کے ہاں کہ ایک دن تمہارے حساب کے ایک ہزار سال کے برابر ہے ۱۲

حالات بدل سکتے ہیں

(از:- جناب وحید الدین خاں صاحب اعظم گڈھ)

"اے قریش کے لوگو! اے قریش کے لوگو!" ——— اب سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے ایک صبح کو اس آواز نے مکہ کی آبادی میں ہیجان پیدا کر دیا۔ پکارنے والا وہ شخص تھا جو پچھلے چالیس برس سے اپنی بے داغ زندگی کے لئے مشہور ہو چکا تھا بستی کے تمام معززین بستی کے باہر پہاڑی کے دامن میں اکٹھا ہو گئے۔ حاضرین سخت انتظار اور اضطراب کی حالت میں اپنے قابل احترام پکارنے والے کو دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی بستی کا سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑا خیر خواہ، جو پہاڑی کے اوپر کھڑا ہوا ہے، پہاڑی کے دوسری طرف سے کسی زبردست حملہ آور دشمن کی خبر دینے والا ہے ——— مگر لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی جب انھوں نے کوہ صفا کے مقرر کی تقریر سنی کیونکہ اس کی ساری تقریر کا خلاصہ صرف یہ تھا:

وَاللّٰهِ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ　　خدا کی قسم تمہارے عمل کے مطابق تم سے معاملہ کیا جائے گا۔

جمہرۃ خطب العرب، حصہ اول، ص۵۱

لوگوں نے کہا ——— "کیا ہمیں اسی لئے بلایا تھا، بیکار ہمارا وقت برباد کیا۔" اور منتشر ہو گئے ———

آج کچھ ایسی ہی صورت ان لوگوں کی ہے جو موجودہ حالات میں ہندستان کے مسلمانوں کو ان کے کرنے کا کام بتا رہے ہیں۔ اگر ان مسلمانوں سے کہئے کہ ملک کی اکثریت تمہاری دشمن نہیں ہے اگر آپ

خلاف احتجاج کی تدبیریں بتائیے، اگر یہ انکشاف کیجئے کہ دستورِ ہند کی فلاں فلاں دفعات تمہارے لئے یہ امکان پیدا کرتی ہیں کہ تم عدالت میں اپنا مقدمہ لے جاکر اکثریت کے مظالم کا انسداد کر سکتے ہو تو یہ باتیں بہت جلد مسلمانوں کی سمجھ میں آجائیں گی۔ اس کے برعکس جب دین کا فہم رکھنے والے ان سے کہتے ہیں کہ اپنے خدا کو پکڑو، کیونکہ اس کے چھوڑنے ہی کے نتیجے میں یہ سارا وبال تمہارے سر پر پڑا ہے، تو یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ناصحین چونکہ خارجی دشمن سے براہ راست مقابلے کی تدبیریں نہیں بتاتے بلکہ خود اپنے اندرونی دشمن کو زیر کرنے کی تلقین کر رہے ہیں اس لئے اس ملک کے مظلوم مسلمانوں کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے جو لوگ ذرا سنجیدہ ہیں وہ دل ہی دل میں سوچ کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ اور جو بیباک ہیں وہ فوراً کہہ اٹھتے ہیں ——— "مولوی سیاست نہیں جانتا"۔ میں کہوں گا کہ یہ مولوی کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات ہے۔ اگر تم کو کہنا ہی تو یوں کہو کہ خدا سیاست نہیں جانتا اس کے جواب میں مولوی کی سیاست دانی پر تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

سیاسی تدبیروں کا جائزہ

اگلے صفحات میں میں مذکورہ بالا حل کی معقولیت اور اس کی دینی اہمیت پر گفتگو کروں گا۔ اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سیاسی تدبیروں کا جائزہ لے لیا جائے جس کو آج کل کا "مسلم تعلیمافتہ طبقہ" بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور جو اس کے نزدیک ہندستانی مسلمانوں کے مسئلے کا واحد حل ہے۔ یہ عموماً تین قسم کی چیزیں ہیں۔

۱ — آئینی مطالبات،

۲ — عدالتی مرافعہ

۳ — انتخابی طاقت کا استعمال

آئینی مطالبہ اس سلسلے کی پہلی چیز آئینی مطالبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں جو حکومت قائم ہے۔ وہ ایک سکولر اور جمہوری آئین کے تحت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے ہر فرد اور ہر فرقے کو تمام جائز انسانی حقوق یکساں طور پر حاصل ہیں۔ ان حقوق کی خاطر جد و جہد کرنے کے بھی تمام قانونی مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے بارے میں جس قسم کی ناانصافیاں دیکھ رہے ہیں ان کے خلاف آئینی جد و جہد کریں ان کو دور کرنے کیلئے قانونی مطالبات کی مہم چلائیں۔

مگر اس حل کے مجوزین کے متعلق میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ وہ الفاظ کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور حقیقت کی دنیا کی انھیں کچھ زیادہ خبر نہیں ہے۔ ان کا خیال شاید یہ ہے کہ ارباب اقتدار اس آئین کی دفعات کو بھول گئے ہیں جس کو انھوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آئین کی موجودگی میں مسلم اقلیت پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اگر مسلمان ایک بار اپنے حکمرانوں کو آئین کی یہ مقدس دفعات یاد دلادیں تو حکومت کی مشنری بالکل دوسری سمت میں حرکت کرنے لگے گی۔ اور جس طاقت کا حال یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ اقلیت کو لوٹنے اور ذبح کرنے کیلئے کھلم کھلا فسادیوں اور بلوائیوں کا ساتھ دیتی ہے، وہ مظلوم اقلیت کی پشت پناہ بن کر کھڑی ہو جائے گی۔ کیونکہ آئین کے الفاظ کا تقاضا یہی ہے!

مگر افسوس کہ واقعات اس خوش گمانی کی تصدیق نہیں کرتے۔ ہر وہ شخص جس کی آنکھوں پر کسی قسم کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے۔ اب اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اتفاقی غفلت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ سوچا سمجھا ہوا ایک ہمہ گیر منصوبہ ہے جو مختلف طریقوں سے بالارادہ زیر عمل لایا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قانونی تحفظ کی یہ سنہری دفعات دراصل ہمارے تحفظ کیلئے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ الفاظ کا ایک پردہ ہے جو عدم تحفظ کی واقعی صورت حال کو چھپانے کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں قانونی مطالبات کی مہم گویا ظالم سے خود اس کے ظلم کے خلاف فریاد کرنا ہے۔ ایک شخص جو اپنی طاقت کے بل پر فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ آپ کو قتل کرے گا، اس سے دس سال پہلے کے چند الفاظ یاد دلا کر کہنا ہے کہ تم مجھے قتل نہ کرو —— ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوششوں کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ سالہا سال کی جدوجہد کے بعد جب آپ اپنا پیغام اس کے کانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ جواب میں کچھ دوسرے الفاظ بول دے اور اپنا منصوبہ بدستور جاری رکھے —— اس سلسلے میں قیاس کرنے کی ضرورت نہیں۔ واقعات کی دنیا میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

ایک مثال لیجئے —— دس سال پہلے دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت دیئے ہوئے ایک حق کو حاصل کرنے کے لئے اتر پردیش میں ایک زبردست جدوجہد کی گئی تھی۔ یہ دفعہ ہمارے

صدر جمہوریہ کو یہ حق دیتی ہے کہ کسی ریاست کی آبادی کا قابل لحاظ حصہ اگر ایک زبان بولتا ہو تو وہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اس زبان کو ریاست کی علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے چنانچہ دستور میں درج شدہ زبانوں میں سے چودھویں زبان (اردو) کے حق میں اس رعایت کو حاصل کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو ہند نے اتر پردیش میں ایک بہت بڑی مہم چلائی اور فروری ۱۹۵۴ء میں ساڑھے بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک درخواست جس کا وزن چودہ من تھا صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہم اس ملک میں چاہتے ہیں، ان میں یہ سب سے زیادہ جائز اور بے ضرر قانونی مطالبہ تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوا۔؟ اگر یہ چودہ من کا بوجھ کسی غریب خاندان کو دیدیا جاتا تو اس کے مہینوں کے ایندھن کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ مگر اس زبردست جدوجہد کا اتنا فائدہ بھی قوم کو نہیں ملا اور ساری کوششوں کے باوجود ریاست کے اندر اردو زبان اب بھی اسی مظلومی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے جو اس کارروائی سے پہلے تھی۔ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ ایک وفد دستخطوں کے اس انبار کو پارسلوں میں بند کر کے نئی دہلی لے گیا۔ اور راشٹرپتی بھون کے گودام میں اس کو چھوڑ کر چلا آیا۔ گویا یہ ایک جنازہ تھا جو دھوم دھام سے اٹھا اور پھر خاموشی کے ساتھ قبر میں رکھ دیا گیا۔ اس درخواست کو پیش کئے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں مگر ابھی تک حکومت کی طرف سے اس کا باضابطہ جواب بھی نہیں دیا گیا۔ کیوں؟ — اس لئے کہ راشٹرپتی کے قانونی مشیر نے راشٹرپتی کو بتایا کہ اس کے سلسلے میں کچھ "قانونی" مشکلات حائل ہیں۔"

آئینی جدوجہد میں صرف یہی ایک خلا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ایک کلی تسلط کو جزوی خلاصی کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش ہے اور ایسی ہر کوشش بالفرض وہ کامیاب ہو جائے۔ جب بھی اپنے انجام کے اعتبار سے ناکام رہتی ہے۔ اگر کوئی منفرد نوعیت کا جزوی خلا ہو تو اس کو بلاشبہ آئینی جدوجہد کے ذریعہ درست کیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں پورے سماجی حالات کا رخ بدلا ہوا ہو، وہاں آئینی جدوجہد کی مثال ایک ایسے ہزارپا کی ہے جس نے اپنے سارے ڈنک گڑا دیئے ہوں اور آپ

اس سے کہیں کہ تمھارا فلاں ڈنک انصاف کی رو سے صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں فلاں قانونی نقص پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہزار بار آپ کی اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے اپنے ایک ڈنک سے دستبردار ہو جائے تب بھی اصل مسئلہ بدستور باقی رہے گا۔

اسی اردو کے مسئلہ کو لیجئے اگر حکومت اس کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلے تو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، صورت حال میں کوئی حقیقی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح کے کسی سرکاری فیصلے کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو اردو[1] پڑھائیں، مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی شخص اردو پڑھنے کی حماقت ہی کیوں کریگا۔ صورت حال یہ ہے کہ حکومت نے پورے ماحول میں ہر جگہ ہندی کو مسلط کر رکھا ہے۔ اس لئے اردو عملاً اب اس دنیا میں بے کار سی چیز بن گئی ہے۔ کوئی شخص اردو پڑھے تو اسکول میں اس کو اجنبی بن کر رہنا ہوگا، اعلیٰ تعلیمی وظائف حاصل کرنے کے لئے وہ نااہل قرار پائے گا۔ وہ دفتر اور کچہری میں جائے تو اس کو محسوس ہوگا کہ اردو کے ذریعہ کام نہیں چل سکتا۔ ملازمتوں میں اس کی اردو دانی اس کے لئے نااہلی کا سرٹیفکٹ ثابت ہوگی۔ ایسی حالت میں کوئی شخص اردو پڑھے تو کس لئے یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیمی تحریک کی کوششوں سے ابتدائی اسکولوں میں بعض شرائط کے ساتھ اردو تعلیم کی گنجائش جو منظور کی گئی ہے، اس کے لئے طلبہ نہیں ملتے کیونکہ سرپرست سوچتے ہیں کہ تعلیم کے بعد جب سارا کام ہندی میں کرنا ہے اور ساری ترقیاں اور کامیابیاں ہندی سے بندھی ہوئی ہیں تو وہ اپنے لڑکوں کو اردو پڑھانے کے بعد ان کی عملی زندگی کے لئے کون سا اردو کا جزیرہ تلاش کریں گے۔

مگر بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ اس سے آگے مزید مشکل یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان میں ریاست کے نام نہاد ترقی یافتہ تصور کو اپنایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے زمانے کی طرح حکومت صرف امن بحال رکھنے اور نظم و نسق قائم کرنے کی ذمہ دار نہیں ہوگی بلکہ وہ شہریوں کے تمام معاملات میں ان کی رہنمائی کرے گی۔ اس فیصلے نے حکومت کا دائرہ اتنا پھیلا دیا ہے کہ اب زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں حکومت اپنے قوانین اور اپنے دفاتر کے ساتھ موجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جہاں حکومت اس طرح زندگی کی تمام سرگرمیوں پر چھائی ہوئی ہو

[1] یا اسی طرح کی کچھ اور قانونی رعایات

وہاں سرکاری زبان کی حیثیت صرف محدود معنوں میں "سرکاری زبان" کی نہیں رہتی بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر معاملے کی زبان بن جاتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو کام چلایا جاسکتا ہے اور نہ کسی میدان میں ترقی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں جب ہندستان میں برٹش کمپنی کی حکومت تھی، اس نے لوگوں کو انگریزی پڑھنے کی طرف مائل کرنے کے لئے ایک قانون منظور کیا تھا، جس کی رو سے سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیدیا گیا۔ مگر موجودہ حکومت کو ایسا کوئی قانون پاس کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب سرکاری ملازمت محض چند اسامیوں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اب تو ساری زندگی، بالواسطہ یا بلاواسطہ سرکاری ملازمت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اب صورت یہ نہیں ہے کہ جس کو سرکاری ملازمت کرنا ہو وہ سرکاری زبان سیکھے۔ بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ جس کو زندہ رہنا ہو وہ سرکاری زبان حاصل کرے۔ گویا اب چند لوگوں کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو سرکاری زبان سیکھنی ہے انگریزی قانون صرف خوش حال طبقے کے تھوڑے سے حوصلہ مند نوجوانوں کو انگریزی پڑھنے اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ مگر آج تو ہر شخص اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ وہ ہندی زبان سیکھے اور ہندی تہذیب میں اپنے آپ کو رنگے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ سوشلسٹ طرز کے ہندستان میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ برطانوی حکومت نے ہندستان میں انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کو پھیلانے کی غرض سے جو اقدامات کئے تھے، ان کے لئے وہ آج تک بدنام ہے۔ مگر موجودہ سیاست دانوں کو شیطان نے "سوشلزم" کے نام سے ایک ایسا حربہ دیا ہے کہ وہ "سماجی ترقی" کے عنوان سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آج کے سوشلسٹ فرماں رواکو اپنے دین کی اشاعت کے لئے بدنام تلوار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سماجی اور اقتصادی، اصلاح کا پروگرام اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ساری آبادی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کو بدل کر اس کے دین میں شامل ہو جائے۔

عدالتی مرافعہ دوسری تدبیر جو سیاست جدیدہ کے ماہرین بتا رہے ہیں وہ عدالتی مرافعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ملک کے بااقتدار طبقہ کے خلاف اپنی شکایتوں کے سلسلے میں عدالت بالا میں مقدمہ دائر کریں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ عدالت سے صرف انھیں چیزوں کے بارے میں

فیصلہ لیا جا سکتا ہے جو قانون کی مخصوص اور متعین دفعات کے تحت آتی ہو۔ اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ آپ خود اپنی زندگی میں جس مسئلے کو محسوس کر رہے ہیں اس کو قانونی طور پر بھی فی الواقع عدالت میں محسوس کرا سکیں گے۔ تاہم اگر کسی قابل بیرسٹر کو بیش قیمت فیس دے کر اور اس کے ضروری "راشن" کا انتظام کر کے آپ اس مشکل کو حل کر لیں اور کسی مسئلہ خاص میں عدالت کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے، جب بھی اس پر عمل درآمد کا انحصار اس بات پر ہے کہ حکومت بھی اس فیصلے کو دل سے مان لے۔ اگر حکومت اس سے اتفاق نہ کرے تو عدالت کی طرف سے کسی بھی قسم کی درواز بندی حکومت کو ایک نئے دروازے سے نکل جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اس سلسلے میں "یو پی روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ ۱۹۵۱ء" کی مثال نصیحت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔ دس سال پہلے جب اتر پردیش کی حکومت نے سڑکوں پر بس چلانے کو نیشنلائز کر لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست کی سڑکوں پر بسیں چلانے کا اختیار صرف ریاستی حکومت کو ہوگا، تو ریاست کے سیکڑوں موٹر کا کام کرنے والے جن پر اس قانون کی زد پڑتی تھی، انھوں نے ہائی کورٹ میں اس قانون کو چیلنج کیا۔ ہائی کورٹ نے ان کی اپیل خارج کر دی اور حکومت کے اقدام کو صحیح قرار دیا۔ اس کے بعد وہ اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے گئے اور انھوں نے وہاں اپنے مقدمہ کی زبردست پیروی کی۔ چنانچہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو سپریم کورٹ کی دستوری بنچ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ یوپی حکومت کا یہ قانون دستور میں دیئے ہوئے اختیارات سے باہر ہے۔ سپریم کورٹ نے اس سلسلے کی تمام اپیلوں اور درخواستوں کو منظور کر لیا اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ عدالت نے ہدایت کی کہ ریاستی حکومت کو اپیل کرنے والوں اور درخواست دینے والوں کے خلاف یوپی روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ کو نافذ ہونے سے روک دیا جائے۔

(نیشنل ہرالڈ، ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء)

مگر حکومت کی بلی چھیلے سے نکل بھاگی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس فیصلے کے باوجود آج ریاست کی سڑکوں پر ہزاروں سرکاری بسیں دوڑ رہی ہیں اور پرائیوٹ موٹریں یا تو اپنے مالکوں کے مکانوں میں پڑی ہوئی زنگ کھا رہی ہیں یا کباڑ خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ مماثل واقعات سے سبق نہیں لیتا جس بل میں وہ ایک بار ڈسا

گیا ہے۔ اسی نوعیت کی دوسری بل کے متعلق امید رکھتا ہے کہ اس میں سانپ نہیں ہوگا۔ ورنہ عدالتی مرافعہ ایک ایسا طریق کار ہے جو ہر شخص کے ذاتی تجربے میں اپنی ناکامی کو ثابت کر چکا ہے۔ کون بستی اور کون سا خاندان ہے جس کو اپنے کسی معاملے میں ملکی عدالتوں کے نقائص کا تجربہ نہ ہوا ہو اور وہ کون شخص ہے جو بے انصافی کے اس کاروبار سے ناواقف ہے جو انصاف کی کچہریوں میں روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر وہی عدالتی نظام جو شخصی مقدموں کے معاملے میں بار بار اپنی نااہلی ثابت کر چکا ہے۔ اس سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے قومی مقدمے کو بہترین طور پر حل کر دے گا۔ جبکہ قومی مقدمات میں مسئلے کی نزاکت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ شخصی مقدمات میں شخصی پیمانے کے مخالف فریق کا سامنا ہوتا ہے، جب کہ قومی مقدمات میں قومی پیمانے کے مخالف فریق کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جس کو ہم عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ کہ جلسوں اور جلوسوں میں کھلم کھلا مسلمان دشمن تقریریں ہوتی ہیں اور اشتعال انگیز نعرے لگائے جاتے ہیں۔ کیا یہ کہ مخصوص تہواروں کے موقع پر بالقصد مسلمانوں پر اس طرح کیچڑ اور غلاظت ڈالی جاتی ہے کہ وہ مشتعل ہو جائیں اور رنگ کی ہولی کھیلنے والوں کو پوری بستی میں خون کی ہولی کھیلنے کا موقع مل جائے۔ کیا یہ کہ حکومت کی اسامیوں میں جان بوجھ کر مسلمانوں کا تقریباً بالکل کاٹ کیا جا رہا ہے اور کوئی مسلمان اتفاق سے کسی سرکاری عہدے پر موجود ہے تو اس کو اس قدر ذلیل اور تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو اپنی خودی کو ہمیشہ کیلئے دفن کر دے یا پھر استعفا دے کر بھاگ جائے، کیا یہ کہ سرکاری ٹیکس جو ملک کی تمام آبادی سے یکساں طور پر وصول کیا جاتا ہے اس کو بے شمار شکلوں میں ایک مخصوص فرقہ کے مفاد کے لئے بے دریغ خرچ کیا جا رہا ہے، کیا تہذیبی یگانگت پیدا کرنے کی اس کوشش کو ہم عدالت میں زیر بحث لانا چاہتے ہیں جس کو بجا طور پر ایک شخص نے تہذیبی جارحیت (Cultural Aggression) کا نام دیا ہے۔ کیا ہم اکثریت کی طرف سے اقلیت کو لوٹنے اور ہلاک کرنے کے ان مسلسل اور منظم واقعات کو عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ جن کو غلطی سے "فرقہ وارانہ فساد" کہا جاتا ہے اور جس نے مسلمانوں کی زندگی کو اس ملک میں اتنا غیر یقینی بنا دیا ہے کہ اب کسی بستی کے مسلمانوں کو نہیں معلوم کہ کس صبح یا شام کو

انھیں مارنا اور ان کی جائدادوں کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیا جائے گا۔ اور ملک کی پولیس اور فوج روکنے کے بجائے خود بھی ان کے اس مقدس کام میں ان کے ساتھ شریک ہو گی ــــ غارتگری کے یہ واقعات اب اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اگر کسی دن ملک کی انشورنس کمپنیاں یہ اعلان کر دیں کہ مسلمانوں کی جان و مال کا بیمہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو بالکل تعجب کی بات نہیں ہو گی۔ کیونکہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کا بیمہ کرنا انشورنس کمپنیوں کے لئے فائدے کے بجائے خسارے کا سودا بن گیا ہے!

اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ اکثریت کے ان مظالم کا عدالت کے ذریعہ دفعیہ ہو سکتا ہے تو وہ یا تو قانون کی حدود کو نہیں جانتا یا پھر اصلاح حال کے لئے قانون کا حوالہ دے کر یہ غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ زیادہ سنگین نہیں، معمولی درجہ کا ہے کیونکہ معمولی اور چھوٹے مسائل ہی کو قانون کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل فریب اور دھاندلی ہے کہ موجودہ حالات کو قانونی طور پر قابل حل مسائل کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ یہ تو ملکی پیمانے پر ایک منظم غارت گری ہے جس میں حکومت پولیس فوج، سرکاری عملہ، اور اکثریتی فرقہ سب کے سب شریک ہیں۔ ایک ایسے ہمہ گیر طوفان کو قانون کے ذریعہ ٹالنے کی کوشش کرنا قانون اور مظلوم فرقہ دونوں کا مذاق اڑانا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس طوفان میں کون فیصلہ دے گا اور وہ کون ہو گا جو اس فیصلے کا نفاذ عمل میں لائے گا۔

انتخابی طاقت کا استعمال

تیسری چیز جس پر سیاسی انداز میں سوچنے والے لوگ مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں بھروسہ کر رہے ہیں، وہ انتخابی طاقت کا استعمال ہے۔ اس کی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک کا انحصار اسمبلی کی ممبری پر ہے اور دوسرے کا انحصار مسلم ووٹوں کی تعداد پر۔ پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے نمائندے اسمبلیوں میں بھیج کر وہاں اپنی آواز پیدا کریں۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمان خود تو اسمبلیوں میں نہ جائیں۔ البتہ الکشن کے موقع پر اپنے ووٹوں کا سودا کیا جائے۔ یعنی تمام مسلمان ووٹر مل کر اپنا ایک انتخابی شرائط

نامہ (MANDATE) تیار کریں جس میں بتایا گیا ہو کہ وہ صرف اس پارٹی کے حق میں اپنی رائیں استعمال کر سکتے ہیں جو کامیاب ہونے کے بعد ان کے فلاں فلاں کام کرنے کا وعدہ کرے۔ اس طرح جو پارٹی ان کی شرائط مان لے مسلمان اس کے نمائندوں کو اپنا ووٹ دیں۔ اس طریقے کو استعمال کر کے مسلمان انتخابی معاہدوں کے ذریعہ ہر پانچ سالہ مدت کے لئے اپنے مقاصد کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

بظاہر یہ تجویزیں بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں لیکن گہرائی سے دیکھئے تو ان کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہماری کچھ سیاسی تمناؤں نے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے۔ واقعات کی دنیا سے صرف نظر کر کے اپنے خیال کی دنیا میں ایک فرضی قلعہ تعمیر کر لیا گیا ہے۔

اب پہلی صورت کو لیجئے۔ اس کی دو ممکن صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان اپنے کچھ افراد کو خود اپنی طرف سے الکشن میں کھڑا کریں اور انھیں کامیاب کر کے اپنے قومی نمائندے کی حیثیت سے اسمبلی میں بھیجیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان افراد دوسری سیاسی پارٹیوں کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں اور ان کے زینے کو استعمال کر کے اسمبلی کی نشستوں تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

اس سلسلے میں جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے، وہ صرف ان چند انتخابی حلقوں میں کارگر ہو سکتی ہے۔ جہاں مسلمان اب بھی اکثریت میں ہیں۔ اپنے اکثریتی علاقوں ہی میں مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی آدمی کامیاب کر سکیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے انتخابی حلقے سارے ملک میں صرف چند ہی ہیں[1]۔ پھر جمہوری نظام میں جہاں سارے فیصلے عددی طاقت کی بنیاد پر ہوتے ہیں، آپ کے چند نمائندے اگر کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچ بھی جائیں تو وہ کسی فیصلے پر کیوں کر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف احتجاجی تقریریں کر سکتے ہیں۔ جیسے یوپی اسمبلی میں گاؤ کشی بل پیش ہونے کے موقع پر بعض مسلمان ممبروں نے شدید تنقیدیں کی تھیں۔ مگر ہر دانا شخص جو انتخابی پالٹکس پڑھتا ہے جانتا ہے کہ اس طرح کی احتجاجی تقریروں کی حیثیت اس کے

[1] اب تو حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ الکشن حلقے (CONSTITUENCIES) کی تقسیم میں مسلم اکثریت والی آبادیوں کی اس طرح قطع و برید کر دی جائے کہ ان کی عددی اکثریت انتخابات میں عملاً غیر مؤثر ہو جائے۔

سوا اور کچھ نہیں کہ ـــــ "کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔"

اسی طرح دوسری سیاسی پارٹیوں کے ٹکٹ پر کھڑے ہو کر اسمبلی میں پہنچنا بھی مسلمانوں کے قومی مسئلے کے حل کے لئے بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ جو مسلمان اس طرح کامیاب ہوتے ہیں وہ بحیثیت مسلمان اسمبلی کے ممبر نہیں ہوتے بلکہ وہ اس مخصوص پارٹی کے نمائندے ہوتے ہیں جس کے زینے کو استعمال کر کے وہ اس کرسی تک پہنچے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مکمل طور پر پارٹی کی پالیسیوں کا احترام کریں۔ ایسے مسلم ممبروں سے یہ امید کرنا کہ وہ مسلمانوں کے قومی مسائل میں ان کے کچھ کام آسکیں گے، ایک خیال خام کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں یہ عبرت انگیز واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۱ء میں جب یو پی اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی، تو اس وقت کے ایک مسلم ممبر مولوی عبدالباقی صاحب (اعظم گڈھ) نے ایک ترمیم پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اصل تجویز میں حسب ذیل الفاظ بڑھا دئے جائیں:-

"اور اردو بھی فارسی رسم الخط کے ساتھ"[1]

یہ ترمیم اردو کی بقا کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے، اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس کو اسمبلی کے مسلم ممبروں کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ یو پی اسمبلی میں اُس وقت مسلمان ممبروں کی مجموعی تعداد ۶۸ تھی لیکن جب رائے شماری ہوئی تو ۶۸ ممبروں میں سے صرف پانچ نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیئے۔ باقی یا تو غیر حاضر رہے یا پھر انھوں نے کانگرس کی اصل تجویز کے حق میں ووٹ دیئے۔ ایک بزرگ نے تقریر میں تو مولوی عبدالباقی صاحب کی ترمیم کی حمایت

---

[1] واضح ہو کہ یہ ترمیم کوئی انوکھی چیز نہیں تھی کیونکہ کانگرس خود پہلے اسی نظریہ کی مبلغ رہی ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۵ء میں کہا تھا۔

"(آزاد ہندستان میں) رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ (فارسی اور دیوناگری) دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ جس خط میں چاہیں لکھیں" ـــــ آٹو بیاگریفی

کی مگر رائے شماری کے وقت ترمیم کے خلاف ووٹ دیا۔ ایک صاحب غیر جانبدار رہے۔ مولوی عبدالباقی صاحب کے بیان کے مطابق ان مسلمان نمائندوں نے اردو کی مخالفت اس لئے کی تھی کہ کانگریس ان سے خفا نہ ہو اور اگلے الکشن میں انھیں اپنے ٹکٹ سے محروم نہ کرے۔ (سیاست جدید ۲۲ دسمبر ۱۹۵۱ء) زبان کے بارے میں حکومت کا یہ فیصلہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ہمارے نمائندوں نے اپنی سیاسی موت کے اندیشے کو قوم کی موت کے مسئلے پر ترجیح دی۔ کیوں، اس لئے کہ یہ لوگ اگرچہ مسلمان تھے، مگر وہ کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے تھے، اس لئے انھیں وہی کرنا تھا جو کانگریس چاہتی ہو۔

اسی طرح انتخابی معاہدہ (MANDATE) کی جو صورت ہے، وہ بھی ایک دلفریب تخیل سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک ایسی تجویز ہے جو بار بار دہرائی گئی ہے اور بار بار ناکام ہوئی ہے۔ ہر بار الیکشن کے موقع پر مختلف پارٹیاں جو منشور (MANIFESTO) شائع کرتی ہیں وہ کیا ہے۔ یہ در اصل ووٹروں کی اپنی تمنائیں ہیں جن کو پارٹیاں اپنے ارادے کی شکل میں ظاہر کرتی ہیں۔ انتخابی مینی فسٹو، پارٹی پروگرام سے زیادہ اس مقصد کے پیش نظر تیار کیا جاتا ہے کہ اس میں ان ووٹروں کے حوصلوں کی ترجمانی ہو سکے جن سے پارٹی کو ووٹ حاصل کرنا ہے۔ تاکہ وہ اس امید کے ساتھ اس پارٹی کو ووٹ دیں کہ —— "جو کچھ ہم چاہتے ہیں، وہی کرنے کے لئے یہ لوگ اسمبلی میں جا رہے ہیں۔" مینی فسٹو اپنی حقیقت کے اعتبار سے مین ڈیٹ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ جو کچھ ووٹر چاہتے ہیں، مینی فسٹو میں پارٹی خود اپنی زبان سے وہی کہہ دیتی ہے۔ جو انتخابی شرائط نامہ آپ اپنی طرف سے پیش کر کے ان سے منظور کرانا چاہتے ہیں، وہی وہ خود لکھ کر آپ کو دیدیتے ہیں۔ اس طرح گویا ہر پارٹی جو کسی الیکشن میں ووٹروں کو متاثر کر کے کامیاب ہوتی ہے، وہ دراصل اپنے ووٹروں سے ایک غیر تحریری مین ڈیٹ پر دستخط کرتی ہے۔ وہ ان سے ایک قطعی معاہدہ کرتی ہے۔ پھر کیا ان انتخابی معاہدوں کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔ کیا ووٹروں سے کئے ہوئے وہ وعدے کبھی پورے ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ووٹروں نے انھیں اپنے ووٹ دیئے تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انتخابی وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ وہ سیاسی بازیگری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ

ووٹروں کی وہ تمنائیں جن کو پارٹیاں یہ حیثیت دیتی ہیں کہ ان کو اپنا ذاتی پروگرام بنا کر پیش کریں۔ جب ان کا یہ حشر ہوتا ہے تو ان تمناؤں کا کیا انجام ہوگا جن کو کہہ سن کر درج فہرست کرایا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے انتخابی معاہدوں سے امیدیں باندھے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسے تجربے کو آزمانا چاہتے ہیں جو بار بار دہرایا گیا ہے اور بار بار ناکام ہوا ہے۔

پھر مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدے تو اور زیادہ ناپائدار ہیں کیونکہ ہم جو تحفظات اور مقاصد اس ملک میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ملک کے جمہوری مزاج اور اکثریتی فرقے کے حوصلوں کے بالکل خلاف ہیں۔ وہ ملک کے سماجی منصوبوں سے براہ راست ٹکرانے والے ہیں۔ پھر کون پارٹی ہوگی جو عملی سیاست میں ان دو طرفہ تقاضوں کو نباہ سکے کہ وہ مسلمانوں کو بھی خوش رکھے اور اپنے دوسرے ووٹروں کو بھی خفا نہ ہونے دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی ہم سے ہمارے واقعی حوصلوں کے مطابق کوئی معاہدہ کرلے تو ایسا کاغذی معاہدہ قطعی طور پر سیاسی مصلحت کی وجہ سے ہوگا جس کو اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ خود ہی دفن کر دے گی۔ کیرلا کے تجربے میں اس کی مثال بھی ہمارے سامنے آچکی ہے۔ تیسرے عام الکشن میں کانگریس نے کیرلا میں وہاں کی مسلم لیگ سے انتخابی سمجھوتہ کیا تھا۔ اس سمجھوتہ کا اصل مقصد ریاست میں کمیونسٹ پارٹی کا مقابلہ کرنا تھا۔ کانگریس اپنے اس مقصد میں کامیاب رہی۔ اور الکشن کے بعد کیرلا مسلم لیگ کے ایک لیڈر مسٹر محمد کو یاریاستی اسمبلی کے اسپیکر بنا دیئے گئے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ نومبر ۱۹۶۱ء میں مسٹر کویا کو اسپیکری سے استعفا دینا پڑا۔ انھوں نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "کانگریس کے شاکاکوں کے گوشت کے مطالبے کی وجہ سے مسلم لیگ — کانگریس کا اتحاد برقرار رکھنا ناممکن ہوگیا ہے۔"

خلا کہاں ہے

آپ کہیں گے پھر کیا ہم احتجاج اور مطالبات کی مہم کو ترک کردیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ ترک نہ کیجئے بلکہ اس مہم میں اپنے خدا کو بھی شریک کر لیجئے۔ اگر آپ ایسا کر سکیں تو یکایک آپ دیکھیں گے کہ طاقت کا توازن بدل گیا ہے کیونکہ خدا اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت

ہے۔ وہ جس کے ساتھ ہو جائے وہ کمزور نہیں رہتا۔ وہ جس کو غالب کرنا چاہے، کوئی اسے زیر نہیں کر سکتا۔ مذکورہ بالا تمام تدبیریں جن پر مسلمان اپنے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں اعتماد کر رہے ہیں، وہ سب اپنی مجرد شکل میں مسئلے کو معبودِ حکومت اور معبودِ عوام کے سامنے پیش کرنے کی صورتیں ہیں۔ مگر آپ کے مسئلے کا حقیقی حل یہ ہے کہ آپ اس کو اپنے معبودِ برحق کے سامنے پیش کریں۔ آپ اس کے لئے اپنے خدا سے درخواست کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان اگر جھوٹے معبودوں کو چھوڑ کر اپنے مالک کی طرف پلٹ آئیں اور اس زمین پر یہ واقعہ ظہور میں آئے کہ آخری رسول کی امت اپنے رب کو پکار کر یہ کہہ رہی ہو کہ ـــــ "خدایا تیرے بندوں پر ظلم ہو رہا ہے تو ان کی مدد فرما" تو میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے مصر میں بنی اسرائیل کو فرعون کے تسلط سے نجات دی تھی، تمھاری دعا کے ختم ہونے سے پہلے یہاں کے زمین و آسمان بدل چکے ہوں گے اور اگلے روز دیکھنے والے دیکھیں گے کہ اس ملک میں ایک نیا انقلاب آ چکا ہے، جس طرح اس سے پہلے دیکھنے والوں نے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔

یہ شبہہ نہ ہو کہ میں دنیوی تدبیروں کو بالکل بے کار اور ناقابل ترک قرار دے رہا ہوں۔ اَعِدُّوْا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُمْ کا حکم تو خود قرآن میں موجود ہے۔ مگر دنیوی تدبیروں کے امکانی استعمال کے ساتھ دوسری حقیقت جو بتائی گئی ہے، وہ ہے وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور یہی وہ پہلو ہے جس پر میں اس وقت زور دینا چاہتا ہوں میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ تدبیریں اگر اپنے پیچھے محض وہ سیاسی اور آئینی قوت رکھتی ہوں جن کے حوالے سے انھیں پیش کیا گیا ہے، تو بلاشبہ وہ قطعاً بے اثر اور لا حاصل ہیں۔ محض آئینی دفعہ یا سیاسی طریق کار ہونا ان کے اندر وہ وزن پیدا نہیں کر سکتا جو ان کو بالفعل مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے آئین اور قانون چند الفاظ کا نام ہے اور اسی قسم کے کچھ دوسرے الفاظ سے بآسانی انھیں رد کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سیاسی طریق کار کی کامیابی انسانوں کی نیتوں اور ارادوں پر موقوف ہے اور انسان کی نیتیں اور ارادے جتنا ذاتی اغراض کے قبضے میں ہوتے ہیں، اتنا کسی اصول اور معاہدے کے قبضے میں نہیں ہوتے۔ اس قسم کی کوئی جدوجہد اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب مزید کسی برتر ذریعہ سے اسے قوت پہنچی

ہو جب قضا و قدر کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگیا ہو۔

قرآن کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ محض کسی اصولی ورفتاری امکان نے کبھی کسی گروہ کو کامیابی سے ہم کنار نہیں کیا ہے اور نہ صرف نظری طور پر ایک عمدہ سیاسی طریق کار کا انکشاف کسی جد و جہد کو اس کے مطلوبہ انجام تک پہنچانے کی کافی ضمانت ہے۔ کوئی بھی تحریک جو کامیاب ہوئی ہے وہ اسی وقت کامیاب ہوئی ہے، جب خارجی حالات ـــــ ایسے حالات جو کسی کے بس میں ہیں اور نہ ان کے بارے میں پیشگی کوئی اطلاع دی جا سکتی ہے ـــــ ان میں کوئی غیر معمولی تبدیلی تحریک کے مساعد ہو جائے۔ اور جو تحریک ناکام ہوئی ہے وہ اسی لئے ناکام ہوئی ہے کہ اس قسم کے حالات اس کے لئے پیدا نہیں ہو سکے۔ تاریخ میں ایسا بہت ہوا ہے کہ کسی تحریک کے لیڈر اپنے پروگرام کی نظری خوشنمائی پر مطمئن ہو کر سمجھنے لگے کہ وہ بہرحال کامیاب ہو کر رہیں گے۔ انھوں نے تحریک شروع کی اور بظاہر کافی نمایاں نظر آنے لگے۔ مگر اچانک قضا و قدر کے ایک فیصلے نے ان کے سارے کام کو اس طرح لپیٹ کر رکھ دیا جیسے وہ بچوں کا گھروندا تھا جو ہوا کے جھونکے سے منتشر ہو گیا۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ بس اب یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اب اس کے غالب آنے کا کوئی امکان نہیں، اور اس کے بعد اچانک حالات میں ایک تبدیلی ہوتی ہے اور لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں کہ جو آگے تھا وہ پیچھے کر دیا گیا ہے اور جو پیچھے تھا اس کو اگلی نشستوں پر جگہ مل گئی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں روس میں کمیونسٹ تحریک کی کامیابی ایک ایسا واقعہ ہے جس کا انیسویں صدی کے اشتراکی مفکرین نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر روس میں اشتراکیت کیسے کامیاب ہوئی۔ اس کی واحد وجہ پہلی جنگ عظیم ہے جس نے زار کی حکومت کو بیحد کمزور اور وہاں کی پبلک کو سخت بیزار بنا دیا تھا یہی وہ نازک حالات تھے جس نے وہاں کی کمیونسٹ تحریک کو یہ موقع دیا کہ وہ زارشاہی کے تخت کو الٹ کر سرخ شہنشاہیت قائم کر سکے۔ اسی طرح یہ واقعہ ہے کہ اگر دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ عظمیٰ کو بے جان نہ کر دیا ہوتا تو ہندستان کو "یوم آزادی" منانے کے لئے شاید کسی اور ۱۵ اگست اور کسی دوسرے ۴۷ء کا انتظار کرنا پڑتا۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں جب دوسری جنگ عظیم آخری مرحلوں سے گزر رہی تھی، بحر اسود کے کنارے ایک پر فضا روسی شہر یالٹا میں روس، امریکہ اور برطانیہ کے "بڑوں" کی کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس ۴ فروری سے ۱۱ فروری تک جاری رہی جس میں بہت سے فیصلے کئے گئے۔ دنیا کا موجودہ نقشہ بہت حد تک انھیں فیصلوں کا رہین منت ہے۔ اسی کانفرنس کے فیصلے کے مطابق روس کو یہ موقع ملا کہ وہ جرمنی سے لے کر بلغاریہ تک مشرقی یورپ کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہو جائے اور اسی طرح اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ویٹو کا اختیار (VETO POWER) جو عملاً آج امریکہ اور برطانیہ کے لئے غیر مفید ہے۔ مگر روس کے لئے مغربی طاقتوں کے مقابلے میں ایک قیمتی ہتھیار ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں بھی اسی کانفرنس میں فیصلہ ہوا تھا۔ اب اگر دوسری جنگ عظیم کا مہیب واقعہ وجود میں نہ آتا اور اٹلی اور جرمنی اور جاپان کے اتحاد سے نازک صورت حال نہ پیدا ہو گئی ہوتی اور بالکل معتدل حالات میں چرچل، روزویلٹ اور اسٹالن ایک کانفرنس میں جمع ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ پانچ لاکھ الفاظ پر مشتمل یہ معاہدہ وجود میں آسکے۔

ابھی دو سال پہلے خود اپنے ملک میں ہم یہ منظر دیکھ چکے ہیں کہ چین کے حملے نے کس طرح حیرت انگیز طور پر سارے مسلمات بدل دیئے تھے۔ ہندستان جو اپنی غیر جانبداری پر فخر کرتا تھا اور دھڑے بندی کی سیاست کے لئے اس کے پاس نفرت آمیز الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہاں کھلم کھلا امریکن بلاک میں شمولیت کی تجویزیں پیش ہونے لگیں۔ پاکستان کے معاملے میں یکایک سوچنے کا انداز بدل گیا اور دفاعی معاہدے سے لے کر آپس کے انتہائی نازک مسائل پر سمجھوتہ تک کی باتیں کی جانے لگیں۔ پنڈت نہرو جو اس ملک کے دیوتا بن چکے تھے، ان کے بارے میں "نہرو استعفا دو" کے نعرے سنائی دینے لگے دہلی کے ایک اخبار نے اسی زمانے میں لکھا تھا۔ "پنڈت نہرو نے کانگریس سے باہر سارے ملک کو اپنے خلاف کر لیا ہے اور اب کمیونسٹوں کے سوا کوئی ان کے ساتھ نہیں۔" اس نے لکھا کہ "پنڈت نہرو مخالف پارٹیوں کی تنقید کو غلط قرار دینے کے لئے دوسرے ملکوں کی مثال دیتے ہیں۔ کہ ملک کو کوئی خطرہ ہو تو تمام سیاسی پارٹیاں حکومت کی پشت پر ہو جاتی ہیں لیکن

وہ کیوں بھول گئے کہ پہلی جنگ یورپ میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اسکوئتھ کی جگہ مسٹر لائڈ جارج نے اور دوسری جنگ یورپ میں مسٹر چیمبرلین کی جگہ مسٹر چرچل نے لے لی تھی۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہ پنڈت نہرو کو حکومت چھوڑ دینی چاہئے۔ تاکہ دوسرے بہتر لوگ ان کی جگہ لے سکیں۔

تحریکوں کی کامیابی کا راز اسی طرح کے غیر معمولی حالات کے پیدا ہونے میں ہے۔ اس طرح کے موافق حالات گویا وہ انقلابی زینہ فراہم کرتے ہیں جس کو استعمال کر کے تحریک یکایک آگے بڑھ جاتی ہے۔ کوئی تحریک محض اپنی عام اور مقررہ رفتار سے چلتی ہوئی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ ایک خاص مرحلے میں اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جو اس کے سفر کو کم کر کے اسے آگے بڑھا دیتا ہے۔ جن تحریکوں کے لئے ناکامی مقدر ہوتی ہے وہ اٹھتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور جنھیں کامیاب ہونا رہتا ہے وہ اٹھتی ہیں اور چلتی رہتی ہیں یہاں تک کہ زمانہ ان کیلئے ایک ایسا زینہ فراہم کرتا ہے جہاں سے چھلانگ لگا کر وہ کامیابی کے مقام تک پہنچ جاتی ہیں ایسی تحریک کا چلنا دوسری لفظوں میں اسوقت کا انتظار کرنا ہوتا ہے جب زمانہ اس کو چھلانگ لگانے کا یہ موقع عطا کریگا، ہر وہ تحریک جو کبھی اس زمین پر کامیاب ہوئی ہے اس کے ساتھ یہی قصہ پیش آیا ہے۔ اشتراکی تحریک کو پہلی جنگ عظیم نے یہ زینہ فراہم کیا تھا، ہندستان کی تحریک آزادی کیلئے دوسری جنگ نے اس قسم کے زینے کا کام کیا۔ اسی طرح صدر اول کی اسلامی تحریک کے لئے مدینے کے باشندوں کا یکایک بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لینا وہ زینہ ہے جس سے اسلامی تحریک جست لگا کر آگے بڑھ گئی اور سارے عرب پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

حالات میں اس قسم کی غیر معمولی تبدیلیاں کسی شخص یا تحریک کے بس میں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا فیصلہ کائنات کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ زمانہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ جب بھی زمانہ کسی تحریک کو کامیابی کا موقع دیتا ہے تو وہ دراصل اس کے حق میں خدا کا فیصلہ ہوتا ہے جو زمانے کے حالات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ باطل گروہوں کے ساتھ یہ معاملہ کچھ دوسرے اسباب و مصالح کے تحت ہوتا ہے اور اہل اسلام کے ساتھ اس لئے ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار بندوں کو ان کی وفاداری کا صلہ دے تاکہ ان کے لئے دین پر عمل کرنے کو آسان بنا دے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں میں آپ کو لانا چاہتا ہوں۔ اس ملک کے مسلمان جن حالات

میں گھر گئے ہیں۔ اس سے نکلنے کی سبیل محض سیاسی پروگرام اور کسی آئینی جدوجہد میں نہیں ہے۔ اگرچہ ہم کو یہ سب بھی کرنا ہے ـــــ ان سے نکلنے کا امکان تو اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ حالات کو ہماری جدوجہد کے لئے سازگار بنا دے۔ جب زمین و آسمان کا مالک مافوق ذرائع سے سیاسی اور تمدنی چٹانوں میں ایسے درّے پیدا کر دے جس سے نفوذ کر کے ہم آگے جا سکتے ہوں۔ وہ ایسی موافق آندھیاں چلائے جس سے ایک طرف مخالف کیمپ کی طنابیں اکھڑ جائیں اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کی راہ ہموار ہو رہی ہو، وہ ایسی بارش برسائے جو ایک کے لئے کیچڑ اور دلدل بنے اور دوسرے کے لئے سیرابی اور تازگی کا سامان فراہم کرے۔ وہ ایسا زلزلہ پیدا کرے جس سے بلندیاں پست ہو جائیں اور پستیاں ابھر کر اوپر آجائیں۔ وہ ایک فریق کے اوپر "رعب" اور دوسرے فریق کے اوپر "امنہ" نازل کرے۔ جب تک اس قسم کی غیر معمولی آسمانی مدد ہمارے ساتھ نہیں ہوگی کسی بھی قسم کی سیاسی اور قانونی مہم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی عقل کا، تاریخ کا اور قرآن کا متفقہ فیصلہ ہے۔

خدا کی مدد کب آتی ہے

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے مقدمے کی کامیابی کا راز آئین کی ورق گردانی میں نہیں ہے بلکہ خدا کی نصرت کا استحقاق پیدا کرنے میں ہے۔ آئین کی دفعات بھی حقیقۃً اسی وقت ہمارے مقدمے کو مضبوط کر سکتی ہیں جب خدا کی غیر معمولی عنایات ہماری طرف مائل ہو گئی ہوں۔ اس استحقاق کا راز کیا ہے۔ اس کا جواب خدا کی کتاب میں ملے گا۔ وہ کتاب جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے "ہدایت" ہے، جس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ ـــــ فِيهِ ذِكْرُكُمْ آیئے ڈھونڈیں کہ ہمارا نام اس کتاب میں کہاں لکھا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب قدیم حاملین کتاب الٰہی کے واقعات میں ہے فرعون کے زمانے میں مصر میں بنی اسرائیل کے جو حالات تھے، اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج اس ملک میں ٹھیک انھیں حالات سے دوچار ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی، بنی اسرائیل کی مصری زندگی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس لئے بنی اسرائیل کو اس وقت جو حل بتایا گیا تھا وہی اسی وقت ہمارے مسئلہ کا بھی حل ہے۔ انھوں نے اپنے معاملے میں جس طرح خدا

کی مدد حاصل کی تھی، اسی طرح ہم بھی آج اپنے آپ کو خدا کی مدد کا مستحق بنا سکتے ہیں جب فرعون نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی نسل سرزمین مصر سے ختم کر دی جائے اور ان پر سخت ترین مظالم ڈھانے شروع کئے تو ان کے پیغمبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو حل انھیں بتایا تھا، وہ یہ تھا:۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

(اعراف ۲۹ — ۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ ملک اللہ کا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور انجام تو صرف متقیوں کے لئے ہے۔ بنی اسرائیل کے لوگوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں پیغمبر نے جواب دیا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین کا اقتدار تم کو عطا کرے۔ پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

یہ الفاظ کسی تاریخ کی کتاب کے نہیں ہیں بلکہ خدا کی کتاب، قرآن کے ہیں جو قیامت تک کے لئے ہدایت نامہ بن کر آیا ہے، جو اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس کو ماننے والے اس سے اپنے تمام سوالات کا جواب معلوم کریں۔ ان الفاظ میں دراصل کائنات کا مالک ہم کو ایک پیغام دے رہا ہے۔ یہ سابق حاملین کتاب کی سرگزشت کی صورت میں موجودہ حاملین کتاب کے مسئلے کا حل ہے جو قرآن میں ہمیں بتایا گیا ہے۔

اس اقتباس میں بنی اسرائیل کے قومی مسئلے کا جو حل بتایا گیا ہے، وہ دو نکات پر مشتمل ہے۔ استعانت باللہ اور صبر ٹھیک یہی بات سورہ یونس میں کہی گئی ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہاں استعانت باللہ اور صبر کے بجائے اقامت صلوٰۃ اور توکل کے الفاظ ہیں۔ یہ دونوں لفظ بظاہر دو قسم کے ہیں۔ مگر وہ حقیقۃً بالکل ایک ہیں۔ استعانت باللہ دراصل نماز کی روح ہے اور صبر و توکل ایک ہی حقیقت کے اظہار کے لئے دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس دوسرے مقام پر اسی کے ساتھ انھیں یہ بشارت بھی

دی گئی ہے کہ اگر تم نے اس پروگرام پر عمل کیا تو یقیناً تمہارے لئے خدا کی طرف سے "رزق طیب" اور "مبوّءِ صدق" کا انتظام کیا جائے گا (یونس -۹۳) آیت کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ	اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ
اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ	پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم
كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى	واقعی مسلم ہو۔ وہ بولے، ہم نے اللہ پر بھروسہ
اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا	کیا۔ خدایا ہم کو ان ظالموں کے لئے فتنہ
فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا	نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں
بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝	کے مقابلے میں نجات عطا کر۔ اور موسیٰ اور
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ	ہارون کو ہم نے وحی بھیجی کہ مصر میں اپنی
اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا	قوم کے لئے کچھ گھر مقرر کر لو اور ان گھروں
وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ	کو قبلہ بنا لو اور نماز قائم کرو اور ایمان
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ	والوں کو خوش خبری دے دو —
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس ۸۴-۸۸)	

اب دیکھئے کہ یہ پروگرام ہم سے کن کن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ——

۱۔ ان آیات میں خاص طور پر دو چیزوں کا ذکر ہے —— استعانت باللہ اور صبر۔ مگر یہ ہدایت جنھیں دی گئی وہ ہماری طرح کوئی منتشر اور متفرق لوگ نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک "قوم" تھی جس کا ایک "موسیٰ" تھا۔ یہ نبی کی قیادت کے تحت ایک منظم گروہ تھا جو نبی کے حکم سے چلتا تھا۔ اور نبی کے حکم سے رکتا تھا جس کے سارے معاملات نبی کے ارشادات کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ہندستان کے مسلمان اس طرح کی کوئی قوم نہیں ہیں اور نہ ان کے درمیان کوئی "موسیٰ" ہے۔ وہ ایک منتشر ریوڑ ہے جس کا کچھ حصہ جنگل میں کھو گیا ہے اور کچھ میدانوں میں بکھرا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے اندر اس اجتماعی حالت کو پیدا کریں جو ان احکام کے نزول کے وقت بنی اسرائیل میں موجود تھی کیونکہ اس کے بعد ہی ہم ان

ارشادات الٰہی کے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آج ہمارے درمیان ایک شخص ہو جو ہم سے علیہ توکلوا کا مطالبہ کرے اور اس کے جواب میں قوم ہم آواز ہو کر کہے کہ علی اللہ توکلنا۔ اس کے بعد ہی ہم نصرت الٰہی کے استحقاق کی دوسری صفات اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، اس کے بعد ہی ہم وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ کا مصداق بن سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اجتماعی معاملات میں کوئی نتیجہ اجتماعی کوششوں ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ عمومی خشک سالی انفرادی دعاؤں سے نہیں ٹلتی۔ مگر جب بہت سے مسلمان جمع ہو کر یکجائی طور پر اس کی دعا کرتے ہیں تو یکایک آسمان میں بادلوں کے ٹکڑے تیرنے لگتے ہیں اور نماز ختم ہوتے ہی بارش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آج ہم جن اجتماعی مشکلات سے دوچار ہیں، ان کے سلسلے میں خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ہم اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب اجتماعی طور پر ہم نے اس کے استحقاق کا ثبوت دیا ہو۔

اجتماعیت سے مراد کمیونسٹ پارٹی کی طرح کوئی سخت قسم کی تنظیم نہیں ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ اس کا کوئی ممبری فارم ہو اور ہر ہر مسلمان اس فارم کی خانہ پری کر کے اس کا ممبر بنا ہو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں، وہ جس بستی میں ہوں ایک متحد الرائے دینی خاندان کی طرح رہیں، ذاتی اور جزوی معاملات یا فقہی مسالک میں اختلاف کے باوجود قومی سطح کے معاملات میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں ان کی مالیات کا اجتماعی نظم ہو، ان کے تعلیمی اور مذہبی مسائل اجتماعی سطح پر طے ہوتے ہوں، وہ ایک آواز پر جمع ہو سکیں۔ اور ایک محاذ پر اپنی قوت لگا سکیں جس طرح ان کی مسجد کا ایک امام ہوتا ہے، اسی طرح ان کے قومی معاملات کا ایک سربراہ ہو جس پر سب اعتماد کریں اور جو سب کو ساتھ لے کر چل سکے ——— اس طرح کی اجتماعیت خواہ بظاہر کتنی ہی مشکل معلوم ہو —— مگر "خدا کا ہاتھ" ایسی ہی اسلامی جماعت کے اوپر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر جماعتی سطح پر کسی گروہ کیلئے خدا کی سرپرستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۲- اس ابتدائی اہتمام کے بعد جو چیز سب سے پہلے ضروری ہے وہ استعانت باللہ ہے یعنی خدا سے مدد مانگنا۔ ہماری کامیابی کا راز سب سے بڑھ کر اس واقعہ میں ہے کہ ہماری جدوجہد میں خدا ہمارے ساتھ شریک ہو گیا ہو۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم خود اس کے لئے خدا کے آگے

طالب بن کر حاضر ہوئے ہوں۔ اگر ہم اپنے معاملے میں خدا کی مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم نے خدا سے اس کی درخواست کی ہو۔ کیونکہ خدا کی مدد کسی کو خود بخود نہیں مل جاتی۔ خدا تو اسی کو دیتا ہے جو اس سے مانگے۔ جو اس سے بے نیازی ظاہر کرے، خدا اس سے بھی زیادہ اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مادہ پرست ذہن سمجھتے ہیں کہ کسی کو ملنا اور کسی سے چھننا، یہ سب مادی اسباب کے تحت ہونے والے واقعات ہیں، وہ "ظاہر حیات" کو اصل حقیقت سمجھے ہوئے ہیں۔ مگر اس دنیا کا اصل حاکم اور کارساز خدا ہے، وہی سارے واقعات کو وجود میں لاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "خدا کی مدد" کوئی موہوم لفظ یا محض ایک پراسرار قسم کا مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو بار بار کے تجربے میں اپنی واقعیت ظاہر کر چکی ہے۔

یہاں میں ایک واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ تقریباً ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے علاقے میں سخت خشک سالی ہوئی۔ برسات کا موسم گزرتا جا رہا تھا۔ مگر بارش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کسان روزانہ صبح اٹھتے ہی آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر بادل کا ایک ٹکڑا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا جس سے دل کو تسکین ہو۔ بالآخر جب مایوسی حد کو پہنچ گئی تو یہ تحریک ہوئی کہ استسقا کی نماز پڑھی جائے۔ اعظم گڈھ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ایک میدان میں اطراف کی تمام بستیوں کے مسلمان جمع ہوئے۔ مرحوم مولانا محمد سعید صاحب ندوی، جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح (سرائمیر) میں حدیث کے استاد تھے، انھوں نے نماز پڑھائی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم لوگ سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سفر کر کے وہاں پہنچے تھے اور اس حال میں نماز ادا کی تھی کہ جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ مگر نماز سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو راستے ہی میں بارش شروع ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے نیچے پناہ لی اور کچھ بھیگتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

یہ کوئی اتفاقی یا منفرد واقعہ نہیں بلکہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لئے یہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ کتنی ہی بار ہمارے خدا نے ہم کو یہ منظر دکھایا ہے کہ خشک سالی میں عام مسلمانوں نے جمع ہو کر استسقاء کی نماز پڑھی اور اس کے بعد ہی آسمان سے پانی کا سیلاب بہہ پڑا۔ یہ تجربات

ایک طرف اس بات کا ثبوت ہیں کہ دنیا کا انتظام کسی اندھی بہری طاقت کے تحت نہیں ہے بلکہ وہ دیکھنے اور سننے والے خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بندوں پر مہربان ہے اور جب بندے اسے پکارتے ہیں تو وہ نظام عالم میں تغیر کرکے ان کی مدد فرماتا ہے۔ دوسری طرف اسی تجربے میں اس سوال کا جواب بھی ہے جو آج ہندستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ پریشان کئے ہوئے ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ اس خدا سے مدد مانگو جو سورج نکالتا ہے اور پانی برساتا ہے۔ جو تمہاری ایک دعا پر اپنے بادلوں کو لئے ہوئے تمہارے پاس دوڑا چلا آتا ہے۔ تم پکارو تو وہ پھر تمہارے پاس آئے گا، تم اس سے مدد مانگو تو وہ تمہاری مشکل کو آسان کر دے گا۔

جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، استعانت باللہ کی جگہ قرآن میں دوسرے مقام پر "اقامت صلوٰۃ" کا لفظ آیا ہے (یونس - ۸۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استعانت باللہ کی روح پیدا کرنے کا حقیقی ذریعہ کیا ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو خدا کی مدد کو اپنی طرف کھینچتی ہے ——— یہ نماز ہے۔

اس بحث کے ضمن میں نماز کا ذکر بعض ذہنوں کو بہت عجیب معلوم ہوگا۔ وہ کہیں گے عملی مسائل تو عملی پروگراموں کے ذریعہ حل کئے جاتے ہیں۔ ان کا نماز اور عبادت گزاری سے کیا تعلق۔ ان میں سے کوئی شخص اگر اس ضمن میں نماز کی اہمیت تسلیم بھی کرے گا تو صرف اس لحاظ سے کہ اس سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوگی، نماز باجماعت کا نظام ان کی منتشر طاقت کو مجتمع کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ کچھ لوگ جب بار بار ساتھ مل کر ایک قسم کا عبادتی عمل کریں گے تو ان میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا ہوگا اور اس طرح وہ مشترک مقصد کے لئے مشترک جد وجہد کے قابل ہو سکیں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

نماز سے اگر اس قسم کے کچھ "فائدے" ہوتے ہوں تو مجھے اس سے انکار نہیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ قرآن و حدیث میں سخت ترین حالات میں نماز سے "استعانت" کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب اس خدا سے تعلق جوڑنا ہے جو انسان کا بہترین سرمایہ ہے اور جس کو مکمل طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ حالات کو جب چاہے کسی کے خلاف کر دے۔ اور جس آن چاہے کسی کے موافق بنا دے۔ قرآن میں اِسْتَعِیْنُوْا

بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ ۱۵۳) کا مطلب نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو کر اس سے مدد طلب کرنا ہے نہ کہ نماز کی تنظیمی طاقت سے دشمن کے مقابلہ میں فائدہ اٹھانا۔

نماز اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے محض کچھ مقررہ حرکات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ خدا سے قریب ہونے کا ذریعہ ہے۔ وہ خدا کی توجہات مائل کرنے کی تدبیر ہے، وہ اپنے کو خدا تک پہنچانے کی کوشش ہے۔ نماز آدمی کے اندر وہ کیفیات پیدا کرتی ہے جب اس کی زبان سے دعا کے وہ بہترین کلمات نکلتے ہیں جو سیدھے خدا تک پہنچنے والے ہیں، اس نماز کو جب حقیقی طور پر ہم اپنی زندگیوں میں شامل کرلیں گے اسی وقت ممکن ہے کہ ہم خدا سے مانگنے والے بن سکیں۔ جو حقیقی معنوں میں نمازی ہو وہی حقیقی معنوں میں سائل بن سکتا ہے۔

ایسی نماز جب کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ محض پانچ وقت کی نماز نہیں رہتی بلکہ وہ اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے۔ ایسا شخص خدا سے جڑ جاتا ہے وہ ایک ایسی زندگی گزارتا ہے جس میں وہ اپنے رب کو پکار رہا ہو، اس کی یاد میں مشغول ہو، اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہوں۔ اس پر خدا کا تصور اتنا چھایا ہوا ہو کہ دنیا کا ہر واقعہ کسی نہ کسی پہلو سے اس کے ذہن میں خالق کی یاد دلانے والا بن جائے۔ اقامت صلوٰۃ محض مخصوص اوقات میں کچھ الفاظ اور رکعتوں کی تکرار نہیں بلکہ وہ خدا سے تعلق قائم کرنے کی ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔ نمازی بندے سے مراد وہ بندہ ہے جس کے دل میں خدا بس گیا ہو، جس کے لئے خدا ایک ایسی ہستی بن گیا ہو جس سے وہ بیحد ڈرتا ہو، جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہو، جس کی نماز اس کی قلبی حالت اور اس کی پوری زندگی کا ایک مجسم اظہار ہو۔

آج مسلمانوں کو اسی قسم کا مستعین باللہ بننے کی ضرورت ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر دوسری تدبیر پر مقدم ہے۔ کوئی تدبیر اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی جب تک یہ کیفیت ہمارے اندر نہ پیدا ہو چکی ہو۔ حکومت سے "ربط" پیدا کرنے سے پہلے مسلمانوں کو خدا سے ربط پیدا کرنا ہے۔ پریس سے آواز اٹھانے سے پہلے دل کی خاموش زبان سے خدا تک اپنی آواز پہنچانا ہے، دنیا کی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے خدا سے دادخواہ ہونا ہے، بیلٹ بکس کے پنج سالہ فیصلوں میں اپنی تقدیر رد ہونے سے پہلے سال کی ان راتوں میں

قسمت آزمائی کرنی ہو جب قضا و قدر کی طرف سے نوشتے لکھے جا رہے ہیں (فیھا یفرق کل امر حکیم۔ دخان)

۲۔ استعانت کے ساتھ نصرت الٰہی کا استحقاق پیدا کرنے کی دوسری شرط صبر ہے۔ خدا کے دربار سے اسی کو ملتا ہے جو مانگنے کے ساتھ صبر کا ثبوت بھی دے رہا ہو۔ صرف لفظی طور پر مانگنا خدا کے یہاں سنا نہیں جاتا۔ اس کی طرف صرف "کلمہ طیب" ہی اٹھتا ہے اور "عمل صالح" اسے خدا تک لے جاتا ہے۔ جو قول کلمہ طیب نہ ہو اور جس کے پیچھے عمل صالح موجود نہ ہو، وہ ہرگز خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور صبر عمل صالح کی آخری کیفیت ہے۔ جب بندہ سخت ترین حالات کے باوجود اپنے رب کی مرضی پر جما رہتا ہے تو وہ عمل کا انتہائی ثبوت دیتا ہے اور اسی کا نام صبر ہے۔ صبر عمل صالح کا انتہائی وقت ہے، اسی لئے وہ قبولیت دعا کا بھی انتہائی وقت ہوتا ہے۔

صبر کے معنی ہیں جمنا۔ تمام مشکلات کے باوجود اپنے مسلک پر ڈٹے رہنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات جب آپ کو خدا کے راستے سے ہٹانے کے لئے زور کر رہے ہوں تو آپ اپنی ساری طاقت اس پر قائم رہنے میں لگا دیں۔ آپ ہر قسم کا نقصان برداشت کریں۔ مگر یہ برداشت نہ کریں کہ آپ کا خدا جو ہر آن آپ کو دیکھ رہا ہے، وہ آپ کو حق کے راستے سے ہٹا ہوا پائے۔ آپ کی دعا محض کچھ الفاظ کی تکرار نہ ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ بندہ خدا کی راہ پر قائم رہنے کے لئے اپنا آخری زور صرف کرتے ہوئے اپنے رب کو پکار رہا ہے کہ خدایا! تو میری مدد کے لئے آجا، کیونکہ میں صرف اپنی طاقتوں کے بل پر ٹھہر نہیں سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے آپ اس ملک میں جو مہم چلانا چاہتے ہیں، اس میں آپ اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب آپ خدا کو بھی اپنے ساتھ لے لیں اور خدا کو ساتھ لینے کی شرط صبر ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ بقرہ۔ ۱۵۳) خدا کا ساتھ آپ کو اسی وقت مل سکتا ہے جب آپ انتہائی مشکل حالات کے باوجود پورے صبر کے ساتھ خدا کی مرضی پر جمے رہیں۔ دنیا کی عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے محض وکیلانہ پیروی کافی ہو سکتی ہے۔ مگر جو شخص خدا کی تائید حاصل کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے اپنے مقدمے میں مخلص ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کے لئے وہ اٹھا ہے، اس کا وہ محض ایک دعوے دار نہ ہو، بلکہ اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکا ہو۔ وہ ہر حال میں اس سے لپٹا رہنا چاہتا ہو۔ یہ مقصد اس سے جو کچھ کرنے کے لئے کہے وہ اس کو

کرے اور جو کچھ اس سے چھوڑنے کے لئے کہے، اس کو وہ چھوڑ دے۔ اسلام کی تاریخ سے ہم کو جو سبق ملتا ہے وہ یہی ہے۔ مکی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا آخری حد تک ثبوت دیدیا جائے کہ اہل ایمان ہر حالت میں خدا کے دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ جب یہ ثبوت مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ حالات کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے جس میں اہل ایمان کو اپنی کامیابی کی راہیں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اس وقت وہ اقدام کرتے ہیں اور ان راہوں کو استعمال کرکے کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دوسرے مرحلے کا نام مدنی زندگی ہے۔

مجھے یہ کہنے کا موقع دیجئے کہ آپ کا مقدمہ ابھی اس پہلو سے بہت کمزور ہے۔ آپ کی پکار صبر کی کیفیت سے خالی ہے۔ ابھی آپ اپنی قومی مہم کو کرسی اور میز کی سطح پر چلا رہے ہیں لیکن اگر اسے کامیابی تک پہنچانا ہے تو اس کو عمل اور قربانی کی سطح پر چلانا ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ کے سامنے ایک مسئلہ اردو زبان کا ہے۔ اردو آپ کی ملی زندگی کے لئے ضروری ہے اس لیے آپ اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن ذرا دیکھئے اس معاملے میں آپ کی قوم کا کیا حال ہے۔ سینما کی کھڑکی پر ہمارے نوجوانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ مگر شبینہ مدارس میں انھیں پڑھنے کے لئے بلائیے تو وہ نہیں آئیں گے۔ سگریٹ اور پان میں بے تکلف پیسے خرچ کرینگے لیکن اگر ان سے کہئے کہ اردو کی ترقی کے لئے اردو اخبار اور کتابیں خریدو تو اس کے لئے ان کی جیب خالی ہوگی۔

یہی تمام حالات میں مسلمانوں کا حال ہے۔ ان کی بہت بڑی تعداد بلکہ اکثریت اسلامی اوصاف سے بالکل خالی ہے۔ یہ حقیقت ہمارے لئے خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر شرک تک پایا جاتا ہے جو اسلام کے عین ضد ہے حتیٰ کہ ان کے اندر شرک جلی کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شرک کوئی معلوم چیز ہے اور اگر اس کا تعلق صرف نسلی اور اصطلاحی قسم کے کفار و مشرکین سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک عقیدہ او عمل ہے اور یہ عقیدہ اور عمل جہاں پایا جائے وہ شرک ہی کہا جائے گا، تو بلا شبہہ عقیدۃً اور عملاً دونوں کا شرک آج مسلمانوں میں موجود ہے۔ کتنے ہی مزار ہیں جہاں وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو بتوں کو پوجنے والے اپنے بتوں کے لئے کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی بزرگان دین ہیں

جن کے ساتھ وہ سارے افعال و تصرفات منسوب کر دئے گئے ہیں جو صرف خدا کا حصہ ہیں۔ سجدے سے لے کر دعا و استعانت تک کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہئے اور جس کو مسلمانوں نے اپنے اولیاء اور بزرگوں کے ساتھ روا نہ رکھا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں شرک پایا جا رہا ہو، اس کے لئے تو خدا کی طرف سے ـــــ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (اعراف - ۱۵۲) کی دعید ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا کی نصرت و تائید کس طرح مل سکتی ہے۔

یہی حال فرض عبادات کا ہے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد فرائض سے سنگین حد تک غافل ہے۔ ہمارے درمیان کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ نہیں نکالتے اور استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتے، روزے کا ترک، جو دینی بے غیرتی کی انتہا ہے، وہ بھی اب ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ نماز جو اسلام کا اہم ترین رکن ہے، اس کو بے شمار لوگ مستقل اور علانیہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ حقیقی نماز تو درکنار رسمی نماز سے بھی ان کی زندگیاں خالی ہیں۔ حالانکہ نماز کو کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل قرار دیا گیا ہے، یہاں تک ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص نماز چھوڑ دے تو اللہ اپنا ذمہ اس سے اٹھا لیتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہم جب ایسے اعمال میں مبتلا ہوں جس نے ہم کو اللہ کے ذمہ سے محروم کر دیا ہو تو ایسی حالت میں نصرت و تائید کا کیا سوال۔ پھر تو یہی انجام ہو سکتا ہے کہ دنیا کی قومیں ہم پر بھوکے بھیڑئے کی طرح ٹوٹ پڑیں اور ہم کو اپنا نوالہ بنائیں۔

اخلاق و معاملات کے اعتبار سے دیکھئے تو اس میں بھی یہی صورت نظر آئے گی۔ کوئی ایسی برائی نہیں ہے جو آج مسلمانوں میں نہ پائی جاتی ہو ـــــ جھوٹ۔ وعدہ خلافی، چغل خوری، غیبت، دھوکا۔ چھچھورا پن، خود غرضی، بخل، گالی گلوچ، بدزبانی، کم ظرفی، بدمعاملگی، کام چوری، بے صبری، عیب جوئی۔ بہتان تراشی، بدگمانی، دو رخا پن، بے جا نمائش، اظہار امارت، اسراف، بدسلوکی، سنگدلی، بے رحمی سب کچھ ان کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح چوری، رشوت، غبن، خیانت، قتل، حق ماری، کم تولنا، ان کا وصف عام بن چکا ہے۔ شراب، جوا، زنا، سود، رقص، موسیقی، فحاشی، بے پردگی، بے حیائی، لغویات میں اشتغال، ان کے لئے کوئی معیوب بات نہیں رہی۔ جس قوم کا یہ حال ہو وہ اگر

خدا سے نصرت وتائید کی امید رکھتی ہے تو یہ بالکل فضول بات ہے، کیونکہ خدا تو وہ ہے جس نے قوم شعیب کی بد دیانتی کے جرم میں ان پر آگ کی بارش برسائی، اور قوم لوط کی فحش کاری کی سزا میں آسمان سے ان پر پتھراؤ کیا اور ان کی بستی کو الٹ دیا پھر اب کیا اسی خدا سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ بد دیانتی اور بدکاری کی سرپرستی فرمائے گا۔

آج قوم کی بے شمار ضرورتیں محض سرمایہ کی کمی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ آج مسلمانوں کو اپنی دینی اور دنیوی ضرورتوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لئے اونچے پیمانے کی اسلامی یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے۔ ان کو ایسے قومی فنڈ کی ضرورت ہے جو حاجت مند مسلمانوں اور نو مسلموں کی کفالت کر سکے، نادار طلبہ کے تعلیمی اخراجات فراہم کرے اور قوم کے بے روزگار افراد کو روزگار پر لگانے میں مدد دے، ایسے تحقیقی اور اشاعتی ادارے کی ضرورت ہے جو جدید ضرورتوں کے مطابق مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر تیار کرے اور ان کو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پھیلائے، ایسے طاقتور پریس کی ضرورت ہے جو قوم کے اندر اور باہر قوم کی آواز کو موثر شکل میں پہنچائے، اس طرح کی کتنی ہی قومی اور ملی ضرورتیں ہیں جو سرمایہ کے بغیر محض تخیل کی دنیا میں پڑی ہوئی ہیں اور اگر کچھ لوگوں کی بلند ہمتی نے کسی کام کو شروع کر دیا ہے تو وہ بھی "مفلس کے چراغ" کی طرح اپنے آغاز ہی سے ٹمٹما رہا ہے۔ قومی ضروریات کا یہ انجام ایسی حالت میں ہے جبکہ قوم میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے سرمایہ دار پڑے ہوئے ہیں جن میں سے صرف چند کی قربانی ان سارے کاموں کا آغاز کر سکتی ہے۔ مگر قوم کے ان قارونوں کے کے پاس اپنے سرمایہ کا مصرف شادیوں کی دھوم دھام اور امارت کے مظاہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا نے زندگی کا قانون یہ بتایا ہے کہ دینی ضرورتوں میں اپنا سرمایہ خرچ نہ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ (بقرہ - ۱۹۵) اس خدا سے ہم اس کے سوا اور کسی انجام کی توقع کر سکتے ہیں جس سے ہم دوچار ہیں۔ جب ہم نے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا ہے تو ہم ہلاکت ہی کے گڑھے میں گریں گے کسی اور منزل تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس عام بے حسی اور بے عملی کا شدید تقاضا ہے کہ ان کے درمیان بہت بڑے پیمانے پر وہ کام شروع کیا جائے جس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ یہ

کام عام حالات میں بھی اسلامی معاشرہ کا ایک اہم ترین جزو ہے اور موجودہ حالات میں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر یہ کام بھی بس برائے نام ہی ہو رہا ہے اور جو ہو رہا ہے وہ بھی بیشتر اس طرح کہ اس کو نہ تو اعلیٰ صلاحیتیں حاصل ہیں اور نہ اعلیٰ وسائل و ذرائع۔ اب آپ ایک طرف اس صورت حال کو سامنے رکھئے اور دوسری طرف اس حدیث کو یاد کیجئے جس میں بتایا گیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو چھوڑنے کے بعد دعائیں تک مقبول نہیں ہوتیں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری تباہی کے اسباب کیا ہیں اور ہم کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی گروہ کے "مابقوم" کو وہ اسی وقت بدلتا ہے جب وہ اپنے "ما بانفس" کو بدل دے۔ ایسی حالت میں مسلمان افراد کی مندرجہ بالا غیر مسلمانہ روش کے باقی رہتے ہوئے یہ امید کرنا ایک خیال خام کے سوا کچھ نہیں کہ اجتماعی مصیبتوں کے سلسلے میں ان کی مطالبات کی مہم کبھی کامیاب ہو سکے گی۔ آپ نظام حاضر سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ دین کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے مگر خود آپ سے خدا کا دین جن باتوں کا تقاضا کر رہا ہے، اس سے غافل ہیں۔ حالات کی باگ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے حکومت سے اپنے معاملات کے سلسلے میں مطالبہ کرنا گویا خدا سے یہ کہنا ہے کہ وہ آپ کو اس ملک میں مسلمان بن کر رہنے کا موقع دے لیکن آج کے موجودہ حالات میں آپ کو اسلام کے تقاضوں پر عمل کرنے کے جو مواقع دیئے گئے ہیں ان میں اگر آپ اپنی اسلامیت کا ثبوت نہیں دیتے تو کس بنا پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ مستقبل کے بارے میں آپ کی درخواست منظور کی جائے گی۔

حالات کی شدت

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے حالات بہت سخت ہو گئے ہیں۔ مگر یہ شدت خود بخود یا محض اتفاقاً وجود میں نہیں آگئی ہے۔ بلکہ یہ بھی خدا کی طرف سے ہے۔ آپ کی بے عملی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے عمل کے لئے حالات سخت کر دیئے گئے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں۔ آپ وہ گروہ ہیں جس نے خدا کی زمین پر خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا اقرار کیا ہے۔ ایسے کسی گروہ کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ اپنے عہد پر قائم رہے تو اس کے لئے زمین کو ہموار کر

دیا جاتا ہے۔ اور اطاعت و بندگی کی تمام راہیں اس کے لئے آسان کر دی جاتی ہیں۔ (نور ـــ ۵۵) لیکن اگر وہ اپنے عہد کو بھول جائے اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کرے تو اس کو صبر کے امتحان میں ڈال دیا جاتا ہے، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جہاں دین پر عمل کرنا پہلے سے زیادہ دشوار ہو اس کی ایک مثال یہود کی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن کی ساتویں سورہ میں کیا گیا ہے۔

اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے جب امت مسلمہ ہونے کی وہ حیثیت یہود کو حاصل تھی جو آخری نبی کی بعثت کے بعد آپ کو دی گئی ہے۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایک شہر تھا جہاں یہودی آباد تھے۔ اس زمانے میں یہود کے لئے یہ قانون تھا کہ وہ ہفتہ (سبت) کے دن روزہ رکھیں اور صبح سے شام تک صرف عبادت و ریاضت میں گزاریں۔ دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے ان کی معاشیات کا انحصار زیادہ تر مچھلی پر تھا۔ وہ اس کو کھاتے تھے اور بیرونی علاقوں میں اس کی تجارت کرتے تھے۔ قانون سبت کے مطابق انھیں چاہیئے تھا کہ وہ چھ دن تک مچھلیوں کا شکار کرتے اور ساتویں دن اپنے اوقات کو فارغ کر کے اس خدا کی عبادت کرتے جس نے مچھلیاں اور زندگی کے سارے سامان دیئے ہیں۔ مگر انھوں نے اس حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی اور ہفتے کے سارے ہی دنوں میں شکار کرنے لگے۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو قانون کو ان کے لئے اور سخت کر دیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا ہوا کہ مچھلیاں صرف سبت کے دن جس دن شکار کرنا ممنوع تھا، سطح کے اوپر رہتی تھیں اور بقیہ چھ دنوں میں سمندر کے نیچے چلی جاتی تھیں گویا پہلے اگر ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھنے کا حکم تھا، تو اب حکم ہوا کہ پورا ہفتہ روزے میں گزار دو۔ کیونکہ قانون سبت پر عمل کرنے کی صورت میں جب وہ مچھلیوں کے اوپر آنے والے دن شکار نہیں کر سکتے تھے تو بقیہ دنوں میں کیا کھاتے۔ یقیناً یہ بڑا سخت حکم تھا لیکن اگر یہود صبر کی روش اختیار کرتے اور ایک ہفتہ بھی انھوں نے ایسا گزارا ہوتا کہ خدا کے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ سات دن بھوکے رہ جاتے تو آپ یقین مانئے کہ جس خدا کے حکم سے مچھلیاں پانی کے نیچے چلی گئی تھیں وہ انھیں حکم دیتا اور مچھلیاں اہل کران کے

گھروں میں آجاتیں اور ان کا شکار کرنے کے لئے انھیں دریا جانے کی بھی ضرورت نہ ہوتی مگر اس صورت حال کے پیش آنے کے بعد وہ ممنوع دنوں میں اور زیادہ شکار کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ایک دن کی مصیبت برداشت نہ کر سکے تھے ان کو ہمیشہ کی سخت تر مصیبت میں ڈال دیا گیا۔ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ ان کی صورتیں مسخ ہوگئیں اور وہ بندر بنا دیئے گئے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

آپ اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں، وہ بھی کچھ اسی نوعیت کا واقعہ ہے مسلمانو کی مسلسل بے حسی اور بے عملی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا ہے جو ابتدائی تنبیہ کے طور پر "قریۂ حاضرۃ البحر" کے ساتھ پیش آیا تھا۔ (اعراف۔۱۶۳) آج ان کے اوپر ایک ایسا نظام مسلط کر دیا گیا ہے جس نے دینی زندگی کو ان کے لئے پہلے کے مقابلے میں "سات گنا" زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔ آج ہمارے اوپر ایک ایسا تعلیمی نظام مسلط ہو گیا ہے جو ہماری نسلوں کے عقیدۂ ایمان کو چھین رہا ہے اور اس پر مزید یہ کہ یہ تعلیمی نظام زندگی کی تمام صورتوں سے اس درجہ وابستہ ہو گیا ہے کہ ہم اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ آج ہم کو ایک ایسے معاشی نظام میں ڈال دیا گیا ہے جہاں جائز طور پر روزی حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا پانی میں گرنے کے بعد بھیگے بغیر اس سے نکل آنا ــــ آج ہم اپنے آپ کو ایک ایسے سماج میں پاتے ہیں جہاں اس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا کہ جائز اور ناجائز کی حدود کو بھول کر موقع پرستی کا طریقہ اختیار کیا جائے آج روزگار کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں اب کوئی شخص اس وقت تک اپنے لئے روٹی اور کپڑا حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنا سارا وقت اور ساری قوتیں اس کی جد وجہد میں لگا نہ دے۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوتی، ان سب سے زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ ہمارے اوپر ایک ایسا اقتدار مسلط ہے جو کھلم کھلا اسلام سے عناد رکھتا ہے، اس کے نزدیک "مسلمان" ہونا اتنا بڑا جرم ہے جس کی سزا ڈاکہ اور قتل سے بھی زیادہ سخت دی جا سکتی ہے۔

اس طرح آپ کو ایک ایسی حالت میں ڈال دیا گیا ہے جب کہ اسلام پر قائم رہنے کے لئے معمولی حالات سے زیادہ سخت جد وجہد کی ضرورت ہے۔ گویا پہلے اگر صرف عمل کا مطالبہ تھا تو اب قربانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ آپ کے صبر کا امتحان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ معمولی

حالات میں آدمی کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اس کے مقابلے میں اسوقت کی ذمہ داریاں زیادہ شدید ہوتی ہیں جب کہ آدمی امتحان کے لئے کھڑا کر دیا گیا ہو۔ آج آپ امتحان کی حالت میں ہیں۔ اس لئے بندگی کا ثبوت دینے کے لئے آج آپ کو پہلے سے زیادہ جاں فشانی کی ضرورت ہے آپ کو زبردست قربانیوں کے ذریعہ اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے بندے بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ آپ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں مگر بندگی کی راہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یاد رکھئے ہر رکاوٹ جو دین کی راہ میں آتی ہے وہ اس لئے آتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمائے کہ وہ کس حد تک اس کے وفادار ہیں۔ یہ رکاوٹیں دراصل آپکے اندر چھپے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ حکومت کی اسکیمیں جو آپ کی ملی زندگی کو ختم کرنے کے لئے شروع کی گئی ہیں۔ زمانے کا معاشی اور تمدنی نظام جو آپ کے لئے زندگی کو مشکل سے مشکل تر بناتا جا رہا ہے۔ اکثریت کے مظالم جن کا نشانہ آپ صرف اس لئے ہیں کہ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ سب آپ کو آخری حد تک جھنجھوڑنے کے لئے ہیں۔ یہ آپ کے دینی احساسات کا آخری امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ کے اندر بے قراری کا وہ جذبہ ہے یا نہیں جو اس کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لئے ایک مومن کے اندر ہونا چاہیئے۔ اگر یہ شدید ترین ضرب بھی آپ کے احساسات کو بیدار نہ کرسکے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ موت کی نیند سو چکے ہیں اب آپ کے اٹھنے کی کوئی امید نہیں۔

ہمارا خدا آج وہ منظر دیکھنا چاہتا ہے جب ہم نے دین کے لئے اپنی دنیوی خوش حالی اور ترقی کو برباد کر دیا ہو۔ آج اس کو ہمارے دل کی وہ بے قراری مطلوب ہے جو انتہائی خواہش کے باوجود کسی دینی کام کو نہ کرسکنے کی وجہ سے قلب مومن میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ان آنسوؤں کا انتظار ہے جو اس شدت احساس سے ہماری آنکھوں سے ڈھلک پڑیں کہ ہم خدا کے دین پر چلنا چاہتے ہیں مگر مجبوراً نہیں چل سکتے۔ اس کو وہ راتیں مطلوب ہیں جب ہم اس کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے کہہ رہے ہوں کہ "خدایا تیری امت پر بڑا سخت وقت آگیا ہے، تو ان کی مدد فرما۔"

یہی آپ کے امتحان کا پرچہ ہے۔ خدا آج دیکھنا چاہتا ہے کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا جذبہ آپ کے اندر کتنا ہے۔ دین کے مطابق زندگی بنانے کی کتنی تڑپ آپ کے

اندر پائی جاتی ہے، اپنے معاملات میں آپ کو خدا کی طاقت پر کتنا بھروسہ ہے۔ بلاشبہ یہ امتحان آپ کو ایسے حالات میں دیتا ہے جو اس امتحان کے لئے مشکل ترین حالات کہے جا سکتے ہیں۔ مگر خدا کی مدد ہمیشہ ایسے ہی حالات میں آتی ہے۔ سخت ترین حالات ہمیشہ اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ فیصلے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور اگر اہل ایمان آخری حد تک اس چیز کا ثبوت دیدیں جو ان حالات میں ان سے مطلوب ہے تو خدا کے فرشتے آکر ان کی راہ کے تمام کانٹے ہٹا دیتے ہیں اور دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ یہ آپ کے لئے مایوسی اور دل شکنی کا وقت نہیں بلکہ انتہائی امید کا وقت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ آپ زیادہ سے زیادہ استحقاق پیدا کرکے زیادہ سے زیادہ خدا کے انعام کے مستحق بن سکتے ہیں۔ مشکل حالات میں صبر کے ساتھ حق پر جمے رہنا ـــــــ یہی وہ چیز ہے جو خدا کی مدد کو کھینچتی ہے اور اہل ایمان کو کامیابی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ ہندستان کے موجودہ حالات جس میں قومی حیثیت سے آپ کو اپنی موت نظر آرہی ہے اسی میں آپ کے لئے زندگی کے اسباب چھپے ہوئے ہیں بشرطیکہ آپ صبر اور تعلق باللہ کا ثبوت دیں۔ ہندستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نہایت تاریک دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے اندر ہمت ہو تو اسی تاریک دور کے اندر وہ مواقع موجود ہیں جو ہمارے لئے ایک روشن دور کا آغاز بن سکیں۔ ایسے مواقع جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئے اور جو اس کے بعد بھی شاید کبھی نہیں آئیں گے۔ بنی اسرائیل کی زندگی کا یہ واقعہ تاریخی الفاظ میں آپ کے لئے مستقبل کی خوشخبری ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ	اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان
كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ	کو ہم نے مبارک ملک میں اس سرے
الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ	سے اس سرے تک قبضہ دیدیا۔
بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ	اور تیرے رب کا عمدہ قول بنی اسرائیل
رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ	کے حق میں پورا ہوا اس وجہ سے کہ
اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا	انھوں نے صبر کیا اور ہم نے فرعون
مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ	اور اس کی قوم کو اس کی تمام صنعت

وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ۔ و زراعت کے ساتھ تباہ کر دیا۔

(اعراف ـ ۱۳۷)

آپ کہیں گے کہ یہ حل جو تم ہم کو بتا رہے ہو وہ تو عجیب ہے کیونکہ ہمارے سامنے تو سیاسی اور تمدنی مسئلے ہیں اور تم ہم کو صبر اور تعلق باللہ کی تعلیم دے رہے ہو۔ مگر اس خدا کی قسم جس نے قرآن نازل کیا اور زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اگر اس ملک کے مسلمان ایک بار بھی فی الواقع اس کا ثبوت دیدیں اگر وہ دکھا دیں کہ خدا کے دین پر قائم رہنے کے لئے وہ ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہیں، تو صبح کی شام بھی نہ ہونے پائے گی کہ خدا کے فرشتے خدا کی مدد لے کر آسمان سے اتر پڑیں گے اور آپ کے سارے مسئلے اس طرح حل ہو جائیں گے گویا کہ وہ تھے ہی نہیں۔

خدا کی خدائی آج بھی ظاہر ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ہم اپنی بندگی ظاہر کرنے کے لئے تیار ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صالحیت

از:- جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (حیدر آباد)

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ" (پ۔ ۲۰۔ ع۔ ۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) اصحاب بحث و افکار جنھیں حکماء و عقلاء کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحاب کشف و ابصار جو عرفا و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہل بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و براہین کی تقریر، اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکماء و متکلمین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرت مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی حیرت کو "حیرتِ نُظّار" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادم شکوک تعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔ اس کے برخلاف اصحابِ کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو "حیرت اولی الابصار" کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدۂ وحدانیت والوہیت کا، آثار و عجائب ربوبیت کا، توالیٔ تجلیات کا۔ اور یہ حیرتِ محمود ہے۔ "رَبِّ زِدْنِیْ فِیْکَ تَحَیُّرًا" کی دعا اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکماء و متکلمین فلاسفۂ یونان کے اتباع میں انبیاء علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کتوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں، کیونکہ کتے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھنجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی "عقل ناقص" کے سوا کچھ نہیں۔ فرحوا بما عندھم من العلم۔

مصطفٰی اندر جہاں آنگہ کسے گوید زعقل

آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید سہا!

اہل کشف وبصیرت وہ ہیں جو تصفیہ باطن، تخلیہ تحلیہ، کمال تبتل اور دوام توجہ سے منتہائے مقصود کو پہنچتے ہیں " وهو الوصول الى معرفة الله ولقائه " انھیں صراط مستقیم کے جادہ پیما کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملت حنیفی و دین مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین) یہ گروہ مقدس ان ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (یحبھم و یحبونہ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (اولٰئك كتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منه) یہ خدائے لم یزل لایزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنھم و رضوا عنه) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدمات عقلیہ کے قائم کیے بغیر کر لیتے ہیں، اور حق کو نور حق ہی سے پہچانتے ہیں۔ (افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربه) انھیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بینا کو رنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (افی اللہ شك فاطر السموات والارض) چنانچہ کسی نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا کہ وجود صانع پر تمھاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:- لقد اغنی الصباح عن المصباح " مجھے دن کی روشنی نے چراغ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ؎

حق را ز حق شناس نہ از حجت و قیاس

خورشید را چہ حاجت شمع است و شعلہ (جامی)

یہ مقدس ہستیاں درجۂ کمال پر فائض ہوتی ہیں، انھیں مکتب خانہ " وعلمناہ من لدنا علما " سے سبق ملتا ہے، یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارث۔ ان کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:- ؎

آنہا کہ ربودۂ الست اند — از عہد الست باز مستند

در منزل درد بستہ پابند — در دادن جاں کشادہ دستند

چالاک روند پس بیک گام — از جوئی حدوث باز جستند

فانی ز خود و بدوست باقی — ایں طرفہ کہ نیستند و ہستند

این طائفہ اند اہلِ توحید　　باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریائے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ حکایتاً سُنا ہے وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے، ان کے لیے "شہادت" ہے۔ چنانچہ عارف رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے :۔

دفترِ صوفی سوادِ حرف نیست　　جز دلِ اسپید ہمچو برف نیست

زادِ دانشمند آثار قلم　　زادِ صوفی چیست اسرارِ قدم

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں　　پیر اندر خشت بیند بیش ازاں

در دلِ انگور می را دیدہ اند　　در فنا محض شئی را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویۂ گم نامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحب کمال ہستی سے اخذ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبۂ صالحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صالحین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ ایمان، وعمل صالح۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لندخلنھم فی الصّٰالحین (۲۹-۶-۱)

ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، توحید ایمانی ہے۔ اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے اور توحید داخل ہوتی ہے! جس ذات پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے، جس کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔

"وعد اللہ المنفقین والمنافقات والکفار نار جہنم خالدین فیہا"

(پ ۹ - ۶ - ۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے، جس کا نتیجہ خلود نار و حبط اعمال ہے۔

ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ واولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔ (پ ۲ - ۶ - ۱۰)

ارتداد شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابل معافی!۔

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب کی تطہیر ضروری ہے یہ تطہیر ان سے توبہ اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر، نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک پیش کیا ہے۔ اور دعا کی ہے کہ:۔

"اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین ۵"

ایمان محض تصدیق قلب کا نام ہے، اور اعمال جوارح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امور ذیل پر غور کرنے سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا سچ ماننے کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں:۔

وَمَا انت بمومنٍ لنا و لو کنا صادقین ۵۔	گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا یقین آنے کا نہیں۔

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعل قلب قرار دیتے ہیں:۔

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم ۵	(جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے، مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو (اس سے کچھ مواخذہ نہیں)، لیکن جو شخص ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کے لیے جی کھول کر، تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہو گا، اور ان پر سخت عذاب ہو گا۔

(پ - ۱۴ - ۶ - ۲۰)

یہاں قلب کو ظرف ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جا رہا ہے، جو جبر و اکراہ کے سبب سے اعمال ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے۔ اور مورد غضب خداوندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔

(۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمال نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

ومن یعمل من الصّٰلحٰت من ذکر او انثٰی وھو مومنٌ فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیراً۔ (پ۔ ۵۔ ع۔ ۱۸)

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

من عمل صالحاً من ذکرٍ او انثٰی وھو مومن فلنحیینّہٗ حیوۃً طیّبۃً ولنجزینّھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔ (پ۔ ۱۴۔ ع۔ ۱۸)

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف زندگی دیں گے، اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

ومن اراد الاٰخرۃ وسعٰی لھا سعیھا وھو مومن فاولٰئک کان سعیھم مشکوراً۔ (پ۔ ۱۵۔ ع۔ ۲)

جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لیے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسی سعی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہ گاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں :-

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علٰی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ط ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً ط انہ ھو الغفور الرحیم ط (پ ۲۴۔ ع۔ ۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی رحمت سے نا امید مت ہو، بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

بہت سی آیتوں میں مغفرت ذنوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لیے عذاب مخلد کی وعید ہے۔

ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ ثمّ ماتوا وھم کفارٌ فلن یغفر اللہ لھم ط (پ ۲۶۔ ع۔ ۸)

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔

اگر اعمال داخل ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخل کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورت عدم تعمیل، کفر کی طرح عدم مغفرت اور دوام عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!۔

(۵) حق تعالیٰ نے دو صاحب تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو مومن کہہ کر یاد فرمایا ہے:۔

وان طائفتٰن من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما، فان بغت احدٰھما علی الاخرٰی فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر اللہ ج فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین ۰ انما المومنون اخوۃ ط فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔

(پ ۲۶ - ۶ - ۱۳)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلاح کردو اور انصاف کا خیال رکھو۔ بیشک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلاح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

اگر اعمال جزو ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مومن نہ کہا جاتا، نہ ان میں صلح کرادینے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔

ان آیات بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ حق تعالیٰ نے صالح اسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہے اور عمل صالح بھی کرتا ہے۔ اب عمل صالح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عمل صالح کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب[۱]:۔ یعنی عمل کا موافق سنت صحیحہ کے ہونا۔

اخلاص[۲]:۔ یعنی شرکت غیر اللہ سے پاک صاف ہونا۔ نیت صحیحہ[۳]۔

وہی عمل صالح ہوگا جو موافق[۱] سنت صحیحہ ہو اور نیت[۲] صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امتثال امر میں، ان[۳] ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ ان تین خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

(۱) نیت کے متعلق جو اصول حضور انور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے:۔ [۱] انما

الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے:۔ فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امراۃ ینکحھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ (رواہ الشیخان) یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی، پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو ملے گی یا کسی عورت کی طرف جس سے وہ نکاح کرے گا تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہوئی"۔

یہ حدیث اصول دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکان اسلام میں سے ایک اہتم بالشان رکن ہے۔ سارے اعمال کا نیت پر ہی دارومدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ اس کا کچھ اعتبار ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے، یعنی دوسری کتب حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) میں بھی ہے۔

(۱۱) اخلاص کے متعلق حضور انور کا یہ ارشاد بہت واضح ہے:۔

یا ایھا الناس اخلصوا اعمالکم فان اللہ تبارک وتعالیٰ لا یقبل من الاعمال الا ما خلص۔	یعنی اے لوگو تم اپنے اعمال کو خالص حق تعالیٰ کے لیے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عمل خالص کے علاوہ کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

(رواہ البزار عن الضحاک بن قیس)

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے، تو ارشاد ہوا:۔

اخلص دینک یکفیک العمل القلیل	تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت کرے گا۔

(رواہ الحاکم)

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے ان ہی کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

(۱۱۱) صالح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب و سنت ہونا ضروری ہے۔ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد" (اخرجہ الشیخان) اس پر نص ہے۔ یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز نکالتا

ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے :۔ " من صنع امراً علی غیر امرنا فھو ردٌ " (رواہ ابو داؤد)۔ ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ " من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو ردٌ " (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمال صالحہ و افعال حسنہ بے حد و بے شمار ہیں تو ان اعمال ثابتہ کو چھوڑ کر افعال مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو کیا ہے! " بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے! سب سے بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں ہر بدعت گمراہی ہے " (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہ گار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، جی میں اُس کام کو برا جانتا ہے گو منھ سے نہ کہے، امید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو بُرا جانتا ہے اس سے کسی روز توبہ کرے گا! لیکن صاحب بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن ابی عاصمؒ نے حضرت ابو بکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روزانہ کے تجربے کو عجیب و غریب طریقے سے ظاہر کرتی ہے :۔

> " ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کر کے ہلاک کر دیا اور انھوں نے مجھے گناہ سے توبہ کر کے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو ہویٰ و بدعت میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں "

اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :۔

" کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار "

ایمان اور عمل صالح کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لا معبود الا اللہ کے شغل میں مصروف ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودان باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودان باطل اس کے حق میں تین ہیں :۔

دنیا[1]، خلق[2]، اور ہوائے نفسانی[3]۔

لا معبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب کبھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں! میرا ہر عمل میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکام الٰہیہ کے پابند ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابل قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں!۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطور کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کے بجائے یہی میرا معبود بن جاتا ہے، میں لا الٰہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خودنمائی، عُجب و کبر یا کسی لذت نفسانی کا گذر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ "ہر چہ در دیدہ آئی بندۂ آنی" اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ:۔

"افرایت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ"

میں لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی اللہ کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں!۔ مجھے حضور انور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو اُنھوں نے اُس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

تعس عبد الدینار وتعس عبد الدرھم وتعس عبد الخمیصۃ وانتکس اذا شیک فلا انتقش

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں رہے) منھ کے بل گرے پھر سر کے بل اُلٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کانٹا نہ نکالے (اتنی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندۂ زر ہے)۔"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سر پر دل پر صرف حق تعالےٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات امر الٰہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہوتا۔

عارف رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے :- ؎

گر تو خواہی حری و دل زندگی ۔۔۔ بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است ۔۔۔ زندگی بے بندگی شرمندگی است

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی ۔۔۔ کفر باشد پیش او جز بندگی

ذوق باید تا دہد طاعات بر ۔۔۔ مغز باید تا دہد دانہ شجر!

حدیث ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے ؟ "ھو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوے اللّٰہ تعالیٰ بالکلیہ"۔ ایسی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراض دنیاوی وخواہشات نفسانی سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایتِ عبودیت کا نام ہے "آزادگی بے بندگی" نہیں۔ ؏

"کہ بستگان کمند تو رستگا ل اند" (حافظ) و نعم ما قیل ؎

خواجگی را خواجگی از بندگی ست ۔۔۔ بندگی کردن کمال خواجگی ست

من از آں روز کہ دربند توام آزادم ۔۔۔ بادشاہم کہ بدست تو اسیر افتادم

لا الٰہ الا اللّٰہ کے معنیٰ اوّل لا معبود الا اللّٰہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غایت تذلل وافتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثال امر الٰہی میں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو، یعنی مقصود و محبوب اللّٰہ ہی ہو۔!

لا مقصود الا اللّٰہ، لا محبوب الا اللّٰہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الٰہ الا اللّٰہ کے۔

لا الٰہ الا اللّٰہ یعنی لا معبود الا اللّٰہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، تعلق طور اور ہوائے نفسانی یا جذبات کا تسلط اٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللّٰہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے

ہیں اور ہوتے ہیں۔

(i) بہشت و مافیہا من الحور والقصور (ii) مقامات کشفی مثلاً کشف قبور، کشف قلوب، یا کشف بلا وغیرہ (iii) تجلیات قربی۔

مقصود حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی [۱] اگر جنت کا سوال کیا جاتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ محل دیدار محبوب ہے۔ ؎

عاشقاں جنت برائے دوست می دارند دوست

و رضوان من اللّٰہ اکبر" سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔
نہ ہی مقصود وہ مقامات کشفی ہیں جو اولیا راللہ کو تبعاً حاصل ہوتے ہیں جیسے کشف قبور یا کشف قلوب یا کشف بلا۔ ؎

دریں منزل بود کشف و کرامات ولے باید گزشتن زاں مقامات

نہ ہی وہ تجلیات قربی مقصود ہیں جو اولیا راللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ مقصود صرف ذات حق رہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد۔ ؎

یارب ز تو آنچہ من گدا می طلبم افزوں ز ہزار پادشاہی طلبم
ہر کس ز در تو حاجتے می خواہد من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان سے غفلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے:۔ ؎

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم
در ہر چہ نظر کنم توئی پندارم

یہ مقام تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے، لیکن وہ

---

[۱] اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمال ایمان کے منافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل کون ہوگا۔ باانیہمہ قرآن وحدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں اُن میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے، اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندۂ مومن کا اصلی اور اولیٰ محبوب و مطلوب بس حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا ہی ہونا چاہیے۔
"والذین آمنوا اشد حبًا للّٰہ" ۱۲م

اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضائے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے، جس حال میں رکھیں اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔ ؎

معشوقہ کہ شد بکامہا عاشق من گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائق من،
وصل است ز من کام تو اے ہستی تو عاشق کام خویش نے عاشق من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہاں پر جاری ہوتا ہے کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور :- ؎

"ہر چہ از دوست می رسد نیکو است"

کہہ کر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں! توافق بالقضا، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا خلافِ نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے محظوظ و خوش وقت ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس یہی نکلتا ہے کہ :- ؎

عاشقم بر رنج خویش و درد خویش
بہر خوشنودیٔ شاہ فرد خویش (رومی)

اور عارف رومی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں :- ؎

آں کسے را کہ چنیں شاہے کشد سوئے بخت و بہترین جائے کشد
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد انچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور ہر حال میں رضا ان کا مقام ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اب "لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم" کا یہ نفوس قدسیہ صحیح مصداق بن جاتے ہیں (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)، یہ نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامر الٰہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں قربان کر دینے کا۔ ؎

ایں راہ طریقت نہ بپائے عقل است خاک قدم عشق ورائے عقل است
سہوے کہ ترشتہ چوں انداز نے خبر است اے غافل بیٔے عقل جبہ جائے عقل است (الاعلم)

ترقی کا صحیح راستہ!

(جناب ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی)

اصل موضوع پر کلام کرنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ ہم ترقی کے مفہوم کی بابت اپنے ذہنوں کو صاف کرلیں، کیونکہ ہمارے اس خوف اور لالچ کے برق رفتار عہد نے مختلف قدروں ہی میں اہم تبدیلیاں نہیں کردی ہیں بلکہ اکثر الفاظ کے قالبوں میں نئے نئے معانی ڈال کر بقول غالبؔ خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد رکھدیا ہے۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور ہمارا ذہن کسی اور طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ہمارے خیالوں میں پراگندگی اور سوچنے اور سمجھنے کے طریقہ میں کجی پیدا ہوتی ہے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ترقی کے معنی آگے بڑھنے کے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کس طرف؟ ہم کس شخص یا کس قوم کو ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں؟ ہمارا زمانہ مغرب سے مرعوبیت کا زمانہ ہے اور اگرچہ اب مشرقی قومیں بھی اپنے صدیوں کے خواب سے چونک کر غلامی کی زنجیریں توڑ کر اپنے گرد وپیش کو تھوڑی بہت تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی ہیں، مگر عام حالت اب بھی یہی ہے کہ جو سکّے مغربی تہذیب ڈھال کر بھیج دیتی ہے وہ بلا تکلف ہمارے یہاں رائج ہو جاتے ہیں اور ہم کھرے اور کھوٹے میں فرق کرنے کی زحمت نہیں گوارہ کرتے۔

مغرب کا ذہن تمام تر مادہ پرست ہے اور اسے ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ یہ ثمرہ ہے رومن تہذیب کا اور رومن تہذیب کی بنیاد قدیم یونانی تہذیب نے رکھی تھی جو مادّی ترقی اور حظِ نفس کو مقصود بالذات سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس کی تعمیر ہی میں اس کی خرابی کی صورت

مضمر ہے۔

مغربی تمدن میں اولاً تو دینی شعور ہے ہی نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ زمانہ کے آگے آگے چلنے کے بجائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اس تمدن کی بنیاد ابتدا میں سائنس اور صنعت و حرفت اور سیاسی جمہوریت پر رکھی گئی تھی لیکن اس کی نشوونما تغلب و استعمار اور کمزور قوموں پر ظلم و استبداد کے ذریعہ حاصل کی ہوئی دولت سے ہوئی اور ہو رہی ہے اور پھر جوں جوں ترقی ہوتی گئی تن آسانی اور عیش پرستی کی تمام باتیں اس کا جزو بنتی گئیں، نتیجہ یہ ہے کہ عیاشی اور نمود نے اتنا فروغ پایا ہے کہ اعلےٰ اخلاقی خصائل تباہ ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کے شیدائی یہ نہیں دیکھتے کہ روحانی عنصر نہ ہونے کی وجہ سے مغربی تمدن کس تیزی سے ہلاکت کی طرف جا رہا ہے۔

ایڈورڈ گبن نے تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تاریخ دراصل جرموں غلطیوں اور نوع انسانی کی بدنصیبیوں کے رجسٹر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے" ہم بغیر کسی تصرف یا غلط بیانی کے یہی تعریف مغربی تمدن کی تاریخ پر بھی چسپاں کر سکتے ہیں۔ دو عظیم جنگیں، فسطائیت، ایٹم بم ہائیڈروجن بم اور نہ جانے کتنے دوسرے فتنے اس کے بطن سے پیدا ہو چکے ہیں۔

ان سطور سے ہمارا مقصد مادی ترقی کی نفی کرنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر دنیاوی ترقی روحانی اور اخلاقی شعور کے ماتحت نہ ہو تو وہ کس درجہ خطرناک اور موجب خطرات بن جاتی ہے۔

جس طرح انسان میں جسم اور روح کا امتزاج ہے اسی طرح اس کی ترقی کے بھی مادی اور روحانی دو پہلو ہیں اور دنیاوی ترقی اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب اسے اطاعت الٰہی کے زیر سایہ حاصل کیا جائے۔

جو تمدن ان دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ چھوڑ دے وہ غیر متدل اور ناقص ہے۔ صحیح تمدن وہی ہے جو دونوں کے مطالبوں اور تقاضوں کو تسلیم کرے

اور ان میں عدل کرے، اور اپنے سامنے یہ نصب العین رکھے کہ انسان کے مادّہ کے ڈھیر کو انسانیت میں تبدیل کرنا ہی ترقی کا صحیح مفہوم ہے۔

لیکن اِس متوازن ترقی کا راستہ صرف اسلام دکھا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک طرف مادیت کی نفی نہیں کرتا اور نہ اس کے امکانات اور تقاضوں سے صرف نظر کرتا ہے اور دوسری طرف وہ ان بنیادی رُوحانی اور اخلاقی قدروں کا بھی محافظ ہے جو مادہ کے ڈھیر کو انسانیت میں تبدیل کرتی ہیں۔

ہم نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ دنیوی علم و عمل سے دین کا رابطہ توڑ دیا ہے، کہیں صرف مادّی اور دنیوی بہبودی پر زور ہے کہ قابل توجہ یہی چیزیں ہیں اور اگر دینی اصول ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے نظر آئیں تو انھیں بلا جھجھک قلمزد کر دینا چاہیئے۔ اور کہیں مذہب یا یں معنی ساری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ قدیم تعلیم و تہذیب کے دائرہ میں محدود رہو ورنہ جدید تعلیم و تہذیب تم کو جہنم میں پہونچا دے گی۔ نئے علوم و فنون جاننے والے طبقہ کی اکثریت اپنے قدیم تہذیبی سرمایہ سے ناواقف ہونے کے باعث دین سے عدم التفات کو ترقی کا وسیلہ سمجھتی ہے اور قدیم علوم و فنون کے وارث عصری رجحانات سے بیخبری کی وجہ سے پرانی بحثوں اور روایتی انداز فکر کے اسیر ہیں، اور مذہب کے سانچہ میں ڈھال کر ایک ترقی یافتہ اور متوازن تمدن کی تشکیل کی ضرورت یا تو محسوس نہیں کرتے یا خود کو اس کا اہل نہیں پاتے۔

عام مُسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کی نوعیت شعوری نہیں بلکہ جذباتی ہوگئی ہے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے جسموں میں جھرجھری اب بھی پیدا ہو جاتی ہے، مُسلمانوں کی زبوں حالی سے دل اب متاثر ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل سے تو ہم اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں مگر چلتے غیر اسلامی طریق پر ہیں اور زندگی غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتے ہیں۔ بعض حضرات دین سے سیاست کا کام لینا چاہتے ہیں بعض تجارت کا اور زیادہ تر تو اس سے کوئی کام ہی نہیں لینا چاہتے حال و قال کا یہ بُعد ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھایا ہوا ہے۔ خدا کو مالک اور آقا مان کر

کوئے غیر میں گداگری کرتے ہم کو شرم نہیں آتی، جھوٹ کو ام الخبائث تسلیم کرکے چند بیگہ زمین کیلئے جھوٹا حلف اٹھا لینا ہمارے اندر الجھن نہیں پیدا کرتا، بڑھتی خود غرضی اور باہمی عداوت سے رسمی طور پر عبرت اندوز ہونے کے لئے ہم ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن اپنی روزمرہ کی زندگی میں خلوص، ایثار اور خدمت کے جذبات پیدا کرنا ہمارے لئے محال ہے۔ مالی ابتری کے باوجود محنت اور کفایت شعاری پر ہماری طبیعتیں نہیں مائل ہوتیں۔ غرض خدا اور آخرت پر ایمان اور ہماری نمازیں اور ہمارے روزے ہم کو خود غرضی، جھوٹ، قوت پرستی، دولت کی طمع اور اس طرح کے دوسرے روحانی واخلاقی امراض سے نجات دلانے میں کارگر نہیں ہوتے، حالانکہ انھیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

سر چارلس لائی نے بڑے مزے کی بات کہی ہے کہ "ایشیا جیسا عملی سیاست کا اسکول کہیں نہیں ہے، جہاں نیکی اور انصاف کے نہایت پاکیزہ اور قابل تعریف اصولوں کے ساتھ چھین لو اور دبا بیٹھو کا پرانا طریقہ اب بھی رائج ہے اور جہاں فعال اور مسلمات کا تضاد کسی کو مطلق نہیں کھٹکتا۔"

یہاں اس سے بحث نہیں کہ آیا کہ تنہا ایشیا ہی اس الزام کا مستحق ہے اور دنیا کے دوسرے برّ اعظم اس سے بری ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ کل ایشیا پر یہ بات صادق آتی ہو یا نہ ہو مسلمانوں کی حالت ضرور ایسی ہی ہے، ان کے یہاں عقائد اور اعمال میں مناسبت رہی معدوم نہیں بلکہ اس عدم مناسبت پر ان کا ضمیر ہلکی سی چٹکی بھی نہیں لیتا۔ اور یہ اس لئے ہے کہ اسلام سے ان کے تعلق کی نوعیت محض طبعی، رسمی اور نسلی ہو گئی ہے۔ دینداری کے معنی چند عقائد کا اقرار اور چند رسوم کی ادائیگی سمجھ لئے گئے ہیں اور زبان سے اسلام کے دین عمل، اور ضابطۂ حیات ہونے کا لاکھ دعویٰ کیا جائے معاشرت میں خوف خدا کو راہ نما بنانے پر کوئی راضی نہیں ہے۔

اسلام کی عظیم الشان عمارت کے چار ستون ہیں (۱) اعتقادات (۲) عبادات، (۳) اخلاقیات، اور (۴) معاملات۔ حضور سرور کائنات کی رسالت کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ ان چاروں عنوانوں کا مجموعہ تھی۔ آپ نے یہ حقیقت بار بار دہرائی کہ ہر انسان کا ایک

تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی مخلوقات کے ساتھ یعنی اس کا ایک رخ عالم غیب کی طرف ہے اور دوسرا عالم شہود کی طرف خدا اور بندہ کے تعلق کے جن اجزا کا تعلق ہماری قلبی و ذہنی کیفیات سے ہے ان کو اعتقادات کہتے ہیں اور جن اجزا کا تعلق ہمارے جسم و جان اور مال و دولت سے ہے وہ تین ابواب یعنی عبادت اخلاق اور معاملہ میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ اسلام کی تکمیل کے لئے ان چاروں کا استحکام ضروری ہے۔ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں آمنوا کے ساتھ ساتھ "عملوا الصّٰلحٰت" پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔

دراصل اعمالِ حسنہ ہی ایمان کی پختگی کی پہچان ہیں، ویسے ہی جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص ایمان کا تو دعویدار ہو مگر اس کے اعمال میں ایمان کے مطابق اچھائی نہ پائی جاتی ہو تو یہ کھلی ہوئی علامت اس بات کی ہوگی کہ ایمان اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں تک نہیں پہونچا ہے۔ احادیث میں اس مضمون کی کمی نہیں۔ مثلاً

"مومنوں میں اسی کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔" (سنن ابی داؤد)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔" (بخاری)

"جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔" (بخاری)

"اچھے خلق ہی کو اسلام کہتے ہیں۔"

"قیامت کی ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہ ہوگی۔"

"خوش اخلاق دنیا اور آخرت کی نیکی کو لے گیا۔"

"بخل اور بد اخلاقی دو ایسی چیزیں ہیں جو مومن میں کبھی جمع نہیں ہوتیں۔"

"جو آدمیوں کو زیادہ نفع پہونچاتا ہے وہی زیادہ اچھا آدمی ہے۔"

"جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہیں وہ مسلمان نہیں۔" (کنز العمال)

مختصر یہ کہ اسلام اور زندگی میں ایک نہ ٹوٹنے والا رابطہ اور علاقہ ہے اور اس کی ہمہ گیر تعلیم کے ثمرات سے ہم تب ہی اپنی جھولیاں بھر سکتے ہیں جب ہم اس کو اپنی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی کرلیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی ترقی کا مدار اپنے اندر سچا مذہبی جذبہ بیدار کرنے پر ہے تاکہ ہمارے تمدن کی بنیاد ابدی اخلاقی قدروں پر ہو۔ وہ طرز زندگی اور وہ تمدن جو مادی اغراض سے مغلوب ہو کر منشائے حق کو پس پشت ڈال دیتا ہے خود بھی برباد ہو جاتا ہے اور انسانیت کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کی تعمیر ریت کی دیواروں پر ہوتی ہے اور جب وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے معائب کے بوجھ سے بیٹھنے لگتا ہے ——— جیسا کہ ضروری ہے ——— تو ہمسایوں کو بھی تباہ کر ڈالتا ہے۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے، لیکن جن کی آنکھیں مغرب کی جگمگاہٹ سے خیرہ ہوگئی ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی عمر ابھی صرف ڈیڑھ سو سال ہی ہے اور اتنی ہی عمر میں جو تاریخی اعتبار سے کچھ بھی نہ ہوئی، اس میں انحطاط کی علامتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اس کے مستقبل کی بابت سخت اندیشے ظاہر کئے جا رہے ہیں۔

تہذیب اپنے عروج کو نہیں پہونچ سکتی جب تک انسان اپنی زندگی کا رشتہ رضائے الٰہی سے نہ جوڑے، اور مادی ترقی صرف اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب روحانی اور اخلاقی اقدار سے اس کا رشتہ قائم رہے۔ ایک متوازن اور عادلانہ نظام تمدن تشفیٔ نفس نہیں بلکہ احتساب نفس ہی کے سہارے وجود میں آسکتا ہے اور مسلمان کسی اور ذہنی فضا میں مسلمان کی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتے۔

ہم کو چاہئے کہ اسلام کے آب حیات سے اپنے معاشرہ کو سیراب کریں ہم میں ایک ایسی جماعت ہو جو اسلام کے عقائد اور اصولوں کو لیکر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے

اور زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات اور مسائل میں ان کو برت کر دکھائے تاکہ قوم کو صحیح عملی ہدایت ملے اور قوم کے مزاج میں پختہ دینی شعور اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ یہی چیزیں ہیں ترقی کے صحیح راستہ پر لگا سکتی ہے اور اسی کی اس وقت ضرورت ہے اور اگر نظر کو ذرا وسیع کر کے دیکھا جائے تو قرآن کی اس آیت میں بھی ہم کو یہی حکم ملے گا۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ	اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا چاہئے
يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ	جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور انھیں
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ	اچھے کام کرنے کی ترغیب دے اور برے
عَلَى الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ	کاموں سے روکے اور یہی لوگ ہیں
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران)	فلاح پانے والے۔

یہ عمل جس طرح ہماری فلاح اخروی کا ضامن ہے۔ دنیوی فلاح و ترقی کے صحیح راستہ پر پڑنا بھی اسی پر موقوف ہے۔

ہم نے بد قسمتی سے اسلام کی سماجی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھا اور یہ نہیں دیکھا کہ یہی وہ صفت تھی جس نے اسلام کو روایتی مذاہب سے ممتاز کر کے اسے ایک تاریخی حقیقت بنا دیا تھا۔

ہماری تاریخ کے نازک دوروں میں ایسی عظیم المرتبت شخصیتیں ضرور ابھریں جنھوں نے معاشرہ کے بارے میں اپنے فرض کے ادائیگی میں اپنی جانوں تک کی بازی لگا دی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام اندر و باہر کے بے شمار خطروں کا مقابلہ کر کے آج بھی ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے قائم ہے لیکن عام طور پر ہمارے دینی رہنماؤں کی اکثریت نے اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا، نہ ذہنی اور علمی سطح پر اور نہ عمل کے میدان میں، مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں اور گھروں، کالجوں، کھیتوں اور کارخانوں کی درمیانی خلیج پر پل بنانے کی کوشش ادھوری ہی رہی اور زندگی کو دین سے اور دین کو زندگی سے قوت کی لہریں جیسی کہ پہنچنی چاہئے تھیں نہیں پہونچ

سکیں۔ انجام کار دین دنیا کی تفریق اور اس بارے میں افراط و تفریط پوری قوم کا مزاج بنا ہوا ہے جو ہزار خرابیوں کی جڑ ہے۔

اسلام کی وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ دراصل اسلام آیا اسی لئے تھا کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہی رکھدے (سیرت ابن ہشام جلد اوّل) یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ ہم اس سے یہ کام نہیں لیتے، جب تک ہم نے اسلام کی روح سے اپنی روحوں کو منسلک رکھا دنیا نے اس صداقت کا حیرت انگیز مظاہرہ دیکھا لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب یہ رشتہ کمزور پڑ گیا اور ملک گیری مسلمانوں کے قتال طبقہ کا نمایاں مقصد بن گئی تو اسلام ایک سیاسی قوت کی طرح دنیا کے بڑے حصہ پر تو چھایا رہا، مگر اس کے جسم سے اس کی روح جدا ہو گئی۔ یہ کوئی اچھی شکل نہ تھی اور انجام وہی ہوا جو ہر ایسی سیاسی طاقت کا بالآخر ہوتا ہے جو اچھے اخلاقی اصولوں سے تربیت نہیں لیتی۔ روحانی امراض نے معاشرہ کو کھوکھلا کر دیا، زندگی کے خانے کمزور پڑ گئے اور رفتہ رفتہ دولت و حکومت بھی جاتی رہی۔

ہماری بہبودی اسی میں ہے کہ ہم روحانیت اور مادیت کے امتزاج کی اسلامی تشریح و توضیح کو اپنی اجتماعی زندگی میں جذب کر لیں، جب تک یہ نہ ہوگا ہم ترقی سے یونہی محروم رہیں گے جیسے کہ آج ہیں۔

علامہ اقبال اور عارفانِ کامل

از

قاضی محمد عدیل عباسی

علامہ اقبال کا کلام مولانا رومؒ کی تعلیمات کا از ابتدا تا انتہا مظہر ہے۔ اقبال نے اپنے کلام کا آغاز ہی اس سے کیا ہے کہ خواب میں مرشدِ رومی نے ہدایت فرمائی اور جب ہدایت مریدِ ہندی نے مطالعۂ کائنات بہ صورت حقائق اسلام پیش کیا ؎

روحِ خود بنمود پیرِ حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

(یعنی حضرت مولانا رومؒ خواب میں تشریف لائے جنھوں نے فارسی زبان میں گویا قرآن تصنیف کیا ہے۔) اور فرمایا ؎

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن!
بزم را از ہائے و ہُو آباد کن!
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را
از قمِ خود زندہ ترکن زندہ را

یعنی ایک نیا انداز حقائقِ قدیم کو دے۔ تب اقبال کے قلب میں گرمی آئی ؎

زیں سخن آتش بہ پیراہن شُدم
مثلِ نَے ہنگامہ آبستن شُدم
برگرفتم پردہ از رازِ خودی

وانمودم سرِ اعجازِ خودی

یعنی مولانا روم کے اس پیغام سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے معرفتِ نفس اور نفس کے حقائق یعنی رازِ خودی پر جو پردہ پڑا ہے اُس کے اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ اقبالؔ اعتراف کرتا ہے کہ اُس نے اپنے کلام کا فیض مولانا روم سے حاصل کیا۔ کس جذب و مستی سے کہتا ہے ؎

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

یعنی تمنا ظاہر کرتا ہے کہ مرشدِ روم سے ایک غزل کیا ایک شعر ہی مل جائے تاکہ میری جان آتشِ تبریز میں غوطہ زن ہو جائے۔ رُومیؔ اقبالؔ کے لئے سند ہیں اور جا بجا ان کو بطورِ سند پیش کیا ہے ؎

گفت رومیؔ ہر بناءِ کہنہ کآباداں کنند
می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

یعنی رومیؔ نے کہا ہے اور رومیؔ کا قول غلط نہیں ہو سکتا ہے کہ جب کسی پُرانے مکان کی جگہ نیا مکان بنایا جاتا ہے تو پُرانے مکان کی بنیادیں برباد کر دی جاتی ہیں یہی حال مسلمانوں کی تعمیر نو کا ہے۔ تباہیاں نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہیں چنانچہ تمام شعراء کے جام و سبو کو اقبالؔ نے کھنگھالا تو کچھ نہ کچھ آمیزش ہر جگہ ملی اگرچہ یہ آمیزش لطیف تھی لیکن رومیؔ نے کہا کہ ؎

آمیزشے کجا گہرِ پاکِ او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

یعنی جتنے پیغامات شعراء صاحبانِ حقیقت جو کے ہیں سب میں کچھ نہ کچھ آمیزش ہے لیکن رومیؔ کے جامِ معرفت میں براہِ راست انگور کے خوشہ کی شراب ہے۔ چنانچہ اقبالؔ اکثر بوعلی سینا کو فلسفہ و حکمت کے لئے اور رومیؔ کو حق آگہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قطعہ

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم	دستِ رُومی پردۂ محمل گرفت
آں فرو تر رفت تا گوہر رسید	ایں بہ گردابے چوں خس منزل گرفت

یعنی فلسفی تو غبار ناقہ میں ہی گم رہتا ہے لیکن اہل معرفت پردہ محمل تک پہنچ جاتے ہیں فلسفی گرداب میں تنکے کی طرح چکر لگاتا ہے اور عارف سمندر کی تہہ میں جاکر موتی لے آتا ہے۔

رُومی کے تلمذ کا تو اقبالؔ علانیہ اعتراف کرتے ہیں اور اسی کو باعث فخر قرار دیتے ہیں، اس سے تو ان کا سارا کلام بھرا پڑا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے رُوم و تبریز است

یعنی مجھ کو دیکھو ایسا ہندوستان میں دوسرا نہیں ملے گا۔ میں ایک برہمن کا لڑکا اور روم و تبریز کا رمز آشنا ہوں (نوٹ: اقبالؔ کے آباؤ اجداد برہمن تھے)۔ لیکن اقبال مجدد صاحبؒ سے بھی حد درجہ متاثر ہیں اور ان سے بھی بہت سی باتیں مستعار لی ہیں اور سیکھی ہیں چنانچہ حضرت مجدد صاحب کے بارے میں اقبال اپنی نذرِ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

فلسفہ لیکن عقیدت، مداحی، ادب اور نیازمندی سے زیادہ اس وقت سوال شاگردی اور استفادہ کا ہے۔ اقبالؔ کے کلام پر حضرت مجدد صاحب کی تعلیم و تلقین کی ہر جگہ چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اقبالؔ خود ایک بڑا فلسفی ہے چنانچہ اپنی فلسفہ دانی پر خود ہی اظہار خیال کیا ہے اور جا بجا کیا ہے ؎

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں کمیاب ہے صہبا

دوسری جگہ ایک سید زادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیدِ ہاشمی کی اولاد — میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

لیکن وہ فلسفہ یا خرد کو وبال تصور کرتا ہے۔ کہتا ہے ؎

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

چنانچہ مولانا رُوم کے قول کے مطابق کہ "زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است" اقبالؔ جابجا عقل کی مذمت اور عشق کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم کرتا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

چنانچہ میلادِ آدم کے بارے میں ارشاد ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد

مغرب کی نقاب کُشائی کرتے ہوئے فلسفہ کی اصل حقیقت کو کس طرح آشکارا کیا ہے

مُکدّر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی

"عقل" اور "فلسفہ" کے بارے میں اقبالؔ نے یہ جو کچھ کہا ہے یہ بعینہٖ حضرت مجددؒ کی تعلیم ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ضرورت اور انسانیت پر اُن کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے اور عقل و فلسفہ کے طریقے پر تنقید کرتے ہوئے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"اگر ان اکابر (انبیاء علیہم السلام) کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں صانعِ عالم کی ہستی کے علم و اثبات اور اُس کے صفات و کمالات کے ادراک سے عاجز و قاصر رہتیں — قدیم فلاسفہ (حکماء یونان) جو اپنے کو عقلِ کل سمجھتے تھے، وجودِ صانع کے مُنکر تھے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ محض عقل اس دولتِ عظمیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اُس کی توحید کے علم و ادراک سے قاصر ہے اور نبوت کی رہنمائی کے بغیر دولت خانۂ توحید کا سُراغ نہیں مل سکتا، یہی حال تمام سماعی حقائق ملائکہ، حشر نشر، جنت و دوزخ وغیرہ کا ہے . . . . عقل ان تمام باتوں کے ادراک

سے قاصر ہے . . . . . جس طرح عقل کی پرواز حسنِ ظاہری سے اوپر ہے کہ جس بات کا ادراک ظاہری حواس سے نہیں ہو سکتا، عقل اُس کا ادراک کر لیتی ہے اسی طرح طریقِ نبوت طریقِ عقل سے بلند و بالا ہے۔ جن حقائق کا علم عقل سے حاصل نہیں کیا جا سکتا وہ نبوت کے توسل سے معلوم ہو جاتے ہیں . . . . . اگر عقل ان معاملات میں رہ نمائی کے لئے کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان ضلالت و گمراہی کے میدان میں سرگرداں نہ ہوتے اور حق تعالیٰ کی معرفت اُن کو سب سے زیادہ حاصل ہوتی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ذات و صفاتِ حق کے معاملہ میں سب سے زیادہ جاہل ہم نے اسی گروہ کو دیکھا ہے۔ الٰہیات کے بارے میں اُن کی حماقتیں اور سفاہتیں حد سے گزری ہوئی ہیں ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کلِّ آں
ہم سفہ باشد کہ حکمِ کل حکمِ اکثر است

(مکتوباتِ امام ربانی دفتر سوم مکتوب ۲۳)

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"ہو سکتا ہے کہ کچھ حقیقتیں بجائے خود صحیح اور واقعی ہوں اور ہماری ناقص عقلیں اُن کو مستبعد سمجھتی ہوں۔ اگر تمام حقائق کے ادراک کے لئے عقل کافی ہوتی تو بوعلی سینا جیسے حکما اور فلاسفہ کے عقلی فیصلوں میں کبھی غلطی نہ ہوتی، حالانکہ ایک ایک مسئلہ میں اُنھوں نے ایسی مضحکہ خیز غلطیاں کھائی ہیں کہ بقول امام رازی" یضحک منہ الصبیان" (سُن کے چھوٹے بچوں کو بھی ہنسی آجائے)"۔

آگے فرماتے ہیں:۔

"ہمارا مطلب و مدعا یہ نہیں ہے کہ عقل رہ نمائی کے قابل ہی نہیں ہے، بے شک وہ بھی دلیل اور راہنما ہے لیکن کامل رہ نما نہیں ہے۔ انسانیت کے لئے کامل رہنما بس انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے۔"

(دفتر سوم مکتوب نمبر ۴۴)

اقبال نے ان عارفین کا یقین جو حیات و کائنات کی حقیقتوں کو قلب کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ خود اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا بلکہ مسلمات کو زبان دبیان کی خوبیوں سے آراستہ کر کے پیش کرتا ہے اس لئے وہ اپنے اوپر عام شاعری کا اطلاق پسند نہیں کرتا ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

یعنی وہ آدمی جو میرے اوپر شعر و سخن کی تہمت لگائے اس سے کسی خیر کی امید نہ رکھنا۔ مطلب یہ ہے کہ میں حقائقِ ایمان و اسلام کو پیش کرتا ہوں۔ شاعری کے عام چلن سے تعلق نہیں رکھتا ؎

بکوئے دلبراں کارے نہ دارم
دل زارے، غمِ یارے نہ دارم

یعنی میں شاعر کیسے ہو سکتا ہوں کیونکہ نہ مجھے کوئے جاناں سے واسطہ ہے، نہ دل زار رکھتا ہوں اور نہ کسی یار کا غم۔ اس طرح وہ صرف اسلام کا مطرب و مغنی ہے اور اسلام اس نے عارفانِ کامل سے سیکھا ہے۔

وحدتِ وجود

خدا، روح اور مادہ کے بارے میں طرح طرح کی کم فکریاں اور مضحکہ خیز حد تک غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں چنانچہ ان بعض ناقابل قبول باتوں کو جگہ جگہ مسلمانوں نے بھی قبول کر لیا جن کی برابر ہر زمانہ میں کتاب و سنت کی روشنی میں اصلاح ہوتی چلی آئی ہے چنانچہ انھی میں ایک عقیدہ وحدت وجود کا ہے جس کے اصطلاحی معنی عام طور سے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ صرف خدا کا وجود ہے بقیہ وا ہمہ ہے اسے مختلف مذاہب اور عقائد میں طرح طرح سے اور بڑے رومانی انداز سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ سوامی شنکر اچاریہ کا لایا ہوا ویدانت فلسفہ کہلاتا ہے۔ جب بدھ جی نے خدا کا نہ اقرار کیا اور نہ انکار کیا اور بدھ مذہب بڑے زور و شور سے پھیل گیا تو سوامی شنکر اچاریہ یہ دوسرا انتہاپسندانہ عقیدہ لے کر اٹھے اور انھوں نے یہ تعلیم

دینی شروع کی کہ بس خدا کا وجود ہے اور کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے رُوح کے وجود کا بھی انکار لازم آتا ہے۔ اسی فلسفہ کو حال میں سوامی ویکانند نے اپنایا اور ہمالیہ پہاڑ سے راس کماری تک اس کی تبلیغ کرتے رہے۔ وہ جب کسی کو خط لکھتے تھے تو اُس کو اس طرح مخاطب کرتے تھے۔" میں خود خلاں کی شکل میں۔" اس عقیدے نے بعض اسلامی مفکرین اور صوفیہ کو بھی متأثر کیا۔ چنانچہ غالبؔ کہتا ہے ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے

اسلامی تاریخ میں" منصور حلاج " کا قصہ شہرت عام رکھتا ہے جس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ واقعہ ادب و شعر میں بھی پوری طرح پیوست ہوگیا ہے اور بڑے رومانی انداز سے اس کے تذکرے آئے ہیں۔ اقبالؔ نے اس کی تردید زوردار سے زوردار الفاظ میں پوری قوت اور بڑی شاعرانہ محاکات کے ساتھ کی ہے چنانچہ اپنی ایک تصنیف" زبورِ عجم " میں ایک خاص باب " گلشن زارِ جدید" باندھا۔ اس میں مختلف سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ اس کا تفصیلی تذکرہ طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ مگر دیکھئے کس یقینِ کامل اور کس تیور سے کہتا ہے ؎

جہاں پیدا و محتاج دلیلے

نمی آید بہ فکر جبرئیلے

یعنی دنیا ظاہر ہے اور پھر بھی اس کے وجود کے لئے دلیل تلاش کی جاتی ہے۔ یہ بات جبرئیل کی فکر میں بھی آنے والی نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ خودی، خود آگاہی اور خدا آگاہی پر زور دیتا ہے کیونکہ اس سے اپنا یعنی رُوح یا الیغو کا وجود لازم قرار پاتا ہے۔ اقبالؔ نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خُدا، رُوح اور مادّہ تینوں کا وجود ہے اور خُدا رُوح اور مادہ کا خالق ہے اور یہی صحیح اسلامی عقیدہ ہے۔ درحقیقت جب اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو اُن کو نہ محض کتابی علوم سے حل کیا جا سکتا ہے اور نہ عقلی موشگافیوں سے بلکہ ایک بڑی دلیل کسی عارفِ کامل کا تجربہ ہونا چاہیئے جس نے باطن کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہو اور جوان منازل سے گزرا ہو۔ دراصل ایسا ہی مردِ خود آگاہ جانی بوجھی راہوں اور اپنے اُوپر گزری ہوئی

کیفیات و واردات کو بیان کرتا ہے تو وہ یقین کے لئے وہی استواری پیدا کرتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرندوں کے ٹکڑوں کے مل کر ہوا میں اُڑنے سے ہوا تھا۔ علماء ظاہر جو بڑے سے بڑا درجہ رکھتے تھے اُن کو شاہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کا حوالہ دے کر مندرجہ بالا قسم کی دلیل سے اطمینانِ قلب حاصل کرتے ہوئے پایا گیا ہے۔ اقبالؔ نے بھی یہ یقین حضرت مجدد صاحبؒ کے تجربہ سے حاصل کیا تھا۔ حضرت مجددؒ نے اپنے کئی مکتوبات میں اپنی یہ سرگزشت لکھی ہے کہ:۔

"میں بچپن سے اور موروثی طور پر توحید وجودی کا قائل اور علمی و ذہنی طور پر گویا اس پر مطمئن تھا۔ اس کے بعد جب میں نے راہِ سلوک میں سفر شروع کیا تو شروع میں مجھے یہی راہ منکشف ہوئی اور الٰہی علوم و معارف کا ورود ہوتا رہا جو اس راہ یعنی توحیدِ وجودی سے مناسبت رکھتے تھے۔ اس کے بعد اس فقیر پر ایک دوسری نسبت کا غلبہ ہوا اور اُس میں درجہ بدرجہ ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ میں اُس مقام تک پہنچ گیا کہ میں نے یقین کے ساتھ محسوس کر لیا اور گویا دیکھ لیا کہ توحید وجودی دراصل اس راہ کی ایک منزل ہے۔ اصل مقام مقامِ عبدیت ہے جہاں تک عنایتِ الٰہی نے مجھے آخر میں پہنچایا۔"

اپنی یہ سرگزشت ایک مکتوب میں لکھ کر آخر میں فرماتے ہیں:۔

"ایں زماں کمال ایں مقام در نظر بر آمد و علو آں واضح گشت و از مقامات گزشتہ تائب و مستغفر شد" (دفتر اول، مکتوب ۵۹)

رُوح کا وجود

یہی حال رُوح کے وجود کا ہے۔ صوفیا کی ایک اصطلاح "نفی خودی" کی تھی۔ اس کا مطلب، و منشا رُوح کے وجود سے انکار نہ تھا لیکن اقبالؔ نے شاعری کی رنگینی اور رومانیت کے لئے اس اصطلاح سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اپنا کلام ہی اثباتِ خودی سے شروع کیا جنانچہ کسی صوفی نے کیا خوب شعر کہا ہے۔ شعری خوبیوں کے لحاظ سے شعر کتنا لاجواب ہے ملاحظہ ہو

لہ اس زمانہ میں اس مقام کا کمال اور اُس کی رفعت کا علم ہوا اور اس علم کے بعد گزشتہ مقامات و احوال سے میں نے توبہ و استغفار کیا۔

؎ خود را نہ پرستیدہ عرفاں چہ شناسی
کافر نہ شدی لذتِ ایماں چہ شناسی

اسی کے بارے میں اقبالؔ کہتا ہے ؎

خود را کنم سجودے دیر و حرم نہ ماندہ
ایں در عرب نہ ماندہ آں در عجم نماندہ

اور تلقین یہ ہے کہ ؎

شمعِ خود را ہمچو رومیؔ برفروز
روم را در آتشِ تبریز سوز

وہ کس ذوق وشوق سے وجد کے عالم میں آواز دے رہا ہے۔ قطعہ

زمن گو صوفیانِ باصفا را — خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمت آں خود پرستم — کہ با نورِ خودی بیند خدا را

اور وحدتِ وجود پر بھرپور وار اس طرح کرتا ہے ع

دگر از شنکر و منصور کم گوئے

یعنی سوامی شنکر اچاریہ اور منصور کا ذکر ترک کرو، ان غلط باتوں سے باز آؤ۔

عشقِ رسول ﷺ

اقبالؔ نے جس طرح رومیؒ اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ سے فیض حاصل کیا ہے اُسی طرح وہ جنیدِ بغدادیؒ۔ عطارؒ۔ عراقیؒ۔ بایزیدؒ۔ ملا جامیؒ اور تمام مشہور عارفانِ کامل سے استفادہ کرتا ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ خودی کے مضامین کے عنوانات یہ ثابت کریں گے کہ اقبالؔ کا ماخذ قرآن و حدیث کے علاوہ وہ شرحیں بھی تھیں جو صاحبانِ کیف وسرور نے اپنی خود آگاہی و خدا آگاہی سے مجتمع کی تھیں۔ آئیے ذرا ان عنوانات پر نظر ڈالیں: "مقصدِ حیاتِ مسلم اعلاءِ کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرک جوع الارض باشد در مذہبِ اسلام حرام است"۔—— "پیشکش بحضور ملتِ اسلامیہ" جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

اے ترا حق خاتم اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد

"مقصود رسالت محمدیہ"۔ "تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است"۔ "حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا"۔ "وطن اساس ملت نیست"۔ "پختگی سیرۂ ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است"۔ "حسن سیرت محمدیہ از تادب بہ آداب محمدیہ است"۔ "مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرام است"۔ "کمال حیات ملیہ ایں است کہ ملت مثل مرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از ضبط روایات ملیہ ممکن گردد"۔ "شرح اسماء حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ" وغیرہ وغیرہ اور اقبال کا پیام "عشق رسول" تمام عارفان زمانۂ قدیم وجدید کے مسلک کا نچوڑ ہے وہ کہیں عراقی کے حسب ذیل شعر کو عنوان قرار دیتا ہے جو انھوں نے روضۂ نبوی کے بارے میں کہا ہے ؎

ادب گاہے است زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یعنی آسمان کے نیچے یہ ایک ادب کی جگہ ہے، یہاں آکر جنید اور بایزید کے بھی ہوش گم ہو جاتے ہیں۔

اور کہیں ملا جامی کی گراں قدر نعتوں پر رشک کی نگاہ ڈالتا ہے ؎

کشتۂ انداز ملا جامیم
نظم و نثر او علاج خامیم

اور خود جا بجا عجیب عجیب انداز سے اس پر روشنی ڈالتا ہے جس میں "گرمیٔ آہ بیتابانہ" "لغزش مستانہ" کی عجیب شان ہے قطعہ

من چہ گویم از تولایش کہ چیست　　خشک چوبے در فراق او گریست
ہستیٔ مسلم تجلی گاہ او　　طورہا لرزد ز گرد راہ او
پیکرم را آفرید آئینہ اش　　صبح من از آفتاب سینہ اش

اور پیام یہ ہے کہ ؎

لشکرے پیدا کند از سلطانِ عشق
جلوہ گر شو برسرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ "انی جاعل" سازد ترا

عارفانِ کامل کے خم خانۂ عشق سے سیراب ہونے کے بعد وہ اپنے شاعرانہ کمالات کو آلۂ کار بناتا ہے اور ہر معمولی چیز سے ایک دلسوز سبق دیتا ہے۔ "صبحِ درخشاں" "شبِ تاریک" "ماہ واختر" "صبح کا ستارہ" اور دیگر مناظرِ فطرت کے تذکروں سے اسلام کی تعلیمات کو دلوں کے اندر جاگزیں کرتا ہے۔ یہ سب فیض اُن عارفانِ کاملین کا ہے جن کا وہ معتقد ہے اور جن کا اُس نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ برگساں اور نیٹشا وغیرہ کا خوشہ چیں نہیں، اُن پر حرف زن ہے چنانچہ ملاحظہ ہو اُس کی ہمت مردانہ۔ نیٹشا کے بارے میں وہ کس جوانمردی سے کہتا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

مگر ہمارے ملک کے اہلِ علم جن کے خیالات کا سدرۃ المنتہیٰ یہ ہے کہ وہ کسی تصنیف یا تالیف یا ادب و شعر کے مجموعہ کو کسی فرانسیسی، جرمن، برطانوی مفکر کے خیالات کا ترجمہ یا اُس کا چربہ ثابت کردیں۔ اُنھوں نے اقبالؔ کو بھی انھیں فلسفیوں کا مقلد قرار دے دیا اور صرف اُس کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مجتہد ہے اور اُس نے صرف علماء و صوفیائے اسلام سے سبق لیا ہے۔

متعصبانہ افترا پردازی کی ایک نہایت مکروہ مثال

(از۔ سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان۔)
ترجمہ ــــ از مولوی محمد اقبال اعظمی

(مسیحیت کے ایک زبردست مبلغ اور فارن مشن ایسوسی ایشن کے معروف لیڈر ڈاکٹر گلوور نے اپنی ایک کتاب میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف تنقید کی شکل میں بہت ہی ذلیل قسم کی افترا پردازی کی تھی۔ پاکستان کے سابق اکاؤنٹنٹ جنرل سید محمد جمیل صاحب نے جو ہمارے دوستوں میں ہیں اپنی کتاب (   ) میں اسکو نقل کرکے اس کا جواب دیا ہے، ذیل میں اسی کے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)

ڈاکٹر گلوور جو اسی بیسوی صدی کے ایک زبردست مشنری اسٹیٹسمین اور بین الاقوامی فارن مشن ایسوسی ایشن کے ایک نمایاں لیڈر ہیں، ان کی ایک کتاب سنہ ء میں نیو یارک سے ہارپر اینڈ برورس نے شائع کی ہے جس کے چوتھے باب کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے:-

" تہذیب و حریت اور حق و صداقت کو جن چیزوں سے نقصان پہونچا ہے اور ان میں سے جن عناصر کا دنیا کو اب تک انکشاف ہو سکا ہے، ان میں "محمد کی تلوار" اور "قرآن" کا درجہ سب سے اونچا ہے، یہ دونوں تہذیب و حریت اور صداقت کے شدید ترین دشمن ہیں ــــ"

اور اس سے پہلے اسی کتاب میں کچھ اسی طرح کے بلکہ اس سے زیادہ تکلیف دہ الفاظ میں قرآن اور اسلام کو "خراج عقیدت" پیش کرتے ہوئے مصنف مذکور نے لکھا ہے۔

" قرآن حقائق و خرافات، قوانین اور افسانے، اور غلط تاریخی روایات و اوہام کا ایک عجیب مجموعہ ہے، نیز اتنا غیر واضح ہے کہ اسے بغیر تفسیر کے سمجھا نہیں جا سکتا، مسلمانوں کا عقیدہ ایک خدا کے ماننے کا ہے لیکن ان کا خدا ایک بےحس اور جابر بےرحم ذات ہے جس کا خود اس کی مخلوق سے کوئی واسطہ بھی نہیں ہے"

"اسلام ایک خوفناک اور ڈراونی دوزخ اور ایک شہوانی لذتوں سے بھری ہوئی جنت کا تصور پیش کرتا ہے! اس کی نمازیں ایک ہی فارمولا کی بے معنی تکرار معلوم ہوتی ہیں، اس کے روزے قریب قریب نیز اس کا زکوٰۃ و صدقات کا نظام نہایت معمولی اور لاحاصل ہے۔"

"اور جہاں تک عیسائی مشن اور اس کی تبلیغ پر اسلام کی اثراندازی کا تعلق ہے، اور ہماری تبلیغی جدوجہد کو اسلام سے جو عظیم نقصان پہونچا ہے اس کی تعبیر ہم ان الفاظ سے زیادہ خوبی کے ساتھ نہیں کر سکتے جو سر ولیم نے اس سلسلہ میں لکھے ہیں جن سے صرف ہمارے اپنے ذاتی عقیدہ ہی کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ ہمارا اندازہ ہے کہ یہی بالعموم ہماری پوری عیسائی تبلیغی مشنری کی متحدہ و متفقہ آواز ہے! وہ کہتے ہیں کہ:

"وہ لوگ ایک ناقابل تلافی نقصان اور عظیم دھوکے میں ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک صحیح اور سعادت مند زندگی اور صلح و خیر کی راہ ہموار کرتا ہے!۔ واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت سے روکنے اور دور کرنے کا اس سے زیادہ کوئی دانشمندانہ اور ماہرانہ طریقہ ایجاد نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔ افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ترقی پذیر ممالک جو مسیحیت کے نور اور حریت سے بہرہ اندوز ہو نے اور اس کے سایہ میں آگے بڑھ رہے تھے، اسلام نے نہ صرف انھیں پیچھے ڈھکیل دیا بلکہ اس کی "تاریکیوں" اور "ظلمتوں" کی ان پر پوری چھاپ پڑ گئی ۔۔۔۔"

پھر اسی رو میں ڈاکٹر گلوور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وہ خالص ایک مشرقی تھے، جنہوں نے زبردستی اپنا تسلط قائم کیا ان کا یہ مشرقی تصور تھا کہ ایک بادشاہ کا یہ حق ہے کہ اپنی طبعی خواہشات کو جائز و ناجائز جس طریقہ سے بھی چاہے پورا کرے، اور ان کا عزم تھا کہ وہ ہر اس انسان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائیں گے جو ان کے خیال

سے موافقت نہیں رکھتا، ان کے سپاہی وحشیانہ توڑ پھوڑ اور تخریب و غارت گری کو اپنا اصول بنائے ہوئے تھے، اور ہر حال میں وہ بس حریف پر غلبہ اور فتح کے پیاسے تھے۔ ان کے پیغمبر کی ہدایت تھی کہ وہ ہر اس شخص سے مقاتلہ ومبارزہ کریں جو ان کے طریقہ کا منکر ہو ....."

یہ افترا پردازی اور دروغ بیانی جس کی مثال ملنی بھی مشکل ہے ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جو کوئی بے پڑھا لکھا عامی آدمی یا ابن الوقت سیاسی لیڈر نہیں کہ اس کو لکھنے والے کی لاعلمی یا اس کی سیاسی مکاری پر محمول کر لیا جائے، بلکہ یہ اس بیسویں صدی کے ایک زبردست مشنری مدبر و ذمہ دار اور بین الاقوامی فارن مشن ایسوسی ایشن کے ممتاز زعیم و رہنما ڈاکٹر گلوور کے سوچے سمجھے ریمارکس ہیں جن کو انہوں نے اپنے عالمی سامعین و ناظرین کے سامنے بطور رپورٹ کے پیش کیا ہے جنہیں دیکھنے کے بعد بلا اختیار یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا ان کے نزدیک اس طرح کی ہرزہ سرائی افترا پردازی اور ذہنی پستی ہی اس جلیسے دینی عہدہ اور مرتبہ کے لئے (جس کی طرف سے ڈاکٹر موصوف نمائندگی کر رہے ہیں) واجبی کوالیفکیشن تو نہیں ہے؟ -

ڈاکٹر گلوور خوب واقف ہوں گے، اور انھیں اگر علم و تاریخ سے ذرا بھی تعلق رہا ہے تو یقیناً ان کو معلوم ہوگا کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود یورپ کا اندرونی علمی و ذہنی ریکارڈ اس بات کو وضاحت کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ:

اسلام انسانی آزادی، اخوت، اور علم وثقافت کا زبردست علمبردار رہا ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ ڈاکٹر گلوور جیسا پڑھا لکھا آدمی اور PROGRESS OF WORLDWIDE MISSIONS جیسی ذمہ دارانہ کتاب کا مصنف ان چیزوں سے ناواقف ہوگا لیکن اگر خدانخواستہ اب تک ان کو اس کی توفیق نہیں ہو سکی ہے تو کم از کم اب انھیں وِلڈ ڈیورنٹ کی مشہور و معروف تصنیف AGE OF FAITH ایڈورڈ گبن

گبن کی "DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE" اور جان ولیم ڈراپر کی "HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE" نیز ایچ، جی، ویلز کی "OUTLINE OF HISTORY" ضرور پڑھ لینی چاہیئے یہ صرف چند نام ان درجنوں معیاری مغربی مصنفوں میں سے ہیں جو اپنی مغربی عصبیت کے باوجود جو ان سب کا ایک مشترک فطری و قومی ورثہ ہے اپنی کتابوں میں اسلام کی لائی ہوئی واضح ہدایات اور ان کی ضوافشانی کی صاف صاف شہادت دیتے ہیں ہم ڈاکٹر گلوور اور ان جیسے لوگوں کی معلومات کے لئے یہاں صرف دو مصنفوں کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں، ہم یہ وضاحت مکرر کر دینا چاہتے ہیں کہ جن کے اقتباسات ہم یہاں دے رہے ہیں وہ کوئی اسلام کے بہی خواہ یا وکیل ہرگز نہیں بلکہ اس کے خلاف وہ مغربی عیسائی تہذیب کے مخلص حامی اور زبردست علمبردار ہیں، —

ولڈ ڈیورنٹ "AGE OF FAITH" میں قرون اولیٰ میں اسلام کی اشاعت اور ترقی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" عدم تشدد اور رواداری کی پالیسی کے باوجود یا اس کے سبب سے اس نئے مذہب نے تھوڑی ہی مدت میں بہت سے عیسائیوں، تقریباً تمام زرتشتیوں نیز ایشیا، مصر اور شمالی افریقہ کے بہت سے یہودیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا .....

رفتہ رفتہ ان ممالک کی غیر مسلم آبادی نے عربی زبان عربی لباس اور قرآنی قوانین و عقائد کو اختیار کر لیا، اور جہاں یونان اپنی ہزار سالہ حکومت کے باوجود ناکام ہو چکا تھا اور رومی فوجیں اپنے ملکی دیوتاؤں سے بیزار ہو کر انھیں چھوڑ چکی تھیں، اور بیزنطینی BYZENTIN قدامت پسندی (ORTHODOXY) کے خلاف ارتداد و انحراف کا ایک زبردست ہنگامہ کھڑا ہو چکا تھا وہاں محمد ازم یعنی اسلام تقریباً بغیر کسی جبر اور غیر معمولی تبلیغی جدوجہد کے صرف ایمان و عبادت ہی کی حد تک نہیں بلکہ انسانوں کے دلی اخلاص اور مکمل و مضبوط حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا

ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اپنے محبوب دیوتاؤں کو جنھیں وہ اللہ کا نائب سمجھتے تھے یکسر بھول جاتے ہیں، اسلام نے چین، انڈونیشیا، ہندوستان، فارس، عرب اور مصر سے لیکر مراکش اور اسپین تک کی سینکڑوں انواع و اقسام کے انسانوں کی نفسیات کو ان کے قلب و ضمیر کی گہرائیوں میں چھو کر دیکھا اور پھر ان کے روحوں اور جسموں پر یکساں حکومت کی، اس نے انھیں تسلی بخش امید اور پائدار خود اعتمادی عطا کی، اور آج بھی تقریباً پینتالیس کروڑ اس کے عشاق و متبعین ہیں جنھیں وہ ان کے مابین تمام سیاسی تفریقوں اور تقسیموں کے باوجود دینی اخوت و بھائی چارگی اور اسلامی خاندان کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر کے ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔"

"مشرق ادنیٰ کے یہودیوں نے عربوں کا اپنے آزاد کنندہ محسنین کی طرح خیر مقدم کیا، ...... وہ عربوں کی حکومت میں عیسائیوں کے برابر ہو کر رہے اور ایک مرتبہ انھیں پھر یہ آزادی ملی کہ وہ یروشلم (بیت المقدس) میں قیام اور عبادت کر سکیں، انھیں ایشیا، مصر اور اسپین میں (زندگی کے تمام میدانوں میں) وہ کامیابی اور ترقی حاصل ہوئی کہ عیسائی راج میں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی! ..... عرب کے باہر مغربی ایشیا کے عیسائی حسب سابق بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے، اور شام تو تیسری صدی ہجری تک بغیر کسی مزاحمت کے بڑی حد تک ایک عیسائی ملک رہا، ...... خلیفہ مامون کے زمانہ ( ) میں ہمیں اسلامی حکومت میں گیارہ ہزار عیسائی چرچوں، سینکڑوں یہودی معبدوں اور مجوسی آتشکدوں کا پتہ چلتا ہے، عیسائی تقریبات اور میلے کھلم کھلا اور آزادی کے ساتھ منائے جاتے تھے اور عیسائی زائرین پورے امن و اطمینان کے ساتھ فلسطین میں اپنے مقدس مقامات کی زیارت

کے لئے جاتے تھے، نیز صلیبی مجاہدین جب بارہویں صدی عیسوی میں مشرق ادنیٰ پہونچے تو انہوں نے خاصی بڑی تعداد میں عیسائی خاندانوں کو پورے اطمینان کے ساتھ وہاں رہتے ہوئے دیکھا۔"

"اور "منحرف مسیحی" جن پر قسطنطنیہ، یروشلم، اسکندریہ اور انطاکیہ کے مسیحی پیشواؤں نے عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا، اب اسلامی حکومت میں وہ آزاد اور پرامن ہو گئے اور ان کے مذہبی جھگڑے بے معنی و بے بنیاد ثابت ہوئے ..... نویں صدی عیسوی میں انطاکیہ کی مسلمان حکومت نے چرچ پر ایک مخصوص محافظ دستہ مقرر کیا، عیسائی راہبوں اور راہبات کو کنیسے اور معابد (NONASTERIES AND NUNERIES) اموی حکمرانوں کے زمانہ میں جھکے، عرب حکمراں عیسائی راہبوں کی زراعتی ترقیات اور احیاء موات (بنجر زمین کو قابل کاشت بنانا) کے سلسلہ کی کوششوں کی قدر کرتے تھے اور اپنے سفروں میں وہ عیسائی معابد میں قیام اور وہاں کی مہمانی سے خوش ہوتے تھے، ایک زمانہ میں ان دونوں مذہبوں کے درمیان تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ ایک عیسائی سینہ پر صلیب لٹکائے اپنے مسلمان دوست سے مسجد میں جاکر بلا روک ٹوک ملاقات اور گفتگو کرتا تھا مسلم حکومت کے انتظامیہ میں سینکڑوں عیسائی ملازمین کام کرتے اور علی الاعلان وہ اتنے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کئے جاتے جس سے بعض اوقات عام مسلمانوں کو شکایت ہو جاتی، دمشق کے سینٹ جان کے والد جبیر (SERGIUS) عبدالملک کے چیف وزیر مالیات تھے اور کنیسہ کا آخری یونانی "فادر" سینٹ جان خود اس راجیہ سبھا کی صدارت کرتا تھا جس کے ہاتھ میں دمشق حکومت کی باگ تھی"۔ (ص ۲۱۸ تا ۲۱۹)

" جب ساتویں صدی عیسوی کا عرب میں فاتحین مصر اور مشرق ادنیٰ کی طرف بڑھے تو وہاں کی نصف آبادی نے بڑھ کر اس حیثیت سے ان کا خیر مقدم

کیا، کہ انھوں نے بنیر نطینی عیسائی حکومت کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی
مظالم سے انھیں آزاد کرایا اور نجات دلائی۔"

چوتھی صدی عیسوی کے وسط سے اب تک کے کینسہ کے موقف کے بارے میں ولڈ ڈرنٹ
کا بیان گو مختصر ہے مگر خاصا واضح ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"ایک مرتبہ فتح حاصل ہونے کے بعد کلیسا عدم تشدد اور رواداری کا
وعظ کہنا اور اس کی دعوت دینا بند کر دیتا تھا۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بے ادب وگستاخ ناقد اتیچ، جی، ویلز تک نے
بھی اپنی کتاب OUT LINE of HISTORY میں تسلیم کیا ہے کہ:

"اسلام نے دنیا میں اچھے تعامل کی ایک عظیم روایت قائم کی اور پھیلے
ہوئے ظلم واستبداد اور سماجی انارکی سے بہت آزاد اور دور ایک ایسے
معاشرہ کو وجود دیا جس کے مثل اعلیٰ وارفع معاشرہ اس سے پہلے دنیا نے
نہیں دیکھا تھا ——"

نیز لکھتا ہے: کہ

"اسلام نے اپنے جمہور مخاطبین سے (ان کے وجدان وضمیر کو ٹٹولنے
کے بعد) جو اپیل کی اور جس بات کی دعوت دی وہ یہ تھی کہ: "اللہ سچائی اور
انصاف والا ہے" —— اور بلا شبہ اس عقیدہ اور فکر کی ایماندارانہ
تصدیق نے اس وہم وشک، نفاق اور تفریقات کی دنیا میں اللہ والوں
اور امانت دار انسانوں کے لئے باہمی اخوت وبھائی چارگی کا راستہ
ہموار کر دیا...... اسلام نے دلوں پر اور دماغوں پر قبضہ کر لیا کیونکہ وہ سب سے
اچھا سماجی اور سیاسی نظام تھا جسے زمانہ پیش کر سکتا تھا، اور یہ اس
لئے بھی ہوا کہ اس نے ہر طرف سیاسی طور پر مغلوب ولاچار مظلوم اور ستائی
ہوئی ان پڑھ اور غیر منظم وغیر متمدن قومیں اور بے حس، خود غرض اور
بیرحم حکومتیں پائیں جن کا پبلک سے کوئی ربط نہیں تھا، برخلاف اس کے

اسلام ان سب فکروں میں جو اب تک دنیا کے تجربہ میں آچکے تھے
سب سے زیادہ اپٹوڈیٹ، اور پاکیزہ سیاسی فکر تھا۔"

اسلام کے ناقابل انکار اور بے مثل سماجی، علمی اور ثقافتی احسانوں اور اس کی بخششوں کے بارے میں اس طرح کی بیسیوں شہادتیں اور بیانات کوٹ کئے جاسکتے ہیں، یقین ہے کہ ڈاکٹر گلودر خود بھی مسلمانوں کی اس ثقافتی برتری سے ناواقف نہ ہوں گے جس کی وجہ سے مسلم عالمی قیادت تاریخ کے ایک لمبے اور مسلسل عرصہ میں ممتاز اور نمایاں رہی اور اسی وجہ سے غیر مسلم ناقدین نے بھی اپنی اسلام دشمنی اور قومی و مذہبی عصبیت کے باوجود اسلام کے اس احسان اور تفوق کا اقرار کیا ہے،

اور اگرچہ —— جیسا کہ ایچ ویلز کا بیان ہے —— آرام طلبی اور عیش پرستی کے آجانے کے بعد جس نے عربوں کی ذکاوت اور قوت ارادی کو مفلوج کر دیا ان کی وہ عظمت اور دوسروں پر اثر اندازی باقی نہیں رہی اور وہ خود اپنے ہاتھوں تباہ ہوئے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بقیہ دنیا اپنے ٹکنیکل جوش، مادی ترقی اور سماجی آزادی کے باوجود اب تک مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے انسانی مساوات اور ترقی پذیر کلچر کے حامل اس بہترین غیر طبقاتی نظام کے برابر تو کیا عشر عشیر بھی لانے سے قاصر ہے۔

ڈاکٹر گلودر اور ان جیسی مسموم ذہنیت رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ اس تاریخی حقیقت سے بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ انسانی تاریخ میں بار بار غیر متمدن جنگجو قوموں نے ان تہذیبوں کو تباہ کیا ہے جو دولت کی فراوانی کے باعث آرام طلب اور عیش پسند ہوگئی تھیں اسی تاریخی تجربہ کے مطابق تاتاریوں نے اس وقت کی مسلم تہذیب کے مرکز بغداد کو بلکہ گویا پوری اسلامی قلمرو کو تباہ کیا اور مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں لیکن آخر میں اسلام کے اصول اور تعلیمات سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ فاتح ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے کو اس مفتوح اسلامی تہذیب کا غلام بنا دیا —— اور ؏

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

کیا ڈاکٹر گلوور بتا سکتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے سوا کسی اور مذہب اور تہذیب کے ساتھ بھی کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ اس کے فاتحوں نے اس کی غلامی قبول کی ہو۔

دیگر اداروں کی خاص مطبوعات

تاریخ وسیرت

مسند حمیدیؒ۔ (۲ جلد)

امام بخاریؒ کے استاذ امام حمیدیؒ کا مرتب کیا ہوا حدیث کا مجموعہ ۔ جو صحیح بخاری کا خاص مآخذ ہے۔

قیمت -/-/۱۸

ترجمان السنّہ :۔

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب (میرٹھی) (مقیم مدینہ طیبہ)

جلد اوّل ـــــ -/-/۱۰

جلد دوم ـــــ -/-/۹

جلد سوم ـــــ -/-/۱۰

(مجلّد میں فی جلد -/-/۲ کا اضافہ)

علم الحدیث :۔

(از مولانا عبداللہ العمادی)

قیمت ـــــ -/۱/۲۵

کتابت حدیث :۔

مؤلفہ

مولانا سیّد منّت اللہ شاہ رحمانی

قیمت مجلّد ـــــ -/۱/۲۵

تدوین حدیث :۔

از مولانا

(سیّد مناظر احسن گیلانیؒ)

تدوین حدیث کی نہایت مفصّل اور محققانہ تاریخ

جس کے مطالعہ کے بعد اسمیں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ــــ کہ احادیث کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقے پر پہنچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں

قیمت مجلّد ـــــ -/۶/۵۰

رحمۃ للعالمینؐ (کامل ۳ جلد)

(از قاضی سلیمان منصور پوریؒ)

قیمت ـــــ -/-/۲۰

النبی الخاتمؐ :۔

سیرت نبویؐ پر مولانا گیلانیؒ کی قابل دید کتاب

قیمت ـــــ -/۳/۷۵

اسلام (آغاز وارتقاء) :۔

مرتبہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ

قیمت ـــــ -/-/۶

رحمت عالمؐ :۔

علّامہ سیّد سلیمان ندویؒ کے قلم سے

قیمت ـــــ -/۱/۷۵

اصح السّیر :۔

مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ کی نہایت مستند ومعتبر سیرت نبویؐ۔

قیمت -/-/۱۰

مقالات سیرت :۔

از ڈاکٹر محمّد آصف قدوائی ایم اے (پی، ایچ، ڈی)

یہ سیرت محمّدیؐ پر آٹھ گرانقدر مقالوں کا مجموعہ ہے جن کو مولانا سیّد ابوالحسن ندوی نے اپنے مقدّمہ میں دل کھول کر دادِ تحسین پیش کی ہے!

قیمت مجلّد ـــــ -/۴/۵۰

عہد نبویؐ کے میدان جنگ

از ڈاکٹر محمّد حمیداللہ صاحب

جس میں غزوات نبویؐ پر فن حرب (جنگی سائنس) کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ متعدد جنگی میدانوں کے نقشے بھی شامل کتاب ہیں

قیمت ـــــ -/۱/۵۰

رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم کے مکتوبات ومعاہدات

یعنی شاہان عالم، عرب کے حکمرانوں وقبائلی سرداروں سے آپؐ کی سیاسی خط وکتابت اور معاہدات

از سیّد محبوب رضوی

قیمت ـــــ -/۲/۲۵

صدّیق اکبرؓ :۔

از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی صدر شعبۂ دینیات (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

قیمت ـــــ -/-/۸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے (مجموعۂ) سرکاری خطوط

اسلامی تاریخ کا ایک نادر باب اور ایک بیش بہا دستاویز!

جسے ایک ریسرچ اسکالر نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے

۴۰۰ سے اوپر خطوط ۔ ایک حصّہ میں خالص اُردو، اور دوسرے حصّہ میں عربی متن ۔ ہر قیمت پر خریدنے کے لائق

قیمت مجلّد ـــــ -/-/۱۲

غیر مجلّد ـــــ -/-/۱۱

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

"حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط" کے بعد اُسی مرتب کی دوسری قابل قدر پیشکش اسی طرز پر۔

قیمت مجلّد ـــــ -/-/۵

حضرت ابوبکرؓ وفاروق اعظمؓ

از (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

قیمت مجلّد ـــــ -/-/۸

دونوں ایک جلد میں -/۶/۷۵

تاریخ الخلفاءؓ۔ از علامہ سیوطیؒ

مترجمہ ۔ اقبال الدین احمد

خلفائے راشدینؓ سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کے دور کی مکمّل تاریخ

قیمت ـــــ -/-/۱۲

امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی

(از مولانا گیلانیؒ)

قیمت مجلّد ـــــ -/-/۱۲

امام ابوحنیفہؒ اور انکی تدوین قانون اسلامی

(از ڈاکٹر حمیداللہ)

قیمت ـــــ -/۶۲/-

ائمّۂ اربعہ :۔

(از رئیس احمد جعفری)

چاروں اماموں کی سوانح حیات اور اجتہادی خدمات

قیمت مجلّد ـــــ -/-/۱۰

سیرۃ النعمان :۔

قیمت مجلّد ـــــ -/-/۴

غیر مجلد ـــــ -/-/۳

حیات امام ابن القیمؒ :-
بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب
قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبد العظیم
کے قلم سے
مترجمہ :- سید رشید احمد ارشد
قیمت ——— ۱۲/-/-

تاریخ دعوت و عزیمت :-
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کی مشہور کتاب
جو مجددین و مصلحین امت کے
تذکروں پر مشتمل ہے
جلد اوّل
پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک
جلد دوم
آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد
امام ابن تیمیہؒ نیز انکے تلامذہ کی
خدمات وحالات کے بیان میں
جلد سوم
خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، اور
خواجہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے
کمالات اور اصلاحی و تجدیدی
کارناموں کے بیان میں
جلد اوّل ——— ۶/-/-
جلد دوم ——— ۶/۵۰/-
جلد سوم ——— ۵/-/-

تاریخ ملت :-
شائع کردہ
(ندوۃ المصنفین دہلی)
عہد رسالت سے سلاطین ہند تک
(گیارہ حصوں میں)
قیمت :- مکمل سٹ
غیر مجلد ——— ۳۱/۵۰/-
مجلد ——— ۳۴/-/-

نقش حیات :-
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
کی خود نوشت سوانح عمری
جلد اول ——— ۵/-/-
جلد دوم ——— ۳/۵۰/-

مقدمہ ابن خلدون :-
علامہ ابن خلدون کی شہرہ آفاق کتاب
(اردو زبان میں)
متعلقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین
قیمت ——— ۱۵/-/-

تذکرہ شیخ محمد طاہر پٹنیؒ
قیمت مجلد ۱/۵۰/-

حیات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ
از پروفیسر خلیق احمد نظامی
قیمت مجلد ۷/-/-

تذکرۃ الرشید :-
از مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی
قیمت ۸/-/-

سوانح قاسمی (رحمۃ اللہ علیہ)
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
کی سوانح حیات
قیمت (کامل) ۱۵/-/-

حیات انورؒ :-
سوانح
حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب
کاشمیریؒ
قیمت ——— ۴/-/-

تذکرہ حضرت مولانا
شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
قیمت ——— ۲/۵۰/-

سوانح
حضرت مولانا رائے پوریؒ
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
قیمت ۵/-/-

سیرت
مولانا محمد علی مونگیریؒ
مولانا مونگیریؒ کی یہ سیرت مولانا
سید ابوالحسن علی ندوی کی رہنمائی
اور نگرانی میں سید محمد حسنی اڈیٹر
"البعث" و "تعمیر حیات"
نے لکھی ہے
قیمت ——— ۶/-/-

تاریخ دیوبند :-
از سید محبوب رضوی
قیمت مجلد ——— ۲/-/-

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات :-
از پروفیسر خلیق احمد نظامی
غیر مجلد ——— ۸/-/-
مجلد ——— ۹/-/-

سفرنامہ ابن بطوطہ :-
(اردو ترجمہ)
قیمت مجلد ——— ۲/۵۰/-

مآثر عالمگیریؒ :-
قیمت ——— ۹/۷۵/-

۱۸۵۷ء کے جانبازان حریت
از مولانا سید محمد میاں صاحب
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا
پس منظر
اور علماء حق کا اس میں حصہ
قیمت ——— ۷/۵۰/-

علمائے صادق پور :-
از مولانا سید محمد میاں صاحب
قیمت ——— ۲/-/-

طوفان سے ساحل تک :-
مشہور جرمن نومسلم محمد اسد
کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا
ملخص ترجمہ
قیمت ——— ۵/-/-

تاریخ اسلام پر ایک نظر :-
غیر مجلد ——— ۹/-/-
مجلد ——— ۹/۵۰/-

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ
غیر مجلد ——— ۳/۵۰/-
مجلد ——— ۴/۵۰/-

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
مصنفہ
سید خورشید مصطفیٰ (بی ایس سی)
صفحات (۵۷۸)
مجلد ——— ۷/-/-

خلفائے راشدینؓ اور اہل بیتؓ کے باہمی تعلقات
مترجمہ
مولانا احتشام الحسن کاندھلوی
قیمت مجلد ——— ۱/۷۵/-

مختلف موضوعات پر قابل مطالعہ کتابیں
حجۃ اللہ البالغہ ۲۰/-/-
فلسفہ کیا ہے؟ ۲/-/-
مقالات احسانی ۶/۵۰/-
مکتوبات شیخ الاسلام (جلد اول) ۶/-/-
جلد دوم ۶/-/- جلد سوم ۴/۵۰/-

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ "الفرقان" کچہری روڈ - لکھنؤ

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

مُرتّب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۶/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
اعزازی خریداروں سے
پندرہ روپئے
غیر ممالک سے ..... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ مطابق جون ۱۹۶۴ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آیندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جون تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔ — دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت

رب کریم کے فضل و احسان سے گزشتہ شمارہ پر الفرقان کی عمر کے ۲۱ سال پورے ہوگئے اور اس شمارہ سے اس کی زندگی کا ۲۲ واں سال شروع ہو رہا ہے۔ حق تعالیٰ ہندوستانی مسلمانوں کے اس نازک ترین دور میں حق بینی اور حق گوئی کی توفیق دے اور نفس کی شرارتوں اور ہر قسم کی گمراہیوں سے حفاظت فرمائے۔

رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

یہ صحیح ہے کہ ہمارے ملک کا دستور جمہوری اور سیکولر ہے اور اس کی نگاہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی، سب برابر ہیں، وہ مذہب یا نسل و رنگ کی بنا پر ملک کے شہریوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا، اس میں ایسی دفعات موجود ہیں جو اقلیتوں کے مذہب، زبان، تہذیب اور حقوق و مفادات کے تحفظ کی پوری ضمانت دیتی ہیں۔

یہ بھی صحیح ہے کہ آزادی کے پہلے دن ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء تک نظام حکومت جس شخصیت کے ہاتھ میں رہی اور جو مسلسل ۱۷ برس تک حکومت کا سربراہ اور ملک و قوم کا سب سے زیادہ با اثر اور مقبول لیڈر رہا ــــ یعنی پنڈت جواہر لال نہرو ــــ وہ اپنے ذہن و مزاج اور سیاسی معتقدات کے لحاظ سے پورا جمہوریت پسند، کمزوروں کا ہمدرد، فرقہ پرستی کا دشمن اور اقلیتوں کے ساتھ انصاف کا حامی تھا۔

لیکن اس سب کے باوجود یہ بھی واقعہ ہے جس پر گزشتہ سترہ سال کا ایک ایک دن گواہ ہے کہ اس ساری مدت میں یہاں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ رہا ہے اور ان کے ساتھ اتنی بڑی بڑی ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں جو جمہوریت اور سیکولرزم کے تصورات سے کوئی میل نہیں کھاتیں ــــ اگر تہذیبی اور اقتصادی و معاشی معاملات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ بات تو نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ۱۹۴۷ء کے طوفانی اور بحرانی فسادات کے بعد (جن کا سلسلہ گاندھی جی کی قربانی پر ختم ہوا تھا) کئی سو (بعض باخبر حضرات کے بیان کے

مطابق قریباً چار پانچسو) فرقہ وارانہ فسادات ہمارے اس ملک میں ہوئے، یہ فسادات عموماً یکطرفہ بالکل یکطرفہ ہوئے، ان میں مسلمانوں کا حصہ بس اتنا ہی رہا کہ وہ قتل ہوئے، زخمی ہوئے، لٹے، ان کے مکانات جلائے گئے اور بعد میں ان میں سے بہت سے گرفتار کر کے جیلوں میں بھی ڈالے گئے ___ ان میں بعض فسادات ایسے بھی ہوئے جن میں کئی کئی ہزار مسلمان موت کے گھاٹ اتار دئے گئے (مثلاً راوڑکیلا (ضلع سندر گڑھ) اور اس کے اطراف کے حالیہ فسادمیں جسمیں سروودے کارکنوں کے جائزے اور اندازے کے مطابق بھی تین اور چار ہزار کے درمیان مسلمان ہلاک ہوئے ہیں اور وہاں کے مقامی مسلمانوں کا اندازہ اس سے بھی زیادہ کا ہے)۔

بہرحال ہندوستان کے طول وعرض میں جو فسادات ان ۱۷ سالوں میں ہوئے جن میں بالکل یکطرفہ طور پر مسلمان قتل وغارتگری کا نشانہ بنے ان میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مسلمان یقیناً موت کے گھاٹ اتارے گئے لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کسی جگہ کے بارہ میں سنا ہو یا کبھی اخبار میں دیکھا ہو کہ ان فسادات کے کسی مجرم کو کسی مسلمان کے قتل کے جرم میں پھانسی دی گئی ___ شاید دنیا کے کسی جمہوری اور سکولر ملک میں اقلیت کے خون کی ارزانی کی ایسی مثال تلاش نہ کی جاسکے۔

پھر یہ سب کچھ ان ۱۷ سالوں میں ہوا جن میں ہوئے ملک پر بلا شرکت غیرے جمہوریت اور سکولرزم کی علمبردار کانگرس کا اقتدار رہا اور حکومت کے سربراہ پنڈت جواہر لال نہرو رہے جن کی جمہوریت پسندی اور اقلیتوں کی بہی خواہی اور ہمدردی واقعۃً ایک مسلم حقیقت ہے۔ انہی کے آخری دور میں دو ہی مہینے پہلے بہار واڑیسہ (جمشید پور راوڑکیلا وغیرہ) کے وہ فسادات ہوئے جو دراصل ان علاقوں میں مسلمانوں کا صفایا کر دینے کی ایک حیرت انگیز حد تک منظم، وسیع گیر اور انتہائی وحشیانہ مہم تھی ___ سروودے لیڈر جے پرکاش نرائن اور ان کے چند ساتھیوں نے ضمیر کی خلش سے بےچین اور بےتاب ہو کر ان فسادات کی سنگینی اور وحشت و بربریت کا کچھ ذکر اپنے ایک بیان میں کیا تھا لیکن فسادات کی بےپناہ وسعت اور ہلاک شدہ مسلمانوں کی تعداد کے بارہ میں انھیں بھی خاموش رہنا پڑا جس کے لئے ہم انھیں معذور سمجھتے ہیں۔

ان سطور نے جب تک خود ان مقامات پر جا کر صورت حال کو نہیں دیکھا تھا فسادات کی ہولناکی کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اخبارات اور بیانات میں سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ دس، بیس، پچاس گنا زیادہ دیکھا اور مردوں سے گزر کر عورتوں اور بچوں بچیوں کے ساتھ درندگی اور بربریت کی وہ دردناک اور شرمناک داستانیں عینی شاہدوں سے سنیں جن سے چیتے، بھیڑیے اور جنگلی سور بھی پناہ مانگیں ___

انہی فسادات کے متعلق مسٹر جے پرکاش نرائن کے ایک خط کی بنا پر اور ان کی دردمندانہ اپیل پر یہ طے کیا گیا تھا کہ ممبران پارلیمنٹ کا ایک وفد زیر قیادت مسٹر مہابیر تیاگی کی قیادت میں ان مقامات پر جائے گا، چند ہفتوں تک ان مقامات کے مظلوم مسلمان بھی اس وفد کے آنے کا بےچینی اور آس کے ساتھ انتظار کرتے رہے لیکن اپنے انتقال سے چند ہی دن پہلے خود پنڈت نہرو نے اعلان فرما دیا کہ چونکہ واقعات معلوم ہو چکے ہیں

اس لئے وفد کے جانے کی تو ضرورت نہیں رہی البتہ مسٹر تیاگی مناسب وقت پر جائیں گے۔

بہرحال جو بھی مجبوریاں یا مصلحتیں ہوں پنڈت نہرو اپنی ذات وخیالات اور ذہن و مزاج کے لحاظ سے ملک کے بہترین آدمی ہونے کے باوجود مسلمانوں پر ظلم و ستم اور قتل و غارتگری کے اس سلسلہ کو روکنے کے لئے اپنا پورا اثر اور اپنی طاقت استعمال نہیں کرسکے، بلکہ اُن کے ۱۷ سالہ وزارت عظمیٰ کے دور میں مسلم دشمن طاقتوں کی سرگرمیاں برابر بڑھتی ہی رہیں اور حکومت کی پالیسی اُن سے ٹکر لینے کے بجائے چشم پوشی کرنے اُن کو نہ چھیڑنے بلکہ اُن کی مفسدانہ سرگرمیوں کو ہلکا کرکے دکھانے کی رہی اور ہمارے نزدیک اسی پالیسی کے نتیجہ میں کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا وغیرہ میں مسلمانوں پر وہ قیامت آئی —— کہ

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

اب نہرو کے بعد ملک میں ایک نیا دَور شروع ہو رہا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان زعما اور عمائد اولین فرصت میں جمع ہوں اور بہت سی باتوں میں اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود ملت کے اس مشترک اور بنیادی مسئلہ پر غور کریں کہ مسلم دشمن طاقتوں نے ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کرنے کی جو مہم خفیہ اور علانیہ چلا رکھی ہے جس کے پروگرام میں وہ سب کچھ بھی شامل ہے جو جنوری اور مارچ میں مغربی بنگال بہار، اور اڑیسہ میں ہوا اور حکومت کا جو رویہ (قولی نہیں عملی) اس بارہ میں رہا ہے اس پر گزشتہ ۱۷ سالہ تجربہ کی روشنی میں غور کرکے ملت کو کوئی رہنمائی دیں ——

ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے مشاورتی اجتماع کی بات چیت دو تین مہینے سے چل رہی ہے اور وہ اسباب بھی ہمارے علم میں ہیں جن کی وجہ سے اس میں ابتک تاخیر ہوتی رہی لیکن اب جبکہ ہندوستان میں کم از کم حکومتی سطح پر ایک نئے دَور کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

—— یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات، ان کے مسائل اور مطالبات پوری صفائی اور دیانتداری کے ساتھ نئی حکومت کے سامنے جلد از جلد لے آئے جائیں۔ اور ملت کو بھی صفائی سے بتا دیا جائے کہ اس ملک میں باعزت زندگی کا مقام حاصل کرنے کے لئے ان کو کیا رویہ اختیار کرنا ہے اور پیش آمدہ حالات سے کس طرح نمٹنا ہے ہماری گزارش ہے کہ مسلمان عمائد و زعما کا یہ مشاورتی اجتماع جولائی میں ضرور ہو جانا چاہیئے، مزید تاخیر کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔

واللہ ولی التوفیق وھو المستعان

معارف الحدیث

مسلسل

میقات احرام تلبیہ

کعبۂ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کا قبلہ اور اپنا محترم و مقدس "بیت" (گھر) قرار دیا ہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا، جو لوگ وہاں حاضری کی استطاعت رکھتے ہوں اُن پر عمر میں ایک دفعہ حاضر ہونا اور حج کرنا فرض کیا ہے اور اس حاضری اور حج کے کچھ لازمی آداب مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ حاضر ہونے والے اپنے روزمرّہ کے اور عام عادی لباس میں حاضر نہ ہوں بلکہ ایسے فقیرانہ لباس میں حاضر ہوں جو مُردوں کے کفن سے مشابہت رکھتا ہو اور آخرت میں میدانِ حشر کی حاضری کو یاد دلاتا ہو ــــ کُرتا، پاجامہ صدری، شیروانی، کوٹ، پتلون کچھ نہ ہو، بس ایک تہبند باندھ لیں اور ایک چادر جسم کے اوپر کے حصہ پر ڈال لیں، سر بھی کُھلا ہو، پاؤں میں موزہ بلکہ ایسا جوتا بھی نہ ہو جس سے پورا پاؤں ڈھک جائے[1]، اسی قسم کی کچھ اور بھی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ بندہ ایسی ہیئت اور صورت میں حاضر ہو جس سے اُس کی عاجزی اور

---

[1] احرام کے سلسلہ میں یہ احکام صرف مردوں لئے ہیں عورتوں کو پردہ کی وجہ سے سلے کپڑے پہنے اور سر ڈھکنے کی اور اسی طرح پاؤں میں موزہ وغیرہ پہننے کی اجازت دی گئی ہے۔

بے چارگی اور بے حیثیتی و بے مائگی اور عیش دنیوی سے بے رغبتی ظاہر ہو ــــــ لیکن بندوں کے ضعف کا لحاظ رکھتے ہوئے اُن کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے گھر ہی سے احرام بند اور ان آداب کے پابند ہو کے روانہ ہوں، اگر یہ حکم دیا جاتا تو اللہ کے بندے بڑی مشکل میں پڑ جاتے، ابھی کچھ ہی زمانہ پہلے تک بہت سے ملکوں کے حاجی کئی کئی مہینے سفر کرنے کے بعد مکہ معظمہ پہنچا کرتے تھے اور اب بھی بہت سے ملکوں کے حجاج کئی کئی ہفتے کا برّی اور بحری سفر کر کے وہاں پہنچتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدّت تک احرام کی پابندیوں کا نبھانا اکثر لوگوں کے لئے سخت مشکل ہوتا اس لئے مختلف راستوں سے آنے والے حجاج کے لئے مکہ معظمہ کے قریب مختلف سمتوں میں کچھ مقامات مقرر کر دئے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ حج یا عمرہ کے لئے آنے والے جب ان میں سے کسی مقام پہ پہنچیں تو "بیت اللہ" اور "بلد اللہ الحرام" کے ادب میں وہیں سے احرام بند ہو جائیں۔

مختلف سمتوں کے یہ معین مقامات جن کی تفصیل آگے آئے گی "مواقیت" کہلاتے ہیں۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ احرام باندھنے کا مطلب صرف احرام والے کپڑے پہن لینا نہیں ہے بلکہ یہ کپڑے پہن کے پہلے دو رکعت نماز (دوگانۂ احرام) پڑھی جاتی ہے اُسکے بعد پکار کے تلبیہ پڑھا جاتا ہے "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ"

اس تلبیہ کے پڑھنے کے بعد آدمی مُحْرِم (احرام بند) ہو جاتا ہے اور اسی سے حج کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور احرام والی ساری پابندیاں اس پر عائد ہو جاتی ہیں ــــ جس طرح تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد نماز کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور نماز والی ساری پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مواقیت، احرام اور تلبیہ کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل احادیث پڑھئے!

مواقیت:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ وَقَّتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ وَلِاَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ وَلِاَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ وَلِاَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ فَهُنَّ لَهُنَّ وَلِمَنْ اَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ اَهْلِهِنَّ لِمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَمَنْ كَانَ دُوْنَهُنَّ فَمُهَلُّهُ مِنْ اَهْلِهٖ وَكَذَالِكَ وَكَذَالِكَ حَتّٰى اَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّوْنَ مِنْهَا ـــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ کو اہل مدینہ کا میقات مقرر کیا اور جُحفہ کو اہل شام کا اور قرن المنازل کو اہل نجد کا اور یلملم کو اہل یمن کا۔ پس یہ چاروں مقامات خود ان کے رہنے والوں کے لئے میقات ہیں اور ان سب لوگوں کے لئے جو دوسرے علاقوں سے ان مقامات پر ہوتے ہوئے آئیں جن کا ارادہ حج یا عمرہ کا ہو۔ پس جو لوگ ان مقامات کے ورے ہوں (یعنی ان مقامات سے مکہ معظمہ کی طرف کے رہنے والے ہوں) تو وہ اپنے گھر ہی سے احرام باندھیں گے اور یہ قاعدہ اسی طرح چلے گا یہاں تک کہ خاص مکہ کے رہنے والے مکہ ہی سے احرام باندھیں گے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُهَلُّ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ وَالطَّرِيْقُ الْاٰخَرُ الْجُحْفَةُ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْعِرَاقِ مِنْ ذَاتِ عِرْقٍ وَمُهَلُّ اَهْلِ نَجْدٍ قَرْنٌ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمُ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اہل مدینہ کا میقات (جہاں سے ان کو احرام باندھنا چاہئے) ذوالحلیفہ ہے اور دوسرے راستہ سے جانے

والوں کا میقات جحفہ ہے اور اہل عراق کا میقات ذات عرق ہے اور اہل نجد کا میقات قرن المنازل ہے اور اہل یمن کا میقات یلملم ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اوپر والی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں صرف چار میقاتوں کا ذکر ہے، ذو الحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل، یلملم۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں پانچویں میقات ذات عرق کا بھی ذکر ہے جس کو اہل عراق کا میقات قرار دیا گیا ہے۔ دونوں روایتوں میں ایک اور خفیف سا فرق یہ بھی ہے کہ پہلی روایت میں جحفہ کو اہل شام کا میقات بتایا گیا ہے اور دوسری روایت میں اس کو "دوسرے راستہ والوں کا" میقات کہا گیا ہے جس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اہل مدینہ بھی اگر دوسرے راستہ سے یعنی جحفہ کی طرف سے مکہ معظمہ جائیں تو وہ جحفہ سے بھی احرام باندھ سکتے ہیں اور ان کے علاوہ جو دوسرے علاقوں کے لوگ مثلاً اہل شام جحفہ کی طرف سے آئیں وہ بھی جحفہ سے احرام باندھیں اور بعض شارحین نے "دوسرے طریقہ والوں" سے مراد اہل شام ہی لئے ہیں اس صورت میں دونوں روایتوں میں صرف تعبیر اور لفظ ہی کا فرق رہے گا۔

بہر حال یہ پانچوں مقامات معین اور متفق علیہ میقات ہیں۔ جن علاقوں کے لئے یہ میقات قرار دئے گئے تھے اُن سے مکہ مکرمہ آنے والوں کے راستہ میں یہ پڑتے تھے۔ ان کا مختصر تعارف یہ ہے۔

ذُو الحُلَیفہ۔ جو اہل مدینہ کے لئے میقات مقرر کیا گیا ہے مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے صرف پانچ چھ میل پر پڑتا ہے، یہ مکہ معظمہ سے سب سے زیادہ بعید میقات ہے یہاں سے مکہ مکرمہ قریباً دوسو میل ہے، بلکہ آج کل کے راستہ سے قریباً ڈھائی سو میل ہے ـــ چونکہ مدینہ طیبہ کا دین سے خاص تعلق ہے اس لئے اُن کا میقات اتنی بعید مسافت پر مقرر کیا گیا ہے، دین میں جس کا مرتبہ جتنا بڑا ہے اس کو مشقت بھی اتنی ہی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ ع

جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

جُحفہ۔ یہ شام وغیرہ مغربی علاقوں سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، یہ موجودہ رابغ کے قریب ایک بستی تھی اب اس نام کی کوئی بستی موجود نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ اس کا محل وقوع رابغ کے قریب تھا جو مکہ معظمہ سے قریباً سو میل کے فاصلہ پر بجانب مغرب ساحل کے قریب ہے،

قرن المنازل۔ یہ نجد کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے، مکہ معظمہ سے قریباً ۳۰۔ ۳۵ میل مشرق میں نجد جانے والے راستہ پر ایک پہاڑی ہے۔

ذات عرق۔ یہ عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے مکہ معظمہ سے شمال مشرق میں عراق جانے والے راستہ پر واقع ہے۔ مسافت مکہ معظمہ سے پچاس میل کے قریب ہے۔

یلملم۔ یہ یمن کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے یہ تہامہ کی پہاڑیوں میں سے ایک معروف پہاڑی ہے جو مکہ معظمہ سے قریباً ۴۰ میل جنوب مشرق میں یمن سے مکہ آنے والے راستہ پر پڑتی ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں مقامات کو خود ان کے باشندوں کے لئے اور دوسرے تمام علاقوں کے ان لوگوں کے لئے جو حج یا عمرہ کے واسطے ان مقامات کی طرف سے آئیں "میقات" مقرر فرمایا ہے فقہائے امت کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کے لئے ان مقامات میں سے کسی مقام کی طرف سے آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ احرام باندھ کے اس مقام سے آگے بڑھے۔ احرام باندھنے کا مطلب اور اس کا طریقہ ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

احرام کا لباس:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْبَسُوا الْقُمُصَ وَلَا الْعَمَائِمَ وَلَا السَّرَاوِيْلَاتِ وَلَا الْبَرَانِسَ وَلَا الْخِفَافَ اِلَّا اَحَدٌ لَا يَجِدُ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ وَلَا تَلْبَسُوْا مِنَ الثِّيَابِ شَيْئًا مَسَّهٗ زَعْفَرَانٌ وَلَا وَرْسٌ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مُحرم (حج یا عمرہ کا احرام

باندھنے والا) کیا کیا کپڑے پہن سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ (حالت احرام میں) نہ تو کرتا قمیص پہنو اور نہ سر پہ عمامہ باندھو اور نہ شلوار یا جامہ پہنو اور نہ بارانی پہنو اور نہ پاؤں میں موزے پہنو، سوائے اس کے کہ کسی آدمی کے پاس پہننے کے لئے چپل جوتا نہ ہو تو وہ مجبوراً پاؤں کی حفاظت کے لئے موزے پہن لے اور ان کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کے جوتا سا بنالے (آگے آپ نے فرمایا کہ حالت احرام میں) ایسا بھی کوئی کپڑا نہ پہنو جس کو زعفران یا ورس لگا ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں قمیص، شلوار، عمامہ وغیرہ صرف ان چند کپڑوں کا نام لیا ہے جن کا اس وقت رواج تھا یہی حکم ان تمام کپڑوں کا ہے جو مختلف زمانوں میں اور مختلف قوموں اور ملکوں میں ان مقاصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں یا آئندہ استعمال ہوں گے جن مقاصد کے لئے قمیص، شلوار، عمامہ وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔

زعفران تو معروف ہے ورس بھی ایک خوشبودار زرد رنگ کی پتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں چونکہ خوشبو کے لئے استعمال ہوتی تھیں اس لئے حالت احرام میں ایسے کپڑے کے استعمال کی بھی ممانعت کردی گئی ہے جس کو زعفران یا ورس لگی ہو۔

سوال کرنے والے شخص نے پوچھا تھا کہ "مُحرِم کونسے کپڑے پہنے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "فلاں فلاں کپڑے نہ پہنے" اس جواب میں گویا آپ نے اس کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ پوچھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ محرم کونسے کپڑے پہنے؟ بلکہ یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ کس قسم کے کپڑے پہننے کی اس کو ممانعت ہے، کیونکہ احرام کا اثر یہی پڑتا ہے کہ کچھ کپڑے اور کچھ چیزیں جن کا استعمال عام حالات میں جائز ہے احرام کی وجہ سے ان کا استعمال ناجائز ہو جاتا ہے اس لئے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ احرام میں کن کپڑوں اور کن چیزوں کا استعمال ممنوع اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَى النِّسَاءَ فِىْ اِحْرَامِهِنَّ عَنِ الْقُفَّازَيْنِ وَالنِّقَابِ وَمَا مَسَّ الْوَرْسُ وَالزَّعْفَرَانُ مِنَ الثِّيَابِ وَلْتَلْبَسْ بَعْدَ ذٰلِكَ مَا اَحَبَّتْ مِنْ اَلْوَانِ الثِّيَابِ مُعَصْفَرًا اَوْ خَزٍّ

اَوْ حُلِيٍّ اَوْ سَرَاوِيْلَ اَوْ قَمِيْصٍ اَوْ خُفٍّ ــــ رواہ ابو داؤد

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ منع فرماتے تھے عورتوں کو احرام کی حالت میں دستانے پہننے سے اور چہرہ پر نقاب ڈالنے اور اُن کپڑوں کے استعمال سے جن کو زعفران یا وَرس لگی ہو۔ اور ان کے بعد اور ان کے علاوہ جو رنگین کپڑے وہ چاہیں پہن سکتی ہیں کُسمبی کپڑا ہو یا ریشمی اور اسی طرح وہ چاہیں تو زیور بھی پہن سکتی ہیں اور شلوار اور قمیص اور موزے بھی پہن سکتی ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ احرام کی حالت میں قمیص، شلوار وغیرہ سِلے کپڑے پہننے کی ممانعت صرف مردوں کو ہے، عورتوں کو پردہ کی وجہ سے ان سب کپڑوں کے استعمال کی اجازت ہے اور موزے پہننے کی بھی اجازت ہے، ہاں دستانے پہننے کی ان کو بھی ممانعت ہے اور منہ پر نقاب ڈالنے کی بھی ممانعت ہے ــــ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اجنبی مردوں کے سامنے بھی اپنے چہرے بالکل کھلے رکھیں، حدیث میں ممانعت چہرہ پر باقاعدہ نقاب ڈالنے کی ہے لیکن جب اجنبی مردوں کا سامنا ہو تو اپنی چادر سے یا کسی اور چیز سے ان کو آڑ کر لینی چاہیے ــــ سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ

"ہم عورتیں حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام کی حالت میں تھیں (تو احرام کی وجہ سے ہم چہروں پر نقاب نہیں ڈالتی تھیں) جب ہمارے سامنے سے مرد گزرتے تو ہم اپنی چادر سر کے اوپر سے لٹکا لیتی تھیں اور اس طرح پردہ کر لیتی تھیں پھر جب وہ مرد آگے بڑھ جاتے تو ہم اپنے چہرے کھول دیتی تھیں۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ احرام کی حالت میں عورتوں کو نقاب کے استعمال کی ممانعت ہے لیکن جب اجنبی مردوں کا سامنا ہو تو چادر سے یا کسی اور چیز سے ان کو آڑ کر لینی چاہیے۔

احرام سے پہلے غسل :-

عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجَرَّدَ لِاِهْلَالِهِ وَاغْتَسَلَ ـــــــ

رواہ الترمذی والدارمی

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے کپڑے اتارے اور غسل فرمایا احرام باندھنے کے لئے۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر احرام سے پہلے غسل کو سنت کہا گیا ہے لیکن اگر کسی نے دوگانہ احرام پڑھنے کے لئے صرف وضو کر لیا تب بھی کافی ہے اور اس کا احرام صحیح ہوگا۔

تلبیۂ احرام

عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُهِلُّ مُلَبِّدًا يَقُوْلُ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ، لَا يَزِيْدُ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ ـــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا اس حال میں کہ آپ کے سر کے بال جمے ہوئے اور مرتب طور پر لگے ہوئے تھے (جیسا کہ غسل کے بعد سر کے بالوں کا حال ہوتا ہے) آپ اس طرح تلبیہ پڑھتے تھے:-

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ	میں حاضر ہوں خدا وندا تیرے حضور
لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ	حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک
لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ	ساتھی نہیں میں تیرے حضور حاضر ہوں،
لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔	ساری حمد وستائش کا تو ہی سزاوار ہے

اور ساری نعمتیں تیری ہی ہیں اور ساری
کائنات میں فرمانروائی بھی بس تیری
ہی ہے تیرا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

بس یہی کلمات تلبیہ میں آپ پڑھتے تھے ان پر کسی اور کلمہ کا اضافہ نہیں فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم (علیہ السلام) کے ذریعہ اپنے بندوں کو حج یعنی اپنے دربار کی حاضری کا بلاوا دلوایا تھا (جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے) تو حج کو جانے والا بندہ جب احرام باندھ کے یہ تلبیہ پڑھتا ہے تو گویا وہ ابراہیم علیہ السلام کی اُس پکار اور اللہ تعالیٰ کے اس بلاوے کے جواب میں عرض کرتا ہے کہ خداوندا تو نے اپنے دربار کی حاضری کے لئے بلوایا تھا اور اپنے خلیل علیہ السلام سے ندا دلوائی تھی میں حاضر ہوں اور سر کے بل حاضر ہوں ---- (لبیک اللھم لبیک الخ)

احرام کا پہلا تلبیہ کس وقت:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَدْخَلَ رِجْلَہٗ فِی الْغَرْزِ وَاسْتَوَتْ بِہٖ نَاقَتُہٗ قَائِمَۃً اَھَلَّ مِنْ عِنْدِ مَسْجِدِ ذِی الْحُلَیْفَۃِ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ (ذوالحلیفہ کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد) جب آپ مسجد کے پاس ہی ناقہ کی رکاب میں پاؤں رکھتے اور ناقہ آپ کو لے کر سیدھی کھڑی ہو جاتی تو اس وقت آپ احرام کا تلبیہ پڑھتے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) صحابہ کرام کی روایات اور ان کے اقوال اس بارہ میں مختلف ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں احرام کا پہلا تلبیہ کس وقت اور کس جگہ پڑھا تھا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان (جیسا کہ اس حدیث میں بھی مذکور ہے) یہ ہے کہ ذوالحلیفہ کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد آپ وہیں اپنی ناقہ پر سوار ہوئے اور جب ناقہ آپ کو لے کر سیدھی کھڑی ہوئی تو اُس وقت آپ نے پہلی دفعہ احرام کا تلبیہ پڑھا اور گویا اسی وقت سے آپ محرم ہوئے اور بعض دوسرے صحابہ کا بیان ہے کہ جب آپ ناقہ پر سوار ہو کر کچھ آگے بڑھے اور مقام بیداء پر پہنچے (جو ذوالحلیفہ کے بالکل قریب کسی قدر بلند میدان سا تھا) تو اس وقت آپ نے پہلا تلبیہ کہا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں دوگانہ احرام پڑھا تو اسی وقت ناقہ پر سوار ہونے سے پہلے آپ نے پہلا تلبیہ پڑھا ——— سنن ابی داؤد اور مستدرک حاکم وغیرہ میں مشہور جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن جبیر کا ایک بیان مروی ہے کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے صحابہ کرام کے اس اختلاف کے بارہ میں دریافت کیا تھا تو انھوں نے بتایا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ذوالحلیفہ میں دوگانہ احرام پڑھنے کے بعد متصلاً پہلا تلبیہ پڑھا تھا لیکن اس کا علم صرف ان چند لوگوں کو ہوا جو اس وقت آپ کے قریب وہاں موجود تھے۔ اس کے بعد جب آپ وہیں ناقہ پر سوار ہوئے اور ناقہ سیدھی کھڑی ہوئی تو اس وقت پھر آپ نے تلبیہ پڑھا اور ناقہ پر سوار ہونے کے بعد یہ آپ کا پہلا تلبیہ تھا تو جن لوگوں نے یہ تلبیہ آپ سے سنا اور پہلا نہیں سنا تھا انھوں نے سمجھا کہ پہلا تلبیہ آپ نے ناقہ پر سوار ہو کر پڑھا۔ پھر جب ناقہ چل کر اور مقام بیداء پر پہنچی تو پھر آپ نے تلبیہ پڑھا۔ تو جن لوگوں نے پہلا اور دوسرا تلبیہ آپ سے نہیں سنا تھا انھوں نے سمجھا کہ آپ نے پہلا تلبیہ اس وقت پڑھا جب آپ بیداء پر پہنچے" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

تلبیہ بلند آواز سے پڑھا جائے:-

عَنْ خَلَّادِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَانِي جِبْرَئِيلُ فَأَمَرَنِي أَنْ آمُرَ أَصْحَابِي أَنْ يَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالْإِهْلَالِ أَوِ التَّلْبِيَةِ۔

——— رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی

خلاد بن سائب تابعی اپنے والد سائب بن خلاد انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبریل آئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے حکم پہنچایا کہ میں اپنے ساتھیوں کو حکم دوں کہ وہ تلبیہ بلند آواز سے پڑھیں۔

(موطا امام مالک جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ مسند دارمی)

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُلَبِّي اِلَّا لَبَّىٰ مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَشِمَالِهٖ مِنْ حَجَرٍ اَوْ مَدَرٍ حَتّٰى تَنْقَطِعَ الْاَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا

رواہ الترمذی و ابن ماجۃ

حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا مومن و مسلم بندہ جب حج یا عمرہ کا تلبیہ پکارتا ہے (اور کہتا ہے لبیک اللھم لبیک الخ) تو اس کے داہنی طرف اور بائیں طرف اللہ کی جو بھی مخلوق ہوتی ہے خواہ وہ بے جان پتھر اور درخت یا ڈھیلے ہی ہوں وہ بھی اس بندہ کے ساتھ لبیک کہتی ہیں یہاں تک کہ زمین اِس طرف اور اُس طرف سے تمام ہو جاتی ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) یہ حقیقت واضح طور پر قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالےٰ کی تسبیح اور حمد کرتی ہے لیکن اس حمد و تسبیح کو انسان نہیں سمجھ سکتے ــــ بس اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ لبیک کہنے والے صاحب ایمان بندہ کے ساتھ اس کے داہنے اور بائیں کی ہر چیز لبیک کہتی ہے لیکن ہم انسان اس لبیک کو نہیں سُن سکتے۔

تلبیہ کے بعد کی خاص دعا:۔

عَنْ عُمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهٖ سَاَلَ اللّٰهَ رِضْوَانَهٗ وَالْجَنَّةَ وَاسْتَعْفَاهُ بِرَحْمَتِهٖ مِنَ النَّارِ

رواہ شافعی

عمارہ بن خزیمہ بن ثابت انصاری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تلبیہ سے فارغ ہوتے (یعنی تلبیہ پڑھ کر محرم ہوتے) تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا اور جنت کی دعا کرتے اور اس کی رحمت سے دوزخ سے خلاصی اور پناہ مانگتے۔　　(مسند شافعی)

(**تشریح**) اس حدیث کی بنا پر علماء نے تلبیہ کے بعد ایسی دعا کو افضل اور مسنون کہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا اور جنت کا سوال کیا جائے اور دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگی جائے۔ ظاہر ہے کہ مومن بندہ کی سب سے بڑی حاجت اور اس کا سب سے اہم مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت نصیب ہو جائے اور اللہ کے غضب اور دوزخ کے عذاب سے اس کو پناہ مل جائے اس لئے اس موقع کی سب سے اہم اور مقدم دعا یہی ہے اس کے بعد اس کے علاوہ بھی جو چاہے دعا کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَضَبِكَ وَالنَّارِ

تجلّیاتِ مجدّد الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ———— از:۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۴۰) خواجہ حسام الدین احمد دہلویؒ کے نام :۔

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ———— احوال و اوضاع اِس طرف کے فقراء کے مستوجب حمد ہیں ———— اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی و عافیت مطلوب ہے۔ صحیفۂ شریفہ جو از روئے شفقت و مہربانی اس فقیر کے نام تحریر فرمایا تھا اسکے مطالعے سے مشرّف ہوا ———— آپ نے اُس میں اس بات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا کہ حرمین شریفین (مکہ معظمہ و مدینہ منورہ) میں سے کسی ایک مقام میں اپنے متعلقین سمیت متوطن و اقامت پذیر ہو جائیں اور وہاں ہی مدفون ہوں ———— مخدوما و مکرما! متعلقین کا جانا نظر (نظر کشفی) میں نہیں آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ منع مفہوم ہو ———— اگر آپ تنہا جائیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے اور اُمید ہے کہ سلامتی کے ساتھ پہونچیں گے ———— والامر الی اللہ سبحانہ۔

مکتوب (۴۱) ایک نیک خاتون کے نام [عورتوں کو ضروری نصیحتیں]

قال اللہ تبارک وتعالیٰ ———— یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ

بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

(اے پیغمبر جب کہ ایمان والی عورتیں آپ کے پاس بیعت ہونے کی غرض سے اس شرط پر آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو (بموافق رواج جاہلیت) قتل نہ کریں گی، ایسا بہتان نہ لائیں گی جس کو انھوں نے اپنی طرف سے گڑھا ہو اور وہ آپ کی کسی کارِ نیک میں نافرمانی نہ کریں گی ـــــ تو آپ اُن کو بیعت کر لیجئے اور ان کے لئے اللہ سے طلبِ مغفرت کیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے)

یہ آیت کریمہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئی ہے ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مَردوں کی بیعت سے فارغ ہو گئے تو آپ نے عورتوں کو بیعت کرنے کا سلسلہ شروع فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عورتوں کو بیعت کرنا فقط قول کے ذریعے تھا۔ آپکا دستِ مبارک ہرگز بیعت ہونے والی عورتوں کے ہاتھوں تک نہیں پہونچا ـــــ چونکہ عورتوں میں ناقص اخلاق بمقابلہ مَردوں کے زیادہ ہوتے ہیں اسلئے عورتوں کی بیعت کے وقت، مردوں کی بیعت کے مقابلے میں زیادہ احکام لائے گئے ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیعت کے وقت عورتوں کو بُرے اخلاق سے منع فرمایا ہے ـــــ (عورتوں سے بیعت کی) پہلی شرط یہ ہے کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے وجوبِ وجود میں بھی اور استحقاقِ عبادت میں بھی ـــــ جس شخص کے اعمال دکھاوے اور سنادے کی آمیزش سے صاف اور غیر خدا سے طلبِ اجر کے گمان سے ـــ اگرچہ قولاً ہی کیوں نہ ہو ـــــ پاک نہ ہوں گے ـــــ وہ شخص دائرۂ شرک سے باہر اور توحید پرست نیز اخلاص والا نہ ہوگا........ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ـــــ شرکِ اصغر سے پرہیز کرو، صحابہؓ نے عرض کیا حضور شرکِ اصغر کیا ہوتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ریاکاری شرکِ اصغر ہے" ـــــ مراسم شرک اور ایّامِ کفر کی تعظیم کو بھی شرک میں بڑا دخل حاصل ہے اور دو مذہبوں کی تصدیق کرنے والا بھی اہلِ شرک ہی سے ہے نیز احکامِ اسلام اور احکامِ کفر پر مشترکا عمل کرنے والا بھی مشرک ہی ہے ـــ کفر سے بیزاری شرطِ اسلام ہے اور آلودگیٔ شرک سے نفرت شرطِ توحید ہے ـــ بیماریوں کے دور کرنے کے لئے بتوں اور شیطانوں سے مدد طلب کرنا، جیسا کہ جاہل مسلمانوں میں رائج ہوگیا ہے عین شرک و ضلالت ہے ـــ ناکارہ سنگہائے تراشیدہ سے طلبِ حاجات کرنا عینِ کفر اور واجب الوجود کا انکار ہے ـــ اللہ تعالیٰ بعض گمراہوں کے حال کی شکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے ـــ

يُرِيدُونَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا

(وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمات طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اُن کے معتقد نہ ہوں اور شیطان چاہتا ہی یہ ہے کہ اُن کو بہت زیادہ گمراہ کردے۔)

بہت سی (مسلمان) عورتیں اپنی انتہائی جہالت کی بنا پر ایسی چیزوں سے مدد طلب کرتی ہیں جن سے منع کیا گیا ہے اور بلا و مصیبت کا دفعیہ اُن اسماء سے کرتی ہیں جن کا کوئی مسمّی نہیں ـــــ نیز وہ مراسم شرک و اہلِ شرک میں گرفتار ہیں ـــــ عورتوں سے یہ بات ـــــ خواہ وہ نیک ہوں یا بد خاص طور پر چیچک کا مرض جس کو سیتلہ بھی کہتے ہیں عارض ہونے پر ـــــ ظاہر و محسوس ہوتی ہے ـــــ بہت کم عورتیں ہوں گی جو اس شرک کی باریکیوں سے خالی ہوں۔ اور چیچک کے رسوم میں سے کسی نہ کسی رسم کا ارتکاب نہ کرتی ہوں ـــــ بس اللہ ہی جس کو محفوظ رکھے وہ ہی بچتی ہوگی ـــــ غیر مسلموں کے معظم ایام کی تعظیم کرنا اور اُن کے مشہور رسوم بجالانا بھی مستلزم شرک اور مستوجب کفر ہے ـــ چنانچہ ایّام دِوالی میں جاہل مسلمان خصوصاً اُن کی عورتیں غیر مسلموں کے رسوم ادا کرتے ہیں اور ان دنوں میں عید کی سی خوشی مناتے ہیں اور اہلِ شرک کی

طرح اپنی لڑکیوں اور بہنوں کو ہدایا روانہ کرتے ہیں وہ اس زمانے میں اپنے برتنوں کو مانند کفار رنگین کرتے ہیں اور ان کو سرخ چاولوں سے بھر کر بھیجتے ہیں اور اس زمانے کو قابلِ اعتبار و توجہ سمجھتے ہیں یہ باتیں شرک کی اور دینِ اسلام سے انکار کی ہیں ——— اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ۔

(ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ وہ بغیر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کئے ہوئے خالص طریقے پر اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہیں)

جیوانات کو جو نذر مشائخ کرتے ہیں اور ان بزرگوں کی قبروں کے سرہانے اُن حیوانات کو ذبح کرتے ہیں فقہ کی روایتوں میں اس عمل کو بھی داخلِ شرک قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں بہت کچھ ممانعت کی گئی ہے نیز اس ذبح کو "ذبائح جن" میں سے شمار کیا ہے جو کہ ممنوع شرعی ہے اور شرک کے دائرے میں آتا ہے ——— لہٰذا اس عمل سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس میں بھی آمیزش شرک ہے ——— نذر کی اقسام بہت سی ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ کسی حیوان کے ذبح کرنے کی نذر کریں اور عملِ ذبح کا ارتکاب کرکے اُس کو "ذبائح جن" کے ساتھ لاحق کر دیں اور جنات کے پجاریوں کے مشابہ ہو جائیں ——— اور اسی (شرک کے) قبیل سے ہے عورتوں کا روزہ رکھنا پیروں اور بیبیوں (حضرت فاطمہؓ و حضرت مریمؑ وغیرہما) کی نسبت سے ——— عورتیں بہت سے پیروں کے نام اپنی طرف سے تراش کر اُن کے نام کا روزہ رکھتی ہیں اور ہر روزے کے افطار کے وقت ایک خاص قسم کا کھانا مخصوص وضع کے ساتھ متعین کرتی ہیں اور اُن روزوں کے لئے تعینِ ایام بھی کرتی ہیں نیز اپنی حاجات کے پورا ہونے کو اُن روزوں کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں۔ ان روزوں کے توسل سے پیروں اور بیبیوں سے اپنی حاجتیں مانگتی ہیں اور حاجت برآری کو ان کی ذات سے جانتی اور سمجھتی ہیں یہ بات عبادت کے اندر شرک ہے اور عبادتِ غیر اللہ کے ذریعے غیر اللہ سے اپنی حاجات کو طلب کرنا ہے اس فعل کی خرابی کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے ——— درآنحالیکہ حدیثِ قدسی میں آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلصَّوْمُ لِي وَاَنَا اَجْزِي بِهٖ یعنی

روزہ میرے ہی لئے مخصوص ہے میرے غیر کی اس عبادت میں کوئی شرکت نہیں میں ہی اس روزے کی جزا دوں گا"۔ اگرچہ کسی عبادت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا جائز نہیں مگر روزے کی تخصیص اس کے اہتمام شان کی وجہ سے ہے اور مقصود تاکید کے ساتھ اس عبادت میں شرکت کی نفی کرنا ہے ــــــ اور یہ محض بہانہ بازی ہے جو بعض عورتیں اس قسم کے شرکیہ روزوں کی خرابی ظاہر کرنے کے وقت کہا کرتی ہیں کہ ہم تو ان روزوں کو اللہ تعالیٰ کے واسطے رکھتے ہیں اور اُن کا ثواب پیروں کو بخشتے ہیں ــ اگر اس بات میں وہ سچی ہیں تو پھر یہ دنوں کا مخصوص و مقرر کرنا کس واسطے ضروری ہوا؟ اور تخصیص طعام اور افطار میں مختلف قسم کی غلط اور خراب رسموں اور ڈھنگوں کا تعیّن کس لئے ہے ؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ افطار کے وقت، ارتکاب محرمات کرتی ہیں اور فعل حرام کے ذریعے افطار کرتی ہیں یعنی بلا ضرورت (ٹوٹکے کے طور پر) سوال و گدائی کر کے اس سے افطار کرتی ہیں اور اپنی حاجتوں کے پورا ہونے کو اس حرام فعل یعنی بھیک کے ساتھ مخصوص سمجھتی ہیں۔ یہ خود عین ضلالت اور شیطان لعین کا فریب ہے ــــ بس اللہ ہی محفوظ رکھنے والا ہے ــ

دوسری شرط جو بیعت نساء کے وقت درمیان میں لائی گئی ہے وہ چوری سے باز رہنا ہے۔ چوری کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور چونکہ یہ خصلت بد اکثر عورتوں میں (کسی نہ کسی صورت میں) پائی جاتی ہے اور کم عورتیں ہوں گی جو اس بُری عادت کی باریکیوں سے خالی ہوں اس لئے اس ذمیمہ سے نہی بھی اُن کی بیعت کے لئے ضروری ہوئی ــــ وہ عورتیں جو کہ اپنے شوہروں کے مالوں میں بغیر اُن کی اجازت کے تصرف بیجا کرتی ہیں اور بے تحاشا خرچ کرتی ہیں سارقوں ہی میں داخل اور سرقے کے گناہ کا ارتکاب کرنے والی ہوتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات عورتوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے یعنی خیانت کا مرض ان کے عام افراد میں موجود ہے ــــ مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہو ــــ کاش وہ اس بات کو گناہ شمار کریں اور برا سمجھیں .... جب عورتوں کے اندر اپنے شوہروں کے اموال کو بار بار (ناجائز طریقے پر) لینے کی وجہ سے ملکۂ خیانت پیدا ہو جاتا ہے اور اموال غیر میں تصرف کرنے کی قباحت اُن کی نظر سے زائل ہو جاتی ہے تو پھر بعید نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شوہروں کے علاوہ

دوسروں کی املاک میں بھی بیجا تصرف کریں اور دوسروں کے مالوں میں بھی خیانت وسرقہ کی مرتکب ہوں ـــــ امید ہے کہ میری یہ بات تھوڑے سے تامل کے بعد واضح ہو جائے گی ـــــ پس ثابت ہو گیا کہ سرقہ سے منع کرنا عورتوں کے حق میں امور ضروریہ اسلام میں ضروری ترین امر ہے ـــــ (اسی ضمن میں یہ بھی لکھتا ہوں کہ) ایک دن حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے دریافت فرمایا جانتے ہو سب چوروں سے زیادہ چور کون ہے؟ یعنی بدترین چور کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ہم کو معلوم نہیں آپ ارشاد فرما دیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ بدتر چور وہ ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے اور ارکان نماز کو بتمام وکمال ادا نہیں کرتا ـ (لہٰذا) اس سرقے سے بھی پرہیز ضروری ہوا تاکہ بدترین چوروں میں شمار نہ ہو ـــــ حضورِ دل کے ساتھ نیت نماز کرنی چاہئے، اسلئے کہ بغیر حصولِ نیت کے عمل، صحیح نہیں ہوتا ہے ـــــ قرآن کو درست پڑھنا چاہیئے، رکوع وسجود کو اطمینان کے ساتھ پورا کرنا چاہیئے، قومہ وجلسہ کو بھی اطمینان کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے یعنی رکوع کے بعد ٹھیک طریقے پر کھڑا ہونا چاہیئے، اور ایک تسبیح کی بقدر کھڑے ہونے میں دیر کرنی چاہیئے ـــ دونوں سجدوں کے درمیان بھی صحیح طریقے پر بیٹھنا چاہیئے اور ایک تسبیح کی بقدر بیٹھنے میں بھی توقف کرنا چاہیئے تاکہ قومہ وجلسہ میں اطمینان میسر ہو جو ایسا نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو "قطاع سارقان" میں داخل کرتا ہے اور خود کو محلِ وعید بناتا ہے۔

تیسری شرط جو بیعتِ نساء کے سلسلے میں نصِ قرآن سے ثابت ہے زنا سے نہی ہے اس شرط کی تخصیص، بیعتِ نساء کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ زنا کا حصول زیادہ تر عورتوں کی رضامندی حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور عورتیں اپنے نفسوں کو مردوں پر پیش کرتی ہیں پس اس عمل میں سابق تر ہوتی ہیں اور ان کی رضامندی اس عمل زنا کے حاصل ہونے میں مُتَیَسِّر ہوتی ہے لہٰذا اس عمل سے نہی عورتوں کے حق میں مؤکد ہوگی اور مرد اس عمل میں عورتوں کے تابع ہوں گے ـــــ اسی وجہ سے حضرت حق سبحانہٗ نے اپنی کتاب مجید میں زانیہ عورت کو زانی مرد سے مقدم رکھا ہے

اور فرمایا ہے:-

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ۔

[(بے شادی شدہ) زانیہ عورت اور (بے شادی شدہ) زانی مرد ان دونوں کے سو سو کوڑے مارو]۔

یہ زنا کی خصلت بد، دنیا و آخرت دونوں جگہ نقصان پہونچانے والی ہے اور تمام مذاہب میں اس فعل کو برا سمجھا گیا ہے۔ حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"اے لوگو زنا سے پرہیز کرو اس لئے کہ اس میں چھ بری صفتیں ہیں تین دنیا میں اور تین آخرت میں ——— وہ تین جو دنیا میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زانی (کے چہرے) سے رونق اور نورانیت زائل ہوجاتی ہے دوسری یہ ہے کہ زنا مفلسی کا سبب ہے، اور تیسری یہ ہے کہ زنا، عمر کو گھٹاتا ہے ——— اور وہ تین باتیں جو زانیوں کے لئے آخرت میں پیش آنے والی ہیں ان سے ایک خدا کا غصہ و غضب ہے، دوسری حساب آخرت کی خرابی ہے تیسری عذاب نار ہے"

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ حدیث نبوی میں آیا ہے نظروں کا زنا نامحرم عورتوں کی طرف نظر کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا نامحرموں کا ہاتھ پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا نامحرم کی طرف چلنا ہے"

——— اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ ———

(آپ مومنین سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی نظروں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے پاکیزہ تر اور مفید تر ہے)

اور (عورتوں کے متعلق) اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ

(اے رسول آپ ایمان والی عورتوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی نظروں کو نیچا رکھیں
اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔)

جاننا چاہیئے کہ دل آنکھ کے تابع ہے تا وقتیکہ آنکھ محرّمات سے بند نہیں رکھی جائے گی دل کی محافظت مشکل ہے۔ جب آنکھ گرفتار ہوتی ہے دل کی محافظت دشوار ہو جاتی ہے اور جب دل گرفتار ہوتا ہے شرمگاہ کی محافظت سخت دشوار ہو جاتی ہے پس آنکھ کا محرّمات سے بند رکھنا ضروری ہوا تاکہ محافظتِ شرمگاہ میسّر آجائے اور خسارت دینی و دنیوی تک بات نہ پہونچے ـــــــ قرآن مجید میں عورتوں کو اس بات سے منع فرمایا گیا ہے کہ وہ بیگانہ مردوں سے کلام نرم و ملائم، بدکار عورتوں کی طرح کریں اس طرح کہ وہ بدکار مردوں کو وہم بد میں مبتلا کر دیں اور ان کے دل میں بری طمع واقع ہو جائے ـــــــ بلکہ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ مردوں سے (بوقتِ ضرورت) ایسے قول معروف و حسن کے ساتھ بولیں جس سے مردوں کو وہم و طمع نہ پیدا ہو ـــــــ نیز قرآن مجید میں اس کی نہی آئی ہے کہ عورتیں اپنی زینت اور حسن کا مظاہرہ مردوں کے سامنے کریں ... ... اور مردوں کو خواہش میں ڈالدیں اور قرآن مجید میں اس کی بھی نہی آئی ہے کہ وہ اپنے پاؤں (چلنے کے وقت) اس انداز سے زمین پر ماریں کہ اُن کی زینتِ پوشیدہ ظاہر ہو جائے مثلاً پازیب اور اس قسم کے زیور حرکت میں آجائیں اور اُن سے آواز نکلنے لگے، کیونکہ اس سے بھی مردوں کا میلان، عورتوں کی طرف ہو جاتا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ جو بات فسق و فجور تک پہونچانے والی ہو وہ ممنوع اور بُری ہے۔ اس کی احتیاط کی جائے کہ مقدمات و مبادی محرمات کا بھی ارتکاب نہ ہونے پائے تاکہ نفسِ محرمات سے سلامتی میسّر آجائے ـــــــ اللہ تعالیٰ ہی ان کاموں سے بچانے والا ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ[1] ـــــــ

یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہے کہ محض نظر اور مس بشہوت میں اجنبی عورت بھی دوسری عورت

---

[1] اور نہیں ہے مجھے توفیق مگر اللہ کے ذریعہ سے اُسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

کے لئے اجنبی مرد کا حکم رکھتی ہے۔ جائز نہیں ہے کہ عورت اپنے آپ کو غیر شوہر کے لئے مزین کرے اور سجائے وہ غیر شوہر خواہ مرد ہو یا عورت ہو ـــــ جس طرح مردوں کو شہوت کے ساتھ امردوں (نابالغوں) کی طرف نظر کرنی اور شہوت کے ساتھ ان کو چھونا حرام ہے اس نکتے کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے اس لئے کہ یہ (عدم احتیاط) دنیا و آخرت کی زیان کاری و بربادی کا کھلا ہوا راستہ ہے ـــــ مرد کا عورت تک پہونچنا تباین صنفین (دو مختلف صنف ہونے) کی وجہ سے (ذرا) مشکل ہے اور (کچھ نہ کچھ) موانع درمیان میں ہوتے ہیں برخلاف عورت کے عورت کے پاس پہونچنے کے کہ وہاں اتحاد صنف (ایک قسم ہونے) کی وجہ سے بہت آسانی ہے ـــــ یہاں بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے اور عورتوں کو عورتیں کے شہوت سے دیکھنے اور چھونے سے انداز بلیغ اور مبالغ بین کے ساتھ اس سے بھی زیادہ منع کیا جائے جتنا کہ مردوں کو عورتوں کے اور عورتوں کو مردوں کے دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے۔

چوتھی شرط ـــــ جو بیعت نساء میں ذکر فرمائی گئی ہے وہ قتل اولاد سے نہی ہے کیونکہ (ایام جاہلیت میں) عرب کی عورتیں اپنی لڑکیوں کو خوف فقر کی بنا پر مار ڈالتی تھیں ـــــ یہ برا عمل جس طرح قتل نفس بغیر حق کو شامل ہے اسی طرح قطع رحم کو بھی شامل ہے جو کہ بڑے گناہوں میں سے ہے ـــــ

پانچویں شرط ـــــ جو بیعت نساء کے سلسلے میں بیان فرمائی گئی ہے وہ افتراء اور بہتان سے نہی ہے چونکہ یہ صفت عورتوں میں بہت ہوتی ہے اس لئے اُن کو اس سے خاص طور پر منع کیا گیا ہے ـــــ یہ صفت انتہائی مذموم صفت ہے اور اخلاق رذیلہ میں سے سب سے زیادہ رذیل عادت ہے ـــــ اس لئے کہ یہ صفت، جھوٹ کو شامل ہے اور جھوٹ تمام مذاہب میں حرام اور قبیح ہے ـــــ افتراء و بہتان، ایذائے مومن کو بھی متضمن ہے جس کے بارے میں بہتان گھڑا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مومن کو ایذا پہونچانا حرام ہے اور اس افتراء و بہتان سے زمین کے اندر فساد بھی برپا ہوتا ہے اور فساد فی الارض بنص قرآنی ممنوع و حرام ہے ـــــ

چھٹی شرط ——— پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے بچنا ہے ہر اس کام میں جس کا انھوں نے حکم فرمایا ہے اور یہ چھٹی شرط تمام اوامر کی تعمیل کرنے اور تمام نواہی سے باز رہنے کو متضمن ہے ——— نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج، ایمان کے بعد اسلام کے بنیادی رکن ہیں (اور یہ بھی اسی شرط کے ضمن میں آجاتے ہیں)

نماز پنجگانہ کو بغیر سستی اور بغیر نقصان کے پورے اہتمام کے ساتھ ادا کیا جائے۔ (بشرطِ نصاب) زکوٰۃ کو رغبت اور جذبۂ تشکر کے ساتھ اُسکے مصارف میں ادا کرنا چاہیئے۔ روزۂ رمضان ——— جو کہ سال بھر کے گناہوں کا مٹانے والا ہے اسکی بھی نگہداشت ضروری ہے (بشرطِ استطاعت) حج بیت اللہ کو بھی جس کی شان میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ (مقبول) حج ماقبل کے تمام (صغیرہ) گناہوں کا مٹانے والا ہوتا ہے۔ ——— ادا کرنا چاہیئے تاکہ اسلام کو قائم و برقرار رکھنا پایا جائے ——— اسی طرح ورع و تقویٰ کے بغیر بھی کوئی چارہ کار نہیں ہے ——— حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تقویٰ تمھارے نظام دین کو قائم رکھنے والا ہے اور تقویٰ نام ہے منہیات و ممنوعات شرعیہ کو ترک کرنے کا ——— تمام نشے والی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیئے اور انکو شراب کی مانند ہی حرام اور بُرا سمجھا جائے ——— گانے بجانے سے بھی اجتناب ضروری ہے کیونکہ یہ داخل لہو و لعب ہے اور لہو و لعب حرام ہے ——— حدیث میں آیا ہے کہ "گانا زنا کا منتر ہے" ——— غیبت کرنے اور چغلخوری سے بھی بچنا لازم ہے یہ بھی ممنوع شرعی ہے۔ نیز کسی کا مذاق بنانا اور مومن کو ناحق ایذاء دینا جس صورت سے بھی ہو، منع ہے اس سے بھی پرہیز ضروری ہے ——— بدشگونی کو کوئی حیثیت نہ دیں اور اس میں کوئی تاثیر نہ جانیں اور یہ بھی عقیدہ نہ بنائیں کہ ایک کا مرض اُڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے اور مریض سے تندرست تک پہونچ جاتا ہے ——— مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں (بدشگونی اور تعدیۂ مرض) کے ماننے سے منع فرمایا ہے اور ان کا ارشاد ہے کہ "بدشگونی و بدفالی کوئی چیز نہیں ہے اور مرض کا متعدی ہونا بھی صحیح نہیں ہے" ——— یعنی شگونِ بد کی اصل ثابت نہیں ہے اور ایک کا مرض دوسرے کو لگ جانا مطلق متحقق

نہیں ہے ـــــ کاہن اور نجومی کی باتوں کو سچا نہ جانیں، غیبی امور اُن سے نہ دریافت کریں اور اُن کو امورِ غیبیہ کا عالم نہ سمجھیں شریعت میں اس بارے میں بہت زیادہ ممانعت آئی ہے ـــــ جادو نہ کریں اور جادوگری کو بروئے کار نہ لائیں اس لئے کہ یہ حرام قطعی ہے اور اس کو کفر میں پورا پورا دخل حاصل ہے ـــ کوئی کبیرہ گناہ جادو اور جادوگری کے مقابلے میں کفر سے نزدیک تر نہیں ہے ـــ احتیاط کرنی چاہیئے کہ جادو کا کوئی دقیقہ بھی عمل میں نہ آنے پائے اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ "جب تک ایک مسلمان (اپنے اندر) ایمان و اسلام رکھتا ہے جادو اس سے وجود میں نہیں آتا ہے اور جب نعوذ باللہ اس سے ایمان جدا ہو جاتا ہے تو پھر جادو اُس سے ثابت و متحقق ہوتا ہے" پس گویا کہ جادو اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں اگر جادو ہے تو ایمان نہیں ہے ـــــ اس نکتے کو اچھی طرح پیش نظر رکھا جائے تاکہ کارخانۂ اسلام میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے، اور اس عمل جادو کی نحوست سے کہیں اسلام ہاتھ سے نہ نکل جائے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اور علمائے کتب شرعیہ میں بیان فرمایا ہے جان و دل کے ساتھ اس کی فرمانبرداری کرنی چاہیئے اور اُس کے خلاف کو ایسا زہر قاتل تصور کیا جائے جو موتِ ابدی تک پہونچاتا ہے اور عذابہائے گوناگوں میں مبتلا کر دیتا ہے ـــــ جب بیعت ہونے والی عورتوں نے ان تمام شرائط کو قبول کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرائط کے زبانی اقرار سے ہی ان عورتوں کو بیعت فرما لیا اور بحکم حق تعالیٰ عورتوں کی اس جماعت کے لئے طلب مغفرت فرمائی ـــ جو طلب مغفرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بحکم حق تعالیٰ وقوع میں آئی ہو اُس کے متعلق پوری پوری اُمید ہے کہ درجۂ اجابت و مقبولیت کو پہونچے گی اور عورتوں کی وہ جماعت مغفور ہو گی ـــ ہندہؓ زوجۂ ابو سفیانؓ بھی اس بیعت میں داخل تھیں بلکہ ان تمام عورتوں کی وہی سرگروہ اور سردار تھیں اُن کے حق میں بھی اس بیعت اور اس استغفار سے اُمیدواری عظیم ہے ـــــ پس عورتوں میں سے (قیامت تک) جو بھی ان شرائط کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرے گی وہ اسی بیعت (کے حکم) میں داخل ہو گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم والے استغفار

کے برکات کی اُمیدوار ہو جائے گی ـــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :ـــــ

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم اس کا شکر ادا کرتے رہو اور ایمان لے آؤ ـــــ

شکر کے ادا کرنے سے مُراد یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کو قبول کرکے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ طریقِ نجات اور چھٹکارے کا راستہ اعتقاد و عمل میں صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے اندر ہے ـــــ اُستاد و پیر کو اسی لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ شریعت کا راستہ بتائیں اور ان کی برکت سے اعتقاد و عمل بشریعت میں آسانی و سہولت ہو جائے۔ یہ نہیں ہے کہ مُرید جو جی چاہے کریں اور جو مَن چاہے کھائیں اور پیر اُن کے لئے ڈھال بن جائیں گے اور عذاب سے محفوظ رکھیں گے ـــــ کیونکہ یہ بات محض تمنا ہی تمنا ہے وہاں کوئی بھی بغیر اجازت شفاعت نہ کر سکے گا اور جب تک کوئی پسندیدۂ حق نہ ہوگا کوئی شفیع اُسکی شفاعت نہ کرے گا ـــــ پسندیدۂ حق اُس وقت ہوگا جب کہ بمقتضائے شریعت عمل کرنے والا ہو گا ـــــ البتہ بوجہ بشریت اگر کوئی لغزش اُس سے سرزد ہو جائے تو شفاعت کے ذریعے اُس کا تدارک ممکن ہے .... وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ الْمُوَفِّقُ

ـــــ "اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے لئے کام میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے" ـــــ (والسلام)

*

از

وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڈھ)

ایک اسلامی شاعر نے کہا ہے :-

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اُٹھے گا دھواں نہیں معلوم

شاعر کے ذہن میں خود اس شعر کا مفہوم کیا ہوگا، اسکے متعلق کچھ قیاس کرنا مشکل ہے، مگر میں نے اس کو یہاں ایک خاص مفہوم میں نقل کیا ہے۔ اللہ کے وہ بندے جو واقعی طور پر اللہ کی اطاعت کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتے ہیں، ان کا عمل ایسے ایسے پہلوؤں سے اپنے نقش چھوڑتا ہے اور ایسے ایسے مقامات سے اسکے اثرات و نتائج ظاہر ہو کر سامنے آتے ہیں جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں میں ایک نیک بخت مسلم خاتون کا واقعہ نقل کروں گا۔ یہ خاتون بفضلہ تعالیٰ زندہ موجود ہیں اور واقعہ بھی سنا ہوا نہیں ہے بلکہ ذاتی طور پر میرے علم میں آیا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ایک دوست ڈاکٹر سے علاج کرا رہی تھیں۔ ڈاکٹر چونکہ ان کے وطن سے پانچ سو کیلومیٹر کے فاصلے پر رہتے ہیں، اس لئے احوال و کوائف بذریعہ خط لکھ کر بھیجتی تھیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہومیوپیتھ ہیں اور اپنے

مخصوص طریق علاج کے مطابق ان کی تاکید تھی کہ حالات بتانے میں یہ بات خاص طور پر لکھی جائے کہ مرض کیسے پیدا ہوا۔ کب بڑھتا ہے اور کب گھٹتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

خاتون کو جوڑوں کا درد تھا۔ جب وہ اچھا ہوا تو سر کا درد شروع ہو گیا۔ کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا تھا، بالآخر انھوں نے ڈاکٹر کو لکھا:۔

"اپنے حالات کے سلسلے میں آپ کو کچھ لکھنا تھا تاکہ آپ مرض کی نوعیت سمجھ کر صحیح دوا تشخیص کر سکیں۔ مگر کئی دن سے سوچ سوچ کر رہ جاتی تھی۔ اب چونکہ یہ علاج کا معاملہ ہے اور طویل علالت کی وجہ سے وہ میرے لئے سخت تکلیف دہ ہو چکا ہے، اس لئے مجبوراً لکھتی ہوں۔

کہنا یہ ہے کہ جوڑوں کا درد جو مجھے پہلے ہو گیا تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کے علاج سے بالکل ٹھیک ہو گیا، مگر اس کے بعد درد سر کی مستقل پریشانی شروع ہو گئی ہے۔ یہ درد کیسے اٹھتا ہے، یہ لکھنے یا کہنے کی بات نہیں تھی، مگر مجبوراً لکھ رہی ہوں کہ اس کے بغیر شاید ہومیوپیتھک طریق علاج میں صحیح دوا تجویز نہیں کی جا سکتی۔

بات یہ ہے کہ اگر میں رات کو ساری رات آرام سے بستر پر پڑی رہوں تو سر میں قطعاً درد نہیں ہوگا۔ اور دن بھی خیریت سے گزر جائے گا۔ مجھے تہجد کو راتوں کی تنہائی میں اٹھ کر نماز پڑھنا بہت پسند ہے۔ انھیں رات کی نمازوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخرت کا منظر یا قبر وغیرہ کی یاد شدت سے دماغ میں آتی ہے اور اس وقت بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ بس انھیں آنسوؤں کا نکلنا مضر ہوتا ہے۔ جیسے ہی آنکھ سے آنسو نکلے، سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بار بار اندازہ کیا ہے کہ آنسوؤں ہی کے نکلنے سے سر میں درد شروع ہوتا ہے۔

یہ بات کسی سے کہنے کی نہیں تھی، محض علاج کی خاطر میں نے اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو لکھ دیا ہے، براہ کرم خط کو پڑھنے کے بعد اسے پھاڑ کر ضائع کر دیں۔"

یہ سادہ سے چند الفاظ جو ایک معمولی پڑھی لکھی خاتون کے قلم سے محض ضرورت شدید کی بنا پر نکل گئے تھے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو انھوں نے حیرت انگیز کام کیا۔ ڈاکٹر نے جواب میں لکھا:۔

"گرامی نامہ ملا۔ آپنے دوسری کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ میرے لئے تشخیص کے سلسلے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ میں نے دوا تجویز کرلی ہے۔ آپ نیٹرم میور ــــ ۳۰ بازار سے منگوا کر کھالیجئے۔ انشاءاللہ ایک ہی خوراک میں فائدہ محسوس ہوگا۔

مگر میں یہ کہنے کے لئے آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ آپکے حکم کے بموجب میں آپکے خط کو پھاڑ نہ سکا۔ کیونکہ اس کا تعلق صرف آپکے علاج سے نہیں ہے بلکہ خود اپنے روحانی علاج کے سلسلے میں میں نے اس کو اس قدر موثر پایا کہ کسی بھی تحریر یا نصیحت کا اتنا گہرا اور فوری اثر نہ ہوا تھا۔ آپنے خط کو پھاڑنے کی بات اس خیال سے لکھی ہوگی کہ اس کے اظہار سے آپکے اجر میں کمی ہوگی۔ لیکن اگر مجھ جیسے کھوئے ہوئے شخص کو کوئی تحریر حرکت میں لاسکے تو وہ بلاشبہ میرے لئے آخری دم تک محبوب ہوگی۔ کاش میرے اندر بھی ایسی ہی کیفیت پیدا ہوجاتی اور رات کی تاریکی میں آخرت کی باز پرس کا ہولناک منظر دیکھنے کی توفیق ہوتی۔ اس لئے یہ اظہار محض آپ کی اجازت کے لئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس لحاظ سے اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت پایا کہ اپنے ایک مریض کے جسمانی علاج سے مجھے روحانی غذا ملی۔"

یہ خاتون جن کا خط میں نے اوپر نقل کیا، وہ ایک خاموش طبیعت کی خاتون ہیں اور ان کو اپنے بارے میں اس کمی کا شدید احساس ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت کا کام نہیں کرسکتیں، مگر آپ نے دیکھا کہ ان کے ایک خاموش عمل نے کس طرح ایک ایسی تبلیغ کا کام انجام دیا جو تقریر دل پر بھی بھاری ہوگیا۔ اس لئے دوسروں کے اوپر تبلیغ و دعوت کا کام کرنے کا مسئلہ سب سے پہلے خود اپنے آپ کو بدلنے کا مسئلہ ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام ذاتی عمل سے نہایت گہرا رشتہ رکھتا ہے۔

جس اسلام کے ہم مبلغ ہیں، اگر وہ خود ہماری زندگیوں میں اترا ہوا ہے تو وہ بے شمار پہلوؤں سے دعوتی کام میں موثر ہوگا۔ اور اگر ہماری زندگی اس سے خالی ہو تو تقریر و تحریر کی شکل میں ممکن ہے کچھ الفاظ وجود میں آجائیں، مگر اس چیز کا وجود نہیں ہو سکتا جس کو حقیقی معنوں میں تبلیغ یا دعوت کہا جاتا ہے۔

دعوت و تبلیغ اور ذاتی عمل کے درمیان یہ رشتہ ان معنوں میں نہیں ہے جیسے کوئی شخص ریاضیات کا ٹیچر بننا چاہتا ہو تو وہ پہلے ریاضی کی تعلیم حاصل کر کے اسے خود سیکھتا ہے تاکہ وہ ریاضی کے طلبہ کو اس کا درس دے سکے۔ ذاتی عمل اور تبلیغ کے درمیان اس قسم کا ارادی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک فطری تعلق ہے۔ ذاتی عمل کا محرک اصلاً یہ نہیں ہے کہ آدمی کامیاب مبلغ بن جائے، ایسا ذاتی عمل کبھی وجود میں نہیں آسکتا اور اسی لئے اس قسم کا ذہن رکھنے والا شخص کبھی اچھا مبلغ بھی نہیں بن سکتا، مومن کے اندر عمل کا داعیہ اس لئے نہیں ابھرتا کہ وہ اس کے ذریعہ سے عمدہ قسم کا مبلغ بن جائے گا، بلکہ جب خدا کا خوف اور آخرت کی بازپرس کا احساس اسے باعمل بنا دیتا ہے تو اس وقت یہ اسکے نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تبلیغ میں اس کی زندگی کے شرارے جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ خود بخود ایک کامیاب مبلغ بن جاتا ہے۔

تبلیغ و دعوت میں ذاتی زندگی کے یہ اثرات مختلف پہلوؤں سے داخل ہوتے ہیں میں یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سب سے پہلا اثر تو وہ ہے جس کو میں بالواسطہ تبلیغ کہوں گا۔ یہ وہ اثر ہے جو تبلیغ میں نکلنے سے پہلے بلا ارادہ اپنے تبلیغی اثرات دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ جب ایک بندۂ خدا کے دل میں اپنے رب کے سامنے حاضری کا خوف سماتا ہے تو وہ فوراً اپنی زندگی پر نظر ثانی شروع کر دیتا ہے۔ اندر سے باہر تک اس کی زندگی بدلنے لگتی ہے۔ یہ تبدیلی اگرچہ اپنی انتہائی اور مکمل شکل میں کسی انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے مگر اس کے باوجود اس کی کچھ جھلکیاں مختلف شکلوں میں لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہیں اور دیکھنے اور سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔

جب اس کو یہ احساس ستاتا ہے کہ پچھلی غفلت کی زندگی میں اس نے فلاں شخص کے ساتھ ایک ایسی زیادتی کی تھی جو اس کے لئے آخرت میں بازپرس کا سبب بن سکتی ہے اور وہ اس کے سامنے معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوتا ہے تو اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ سننے والے کو بھی ہلا دیتے ہیں اور غلطی کا اظہار کرتے وقت نکل پڑنے والے آنسو کتنے سیاہ اور غبار آلود دلوں کو دھو کر صاف کر دیتے ہیں۔ جب وہ غلط طریقے سے حاصل کئے ہوئے ایک مال کو اس اندیشے کی بنا پر واپس کرنے جاتا ہے کہ آخرت میں اس کے اصل مالک کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ اس کے بدلے غاصب کا سارا عمل لے لے۔ اور اسے بالکل خالی کر کے چھوڑ دے، تو وہ ایک شخص کو صرف اس کا مال ہی نہیں لوٹاتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کو ایمان کی وہ دولت بھی واپس دلاتا ہے جو غفلت میں شیطان اس سے اُچک لے گیا تھا۔ جب ایک واقعی نمازی سجدے میں ہمہ تن پڑا ہوا خدا سے اس طرح سرگوشی کر رہا ہوتا ہے کہ بقیہ دنیا کی اسے خبر بھی نہیں ہوتی، عین اس وقت اس کی اس ہیئت دنائیت کو دیکھ کر کسی بندۂ خدا کا دل اندر ہی اندر اپنے رب کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ بے اختیار چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح اپنے خدا کو پا کر اس سے لپٹ جائے۔ جب زندگی کے عملی معاملات میں لوگوں کو اس سے سابقہ پیش آتا ہو اور لوگ اس کی سچائی، پاکیزگی، دیانت داری اور ایفائے عہد کا تجربہ کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں کہ اُس دین کی قدر کریں جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ ایسے عمدہ انسان تیار کرے، حتیٰ کہ کتنے غیر مسلموں کو اس طرح کے تجربات سے اسلام کی توفیق ملتی ہے اور کتنی غافل روحوں کو دوبارہ اسلام کا شعور نصیب ہوتا ہے۔

دو پتھر باہم ملیں تو کوئی خاص بات نہیں ہو گی۔ لیکن بجلی کا ایک تار جب دوسرے تار سے مَس کرتا ہے تو فوراً سادہ تار میں برقی رو دوڑنے لگتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ ایک اچھے انسان کی خصوصیات دوسرے انسان کے لئے برقی رو کی حیثیت رکھتی ہیں، انسان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اچھی چیز سے اثر قبول کرتا ہے اور خدا پرستی کی چیزیں اس کے دل کی آواز بن کر اس کی نفسیات

میں پیوست ہوجاتی ہیں جب ایک شخص کوئی عمدہ عمل کرتا ہے۔ یا اس کی زندگی سے خدا پرستی کا کوئی نور چھن کر لوگوں کے سامنے آجاتا ہے تو اس وقت دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان اسی طرح اس کو قبول کرتے ہیں جیسے بجلی کے تار سے کوئی دوسرا تار برقی رو قبول کرتا ہے۔ اس وقت فطرت کے ایک ان دیکھے تار پر ایک طرف کے جذبات دوسری طرف منتقل ہونے لگتے ہیں، ایک کی ہلچل دوسرے کو لرزہ براندام کر دیتی ہے، ایک کی روشنی سے دوسرے کا باطن چمکنے لگتا ہے۔ یہ ایک بالکل فطری عمل ہے جو لازمی طور پر اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی کے اندر ایمان و اسلام کا شعلہ بھڑکے اور اس کے گرد و پیش ایسے لوگ موجود ہوں جن کی فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو اور انسانی اوصاف ابھی باقی ہوں۔

۲۔ دوسری چیز وہ ہے جو براہ راست تبلیغ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ الفاظ جن کے ذریعہ سے ہم اپنی بات دوسرے تک پہنچاتے ہیں وہ کسی مفہوم کا مجرد اظہار نہیں ہیں جیسے پانچ اور دس کسی چیز کے عدد کا مجرد اظہار ہیں۔ بلکہ اسی کے ساتھ ان کے اندر مختلف قسم کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے دو بالکل یکساں کلام اپنی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے بے حد مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے میں یہاں دو شعر نقل کرتا ہوں:-

خرابات عالم میں ہر چار جانب چھلکتے ہوئے جام و مینا دھرے ہیں
فرو دست اسی کی ہے لے اہل محفل کوئی ہاتھ اس کو بڑھا کر اٹھالے

حماد

یہ مے خانہ ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

شاد

یہ دونوں اشعار مفہوم کے اعتبار سے بالکل ہم معنی ہیں، مگر الفاظ اور دروبست کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔

یہ فرق کی ابتدائی قسم ہے جس کو ہم ادبی فرق کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ قدرت کلام اور

فنی ذوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرا فرق وہ ہے جو صاحب کلام کی اپنی اندرونی کیفیات کے اعتبار سے وجود میں آتا ہے۔ اگر آپ ایک واقعہ سے متاثر ہوں تو اس کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف آپ کا لب و لہجہ بدل جائے گا۔ بلکہ آپ کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ نکلیں گے جو آپ کی اندرونی کیفیات کی ترجمانی کر رہے ہوں جن میں آپ کا تاثر اسی طرح بھرا ہوا ہو جیسے کسی تازہ پھل میں اس کا رس بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ متاثر نہ ہوں تو آپ کا بیان واقعہ محض اخباری رپورٹ معلوم ہوگا۔

ذاتی طور پر ایمان و اسلام کی زندگی کو پالینا آدمی کے تبلیغی کام میں بھی دوسری خصوصیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اس کے کلام کو مجرد کلام کے مقام سے اٹھا کر موثر کلام بنا دیتا ہے۔ وہ اس میں شدت جذبات کا رس بھرتا ہے، وہ ننگے الفاظ کو کیفیات کا لباس اوڑھاتا ہے وہ حروف کے مجموعوں کو دل کے ٹکڑے بنا دیتا ہے، وہ کلام کو خوشبو فروش کا معطر اشتہار بنا دیتا ہے جو صرف پڑھا نہیں جاتا، بلکہ اپنی خوشبو بھی مخاطب تک پہنچا دیتا ہے۔

جس کے اپنے اندر اسلام اترا ہوا نہ ہو، اسکے کلام میں بظاہر تمام شرعی باتیں موجود ہوں گی مگر وہ بس الفاظ کا ایک مجموعہ ہوگا جس میں دل کی بو بسی ہوئی نہیں ہوگی۔ وہ ایک سپاٹ کلام ہوگا جو خود اپنی حقیقتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب ایک ایسا شخص بولتا ہے جس نے فی الواقع دین کو پالیا ہو تو اس کی زبان اور اسکے الفاظ میں حیرت انگیز خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جب لوگوں کو آخرت سے ڈراتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔ اس کے بے قرار جملے صاف بتاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض کچھ الفاظ کی تکرار نہیں ہے، بلکہ وہ ان ہیجان خیز واقعات سے براہ راست آشنا ہو کر بول رہا ہے۔ اسکی تحریروں میں دل کا سوز گھلا ہوا ہوتا ہے، اس کے الفاظ اندرونی تپش کی آنچ سے جل رہے ہوتے ہیں، اس کے ہر بول میں حقیقت کی خوشبو لپٹی ہوئی ہوتی ہے، اس کی سطروں کے

درمیان جگہ جگہ نظر آتا ہے کہ آنسوؤں نے ٹپک کر لکھی ہوئی سیاہی کا رنگ بدل دیا ہے ـــــــ یہ چیزیں اس کے کلام کو حقیقت بیانی کے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہیں جہاں دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے گویا حقیقت خود مجسم بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی ہے۔
تبلیغ و دعوت کے کام کو موثر بنانے کے لئے خارج میں کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے۔ اسکی صرف ایک ہی تدبیر ہے ـــــــ اپنے اندرون کو مسلمان بناؤ، اسی وقت تم اپنے بیرون کو مسلمان بنا سکو گے۔

*

معاشرہ کی اصلاح

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

جس طرح کسی انسان کے جسم پر پھوڑے پھنسی یا کسی دوسرے ظاہری فساد کو دیکھکر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے باطن میں مادۂ فاسد بھرا ہوا ہے اور اس سارے ظاہری فساد کی جڑ یہی ان دیکھا فساد ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرہ کے بیرونی بگاڑ کو دیکھ کر یقین کر لینا چاہیئے کہ یہ کسی اندرونی خرابی کا نتیجہ ہے اور جس طرح پہلی صورت میں علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اصل توجہ مادۂ فاسد کو جڑ سے نکال دینے پر کی جائے اسی طرح دوسری صورت (یعنی معاشرہ کے بیرونی بگاڑ) کے علاج میں بھی یہی طریقۂ علاج صحیح اور کارگر ہے اور اسی سے سوسائٹی (معاشرہ) کی پائدار صحت مندی کی توقع کرنا صحیح ہے۔ اس اصول کو چھوڑ کر اگر علاج کیا جائے تو ممکن ہے کہ ظاہری فساد کچھ دیر کیلئے دب جائے مگر مٹ نہیں سکتا۔

پہلا طریقہ نبض شناس اطبّاء کا ہے اور دوسرا نبض سے بے بہرہ ظاہر بین جرّاحوں کا، بیشک ایسا ہوتا ہے کہ پھوڑوں سے بھرا ہوا جسم جرّاح کے علاج اور اس کی مرہم پٹی سے بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور مریض کو صحت کا سکون مل جاتا ہے، مگر اس پر یہ سمجھ لینا کہ صحت تام حاصل ہو گئی بڑی خطرے کی بات ہے اس لئے کہ اندرونی مادّہ کو مہلت مل جاتی ہے کہ وہ اندر ہی اندر بگڑتا اور سڑتا رہے اور پھر کسی دوسرے وقت میں پہلے سے زیادہ شدت و قوت کیساتھ ظاہری جسم پر حملہ کرے لہٰذا اندرونی فساد کو ختم کئے بغیر ظاہری سکون پر اطمینان دانش مندی کے خلاف ہے۔

بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرہ کی حالت بالکل اسی انسان کی سی ہو جس کا جسم زہریلے پھوڑوں سے بھرا ہوا ہے، ہمارے معاشرہ کے پھوڑے کیا ہیں بد اخلاقی، بے حیائی، ظلم، حقوق تلفی، رشوت، بد دیانتی، اور اسی قسم کی سیکڑوں برائیاں۔ یہ وہ زہریلے پھوڑے ہیں جن کی وجہ سے چین وسکون سماج سے کوسوں دور ہو گیا ہے۔ صحیح اصول علاج کے ماتحت ہمیں ان امراض کے اسباب کا پتہ لگانا چاہیئے، صرف وعظ و نصیحت کے مرہم یا کسی آہنی نظام کے دباؤ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔

بعض مدعیان نبض شناسی کی تشخیص یہ ہے کہ سوسائٹی میں یہ بگاڑ عام غریبی اور طبقاتی ناہمواری سے آیا ہے اگر ہر شخص کو بقدر ضرورت دولت مل جائے، تو یہ مریض معاشرہ صحت مند ہو سکتا ہے، جب اس تشخیص پر نگاہ فکر پڑی تو اس کے سامنے یہ سوال آکھڑا ہوا کہ سوسائٹی میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جن کے پاس بقدر ضرورت یا زائد از ضرورت مال و دولت موجود ہے پھر ان سے یہ امراض کیوں دور نہیں ہوئے؟ بلکہ برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دوا ان کے امراض کی شدت میں مزید اضافہ کرتی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بسا اوقات کم پیسے والا اتنا بد اخلاق نہیں ہوتا جتنا زیادہ روپیہ والا۔ اگر غریب ظالم ہوتا ہے تو امیر ظلام۔ اگر ایک کانسٹبل دو چار روپیہ رشوت لیتا ہے تو تھانہ کا انچارج سیکڑوں کے وارے نیارے کرتا ہے اگر ایک تھوڑی تنخواہ والا کلرک رشوت لیتا ہے تو سیکڑوں پانے والا آفیسر اس سے بدرجہا زیادہ گندی کمائی کرتا ہے، فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ ایک طرف برائی عریاں اور بے ڈھنگی ہوتی ہے دوسری طرف کوئی خوبصورت آڑ اور نظر فریب پردہ چھپا ہو جاتا ہے۔ برائی یہاں بھی وہی برائی ہے۔ اور وہ برائی یقیناً زیادہ بری ہے جس کی قباحت و شناعت عام طور سے محسوس نہ کی جا سکتی ہو۔

اس سوال کی روشنی میں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ افراد کو بقدر ضرورت دولت مل جانا سوسائٹی کے پھوڑوں کا علاج ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ دوا جب معاشرہ کے بعض

افراد کو فائدہ نہ دے سکی تو کیسے ضمانت کی جا سکتی ہے کہ پورا معاشرہ اس سے صحت پائے گا۔

تجویز کی غلطی ہمارے نزدیک تشخیص کی خطا کی طرف اشارہ کرتی ہے، مگر بعض حکمائے وقت نے تشخیص سے اتفاق کرتے ہوئے تجویز میں کچھ ضروری اضافہ کیا ہے وہ ہے "نظام حکومت کا آہنی شکنجہ" یعنی سماج کا جسم اس طرح کس دیا جائے کہ اندرونی مواد کو پھوڑے بن کر ابھرنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن زمانۂ ماضی کے انقلابات و حوادث کی تاریخ اگر محفوظ ہے اور اس سے عبرت و بصیرت حاصل ہوتی ہے تو ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ سارے گذشتہ نظاموں کی طرح اس نظام کے اعضاء میں بھی اضمحلال کا عمل ضرور ہوگا، اس کی گرفت یقیناً ڈھیلی ہو جائے گی، اور برسوں کے سڑے ہوئے مواد کو ابھرنے کے بجائے ابلنے کا موقع ہاتھ آئے گا، اور اس وقت اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت سماج کا بگاڑ کس درجہ پر ہوگا، ممکن ہے کہ موجود پیمانہ اس کو ناپ بھی نہ سکے ـــــ اس آخری تجویز پر اگر عمل کر لیا جائے تو نتیجہ ثابت کریگا کہ اشرف المخلوقات انسان اور ایک سرکش گھوڑے میں کوئی فرق نہیں، کہ جب تک چاروں طرف سے چار رسیوں میں جکڑا ہے معقول ہے، اور جہاں بندش دور ہوئی پھر وہی شرارت اور سرکشی۔

ایک انسانی مثال لے لیجئے کہ بعض لوگوں میں چوری یا ڈکیتی کی عادت ہو جاتی ہے جو بیشک سوسائٹی کے لئے ایک ایسا ہی زہریلا پھوڑا ہے جیسے چند اوپر ذکر ہوئے ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے جیل خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، مار پیٹ کی جاتی ہے لیکن کتنے چور اور ڈاکو ہیں جو جیل خانہ سے نکلنے کے بعد اس حرکت سے باز آ جاتے ہیں اور اس طریقۂ علاج سے ان کا مرض دور ہو جاتا ہے۔ بیشک وہ قید کی مدّت میں یہ کام نہیں کر پاتے مگر باہر نکلتے ہی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں ـــــ یہ تو تھی انسانی دماغوں کی تشخیص اور تجویز، جس کی غلطی اور ناکامی ہمیں صاف نظر آ رہی ہے۔ اس سے بالکل الگ ایک تشخیص اور تجویز وہ ہے جس کو ایک انسان نے وحی کی روشنی میں ساری

دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے مختصر الفاظ یہ ہیں:۔

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔	معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جس پر انسان کی اچھائی برائی کا مدار ہے وہ جب ٹھیک رہتا ہے تو انسان ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو انسان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ اس کا دل ہے

عقلیت او تجدد کا مضحکہ خیز مظاہرہ ہوگا اگر اس کو صرف اس لئے رد کر دیا جائے کہ یہ نظریہ ڈیڑھ ہزار برس پرانا ہے ــــ یہ نظریہ ہماری اس فطرت کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو اس سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ انیسویں صدی میں ملیریا کیلئے کنین کا استعمال اس لئے نہیں ترک کیا جا سکتا کہ اس کی دریافت کسی گذشتہ صدی میں ہوئی تھی اگر ملیریا کے اسباب نہیں بدلتے تو دوا کیسے بدل دی جائے، صحیح طریقے پر کنین کے استعمال سے لاتعداد مریضوں کا ملیریا سے نجات پانا تشخیص و تجویز کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہے، تاریخ اگر کسی زمانے میں کسی جگہ سماجی امراض کے بالکلیہ ازالہ کا پتہ دیتی ہے تو وہ انسانیت کے صحیح اور کامل ارتقاء کا صرف وہی دور ہے اور وہی ملک ہے جس میں اس نسخہ کا تجربہ صحیح طریقے پر کیا گیا۔ یہ آپ کا کام ہے کہ تاریخ میں اس زمانہ کا پتہ لگا کر اور اس کی تفصیلات دیکھ کر اطمینان کر لیں کہ مدعی کا یہ دعوی صحیح ہے" اور یہ بھی دیکھ لیجئے گا کہ وہ معاشرہ کسی آہنی نظامِ حکومت میں کسا اور بندھا ہوا تو نہ تھا۔

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ایک تحصیل دار عبد اللہ بن رواحہؓ کو خیبر کے یہودیوں سے زرعی ٹیکس وصول کرنے کے لئے بھیجتے ہیں، وہ یہودی ٹیکس میں تخفیف کرانے کیلئے بغیر کسی طلب کے رشوت کی پیشکش کرتے ہیں، عبد اللہ بن رواحہؓ جانتے ہیں کہ جاسوسی کا کوئی سسٹم نہیں ہے، ان پر کوئی نگرانی نہیں ہے مگر ان کا ضمیر بالکل نہیں پھسلتا اور پوری نفرت اور حقارت کے ساتھ اس ناپاک پیش کش کو ٹھکرا دیتے ہیں، یہودی ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں، اور ان کی زبان نقارۂ خدا بن کر کہتی ہے کہ "بیشک اسی انصاف کے بل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔"

دوسری مثال لیجئے عمر بن عبد العزیزؒ (جو صحابی نہیں ہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد پیدا ہوئے) کو پوری اسلامی سلطنت (روم و ایران کی سب سے بڑی شہنشاہیاں جس کا جزء بن چکی تھیں) سپرد کی جاتی ہے۔ وہ اپنے پیشرووں کی روایات سے فائدہ اٹھاکر اس اقتدار کو اپنی ذات اور خاندان کے لئے استعمال کر سکتے تھے مگر ہوا کیا؟ انھوں نے ان تمام جاگیروں اور اموال کو جو شاہی خاندان اور امرار سلطنت کی ذاتی ملکیت بن گئے تھے، ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہو کر عوام کے خزانہ بیت المال میں واپس کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی (جو سابق خلیفہ کی صاحبزادی تھیں) کے گلے میں اس قسم کا ایک قیمتی ہار باقی رکھنا بھی گوارہ نہ کر سکے اور صاف کہہ دیا۔

"اے فاطمہ یا تم اس کو بیت المال میں واپس کردو
یا مجھ سے تعلق ختم کر لو"

کیا نام نہاد جمہوریت اور "عزیب راج" نے ایسی کوئی ایک مثال بھی پیش کی ہے جبکہ اسلام نے ٹھیٹ شہنشاہیت اور ملوکیت کے دور میں اپنی تاریخ میں ایسی ان گنت مثالیں چھوڑیں، مگر برا ہونا بینائی کا کہ اس پر تو سورج بھی اثر کرنے سے عاجز ہے! گو میرا مقصد مثالوں کا شمار کرانا نہیں ہے، نہ خود کو اتنی فرصت نہ اوراق میں اتنی وسعت، مگر ایک مثال اور پیش کرنا چاہتا ہوں شاید مساوات کے سچے جویا کچھ غور کریں۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے سچے اور مخلص مساواتیوں کیلئے بھی مساوات اب تک لیلئِ خیال سے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جی چاہتا ہے کہ وہ چشم تصور کی مدد سے چند لمحوں کے لئے اس دور پر ایک نظر ڈالیں، جس میں اسلام کا صحیح تجربہ ہوا ہے، ممکن ہے وہ اپنی اس ذہنی جستجو کو پیکرِ حقیقت میں دیکھ پائیں۔

حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) اسلامی حکومت کے تیسرے خلیفہ ہیں (انھیں) خلافت اس وقت ملی ہے جب اسلامی فوجیں روم و ایران میں اپنی فتوحات

قریباً مکمل کر چکی تھیں) ان کی اس حیثیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد ذرا ایک واقعہ سنئیے۔

ایک مرتبہ غصہ میں آکر اپنے کسی غلام کا کان کھینچ دیا، فوراً تنبہ ہوا اور اس سے کہا "تو اس کے بدلے میں میرا کان کھینچ"۔ اس غریب کو کیسے جرأت ہو سکتی تھی لیکن انہوں نے خوشامدانہ اور حاکمانہ لہجوں کی پوری طاقت استعمال کر کے اسے اس پر آمادہ کیا۔ اس نے تعمیل حکم میں بہ مشکل کان پکڑ لیا، مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا یعنی کھینچنا اس کی جرأت کہاں سے لائے، بہت کہنے سننے سے کھینچا بھی تو بہت آہستہ سے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے کہا: "مجھے اتنی ہی زور سے کھینچنا ہوگا جتنی زور سے میں نے کھینچا تھا، میں اس کے بغیر نہیں مانوں گا۔"

اب میں اصل مدعا کی طرف آتا ہوں جو تشنۂ تفصیل رہ گیا تھا یعنی نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تشریح کہ "الا ان فی الجسد لمضغۃ" الخ جو تشخیصی حیثیت رکھتا ہے اور اس تشخیص کی بنیاد پر آپ کی تجویز۔

آپ کی تشخیص کا حاصل تو یہ ہے کہ معاشرہ کا بناؤ بگاڑ، صلاح و فساد اہل معاشرہ یعنی افراد کے دل کی حالت پر موقوف ہے۔ اگر دل میں بگاڑ آگیا ہے تو معاشرہ میں یہ امراض پیدا ہو جائیں گے اور افراد کا دل اگر درست ہے تو ان افراد کی ترکیب سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا اس کی حالت بھی درست ہوگی، گویا سوسائٹی کے ان امراض کو دیکھتے ہی افراد کے دل کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، اگر دل کی حالت بدل گئی تو بہت آسانی سے ان برائیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے ورنہ تو پوری عمر اسی میں صرف ہو جائے گی اور امراض کا استیصال پھر بھی نہ ہو پائے گا، آج ایک پھوڑا اچھا ہوگا تو کل دوسرا پھوڑا دوسری جگہ نکل آئے گا، غرض جب تک دل میں بیماری فساد موجود ہے وہ روز نت نئے راستوں سے باہر آتا رہے گا، سبب سے تعرض کئے بغیر نتیجہ کے ظہور کو کوئی پیش بندی نہیں روک سکتی، کسی تیز دریا پر بند باندھ کر اس کا راستہ روکا نہیں جا سکتا، تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر افراد انسانی کے

قلوب کی اصلاح کیلئے آپ نے دو بنیادی چیزیں پیش فرمائیں، ایک ایمان باللہ۔ دوسرے ایمان بالیوم الآخر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس بیّن حقیقت پر ایمان لائے کہ میرا اور ساری کائنات کا خالق ایک اللہ ہے، اسی طرح اس حقیقت کا بھی یقین کرے کہ اس سب کا حقیقی مالک اور حاکم بھی وہی ہے، ہر وقت ہر چیز پر اس کی نظر ہے نہ اسے دھوکہ دیا جا سکتا ہے نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے، وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے، غرض ساری اعلیٰ صفات اس میں پائی جاتی ہیں، کائنات کا وجود اور بقا پھر اس میں یہ ہمہ گیر نظم و ضبط عقلی طور پر بھی تقاضہ کرتے ہیں، ایک ایسی ذات اور اس کی ان صفات کا۔

اسی طرح یقین کرے کہ موت سے کتاب زندگی بند نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ عمل کا باب ختم ہو کر جزا و سزا کا باب شروع ہوتا ہے، وہاں اس زندگی کا کیا دھرا سامنے آئے گا، باز پرس ہوگی اور حسب استحقاق بہترین انعام یا بدترین عذاب دیا جائے گا، یہی عقل اور انصاف کا تقاضہ بھی ہے، لیکن عقل اگر اس زندگی کا پورا ادراک نہیں کر سکتی تو کیا بات ہے، یہ عقل کا قصور ہے نہ کہ ایک حقیقت کے بطلان کا ثبوت، خصوصاً جبکہ عقل کی شکست و درماندگی اب کوئی چھپی ہوئی بات نہیں رہ گئی ہے، اور بڑے بڑے فلاسفہ و عقلا اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ (العقل لیس کل شیئ) عقل ہی سب کچھ نہیں ہے کہ ہر بات کا فیصلہ کر سکے۔ عقل میدان چھوڑ چکی اب اس خالی میدان میں، ایک شخص کہتا ہے کہ میں اللہ کا فرستادہ ہوں اور اس نے مجھے خبر دی ہے کہ دوسری زندگی ضرور آئی گی اور اس کی تفصیلات یہ ہیں۔ آپ تردید کس بنیاد پر کر سکتے ہیں جبکہ اس کو غیر ممکن بتانے کیلئے عقل کے پاس دلائل نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اس شخص کی تردید یا تائید کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس شخص کی پوری زندگی کو سچائی کی کسوٹی پر کسا جائے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے پرکھنے کا یہ عمل مسلسل ہو رہا ہے، لیکن نتیجہ برابر ایک ہی رہا کہ صرف سچائی نہیں بلکہ ہر پہلو سے اس کی سیرت عام انسانی سطح سے بہت بلند ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی سیرتوں

کے پیمانے اسے ناپنے کیلئے بیکار رہے، یہ سیرت کسی اور ہی پیمانے کی ہے، یہ سیرت اگر کہیں اور بھی پائی جاتی ہے تو صرف انھیں انسانوں میں جن کو انسانیت محضہ کے علاوہ نبوت یا رسالت کا منصب عطا ہوا ہے (ان افراد کی تصدیق خود یہ شخص کر رہا ہے جس کو ہم اللہ کے آخری پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔

عقل نے خود کو عاجز پا کر سیرت سے شہادت طلب کی، بیان کے ہر ہر فقرہ سے ٹپک رہا ہے "حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم" لیکن وہ خود اپنے متعلق صفائی سے پکار رہا ہے نہیں! ہرگز نہیں!! میں پیکر نوری نہیں، تمھاری ہی طرح جسد خاکی ہوں، ہاں بس افضلیت اتنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنی رسالت کیلئے منتخب کیا ہے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ	اسکے سوا کچھ نہیں کہ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں
إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ	وحی کی گئی ہو میری طرف کہ تمہارا معبود مالک
رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ	ایک اللہ ہو، پس جو امید رکھے اپنے اس رب سے
بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا	ملنے کی تو عمل کرے اچھے، اور شریک کرے اپنے رب کیساتھ کسی کو۔

ممکن ہے کہ ضمنی بات کی طوالت نے اصلی بات بھلا دی ہو، اس لئے پھر اجمالی اعادہ کرتا ہوں۔ اللہ کے پیغمبر نے اللہ کی جانب سے ان امراض کے ازالہ کیلئے یہ چند یقین پیش کئے ہیں، اللہ کی ذات کا یقین، اس کی صفات کا یقین، موت کے بعد جزاء سزا والی زندگی کا یقین۔

دنیا انصاف سے کہے، کیا جس معاشرہ کے افراد کے دل ان چند یقینوں سے لبریز ہونگے وہاں یہ امراض پنپ سکیں گے، جو آج عام ہیں؟ یہ برائیاں باقی رہ سکیں گی جو آج غالب ہیں؟ — گویا یہ مادۂ فاسد کے مقابلے میں صالح مواد ہے، خراب خون کے مقابلے میں اچھا خون ہے، خارجی صحت مندی جس کے تابع ہوتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ یقین زندہ اور طاقتور ہوں، جن میں بری خواہشات کے آڑے آنے کی طاقت ہو جو مادۂ فاسد کے عمل کو روک سکیں، اچھے خون کے یہ قطرے اگرچہ چند ہیں مگر

کافی ہیں بشرطیکہ گرم ہوں، اگر گرمی کی جگہ سردی ہے تو پھر اس مقصد کیلئے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ـــــــــ مسلمانوں میں ہیں مگر سرد ـــــــــ

اللہ کے رسولؐ نے عبادات کا نظام اس آگ کو ہوا دیتے رہنے ہی کیلئے پیش کیا ہے لیکن یہ عبادات اگر صرف رسوم بن کر رہ جاتی ہیں تو اس مقصد کے لیے مفید نہیں ہیں مسلمانوں کی عبادات کا آج یہی حال ہے اور ان کی بے اثری کا یہی راز ہے۔

ہاں اس اندرونی اصلاح کی طرف اصلاً اور اولاً توجہ دینے کیساتھ ساتھ خارجی علاج کا بھی پورا اہتمام کیا جائے۔ یعنی غریبوں کی بھوک اور افلاس کے ازالہ کی کوشش کی جائے۔ مالداروں کے اموال کو خزانوں کی شکل نہ اختیار کرنے دی جائے، فضول خرچی کے مواقع ختم کئے جائیں، مثلاً جوا، شراب، سینما، اور تعیش کے وسائل، کہ یہ چیزیں بہت سی برائیوں کیلئے ترغیبات بنتی ہیں، جیسے رشوت اور بددیانتی وغیرہ۔ بے حیائی اور بداخلاقی کی ترغیبات دور کی جائیں مثلاً بے پردگی غیر مردوں عورتوں اور لڑکوں لڑکیوں کا اختلاط، ورنہ ان مذکورہ اور ان جیسی بہت سی غیر مذکورہ بد پرہیزیوں کی موجودگی میں مکمل اصلاح کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

حاصل مدعا یہ ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ طبیبؐ انسانیت کے اس نسخہ کو اس کی پوری ہدایات کی رعایات کرکے استعمال کرے تو صحت کامل میں کوئی شبہ نہیں، اطمینان کے لئے پہلا تجربہ موجود ہے، ورنہ صرف ظاہری لیپ پوت اور خارجی مرہم پٹی پر اعتماد اور اس غلط طریقۂ علاج کے ماتحت روز نئے نئے تجربات کی مشقِ ستم اس مریض کو وہیں پہونچا کے رہے گی جو اس غلط اندیشی کی آخری منزل ہے۔

فانتظروا انّا معکم منتظرون

اسلام — ایک مقصد

(جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

(مسلمانوں کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر)

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیونکہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جا رہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سُن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظریہ کسی کے دماغ میں پہنچ جائے تو صرف اس بنا پر اس کو بامقصد انسان نہیں کہا جا سکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو۔ جس کی زندگی اس کے مقصد میں اس طرح ڈھل جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک مسجد میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں۔ اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتے اڑ کر آئیں اور ان میناروں پر اٹک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو۔ محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیز پر آم سے مشابہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتفاق سے جمع ہو جانا، اس کو ہرگز آم نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب آپ

سر سے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظریات کا کہیں سے آکر آپ کے ذہن میں اٹک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اسی وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو درجنوں پیرایہ سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں اس کی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کروں گا۔

۱۔ بامقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہو جائیں۔ آپ کا سوچنا آپ کا محبت کرنا، آپ کا نفرت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہوں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جوتا بنانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا ہو گا۔ کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھراتے ہیں جس سے تمام بکھری ہوئی کیلیں کھنچ کھنچ کر اس سے چمٹ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ اٹھا کر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس کی جگہ آپ اپنے مقصد کو رکھیں اور کیلوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کر کے اکٹھا ہو جاتے ہیں اور آس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آکر چمٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد کے گرد اس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہو جانا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے یہاں آئے۔ ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جا کر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لیے بڑی نصیحت ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک جگہ پہنچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی اپنی دوکان لیے بیٹھے تھے۔ جب میں ان کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔

جس موچی کی نظر اٹھتی ہے وہ بس میرے جوتے پر آکر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گم ہیں۔ ان کو انسان صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بھرے ہوئے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آنے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہنے ہوئے ہیں جس کی پالش کر کے یا جس کی مرمت کر کے وہ کچھ پیسے حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح بامقصد آدمی اپنے مقصد میں گم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو بہت فعال آدمی ہیں جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پائجامہ میں ایک جگہ بہت سے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھ کر کہا، مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انھوں نے پائجامہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلق خبر نہیں ہوئی۔ جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اسے محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بامقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو بامقصد آدمیوں کی فہرست میں لکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ بامقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گزارتا ہو۔ "مقصد کے مطابق عمل" سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ

سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں۔ وہ کوئی سند یافتہ طبیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ ان کے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھودنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے، وہ شاید کوئی شیروانی پوش آدمی ہوں گے اور اپنی شیروانی کی عزت رکھنے کے لیے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے۔ مگر ان کو "شیروانی" اور "پتلون" کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سخت کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا، انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی نبض میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لیے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہیں، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو اپنائے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی کو اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا ہونے نہ دے۔ بامقصد آدمی ایک باشعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقۃً ایک مقصد اترا ہوا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا بن کر نہ رہ سکے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہیے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقہ سے ایک سادہ زندگی گزار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ اس کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق جو زندگی چل رہی ہے، اس

میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لیے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیار زندگی اس کے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا۔ بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہوگیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اجڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی غنیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے وقتی حادثے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ سنبھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ سنبھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیے اور سسرال سے اس کے لیے جو کپڑے وغیرہ آئے، اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکایک بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کے ساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر میں اتری ان چیزوں کے نتیجہ میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکایک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائگی اور دوسری طرف بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جس کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی اس کا گھر دیکھتے دیکھتے دین دار گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہوگیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دنیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انھیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پہنچا دیتا ہے۔ جو شخص کسی مقصد کے لیے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ باشعور زندگی گزارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خودکشی کرلی ہو۔ دنیا کی نمائشی چیزوں میں دلچسپی مادی سازوسامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لٹریچر کا مطالعہ ــــ یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کردیتی ہیں، اس کے

وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات و احساسات کو مقصد کے بارے میں کمزور کر کے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں، اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھنچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے لازم ہے کہ اپنی عملی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیے جو اپنی انگلیوں تک کی اس حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں پھر ایک مسلمان کا مقصد تو اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لیے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

۳۔ تیسری چیز با مقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی روح موجود ہو۔ یہاں "عمل" سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ بہ ظاہر آدمی مقصد کا سا عمل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجیے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فرقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصلاً ایک مقصدی گروہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جامد قسم کی روایتی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لیے کام کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے۔ اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں اور کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے

زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی پڑی ہوئی ایک لکیر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دنیا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقتاً انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے دورے اور تقریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تابی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی پبلسٹی برانچ کا افسر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے حلقہ کی مانگ پوری کردی جائے۔

وہ عمل جو حقیقتہً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کیا جاتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو انڈیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک لگی بندھی کارروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بیتاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصدنما اجزا اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح اِدھر اُدھر اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔

یہ خطرہ ہر اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لے کر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گزر جائیں۔ لیکن یاد رکھیے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقتہً وہ مشنری اسپرٹ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی گاڑی اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کارروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رسم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ شکلاً وہ ایک بامقصد گروہ کی مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

وہ بامقصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ بامقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان کی طرح نظر آتی ہے۔ مگر حقیقۃً انسان نہیں ہوتی۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کروں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں تو بعض لوگ جواب دیتے ہیں ——" آپ کی باتیں توسب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیز کیسے پیدا ہو" یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً اس کے ذریعے سے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹا کر اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچیے کہ وہ خارج جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں، وہ کون ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک، خدا ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس لیے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم وہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو حاصل نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا اس سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی تخلیق پر اس قسم کا الزام عائد ہوسکے۔ اس لیے جب خارج پر الزام ڈالا نہیں جاسکتا تو لامحالہ وہ آپ کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اپنی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہیے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہم ایسے بن سکیں۔

اس لیے ہر خرابی کا سبب اپنے اندر ڈھونڈیے۔ کیونکہ آپ کے باہر درحقیقت کوئی چیز ہی نہیں ہے جہاں یہ اسباب پائے جارہے ہوں۔

*

ساعتے با اولیا

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری پانچویں صدی ہجری کے اولیا ، امت میں سے ہیں انھوں نے اپنا یہ عجیب و غریب واقعہ خود ہی بیان فرمایا ہے جس کو یوسف بن خلیل حافظ نے اپنے معجم میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور انھیں کے حوالے سے ابن رجب نے طبقات حنابلہ میں بھی اس کو ذکر کیا ہے ـــــ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک زمانے میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا اور فقر و تہی دستی کی وجہ سے فاقوں پر فاقے آتے تھے، ایک دن جب میں بھوک سے بہت ہی بیتاب تھا اور بھوک کی تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا مجھے ریشم کی ایک تھیلی پڑی ملی جو ریشمی دھاگے ہی سے بندھی ہوئی تھی، میں نے اس کو اٹھا لیا اور اپنے گھر لے آیا، کھول کے دیکھا تو اس میں ایسے نفیس اور بیش قیمت موتیوں کا ایک ہار تھا جو میری چشم تصور نے بھی کبھی نہیں دیکھے تھے، میں اس کو گھر میں رکھ کے باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک صاحبِ وجاہت بزرگ اپنے گم شدہ ہار کے بارے میں اعلان کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ میں رومال میں بندھی پانچ سو اشرفیاں ہیں اور وہ پکار کے کہہ رہے ہیں، کہ یہ اشرفیاں میں اللہ کے اس بندہ کی خدمت میں پیش کروں گا جو میرا ہار کہیں سے پا کے مجھ تک پہنچا دے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے سوچا کہ غالباً وہ ہار انہی بزرگ کا ہے، میں ان کو دے دوں اور چونکہ میں اس وقت بہت بھوکا اور سخت حاجت مند ہوں اس لیے یہ رقم ان سے لے لوں اور اپنی ضرورتیں اس سے پوری کروں، چناں چہ میں نے ان سے کہا آپ ذرا میرے ساتھ آئیے! وہ میرے ساتھ میرے گھر آئے، پھر میرے دریافت کرنے پر انھوں نے اپنی گم شدہ تھیلی اور اس کے تسمہ کی خاص علامات بتائیں اور بتلایا کہ ہار میں کتنے موتی ہیں اور

ان موتیوں میں کیا خاص نشانات ہیں اور دھاگہ کی کیا خاص پہچان ہے۔ انھوں نے جو کچھ بتایا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تھیلی انہی کی ہے تو میں نے نکال کے ان کی خدمت میں پیش کر دی انھوں نے اپنے اعلان کے مطابق پانچ سو اشرفیاں مجھے دینی چاہیں لیکن اب میرے دل نے کہا کہ ان کا لینا ٹھیک نہیں، چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ آپ کی چیز اور آپ کی امانت تھی میرا فرض تھا کہ میں آپ کو پہنچاؤں، اللہ تعالیٰ نے اس فرض کی ادائیگی میرے لیے آسان فرما دی، میں اس کا کوئی معاوضہ اور بدلا نہیں لے سکتا، انھوں نے اصرار کیا اور سخت اصرار کیا لیکن میرا ضمیر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا، اور اپنی سخت بھوک اور حاجت مندی کے باوجود میں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ آگے اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھئے!

ایک مدت کے بعد میں مکہ معظمہ سے چلا اور ایک کشتی پر سوار ہوا جس پر اور بھی بہت سے مسافر تھے، اللہ کی شان کشتی بیچ سمندر میں ٹوٹ گئی اور اس کے سارے مسافر ایک ایک کر کے سمندر میں ڈوب کے ختم ہو گئے مجھے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا اور کشتی کے ایک ٹکڑے پر میں کسی طرح بیٹھا رہا، سمندر کی موجیں کشتی کے اس ٹکڑے یا تختے کو چلاتی اور بڑھاتی رہیں ایک مدت تک میں سمندر میں اس تختہ پر رہا اور مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں یہاں تک کہ کشتی کے اس تختہ نے مجھے ایک جزیرے میں پہنچا دیا، اس جزیرے میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور مسجدیں تھیں میں ایک مسجد میں جا کے بیٹھ گیا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگا، وہاں کے لوگوں نے جب مجھے قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا اور اس کا چرچا ہوا تو جزیرے کے باشندے ایک ایک کر کے میرے پاس آئے اور سب نے مجھ سے استدعا کی کہ ہم کو بھی قرآن سکھا دو، میں ان کو قرآن مجید پڑھانے اور سکھانے لگا، اہل جزیرہ نے میرا بڑا اکرام کیا اور طرح طرح کے ہدایا اور عطایا مجھے دیے۔

ایک دن اسی مسجد میں مجھے نہایت خوشخط لکھے ہوئے قرآن مجید کے کچھ اوراق ملے، وہاں کے لوگوں نے میرے پاس جب وہ اوراق دیکھے تو انھوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لکھنا بھی بہت اچھا جانتے، میں نے کہا کہ ہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ چیز بھی نصیب فرمائی ہے اور میں خطاط بھی ہوں، ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہم کو لکھنا بھی سکھا دیجئے، چنانچہ سارے جوان اور نوعمر بچے خطاطی سیکھنے کے لیے میرے پاس آنے لگے اور میرا اور زیادہ اکرام ہونے لگا اور ہدایا

اور تحائف سے انھوں نے مجھے مالا مال کر دیا کچھ دنوں کے بعد وہاں کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے ہاں ایک بڑے معزز اور باثروت گھرانے کی ایک یتیم لڑکی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا نکاح آپ سے ہو جائے میں نے ابتدأً عذر کیا لیکن انھوں نے ازراہِ اکرام و محبت اصرار کیا یہاں تک کہ میں آمادہ ہو گیا اور بالآخر نکاح ہو گیا، جب نکاح کے بعد وہ لڑکی میرے پاس پہنچائی گئی تو میری نگاہ اس کے گلے کی طرف گئی، میں نے دیکھا کہ اس کے گلے میں نہایت بیش قیمت موتیوں کا گویا بعینہ وہی ہار ہے جو مکہ معظمہ میں مجھے پڑا ہوا ملا تھا اور میں نے وہ اس کے مالک کے حوالہ کر دیا تھا، میں حیرت اور تعجب اور غور کے ساتھ اس ہار کو دیکھنے لگا، میری یہ حرکت بڑی نامناسب سمجھی گئی کہ نئی بیوی کو دیکھنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے میں اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار کو دیکھ رہا ہوں، آخر میں نے بتایا کہ میں ہار کو اس لیے دیکھ رہا ہوں کہ بالکل ایسا ہی بلکہ گویا یہی ہار میں نے مکہ معظمہ میں پایا تھا اور پھر اس طرح اس کے مالک کو پہنچا دیا تھا پھر میں نے مکہ معظمہ کا وہ پورا قصہ بیان کیا۔ لوگوں نے جب وہ قصہ مجھ سے سنا تو سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر ان کی زبانوں پر جاری ہو گیا اور ایک شور مچ گیا اور پھر ان لوگوں نے بتایا کہ بیشک یہ وہی ہار ہے جو مکہ معظمہ میں گم ہو گیا تھا اور تم نے پایا تھا، اور وہ صاحبِ وجاہت بزرگ جن کو تم نے وہ ہار واپس کیا تھا اس لڑکی کے والد تھے جو ہمارے جزیرے کے بڑے صالح بزرگ تھے ان کا اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے انتقال ہوا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے دنیا میں بس ایک ہی سچا مسلمان مرد دیکھا ہے جس نے مکہ معظمہ میں میرا ہار پا کر مجھے واپس کیا تھا اور میں اصرار سے اس کو پانچ سو اشرفیاں دینا چاہتا تھا مگر وہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ بزرگ برابر یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ کسی طرح اپنے اس بندے کو میرے پاس پہنچا دے اور ایسی صورت پیدا فرما دے کہ میں اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دوں ــــ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس صالح بندے کی دعا کس طرح قبول فرمائی۔

سنہ آغاز ۱۹۳۳ء

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان سے .... -/6	ماہنامۂ الفرقان لکھنؤ	اعزازی خریداروں سے
پاکستان سے .... -/7		پندرہ روپے
ششماہی		غیر ممالک سے ...... 12 شلنگ
ہندستان سے 3/50		ہوائی ڈاک سے
پاکستان سے ...... -/4		ایک پونڈ

جلد (32) بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۴ھ مطابق جولائی ۱۹۶۴ء شمارہ (2)

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ر جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولیں

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

آج پورے پانچ ماہ کے بعد قلم ہاتھ میں لینے کی نوبت آرہی ہے۔ محض خدا کا کرم ہے کہ کھوئی ہوئی قوتیں جسم میں واپس آگئیں۔ اور اُن کی واپسی و بحالی کے لیے جس قدر عرصہ بھی آرام اور کام سے اجتناب کی ضرورت محسوس ہوئی اس کا بھی موقع خدا کے کرم سے بلا کسی پریشانی کے نصیب ہوا، ورنہ کتنے انسان ہیں جو صحت کی ایسی افتادوں میں بھی آرام کی سانس نہیں لے پاتے اور یا طرح طرح کی پریشانیاں اُن کے آرام کو بھی بے آرامی کی ایک دوسری شکل بنا ڈالتی ہیں خدا کا شکر ہے کہ اس پانچ ماہ کے اچھے خاصے طویل عرصہ میں کوئی ایک وقت بھی ایسا گزرنا یاد نہیں آتا۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰاہُ۔

اس پانچ ماہ کے عرصۂ علالت و تعطل کا یہ وہ رُخ ہے جس پر جتنا بھی جذبۂ شکر دل میں ابھرے کم ہو لیکن انہی پانچ مہینوں کے درمیان میں بیک وقت ہندوستان کے دو تین صوبوں کے مسلمانوں پر آگ اور خون اور ہلاکت و بربادی کی وہ قیامتیں ٹوٹ گئیں جن کی کوئی نظیر ۱۹۴۷ء سے ادھر نہیں ملتی۔ یہ اندوہناک واقعات جب غیروں کے دلوں کو تڑپائے بغیر نہ رہ سکے تو ملت کا کوئی بڑا ہی محروم الاحساس فرد ایسا ہو سکتا تھا جس کے دل و جگر میں ان ملی جراحتوں کی کوئی سوزش اور اُن پر پیچ و تاب کا کوئی طوفان نہ برپا رہا ہو، مگر اپنا منفرد غم اسی کے ساتھ یہ بھی رہا کہ ایسے مواقع پر اور کچھ نہیں تو قلم ہی سے اپنا حصہ ادا کرنے کے جو وسائل میسر ہیں اُن کے بھی استعمال میں ایک مجبوری اور بے بسی حائل، اور دل و دماغ میں اس قومی المیہ کی تفصیلات سن سن کر اور پڑھ پڑھ کر جو کچھ آتا وہ اس مجبوری کے ہاتھوں وہیں کا وہیں دفن ہوتا چلا جاتا ——— مگر اللہ کی مصلحتوں کو کون جانتا ہے، شاید اس میں بھی کوئی خیر رہا ہو!

مسلمانوں کی موت وحیات کے اس مسئلہ پر کس نظر سے غور کرنا چاہیے؟ اس کے لیے بہت ہی بروقت روشنی ہمیں اپنے محترم ومحبوب بزرگ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے اس خطبہ سے ملتی ہے جو اسی گزشتہ جون میں آپ نے دینی تعلیمی کونسل کی ریاستی کانفرنس (الٰہ آباد) کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ نے انسان کے عام تعلیمی مسئلے سے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ

"تعلیم کا نشیمن جس شاخ پر قائم ہو اور ہمیشہ جس شاخ پر قائم رہے گا وہ انسانی زندگی کا تحفظ اور امن وامان کی فضا ہو اس لیے نشیمن کی تعمیر و تزئین کے منصوبوں اور اسکی ترتیب وتنظیم کی تجویزوں سے پہلے اس شاخ کی حفاظت ضروری ہے۔"

اور پھر خاص مسلمانوں کی تعلیم کی طرف رخ موڑتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

"کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا کے واقعات نے اس شاخ ہی کو خطرہ میں ڈال دیا ہو جس پر یہ نشیمن تعمیر ہوگا اور ہمارے پورے تعلیمی فکر و فلسفہ کو متزلزل کر دیا ہے۔"

اس خطبہ کا تعلق صرف تعلیم (دینی تعلیم) کے موضوع سے تھا، ورنہ ایک تعلیم ہی کیا، تہذیب ہو یا تمدن، مذہب ہو یا عقیدہ، معاش ہو یا روزگار، امارت وثروت ہو یا سیاست واقتدار کا حصہ سب کے بارے میں یہی بات حق ہو کہ ان کے وجود اور بقاء وترقی کا انحصار انسان کی زندگی پر ہو۔ آج اگر مسلمان کی زندگی کا بھروسہ اس کے اس ملک میں نہیں اور اس کی منظم نسل کشی کے سیلاب اسی رفتار سے اسے موت کے گھاٹ اتارتے رہے تو مسلمانوں کی دینی و مذہبی اصلاح کی جدوجہد کے پھول کس شاخ پر کل کو کھلیں گے؟ اسلامی تہذیب وتمدن کے گیسوؤں کی آرائش کے لیے شانہ کی جستجو کہاں کی جائے گی؟ معاشی بحالی وخوشحالی کی تدبیروں سے فائدہ کون اٹھائے گا؟ کون رہ جائے گا جسے دولت وثروت کے ذخیرے کام دیں گے؟ اور کون ہوگا جس کے نام سے لوگ سیاسی عہدوں میں حصہ پائیں گے؟ اسلئے بات دو اور دو چار کی طرح سیدھی اور صاف ہو کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے مقدم مسئلہ ان کی نسل کشی اور تباہی کی ان لہروں کا انسداد اور ان کی زندگی کے لیے حفاظت اور امن وامان کا اطمینان ہے۔ اور سارے مسائل کی فکر بھی ضروری ہے اور جاری رہنی چاہیے۔ مگر موت وحیات کے اس مسئلہ کو سب سے آگے رکھ کر اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی کو ان سارے ہی کاموں کا تقاضہ سمجھ کر!

اس مسئلے سے نپٹنے کی ذمہ داری یوں تو ملّت کے ہر فرد پر اپنی حیثیت اور استطاعت کے بقدر عائد ہوتی ہے مگر پیشقدمی اور آگے چلنے کی ذمہ داری اُن منظم جماعتوں کی ہے جنھوں نے اپنے دائرۂ کار میں اس مسئلہ کو بھی رکھا ہے اور اس کی پکار پر وہ میدان عمل میں آتی ہیں، یہ جماعتیں جس حد تک میدان عمل میں آتی ہیں اس کی ضرورت اور قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کا تعلق مسئلہ کے حل سے ہے ہی نہیں، اس مسئلہ کے حل کا تو دُنیا بھر میں ایک ہی طریقہ ہے جس کے تجربہ کی جرأت کچھ خاص اندیشوں کی بنا پر نہیں کی جاتی۔ بیشک ان جماعتوں میں سے بعض کے ہاتھوں اس طریقہ کا تجربہ بہت خطرناک بن سکتا ہے اس لیے کہ وہ موجودہ ہندوستان میں اس کے لیے بالکل موزوں نہیں ہیں لیکن جن جماعتوں کی پوزیشن ایسی نہیں ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کب تک ان اندیشوں کو انگیز کرنے کی جرأت نہیں کریں گی۔ ان کی بے ضرر پالیسی کے باوجود جب قوم خود ان کے احساس کے مطابق بھی روز بروز موت کی گرفت میں آتی جا رہی ہے تو پھر اس کے سوا چارۂ کار کیا ہے کہ کچھ پرخطر راستوں پر ہی قسمت آزمائی کی جائے؟ ان راستوں پر اگر ہلاکت کے سوا کوئی دوسرا امکان ان جماعتوں کی نظر میں نہیں تو ٹھیک ہے کہ قوم کو کھلے میدان کی بارش سے ہٹا کر پرنالے کے نیچے کیوں کھڑا کیا جائے۔ لیکن اگر نجات کا کوئی بھی امکان ان راہوں پر انھیں تسلیم ہے تو پھر یہ قیادت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں کہ اس امکان پر قسمت آزمائی کے لیے وہ کسی بھی درجہ کی قابل عمل راہ نہ پیدا کر سکیں! ذہن صاف ہو تو ہلکے ہلکے تجربات سے راہ دریافت کی جا سکتی ہے اور اسی کا نام قیادت کی اہلیت ہے۔

دو حرف خریداران الفرقان سے

الفرقان کی پابندیٔ وقت کے ساتھ اشاعت کے نظام میں تھوڑا بہت خلل تو راقم الحروف کی ان ذمہ داریوں کے باعث کافی دن سے چل رہا تھا جو ہفت روزہ ندائے ملت کی ادارت کیلئے کوئی دوسرا انتظام نہ ہو سکنے کے بموجب اپنے سر لے لی گئی تھیں مگر ادھر پانچ چھینے کے عرصہ میں قدرتی طور سے اس صورت حال میں مزید اضافہ ہوا، اس سے خریداروں کو جو ذہنی کوفت ہوتی رہی ہوگی اسکے باوجود امید ہے کہ وہ ایک معقول عذر کی بنا پر اسکے بابت میں کوئی شکایت نہ رکھتے ہوں گے۔

آئندہ کے بارے میں یوں تو خدا بہتر جانتا ہے مگر بظاہر ایسی کوئی وجہ نہیں کہ اشاعت کی یہ بےنظمی برقرار رہے۔ علالت کی مجبوری بھی خدا کے فضل سے نہیں رہی ہے۔ اور ادھر ندائے ملت کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کا بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے پوری امید ہے کہ اب الفرقان پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔

معارف الحدیث

مسلسل

حجۃ الوداع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخصتی حج :-

اس بارہ میں علماء کے اختلاف رائے کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حج کی فرضیت کا حکم کس سنہ میں آیا، اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ راجح قول یہ ہے کہ ۸ھ میں مکہ معظمہ پر اسلامی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد سنہ ۹ھ میں حج کی فرضیت کا حکم آیا، اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو حج نہیں فرمایا لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور ان کی امارت میں اس سال حج ادا ہوا اور آئندہ کے لیے چند اہم اعلانات کیے گئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آئندہ کوئی مشرک اور کافر حج میں شرکت نہیں کر سکے گا اور جاہلیت کے گندے اور مشرکانہ طور طریقوں کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی ——— غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سال خود حج نہ کرنے کی خاص حکمت یہ بھی تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ آپ کا حج ایسا مثالی حج ہو جس میں کوئی ایک آدمی بھی کفر و شرک اور جاہلیت کے طور طریقوں سے حج کو مکدّر کرنے والا نہ ہو، بلکہ از اول تا آخر بس نور ہی نور اور خیر ہی خیر ہو اور آپ کی دعوت و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے نتائج کا صحیح آئینہ ہو ——— اس طرح گویا سنہ ۹ھ کا یہ حج جو صدیق اکبر کی امارت میں ادا ہوا اگلے سال ہونے والے آپ کے حج کا پیش خیمہ اور اس کی تیاری کے سلسلے ہی کا ایک قدم تھا۔

پھر اگلے سال سنہ ۱۰ھ میں جو آپ کی حیاتِ مبارکہ کا آخری سال ہے آپ نے حج کا

ارادہ فرمایا۔ اور چونکہ آپ کو یہ اشارہ مل چکا تھا کہ اب دُنیا میں آپ کے قیام اور کام کا وقت تھوڑا ہی باقی رہ گیا ہے اس لیے آپ نے اپنے اس ارادۂ حج کی خاص اہتمام سے اطلاع اور تشہیر کرائی تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس مبارک سفر میں آپ کے ساتھ رہ کر مناسکِ حج اور دین کے دوسرے مسائل و احکام سیکھ سکیں اور سفرِ حج کی صحبت و رفاقت کی خاص برکات حاصل کر سکیں۔ چنانچہ دور و قریب کے ہزارہا ہزار مسلمان جن کو اس کی اطلاع ہوئی اور ان کو کوئی خاص مجبوری نہیں تھی مدینہ طیبہ آ گئے، ۲۴ ذی قعدہ کو جمعہ تھا اُس دن آپ نے خطبہ میں حج اور سفرِ حج کے متعلق خصوصیت سے ہدایتیں دیں اور اگلے دن ۲۵ ذیقعدہ ؁۱۰ھ بروز شنبہ بعد نماز ظہر مدینہ طیبہ سے یہ عظیم الشان قافلہ روانہ ہوا اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ جا کر پڑھی۔ جہاں آپ کو پہلی منزل کرنی تھی، اور یہیں سے احرام باندھنا تھا، رات بھی وہیں گزاری اور اگلے دن یکشنبہ کو ظہر کی نماز کے بعد آپ نے اور آپ کے صحابۂ کرام نے احرام باندھا اور مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے اور نویں دن ۴ ذی الحجہ کو مکۂ معظمہ میں داخل ہوئے ——— رفقاءِ سفر کی تعداد میں راستہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

اس سفر میں آپ کے ساتھ حج کرنے والوں کی تعداد کے بارے میں روایات میں بہت اختلاف ہے۔ چالیس ہزار سے لے کر ایک لاکھ بیس ہزار اور ایک لاکھ تیس ہزار تک کے بیانات روایتوں میں موجود ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ بڑے مجمعوں اور میلوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کے بارہ میں لوگوں کے اندازے آج بھی مختلف ہوتے ہیں جس نے جو عدد بتایا ہے اپنے اندازے کے مطابق بتایا ہے، باقاعدہ حساب لگا کے اور شمار کر کے کسی نے بھی نہیں بتایا ہے۔ تاہم اتنی بات بطور قدر مشترک کے تمام ہی روایات میں ہے کہ مجمع بے حد و حساب تھا، جدھر نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر پڑتے تھے۔

اس حج میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر خطبے دیئے اور بالکل اس انداز سے بلکہ صاف صاف یہ آگاہی دے کے یہ خطبے دیئے کہ اب میرا وقت موعود قریب ہے اور تمھیں دین کی تعلیم و تربیت مجھ سے حاصل کرنے کا موقع اس کے بعد نہیں مل سکے گا،

بہرحال اس پورے سفر میں آپ نے تعلیم و تلقین اور ہدایت و ارشاد کا خاص اہتمام فرمایا۔ ـــــ حجۃ الوداع کے سلسلے میں جو روایات کتب حدیث میں ہیں (جن میں سے چند یہاں بھی درج کی جا رہی ہیں) ان سے حج کے مناسک و احکام اور اس کا تفصیلی طریقہ معلوم ہونے کے علاوہ دین اور شریعت کے دوسرے بہت سے ابواب اور شعبوں کے بارہ میں نہایت اہم تعلیمات اور ہدایات بھی اُمت کو مل جاتی ہیں ـــــ حقیقت یہ ہے کہ قریباً ایک مہینے کے اس سفر میں دین کی تعلیم و تبلیغ اور ہدایت و ارشاد کا اتنا کام ہوا اور اتنے وسیع پیمانے پر ہوا کہ اس کے بغیر برسوں میں بھی انجام نہ پا سکتا ـــــ اسی سے بعض با توفیق اکابر اُمت نے سمجھا ہے کہ دین اور برکات دین حاصل کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ دینی سفروں کی رفاقت اور صحبت ہے۔

اس تمہید کے بعد حجۃ الوداع کے سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث صحیح مسلم سے نقل کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ حدیث بہت طویل ہے اس لیے ناظرین کی سہولت فہم کے لئے اس کے ایک ایک حصہ کا ترجمہ کر کے تشریح کی جائے گی اور ہر حصہ کے متن کا صرف ابتدائی اور آخری فقرہ نقل کیا جائے گا۔ پورا متن صحیح مسلم یا مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ فَسَأَلَ عَنِ الْقَوْمِ حَتّٰى انْتَهٰى اِلَيَّ فَقُلْتُ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ فَاَهْوٰى بِيَدِهٖ اِلٰى رَاْسِىْ فَنَزَعَ زِرِّيَ الْاَعْلٰى ثُمَّ نَزَعَ زِرِّيَ الْاَسْفَلَ ثُمَّ وَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ ثَدْيَيَّ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ شَابٌّ فَقَالَ مَرْحَبًا بِكَ يَا ابْنَ اَخِيْ سَلْ عَمَّا شِئْتَ فَسَأَلْتُهٗ وَهُوَ اَعْمٰى وَحَضَرَ وَقْتُ الصَّلٰوةِ فَقَامَ فِيْ نِسَاجَةٍ مُلْتَحِفًا بِهَا كُلَّمَا وَضَعَهَا عَلٰى مَنْكِبِهٖ رَجَعَ طَرَفَاهَا اِلَيْهِ مِنْ صِغَرِهَا وَرِدَاؤُهٗ اِلٰى جَنْبِهٖ عَلَى الْمِشْجَبِ فَصَلّٰى بِنَا فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنْ حَجَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ..... اِلٰى قَوْلِهٖ وَلَزِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَلْبِیَتَہٗ "

جعفر بن محمد (جو سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے پرپوتے ہیں اور امام جعفر صادق کے لقب سے معروف ہیں) اپنے والد ماجد محمد بن علی (معروف بہ امام باقر) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم چند ساتھی جابر بن عبداللہ کی خدمت میں پہونچے، انھوں نے ہم سے دریافت کیا کہ ہم کون کون ہیں (ہم میں سے ہر ایک نے اپنے متعلق تبلایا) یہاں تک کہ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں محمد بن علی بن حسین ہوں (وہ اس وقت بہت بوڑھے تھے اور نابینا ہو چکے تھے انھوں نے شفقت اور محبت سے) اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا پھر میرے کرتے کی اوپر والی گھنڈی کھولی اس کے بعد نیچے والی گھنڈی کھولی، پھر اپنا ہاتھ (کرتے کے اندر لے جاکر) میرے بیچ سینے پر رکھا اور میں ان دنوں بالکل نوجوان تھا[۵] اور (میرے آنے پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے) مجھ سے فرمایا "مَرْحَبًا بِكَ يَا ابْنَ أَخِي" (مرحبا اے میرے بھتیجے میرے بھائی حسین کی یادگار!!) جو کچھ تمھیں مجھ سے پوچھنا ہو بے تکلف پوچھو! (امام باقر کہتے ہیں) کہ اس اثنار میں نماز کا وقت آگیا، حضرت جابر ایک چھوٹی سی چادر لپیٹے ہوئے تھے وہ اسی میں لپیٹے ہوئے نماز کے لیے کھڑے ہوگئے اور اس کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے حالت یہ تھی کہ جب وہ اس کو اپنے مونڈھوں پر رکھتے تو اس کے کنارے اُٹھ کے اُن کی طرف آجاتے۔ حالانکہ ان کی رداء (یعنی بڑی چادر) ان کے قریب ہی لٹکن پر رکھی ہوئی تھی (مگر انھوں نے اس کو اوڑھ کے نماز پڑھنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ وہی چھوٹی سی چادر لپیٹ کر

---

[۵] محمد بن علی امام باقر رحمۃ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اگر حضرت جابر سے یہ ملاقات انھوں نے ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں بھی کی ہو تو اس وقت حضرت جابر کی عمر قریبًا نوّے سال کی ہوگی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وفات ۹۴ سال کی عمر میں ۷۴ھ میں مدینہ طیبہ میں ہوئی اور مشہور قول کے مطابق اہل مدینہ میں وہ آخری صحابی تھے جن کے انتقال کے بعد مدینہ طیبہ صحابی کے وجود سے خالی ہوگیا۔

ہمیں نماز پڑھائی) نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج (حجۃ الوداع) کی تفصیلات بتائیے ــــ انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں سے نو کی گنتی کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر نو سال تک کوئی حج نہیں کیا پھر سنہ ۱۰ھ میں آپ نے اعلان کرایا کہ اس سال آپ کا ارادہ حج کرنے کا ہے۔ یہ اطلاع پاکر لوگ بہت بڑی تعداد میں مدینہ آگئے۔ ہر ایک کی خواہش اور آرزو یہ تھی کہ اس مبارک سفر میں آپ کے ساتھ رہ کر آپ کی پوری پوری پیروی کرے اور آپ کے نقش قدم پر چلے ــــ (حضرت جابر کہتے ہیں کہ) پھر جب روانگی کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں یہ پورا قافلہ مدینہ سے روانہ ہو کر ذو الحلیفہ آیا، اور اس دن یہیں قیام کیا۔ یہاں پہونچ کر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ اسماء بنت عُمیس (جو ابوبکر صدیق کی بیوی تھیں اور وہ بھی اس قافلہ میں تھیں) ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا یعنی محمد بن ابی بکر، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرایا کہ ایسی حالت میں میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ اسی حالت میں احرام کے لیے غسل کرلیں اور اور جس طرح عورتیں ایسی حالت میں کپڑے کا لنگوٹ استعمال کرتی ہیں اسی طرح استعمال کریں اور احرام باندھ لیں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذو الحلیفہ کی مسجد میں آخری نماز (ظہر کی) پڑھی، پھر آپ اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہوئے یہاں تک کہ جب ناقہ (مسجد ذو الحلیفہ سے کچھ آگے بڑھ کر) بیداء پر پہونچی (جو ذو الحلیفہ کے قریب ہی ذرا بلند اور ہموار میدان سا تھا) تو میں نے اس بلندی سے ہر طرف نگاہ دوڑائی تو آگے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک سوار اور پیادے آدمی ہی آدمی نظر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان میں تھے اور آپ پر قرآن نازل ہوتا تھا اور آپ اس کی حقیقت اور اس کا صحیح مطلب و مدعا جانتے تھے (اس لیے آپ جو کچھ بھی کرتے تھے اللہ کے حکم اور اس کی وحی کے مطابق کرتے تھے) اور ہمارا رویہ یہ تھا کہ جو کچھ

آپ کو کرتے دیکھتے تھے وہی ہم بھی کرتے تھے (تو جب آپ کی ناقہ بیداء پر پہونچی)، اس وقت آپ نے بلند آواز سے توحید کا یہ تلبیہ کہا۔

"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ"

اور آپ کے رفقاء صحابہ جو تلبیہ پڑھتے تھے جس میں بعض الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا تھا انھوں نے اپنا وہی تلبیہ بلند آواز سے کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے تلبیہ کی کوئی تردید اور تغلیط نہیں کی اور خود اپنا ہی تلبیہ پڑھتے رہے۔

(مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعض صحابہ تلبیہ میں بعض تعظیمی اور تعبدی کلمات کا اضافہ کرکے پکارتے تھے، اور چونکہ اس کی اجازت اور گنجائش ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا، لیکن آپ نے اپنے تلبیہ میں کوئی کمی زیادتی نہیں فرمائی)

قَالَ جَابِرٌ لَسْنَا نَنْوِىْ اِلَّا الْحَجَّ لَسْنَا نَعْرِفُ الْعُمْرَةَ......

...... اِلٰى قَوْلِهٖ فَشَبَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصَابِعَهٗ وَاحِدَةً فِى الْاُخْرٰى وَقَالَ دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِى الْحَجِّ لَا بَلْ لِاَبَدِ اَبَدٍ۔

حضرت جابر نے (حجۃ الوداع کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے) تبلایا کہ اس سفر میں ہماری نیت (اصلاً) صرف حج کی تھی (مقصد سفر کی حیثیت سے) عمرہ ہمارے ذہن میں نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جب ہم سفر پورا کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ پر پہونچ گئے تو آپ نے سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کیا (یعنی قاعدہ کے مطابق اس پر ہاتھ رکھ کے اس کو چوما، پھر آپ نے طواف شروع کیا، جس میں تین چکروں میں آپ نے رمل کیا (یعنی وہ خاص چال چلے جس میں قوت اور شجاعت کا اظہار ہوتا ہے) اور باقی چار چکروں میں اپنی عادت کے مطابق چلے، پھر (طواف کے سات چکر پورے کرکے) آپ مقام

ابراہیم کی طرف بڑھے اور یہ آیت تلاوت فرمائی "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى" (اور مقام ابراہیم کے پاس نماز ادا کرو) پھر اس طرح کھڑے ہو کر کہ مقام ابراہیم آپ کے اور بیت اللہ کے درمیان تھا آپ نے نماز پڑھی (یعنی دوگانہ طواف ادا کیا) حدیث کے راوی امام جعفر صادق بیان کرتے ہیں کہ میرے والد ذکر کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں آپ نے قُلْ یَا اَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کی قرأت کی ___ اس کے بعد آپ پھر حجر اسود کی طرف واپس آئے اور پھر اس کا استلام کیا[ل] ، پھر ایک دروازہ سے (سعی کے لیے) صفا پہاڑی کی طرف چلے گئے اور اس کے بالکل قریب پہونچ کر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ" (بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں جن کے درمیان سعی کا حکم ہے) ___ اس کے بعد آپ نے فرمایا ___ "میں اسی صفا سے سعی شروع کرتا ہوں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے کیا ہے" چنانچہ آپ پہلے صفا پر آئے اور اس حد تک اس کی بلندی پر چڑھے کہ بیت اللہ آپ کی نظر کے سامنے آگیا اس وقت آپ قبلہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے اور اللہ کی توحید اور تکبیر و تحمید میں مصروف ہو گئے، آپ نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ ۔

(اللہ کے سوا کوئی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں، وہی تنہا معبود و مالک ہے. کوئی اس کا شریک ساجھی نہیں. ساری کائنات پر اسی کی فرمانروائی ہے. اور حمد و ستائش اسی کا حق ہے. وہ ہر چیز پر قادر ہے. وہی تنہا مالک و معبود ہے. اس نے (مکہ پر اور سارے عرب پر اقتدار بخشنے اور اپنے دین کو سربلند کرنے کا)

[ل] یہ استلام سعی کے لیے تھا، جس طرح بیت اللہ کا طواف حجر اسود کے استلام سے شروع کیا جاتا ہے اسی طرح سعی سے پہلے بھی استلام مسنون ہے ۱۲

اپنا وعدہ پورا فرما دیا، اپنے بندے کی اس نے بھرپور مدد فرمائی اور کفر و شرک کے لشکروں کو اس نے تنہا اسی نے شکست دی)

آپ نے تین دفعہ یہ کلمات فرمائے اور ان کے درمیان میں دعا مانگی۔ اس کے بعد آپ اتر کے مروہ کی طرف چلے یہانتک کہ جب آپ کے قدم وادی کے نشیب میں پہونچے تو آپ کچھ دوڑ کے چلے پھر جب آپ نشیب سے اوپر آگئے تو پھر اپنی عام رفتار کے مطابق چلے یہانتک کہ مروہ پہاڑی پر آگئے اور یہاں آپ نے بالکل وہی کیا جو صفا پر کیا تھا، یہاں تک کہ جب آپ آخری پھیرا پورا کر کے مروہ پر پہونچے آپ نے اپنے رفقا صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا ـــــ اگر پہلے سے میرے خیال میں وہ بات آجاتی جو بعد میں آئی تو میں قربانی کے جانور مدینہ سے ساتھ نہ لاتا اور اس طواف وسعی کو جو میں نے کیا ہے عمرہ بنا دیتا ـــــ تو اب میں تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ تم میں سے جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں آئے ہیں وہ اپنا احرام ختم کر دیں اور اب تک جو طواف وسعی انھوں نے کی اس کو عمرہ بنا دیں ـــــ آپ کا یہ ارشاد سن کر سراقہ بن مالک نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ حکم (کہ اشہر حج (حج کے مہینوں) میں عمرہ کیا جائے) خاص اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے یہی حکم ہے ـــــ آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا کہ "دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ" لا بل لابد ابدٍ" (عمرہ حج میں داخل ہو گیا، خاص اسی سال کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے)

تشریح) آپ نے مروہ پر سعی کے خاتمہ پر یہ جو بات فرمائی کہ "جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے ہیں وہ اپنے طواف وسعی کو عمرہ قرار دے دیں اور میں بھی اگر قربانی کے جانور ساتھ نہ لایا ہوتا تو ایسا ہی کرتا" ـــــ اس کا مطلب اور اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت میں حج اور عمرہ کے سلسلے میں جو اعتقادی اور عملی غلطیاں رواج پا کر دلوں میں راسخ ہو چکی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ شوال، ذی قعدہ

ذی الحجہ جو اَشْہُرِ حج یعنی حج کے مہینے کہلاتے ہیں (کیونکہ حج کا سفر انہی مہینوں میں ہوتا ہے) ان مہینوں میں عمرہ کرنا سخت گناہ سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور من گھڑت تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع سفر ہی میں وضاحت کے ساتھ لوگوں کو یہ بات بتا دی تھی کہ جس کا جی چاہے صرف حج کا احرام باندھے (جس کو اصطلاح میں افراد کہتے ہیں) اور جس کا جی چاہے شروع میں صرف عمرہ کا احرام باندھے اور مکہ معظمہ میں عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کے لیے دوسرا احرام باندھے (جس کو تمتع کہتے ہیں) اور جس کا جی چاہے حج وعمرہ دونوں کا مشترک احرام باندھے اور ایک ہی احرام سے دونوں کو ادا کرنے کی نیت کرے (جس کو قران کہتے ہیں) ـــــ آپ کا یہ ارشاد سننے کے بعد صحابۂ کرام میں سے غالباً چند ہی نے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے تمتع کا ارادہ رکھا اور انھوں نے ذوالحلیفہ میں صرف عمرہ کا احرام باندھا ـــــ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں ـــــ ورنہ زیادہ تر صحابہ نے صرف حج کا یا حج وعمرہ دونوں کا مشترک احرام باندھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا احرام باندھا یعنی قران اختیار فرمایا۔ اس کے علاوہ اپنی قربانی کے جانور (اونٹ) بھی آپ مدینہ طیبہ ہی سے ساتھ لے کر چلے اور جو حاجی قربانی کے جانور ساتھ لے کر چلے وہ اسوقت تک احرام ختم نہیں کر سکتا جبتک دسویں ذی الحجہ کو قربانی نہ کر دے، اسلیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ صحابۂ کرام جو آپ کی طرح اپنی قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے حج سے پہلے (یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی کرنے سے پہلے) احرام سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ لیکن جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے تھے اُن کے واسطے یہ شرعی مجبوری نہیں تھی ـــــ

مکۂ معظمہ پہونچ کر آپ کو اس کا احساس زیادہ ہوا کہ یہ جو جاہلانہ بات لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہو اسکی تردید اور بیخکنی کے لیے اور دماغوں سے اس کے جراثیم ختم کرنے اور دلوں سے اس کے اثرات کو دھونے کے لیے ضروری ہو کہ وسیع پیمانہ پر اسکے خلاف عمل کر کے دکھایا جائے اور اس کی ممکن صورت یہی تھی کہ آپ کے ساتھیوں میں سے زیادہ سے زیادہ لوگ جو آپ کے ساتھ طواف اور سعی کر چکے تھے اس طواف اور سعی کو عمرہ قرار دے کے احرام ختم کر دیں اور حلال ہو جائیں اور حج کے لیے اُس کے وقت پر دوسرا احرام

باندھیں اور خود آپ چونکہ قربانی کے جانور ساتھ لے کے آئے تھے اس لیے آپ کے لیے اسکی گنجائش نہیں تھی اس لیے آپ نے فرمایا کہ "اگر شروع میں مجھے اس بات کا احساس ہو جاتا جس کا احساس بعد میں ہوا تو میں اپنے ساتھ قربانی کے جانور نہ لاتا اور جو طواف وسعی میں نے کی ہے اس کو مستقل عمرہ قرار دے کر یہ احرام ختم کر دیتا، لیکن میں تو قربانی کے جانور ساتھ لانے کی وجہ سے ایسا کرنے سے مجبور ہوں، اسلیے آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ میں سے جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے ہیں وہ اپنے اس طواف وسعی کو مستقل عمرہ قرار دے دیں اور اپنا احرام ختم کر کے حلال ہو جائیں"۔

آپ کا یہ ارشاد سن کر سراقہ بن مالک[ؓ] کھڑے ہو گئے، چونکہ وہ اب تک یہی جانتے تھے کہ حج کے مہینوں میں مستقل عمرہ کرنا سخت گناہ کی بات ہے اس لیے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان دنوں میں مستقل عمرہ کرنے کا یہ حکم کیا صرف اسی سال کے لیے یا اب ہمیشہ کے لیے مسئلہ یہی ہے کہ اشہر حج میں مستقل عمرہ کیا جا سکتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اچھی طرح سمجھانے اور اُن کے ذہن نشین کرنے کے لیے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا "دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ" (حج میں عمرہ اس طرح داخل ہو گیا) یعنی حج کے مہینوں میں اور ایام حج کے بالکل قریب بھی عمرہ کیا جا سکتا ہے اور اس کو گناہ سمجھنے والی بات بالکل غلط اور جاہلانہ ہے۔ اور یہ حکم ہمیشہ کے لیے ہے۔

وَقَدِمَ عَلِيٌّ مِنَ الْيَمَنِ بِبُدْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ف۔ یہ وہی سراقہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت فرمانے کے بعد آپ کو معاذ اللہ گرفتار کرنے اور اس کا انعام حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک غلام کی نشاندہی پر آپ کا تعاقب کیا تھا اور آپ کے قریب پہونچ جانے پر ان کی گھوڑی کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے اور ان کی درخواست پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی تو گھوڑی صحیح سلامت نکل آئی تھی اور یہ مکہ واپس لوٹ گئے تھے۔ ۸ھ تک یہ مکہ معظمہ میں کفر و شرک ہی پر قائم رہے۔ پھر مکہ معظمہ فتح ہونے کے بعد عام اہل مکہ کی طرح انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ۱۲۔

.......إِلَىٰ قَوْلِهِ فَحَلَّ النَّاسُ كُلُّهُمْ وَقَصَّرُوا إِلَّا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ كَانَ مَعَهُ هَدْيٌ ۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (جو زکوٰۃ اور دوسرے مطالبات کی وصولی وغیرہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یمن گئے ہوئے تھے) وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے مزید جانور لے کر مکہ معظمہ پہونچے انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ احرام ختم کر کے حلال ہو چکی ہیں اور رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور سرمہ بھی استعمال کیا ہے تو انھوں نے ان کے اس رویہ کو بہت غلط سمجھا اور ناگواری کا اظہار کیا (اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت علی نے اُن سے کہا کہ تم کو کس نے یہ کہا تھا کہ تم احرام ختم کر کے حلال ہو جاؤ) حضرت فاطمہ نے کہا کہ مجھے ابا جان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ حکم دیا تھا (میں نے اس کی تعمیل میں ایسا کیا ہے) ـــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ جب تم نے حج کی نیت کی اور تلبیہ کہہ کے احرام باندھا تو اس وقت تم نے کیا کہا تھا؟ (یعنی افراد کے طریقہ پر صرف حج کی نیت کی تھی یا تمتع کے طریقہ پر صرف عمرہ کی یا قران کے طریقہ پر دونوں کی ساتھ ساتھ نیت کی تھی) انھوں نے عرض کیا کہ میں نے نیت اس طرح کی تھی کہ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أُهِلُّ بِمَا أَهَلَّ بِهٖ رَسُوْلُكَ" (اے اللہ میں احرام باندھتا ہوں اس چیز کا جس کا احرام باندھا ہو تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے) آپ نے فرمایا کہ میں چونکہ قربانی کے جانور ساتھ لایا ہوں (اور اس کی وجہ سے اب حج سے پہلے احرام ختم کرنے کی میرے لیے گنجائش نہیں ہے اور تم نے میرے جیسے احرام کی نیت کی ہے) اس لیے تم بھی میری طرح احرام ہی کی حالت میں رہو ـــــ آگے حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے جو جانور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ لے کے آئے تھے اور جو بعد میں آپ کے لیے حضرت علی یمن سے لے کر آئے ان کی مجموعی تعداد سو تھی (بعض روایات سے تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۶۳ اونٹ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے اور ۳۷ حضرت علی یمن سے لائے تھے)
حضرت جابر نے آگے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق تمام اُن صحابہ نے احرام ختم کردیا جو قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے تھے اور صفا مروہ کی سعی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے سروں کے بال ترشوا کے وہ سب حلال ہوگئے اور جو طواف وسعی انھوں نے کی تھی اس کو مستقل عمرہ قرار دے دیا۔ بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ صحابہ حالتِ احرام میں رہے جو اپنی قربانیاں ساتھ لائے تھے۔

(تشریح) جن صحابہ نے آپ کی ہدایت اور حکم کے مطابق اپنا احرام ختم کیا انھوں نے اس موقع پر بال منڈوائے نہیں بلکہ صرف ترشوائے، ایسا انھوں نے غالباً اس لیے کیا کہ منڈوانے کی فضیلت حج کے احرام کے خاتمہ پر حاصل کرسکیں۔ واللہ اعلم

(باقی)

عرب قوم پرستی کی تحریک کا آغاز و ارتقاء

اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اولین قیادت کیلئے اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم میں عربوں کو منتخب فرمایا۔ اور جس طرح بنی اسرائیل کے لیے فرمایا گیا تھا کہ "واقد اخترنا ھم علی علم علی العالمین" (اور بے شک ہم نے اپنے علم کی بنا پر اقوام عالم میں سے ان کا انتخاب کیا) اسی طرح نبی عربی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ارشاد ہوا "اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ" (اللہ جانتا ہے کہ کس کے سپرد کرے اپنی پیغامبری)

اس انتخاب کے وجوہ اور اسباب کیا تھے اور وہ کیا صفات و خصوصیات تھیں جن کی بنا پر عربوں کو یہ شرف بخشا گیا، یہ عرصہ سے محققین اور اہل نظر کا موضوع چلا آرہا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ دورِ اول کے عربوں نے اسلام کے مزاج کو سمجھنے، اس کی تعلیمات کو صحیح اور مکمل طریقہ پر اخذ کرنے، اس کے خلاف ہر چیز سے بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرنے، اسلام کی اشاعت کے لیے اپنے بے مثال جوش اور بے نظیر قربانی، اس کی روح اور اسکی نفسیات کی حفاظت میں غیر معمولی احتیاط اور امانت داری اور عقلوں کو مطمئن کرنے اور قلوب کو مسخر کرنے میں حیرت انگیز کامیابیوں سے اس انتخاب کے لیے اپنی اہلیت اور استحقاق کو پوری طرح ثابت کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے عربوں اور اسلام کے درمیان ایک غیر فانی رشتہ قائم کر دیا اور ہر ایک کے مستقبل کو دوسرے سے وابستہ فرما دیا، اب عربوں کو اسلام کے سوا کسی اور چیز سے عزت و سرفرازی حاصل نہیں ہو سکتی اور اسلام اپنی صحیح شکل و صورت اور پورے اعتدال و توازن کے ساتھ اسی وقت تک ظاہر ہوا جب تک عرب اس دعوت کے حامل اور علم بردار رہے۔

عربوں اور اسلام کے درمیان اس رشتہ کی استواری اور پائیداری کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خیال اور اہتمام تھا، آپ نے جزیرۂ عرب کو اسی مقصد سے اس کا ابدی مرکز اور پایۂ تخت بنایا اور اس بات کی پوری فکر کی کہ وہاں امن و سکون کی فضا برقرار رہے۔ اور وہ مضبوطی کے ساتھ اس راستہ پر قائم رہیں اس لیے کہ دار السلطنت اور مرکز قیادت کو ہمیشہ انتشار، بے یقینی اور کش مکش سے پاک رہنا چاہیے۔ اس کے لیے آپ نے بہت سے دور رس احکام دیئے، اپنے اصحاب کرام سے اس کے لیے عہد و پیمان لیے اور بہت سی حکیمانہ وصیتیں فرمائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وصیت یہ فرمائی تھی کہ لا یترک بجزیرۃ العرب دینان (جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں)[۱]

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم فرمایا کہ ہم مدینہ میں اسلام کے علاوہ کوئی دین باقی نہ چھوڑیں[۲] جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (لأخرجن الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب حتیٰ لا أدع الا مسلماً)[۳] (میں جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو ضرور نکالوں گا یہاں تک کہ ایک غیر مسلم کو بھی اس میں باقی نہ چھوڑوں گا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین بھی اسی اصول پر کاربند رہے

---

[۱] مسند احمد و اوسط طبرانی [۲] طبرانی [۳] صحیح مسلم و جامع ترمذی

اور جزیرۂ عرب کو اسلام کا مرکز اور دعوتِ اسلامی کا راس المال سمجھتے رہے، امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے نائب و خلیفہ کو جو وصیت کی اس میں یہ فرمایا "اوصیہ بالاعراب خیراً فانہم اصل العرب ومادۃ الاسلام"[۵] (عرب کے اہلِ بادیہ کا خیال رکھا جائے اس لیے کہ وہ اصل عرب اور اسلام کی طاقت کا سرچشمہ ہیں)

ایک طویل عرصہ تک عربوں اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے گویا دونوں نے علیحدہ نہ ہونے کی قسم کھائی تھی اور اس عہد وفا پر مضبوطی سے قائم رہے۔

اس طرح عربوں نے اسلام سے عزت و سرفرازی پائی، پوری دنیا کی قیادت حاصل کی۔ اُن کی زبان اُن کی ثقافت ایسے ایسے دور دراز اور اجنبی مقامات اور ماحول میں پہونچی جہاں اسلام اور قرآن کے بغیر اس کا پہونچنا ناممکن تھا، علماء اور اہلِ فکر نے اس کو علم دین اور تصنیف و تالیف کی زبان بنایا، اگر وہ اسلام کی سرکاری زبان اور اسلامی کتب خانہ کی کلید نہ ہوتی تو کبھی یہ ممکن نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نہ صرف باقی رہا بلکہ اس نے گریز پا ترقی کی مشکلات اور دشواریوں پر قابو حاصل کیا اور اس قدر غیر معمولی سرعت کے ساتھ پھیلا کہ دُنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ یہ سب عربوں کے جوشِ جہاد، اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں ان کی گرمجوشی اور مفتوحین کے ساتھ اُن کے حُسنِ سلوک کا نتیجہ تھا، اسلام اور عرب میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار، اس کی قوت کا راز اور اس کی عزت و آبرو کا پاسبان تھا۔

اس پرسکون فضا اور خوشگوار ماحول میں صرف دو تین واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے کسی قدر انتشار و اضطراب پیدا ہوا اور اس مبارک اتحاد کو نقصان پہونچا، ان واقعات کے پیچھے بعض اشخاص اور اغراض کی کارفرمائی تھی، ان میں سے ایک "شعوبیت" (عربوں سے نفرت اور عجمی غرور) کی مشہور تحریک تھی جس کا علم بعض عجمی علماء نے تیسری صدی ہجری میں بلند کیا، یہ وہ لوگ تھے جن کا دل اسلام پر پوری طرح مطمئن نہ تھا اور اُن کے دل میں ایران

---

[۵] صحیح البخاری کتاب المناقب باب مناقب عمر بن الخطابؓ۔

کی شہنشاہی کے زوال کا زخم تھا، اس کا دوسرا سبب بعض غیر عربی عناصر[۱] کا تکبر و قومی عصبیت اور عربوں کے منصب و کردار اور اُن کی دینی و شرعی حیثیت و مرتبہ کو مجروح کرنے کی کوشش تھی، عربی حمیت اس بے انصافی اور حق تلفی کے خلاف قدرتی طور پر اُبھر کر اس کے سامنے آئی۔ لیکن ایمان و اسلام کی محبت جو عربوں کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی اس فوری اور ہنگامی جذبہ پر غالب رہی، ہمیں تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا کہ اس عہد میں کوئی منظم تحریک یا مدوّن فلسفہ وجود میں آیا ہو جس کو "قومیت عربیہ" کا نام دیا جا سکے، عرب اسلا[م ہ]ی پر جیتے اور مرتے رہے۔ دونوں کی تاریخ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے میں پیوست رہی

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک یہ صورت حال برقرار رہی، ادھر ترکوں میں جو شام و عراق اور حجاز کے حکمراں تھے قومی غرور پیدا ہونا شروع ہوا، بہت سے ترکی حکام عرب اقوام اور عربی زبان سے اس قسم کا معاملہ کرنے لگے جو کوئی سامراجی ذہنیت کی قوم اپنی مفتوح قوم کے ساتھ کرتی ہے اور باوجود اس کے کہ حجاز اور حرمین شریفین کے لیے وہ پوری فیاضی کے ساتھ اپنی دولت کا استعمال کرتے تھے، نیز وہ دینی اور روحانی حیثیت سے عربوں کا ادب و احترام کرتے تھے، لیکن بعض ناعاقبت اندیش حکام سے تشدّد، اکھڑپن اور تکبر وغیرہ کا مظاہرہ ہوا اور رواداری، فراخ دلی، لطافتِ ذوق، آزادیٔ رائے اور عربوں کے جائز میلانات اور قدرتی رجحانات کے احترام کا مظاہرہ اُن سے نہ ہو سکا، جس کی اس تغیر پذیر اور نازک عہد میں ایک مدبر و بالغ نظر حکومت سے بجا طور پر توقع تھی، خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ عرب اسلامی دعوت کا سرچشمہ تھے، بعض کوتاہ نظر اور بے لوچ حکام نے عربی شخصیت کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی اور عربی زبان و ثقافت کے ساتھ بیگانگی کا معاملہ کیا اور عربوں کے قومی شعور کو کچلنے میں ان سے بڑی بے رحمی اور سنگدلی کا اظہار ہوا[۲]۔ ان سب چیزوں نے عربوں میں ایک انتقامی جذبہ اور عربی نخوت و عصبیت

---

[۱] ایرانی و ترک [۲] اس سلسلہ میں خاص طور پر جمال پاشا گورنر شام کا نام لیا جاتا ہے، جن کے مظالم نے ان کو جمال السفاح کا لقب عطا کیا۔

پیدا کر دی اور ایک قوم پرست مصنف کے الفاظ میں" انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے عربوں میں عرب قوم پرستی کا شعور پیدا ہونا شروع ہو گیا اور یہ عمل سب سے پہلے ملک شام میں شروع ہوا جبکہ انھوں نے غیر ملکی" ترکی" اقتدار کو ختم کرنے کا ارادہ کیا"[ا]

اس تحریک کے اولین قائد وعلم بردار بعض مسیحی فضلاء تھے جن کا ترکوں سے عقیدہ ومذہب اور اخوت اسلامی کا کوئی رشتہ نہ تھا، وہ اس مغربی ثقافت کے حامل تھے جس کی بنیاد ہی قومی عظمت اور قوم پرستی کے جذبہ پر ہے، اس وقت اس تحریک کے لیڈر ڈاکٹر فارس نمر شیخ ابراہیم الیازجی استاذ نجیب العاذوری لبنانی تھے[۲]

عربوں میں خلافت عثمانیہ سے علیحدگی اور ایسی خلافت کے قیام کا خیال جو کسی عرب ملک میں ایک عرب کی سربراہی میں قائم ہو اور یہ عقیدہ کہ وہی اس کے جائز وارث ہیں، انگریز ماہرین سیاست اور سبک دست انگریز اہل قلم نے پیدا کیا ۱۸۸۲ء میں مسٹر ولفیرڈ بلنٹ نے FUTURE OF ISLAM کے نام سے ایک کتاب لکھی جو تمام ممالک اسلامیہ وعربیہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے متعدد تراجم اسلامی زبانوں میں ہوئے ہندوستان میں اس کی مقبولیت واہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ لسان العصر میر اکبر حسین الہ آبادی بھی اس کے مترجمین میں ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑی احتیاط اور خوبصورتی سے عربوں میں اس خیال کی تخم ریزی کی ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔

"مصر کے لیڈروں نے خلافت کے مسئلہ کے متعلق نہایت اعتدال مرعی رکھا ہے اس جماعت نے مخالفت کو نظر انداز کر کے فقط آزادی کو اپنا مدعا ٹھہرایا ہے۔ اور اس نے اسلام کی دیوار میں کوئی نیا رخنہ پیدا نہیں کیا، نہ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے (سلطان) عبد الحمید خاں برابر اب تک اتقی امیر المؤمنین تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور نسبتاً زیادہ جائز اور مستحق تر خلافت کا

ا تصفیۃ العرب از علی ناصر الدین ص۳، طبع بیروت ۲ ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص۳

کر رقیام اس دن پر ملتوی کیا گیا جبکہ عثمانیہ سلطنت کی اجل اُس کا خاتمہ کر دے'
مصریوں کی یہ روش نہایت سنجیدہ ہے۔ ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے بھی تھا۔"
آگے چل کر لکھتا ہے:

"یہ کامیابی غالباً چند ہی برسوں کے صبر و تحمل سے نسبتاً زیادہ عام فتح و کامیابی کے ساتھ متبدل ہوسکتی ہے، اس وقت اس میں بہت تھوڑا اشبہ ہوسکتا ہے کہ عبد الحمید کی وفات یا سلطنت سے اس کی علاحدگی خلافت کے پھر قاہرہ میں قائم ہونے اور عربوں کے پھر وہاں اپنی گم کردہ مذہبی صدارت کو از سرِ نو باقاعدہ طور پر قائم کرنے کا پیش خیمہ ہو گی۔"

اسی کتاب کے ایک باب میں جس کا عنوان ہے "اصلی دار السلطنت مکہ" لکھتا ہے:

"دور اندیش مسلمانوں کو اب یہ صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر واپسی سفر شروع ہوا[۵] تو اور بھی آگے جانا پڑے گا یعنی مذہب کا اصلی صدر مقام عرب میں ہے جو اس کا زاد و بوم اور اس کے الہام کا سرچشمہ ہے، دنیا بھر میں یہی ایسا ملک ہے جہاں مذہبی بادشاہت کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی شرائط پائی جاتی ہیں، عرب میں عیسائی یہودی اور کسی قسم کے غیر مسلم نہیں جن سے اسلام کو مقابلہ کرنا پڑے، نہ یہ ایسا زرخیز ملک ہی ہے کہ اس کو دیکھ کر مغربی دول کے دہان آز میں پانی بھر آئے، وہاں خلیفہ کو فرانسیسی یا کسی اور فرنگی سفیر کی تنبیہ کا اندیشہ نہ ہو گا۔ وہ جیسا کہ پیغمبر کے جانشین کے واسطے شایانِ شان ہے آزادانہ کارروائی کر سکے گا اور وہاں اسلام تمام آلائشوں سے پاک اور صاف ہو گا، پس غالباً آئندہ کو خلافت مدینہ یا مکہ واپس آئے گی"

آگے چل کر لکھتا ہے:

"دینی اقتدار کے صدر مقام کا قسطنطنیہ سے مکہ میں تبدیل ہونا بالکل

---

۵ یعنی قسطنطنیہ کے بجائے ایشیا میں کسی اور جگہ کو مرکزِ خلافت بنانے کی کارروائی شروع کی گئی۔

آسان اور طبعی امر ہوگا اس سے عوام کے موجودہ خیالات میں کچھ فرق نہ آئے گا اور علماء کی آراء اور خیالات کے بالکل مطابق ہوگا قسطنطنیہ کے معدوم ہونے پر مکہ یا مدینہ بالطبع اہل حل وعقد کا شرعی مسکن ہوگا اور دینی اقتدار کا مسلمہ مرکز بن جائے گا، جن لوگوں سے اس مضمون پر میری گفتگو ہوئی ہے انھوں نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ اس مشکل مسئلہ کے ایسے حل کو ترکی کے حامیوں کے سوائے تمام علماء تسلیم کریں گے۔ بیشک جہاں تک مسلمانوں کی موجودہ ضرورت سے مجھے فیصلہ کرنے کا موقع ملا ہے مکہ خلافت کا صدر مقام ہے آئندہ بھی اس کا اقتدار زائل نہ ہوگا۔ قدیم زمانہ میں یہ نعرہ سنا جاتا تھا "روما پایہ تخت ہے" اور جن لوگوں کو اب مکہ کے پایہ تخت ہونے کا خیال بتایا جاتا ہے اُن کی قوت متخیلہ پر بہت اثر ہوتا ہے اور مزید برآں جب یہ کہا جاتا ہے کہ خلافت قریش سے ہوگی تو کم از کم عرب بے تاب ہو جاتے ہیں، اگر ہم گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو بے شک سوائے اس کے کچھ نہیں نکلتا ... ...
... ... اسلام کا عربی عنصر بے شک ایسے انتخاب کی تائید کرے گا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ عرب کا دائرہ اقتدار مراقش سے بوشہر تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح ہندوستان اور ملایا کے مسلمان بھی اسی دائرہ میں ہیں، ملکہ ترکوں کے سوا جن کی وقعت یوماً فیوماً کم ہوتی جاتی ہے اسلام کا ہر ایک عنصر اسی دائرہ میں خیال کرنا چاہیے[۱]"

۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں پہلی عمومی جنگ ہوئی اور عرب ممالک کو اس کا بہترین موقع ہاتھ آیا کہ وہ سلطنت عثمانیہ میں تنگاف ڈال سکیں، دوسری طرف اتحادیوں نے بھی اس فرصت کو غنیمت جانا اور قومیت کو خوب ہوا دی، لارنس نے اس سلسلہ میں اپنا مشہور کردار ادا کیا اور عربوں میں قومی جوش پیدا کر کے اُن کو ترکوں کے خلاف صف آرا کر دیا ہے[۲]

۱؎ مستقبل اسلام۔ ترجمہ FUTURE OF ISLAM شائع کردہ وطن لاہور۔
۲؎ ملاحظہ ہو ERIKDOWROT کی کتاب LAWRENCE OF ARABIA

چنانچہ شریف حسین نے حجاز میں بغاوت کی اور اہل شام نے شام میں، ان مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں جنھوں نے پانچ سو برس تک اسلام کا علم بلند اور اس کے دشمنوں کو مرعوب و مغلوب رکھا اور جو اپنی ساری کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اسلامی قوت و شوکت کی علامت تھے، ان عربوں نے اتحادیوں کا ساتھ دینا اور اُن کے کیمپ میں شامل ہونا گوارا کیا جنھوں نے کبھی کسی مسلمان کی عزت وآبرو کی پرواہ نہیں کی اور کسی عہدو پیمان کا پاس نہیں کیا اور جن کی قیادت وہ انگریز کر رہے تھے جن کے ہاتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سخت ترین مظالم سے رنگین اور ان کی تاریخ اسلام دشمنی کی خونی داستانوں سے آلودہ ہے۔

انھوں نے اس جوش وردعمل میں قرآن و حدیث کے اُن قطعی نصوص کی بھی پرواہ نہیں کی جو دشمنان اسلام سے ترک موالات اور ان کے حلیف بن کر جنگ کرنے کے خلاف صاف موجود تھے، انھوں نے ان خوش کن اور پُر فریب سیاسی وعدوں پر اعتماد کرلیا جو ہر لحظہ وہر آن بدلتے رہتے ہیں اور جو سوائے مصلحت اور سوائے قوت کے کسی اور چیز سے آشنا نہیں انھوں نے حرم کے حدود میں بھی ترکوں کو تہ تیغ کرنے سے گریز نہیں کیا، یہ وہ اقدام تھا جسکی نحوست سے ابھی تک عربوں کا پیچھا نہیں چھوٹا، اس کے بعد شام میں امیر فیصل کی سربراہی میں ہاشمی عربی حکومت کا قیام، اتحادیوں کی وعدہ خلافی اور تغافل شعاری اور اس حکومت کے ڈرامائی خاتمہ کے وہ واقعات پیش آئے جن سے سب واقف ہیں۔

اس کے بعد قومیت کے اس مغربی مفہوم کا زمانہ آیا جو ایک مستقل فکر اور فلسفہ ہے اور اس میں وہ ساری حمیت وحرارت اور شعائر و مقدسات پائے جاتے ہیں جو مذہب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تعلیم یافتہ عرب خاص طور پر جن کا رشتہ (مختلف اسباب کی بنا پر) دین سے کمزور پڑ چکا تھا اور قومی عظمت و شوکت تک جلد از جلد پہونچنے کی شدید خواہش ان میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تہذیب و تمدن اور ترقی پسندی کے میدان میں اپنی معاصر قوموں کے دوش بدوش آگے بڑھیں، ان میں موجودہ حالات سے مایوسی اور مغربی اقوام سے بیزاری اور بددلی پیدا ہوگئی تھی جنھوں نے اسرائیل کو جنم دیا اور جو برابر اسرائیل کی حمایت کرتی رہتی ہیں،

ان نوجوانوں نے سخت ردعمل اور فکری اُبال کے عالم میں قومیت کے سایہ میں پناہ لی اور اس کو اپنے درد کا درماں سمجھا۔

انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور قومیت کو صرف ایک دفاعی یا تنظیمی تدبیر یا عبوری مرحلہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جیسا کہ اس کے بعض داعیوں کا دعویٰ ہے[۱] بلکہ قومیت عربیہ کی تقدیس و تنزیہ اور اس کا کلمہ پڑھنے میں انھوں نے پورے جوش و مبالغہ سے کام لیا اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور وفاداری کے اظہار کے لیے اس کے سوا ہر چیز کے انکار اور اس کی تحقیر کو ضروری سمجھا اس کو انھوں نے عقیدہ و مذہب کی جگہ دی جس کے لیے ان کے اندر وہی تعصب پیدا ہو گیا جو اس وقت تک مذہب کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی اس قومیت کے لیے انھوں نے بیباکانہ طریقہ پر مذہب اور اہلِ مذہب کی تحقیر اور استہزا میں بھی تامل نہیں کیا، اس کا اندازہ ان اقتباسات سے ہوگا جو ان قوم پرست اہلِ فکر و اہلِ قلم کی کتابوں اور تحریرات سے لیے گئے ہیں جو قومیت عربیہ کی تحریک کے مستند ترجمان اور شارح سمجھے جاتے ہیں :۔

لبنانی مسلمان فاضل علی ناصر الدین اپنی مقبول عام کتاب قضیۃ العرب[۲] میں لکھتے ہیں۔

"عربوں کا مسئلہ ایک مومن آزاد فطرت، عاقل، شریف، صالح صادق دل خود دار اور بلند نظر عرب کے نزدیک ایمان کے مسئلہ سے کم نہیں، وطن پر ایمان وطن کے لیئے ٹھیک اسی طرح جس طرح اللہ پر ایمان اللہ کے لیے ہو سکتا ہے اور بس"[۳]

---

[۱] جس تحریک کے ساتھ مستقل فلسفہ اور فکر ہو اور جس کی جڑیں قلب و دماغ میں بہت گہری ہوں وہ کبھی بھی محض عارضی سلاح یا عبوری مرحلہ کے طور پر استعمال نہیں کی جا سکتی۔ [۲] اس کتاب کے تین اڈیشن تھوڑے وقت میں نکل چکے ہیں، کتاب اور مصنف کتاب پر ممتاز عرب زعماء و مفکرین کی تقریظیں اور تعریفی تبصرے ہیں۔

[۳] مقدمہ قضیۃ العرب از علی ناصر الدین طبع بیروت ۱۹۶۳ء صد ۱۹

عربوں کے مسئلہ اور اس کے مقاصد و عنصرات کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"وہ (یعنی عربی قومیت) جہالت، افلاس، بیماری، ظلم و ناانصافی اور ہر قسم کی بے عنوانی اور عصبیت عربیہ کے سوا ہر عصبیت کا مقابلہ کرے گی جو دین و سیاست کی تفریق کی قائل ہے، وہ اہل دین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے گی، ایک عرب کے لیے اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو دو چیزوں کے لیے پورا تعصب برتے، ایک اپنی قومیت کے لیے، ایک حق و صداقت کے لیے[۵]"

یہی مصنف "العروبة" یعنی عربیت کی تشریح کرتے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے :۔

قومیت عربیہ پر راسخ ایمان رکھنے والے ہم عرب قوم پرستوں کے نزدیک "عروبۃ" بجائے خود ایک دین ہے اس لیے کہ وہ اسلام اور مسیحیت دونوں سے پہلے اس دنیا میں موجود ہے، اگرچہ وہ آسمانی مذاہب کے اخلاق و معاملات اور فضائل کا خود بھی حامل و داعی ہے[۶]"۔

اس کے ثبوت میں کہ عربی قومیت اس کے بہت سے داعیوں اور رہنماؤں کی نظر میں مذہب کے متوازی ایک مذہب اور عقیدہ کے بالمقابل ایک عقیدہ بن چکی ہے، ایک دوسرے قوم پرست مفکر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :۔

"العربی" کے جنوری ۵۹ء کے شمارہ میں ایک قوم پرست عرب فاضل لکھتے ہیں :۔

وحدت عربیہ کے سب سے پہلے معنی یہ ہیں کہ اس زمین کے تمام باشندوں میں جو اس نام (عرب) سے اپنے کو موسوم کرتے ہیں اتحاد قائم ہو، عرب اتحاد کی عربوں کے دلوں میں وہی جگہ اور مرتبہ ہے جو اہل ایمان کے قلوب میں خدا کی توحید کا ہے"۔

---

[۵] مقدمہ قضیۃ العرب از علی ناصر الدین طبع بیروت سنہ ۱۹۶۳ء صہ ۲۵، [۶] ایضاً صہ ۱۳۸

مشہور مصری ادیب استاذ محمود تیمور مصر کے مشہور رسالہ العالم العربی کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

"اگر ہر عہد کی ایک مقدس نبوت تھی تو اس زمانہ کی نبوت ہمارے معاشرہ میں عربی قومیت ہے، اس نبوت کا پیغام اپنی قوت کو جمع کرنا، اپنے محاذ کو مضبوط کرنا اور عرب معاشرہ کی انسانی طاقت کو اس رُخ پر لے چلنا ہے کہ زندگی کی نعمت وعزت حاصل ہو، عرب مفکرین وادبا کے کاندھوں پر یہ ایک امانت ہے کہ وہ اس سچی نبوت کے حواری ثابت ہوں، اپنے قلم سے اس کو روشن کریں، اس میں اپنی روح پھونکیں اور اس کے لیے کوشش کریں کہ ترقی وسرسبزی کے سارے اسباب اس کے لیے مہیا ہو سکیں"[۱]

یہ مفکرین واہل قلم اس کو اسلامی اتحاد پر ترجیح دیتے ہیں، اس کو زیادہ آسان" ممکن الحصول، زیادہ مؤثر اور طاقتور اور زیادہ وسعت پذیر تحریک سمجھتے ہیں، ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ اپنے ایک مضمون "عربی قومیت جتنا کہ اس کو ہمیں سمجھنا چاہیے" میں لکھتے ہیں:-

"آج سیاست داں عربی قومیت کی دعوت دیتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ عرب اتحاد آج اسلامی اتحاد سے زیادہ سہل الحصول ہے، ہماری مصلحت اسی میں ہے کہ پہلے ہم اس قریبی مقصد کو حاصل کریں، اس پر مستزاد یہ ہے کہ عربی فکر اسلامی فکر کے مقابلہ میں پھیلنے اور متاثر کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ عالم عربی کے تمام باشندوں پر محیط ہے۔ لیکن اسلام ان سب پر شامل نہیں، ان ممالک کے سب باشندے عرب ہیں، لیکن سب مسلمان نہیں، ان میں اب بھی یہودی اور عیسائی موجود ہیں۔"[۲]

بعض مفکرین واہل قلم قومیت کی حمایت میں اس قدر مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں کہ جو اس نعمت سے محروم ہو اس کا اسلام بھی معتبر نہیں سمجھتے۔ علی ناصر الدین جن کا ذکر پہلے

۱؎ عربی قومیت از محمود تیمور مجلۃ العالم العربی شمارہ ۱۱؍؟ ۲؎ مجلۃ العربی پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۴

گزر چکا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ہماری رائے میں یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی غیر عرب ایسا مسلمان بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ خدا اور اس کے رسول کو مطلوب ہے، کوئی شخص اتنی بات پر کہ اس کے والدین مسلمان ہیں اور وہ ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہو مکمل مسلمان نہیں ہو سکتا، اس کو ایسا ہونے کے لیے اس بات کی ضرورت ہو کہ وہ اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنے رجحانات کے لحاظ سے عرب ہو۔"[۱]

یہ انداز فکر (جو ایک ایسے عقیدہ اور نظریہ کی غمازی کرتا ہے جو خوب راسخ اور پختہ ہو چکا ہے اور اپنے ارتقاء کی آخری منازل طے کر چکا ہے) صرف مغرب کی لادینی قومیت کی صدائے بازگشت ہے اور یہی چیز ہے جسے ہم اسلام کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کا حریف و رقیب ہے اور عربوں کے معاشرہ اور اُن کے قلب و دماغ میں وہ جگہ لینا چاہتا ہے جو ابھی تک اسلام کے لیے مخصوص تھی، وہ جس قدر ترقی کرے گا اور پھلے پھولے گا اسلام کی گرفت کمزور اس کا اثر مضمحل ہوتا چلا جائے گا۔ وہ اسلام کے اولین داعیوں کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دینے کے درپے ہے اور چاہتا ہے کہ عربوں کا رشتہ اُن کی قوت و حیات کے سرچشمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی دعوت و پیغام سے اور اس کے بعد سارے عالم اسلام اور مسلم اقوام سے منقطع ہو جائے اور ان کی توجہ انسانیت کے مستقبل اور اقوام عالم کی رہنمائی سے بالکل ہٹا دے[۲]، وہ عربوں کو جو ایک ایسی ملت کا اہم حصہ ہیں جو پوری انسانیت کے لیے پیدا کی گئی ہے ایک ایسی محدود اور تنگ نظر قوم میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے جو مسائل کو صرف اپنے (قومی) نقطۂ نظر سے سوچنے کی عادی اور صرف اپنے ہی لیے جینے اور مرنے کا خواب دیکھتی ہے۔

---

[۱] حاشیہ تصفیۃ العرب صفحہ ۱۳۹ [۲] عالم اسلامی کی دوسری مسلم اقوام سے عرب قوم پرست حکومتوں اور افراد کی بے تعلقی بالکل عیاں ہو۔ قبرص کے ترکوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ان کے اندر کوئی گہرا ہمدردی کا جذبہ اور جوش نہیں پایا جاتا، اور انھوں نے اس صورت حال کے خلاف کوئی احتجاج تک نہیں کیا۔

حیرت و افسوس کی بات ہے کہ عرب قوم پرست تو اپنے دائرہ کے اندر سوچیں اور اپنی تمام سرگرمی اور جد و جہد کو صرف عرب اقوام تک محدود رکھیں حالانکہ ان کی اکثریت دین اور عقیدہ کے لحاظ سے مسلمان ہے اور ملحد کمیونسٹ انسانیت کی سطح پر سوچیں اور ملک و قوم کے امتیازات سے بالاتر ہو کر تمام دنیا کے محنت کش طبقہ اور مزدوروں و کسانوں کے مسئلہ پر غور کریں طرزِ فکر کا یہ اختلاف اس وقت کھل کر سامنے آیا جب روسی وزیر اعظم خروشچیف نے جو مصر کا دورہ کر رہے تھے ۱۶ مئی ۱۹۶۴ء کو عرب مزدور ٹریڈ یونین کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے جمال عبدالناصر کی تقریر پر نکتہ چینی کی۔ انھوں نے کہا کہ:۔

"آپ نے اپنی تقریر میں ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا میں پہلے بھی کئی بار تذکرہ سن چکا ہوں، آپ عرب اتحاد پر زور دے رہے ہیں لیکن میں اس سلسلہ میں کہنا چاہوں گا کہ اتحاد کے سوال کو ہم روسی اس کے وسیع تر معنوں میں دیکھتے ہیں، ہم اتحاد کی بنیاد قوم پروری کے تصور پر نہیں بلکہ محنت کش طبقہ کی طاقت پر رکھتے ہیں[1]"

عرب مسلمان دراصل اس بات کے زیادہ حقدار تھے کہ عالمی سطح پر مسائل پر غور کریں اور عقائد و اسلامی اقدار کی بنیاد پر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود سے دلچسپی لیں اور زیادہ "بین الاقوامیت" اور "انسانیت دوستی" کا ثبوت دیں۔ لیکن قومیت کا مزاج ان کو اس تنگ دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتا اور انسانیت کے لیے ان کے دل میں کچھ زیادہ گرمجوشی اور جذبہ نظر نہیں آتا۔

قوم پرستی کی غالی تحریک کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی ہے کہ الحاد و بے دینی اور مذہب بیزاری کی ایک تیز و تند لہر عالم عربی میں اٹھے اور نوجوان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اس طرزِ فکر کے نمونے قوم پرست ادبا و مفکرین کے مضامین میں نظر آنے لگے۔ اس کا ایک "بہترین نمونہ" مشہور قوم پرست صحافی ڈاکٹر احمد زکی مدیر رسالہ "العربی"[2] کا وہ مضمون ہے جو

---

[1] روزنامہ قومی آواز ۲۲ مئی ۱۹۶۴ء۔ [2] شرق اوسط اور ممالک عربیہ کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور مقبول عربی رسالہ جو کویت کی حکومت کی سرپرستی میں نکلتا ہے اور جسکو عربوں کے مزاج کو بگاڑنے میں بہت بڑا دخل ہو۔

انھوں نے کویت کے کثیر الاشاعت اور مقبول رسالہ "رسالہ العربی" کے پہلے شمارہ میں لکھا تھا وہ کہتے ہیں:۔

"رسالہ العربی" عربیت کو دین کے ساتھ نہیں جوڑتا سب لوگ اللہ کے بندے اور اس کے راستہ کے مسافر ہیں، راستے مختلف اور منزل مقصود ایک ہے، ہر زندہ انسان اس زندگی کی ضمانت چاہتا ہے اور اطمینان وسکون کا خواستگار ہے، دین کے ذریعہ وہ اس زندگی کے بعد کی ضمانت حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن صدیوں کے خون آشام تجربوں نے اس بات کو ظاہر کردیا ہے کہ دین (جو اس زندگی کے بعد والی زندگی کی ضمانت کا طالب تھا) اس نے خود اس زندگی کا امن وسکون چھین لیا ہے، اب ایک عاقل اور صاحب فکر جو اللہ کے اس عطیہ آزادی رائے سے متمتع ہو، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کا پیچھا چھوڑ دو، وہ اللہ تک پہونچنے کے لیے جس راستہ پر چاہیں چلیں، یہاں تک کہ وہ شخص بھی جو اس راستہ پر نہ چل رہا ہو یعنی ملحد و بے دین، اس لیے کہ اس کے اس فعل کی ذمہ داری تنہا اس پر ہوگی نہ کہ دوسرے لوگوں پر[۱]

یہی بات عمر فاخوری نے عرصہ ہوا اپنی کتاب (کیف ینہض العرب؟) (عرب کیسے ترقی کرسکتے ہیں؟) میں کہی تھی۔

"عرب اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے جب تک کہ عربیت اور عربی اصول ان کا مذہب نہ بن جائے گا اور وہ اس کے لیے اتنے غیرت مند، حساس، اور پرجوش نہ ہوں گے جتنے مسلمان نبی کریم کے قرآن مجید کے لیے، عیسائی اور کیتھولک رحم دل مسیح کی انجیل کے لیے، پروٹسنٹ لوتھر کی اصلاحی تعلیمات کے لیے اور فرانس کے انقلابی روسو کے جمہوری اصولوں کے لیے ہیں اور اس کے لیے ایسا تعصب نہ برتیں گے جس کا مظاہرہ سینٹ پیٹر کی دعوت پر صلیبیوں نے کیا تھا"[۲]

---

[۱] "العربی" پہلا شمارہ [۲] الامۃ العربیۃ فی معرکۃ تحقیق الذات ص۱۴۱۔

درحقیقت عرب مسلمان مشرق وسطیٰ کی اس چھوٹی سی مگر زیرک و ہوشمند غیر مسلم اکثریت کی سازش کا شکار ہوئے ہیں جس کا مستقبل صرف عربی قومیت کی بقا و ترقی سے وابستہ ہے اور جو صرف اسی راستہ سے عالم عربی کی قیادت حاصل کر سکتی ہے اور اس کو اس عالم اسلام سے منقطع کر سکتی ہے جس کا اس اقلیت کے ساتھ دینی عقائد اور تاریخ کا کوئی رشتہ نہیں ہے، اس بات کو سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ میشیل عفلق جو عیسائی ہیں بعث پارٹی کے سربراہ اور مشرق وسطیٰ میں عرب قوم پرستی کی تحریک کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر مانے جاتے ہیں۔

غیر مسلم عرب مفکرین نے اس فلسفۂ قومیت کو جس چابک دستی اور ذہانت سے مرتب کیا ہے اور اس میں جس طرح علمی (سائنٹفک) انداز فکر پیدا کیا گیا ہے اور اس میں ایک عرب تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے جو احساسِ برتری کے نشہ سے سرشار ہے جو کشش پائی جاتی ہے اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباسات سے ہوگا جو میشیل عفلق کی کتاب فی سبیل البعث[۱] سے اخذ کیے گئے ہیں جس کو اس تحریک و دعوت کا صحیفہ کہنا صحیح ہوگا۔

"یہ قدرتی طور پر بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص بھی خواہ وہ محدود سے محدود صلاحیت رکھتا ہو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حقیر اور دھندلی تصویر بن سکے جب تک وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جس نے اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں جمع کر کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کیا یا زیادہ مناسب الفاظ میں جب تک وہ شخص اس قوم کا فرد ہے جس کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی ساری قوتیں جمع کر دیں اور اس کی تخلیق کی، کسی زمانے میں ایک شخص کے اندر پوری قوم کی زندگی مجسم ہو گئی تھی اور آج اس کی ضرورت ہے کہ اس قوم کی جو نئی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے پوری زندگی اس عظیم الشان شخصیت کی زندگی کی تفصیل اور امتداد بن جائے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کُل عرب تھے، آج

---

[۱] اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مصر کی قومیت عربیہ کے مفکر و زعما بھی ان کے خوشہ چین اور ان کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کل عربوں کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونا چاہیے۔"[۵۱]

"۔۔۔ اسلام کو فتحیاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی وہ دراصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جد و جہد اور خود اپنے وجود اور دنیا کے باہمی تجربات اور امتحانات کے نتیجہ میں اور بہت سی آزمائشوں اور تکلیفوں، امید و نا امیدی اور کامیابی و ناکامی کے بعد حقیقت تک پہونچ جائیں، یعنی ایمان خود ان کے اندر سے پیدا ہوا اور وہ ایمان تجربہ سے ملا ہو، زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا اور اس کے معنی تھے عربیت کی تجدید و تکمیل۔"[۵۲]

"اسلام عرب قوم کے جذبۂ ابدیت و وسعت کا بہترین اظہار و تعبیر، اس لحاظ سے وہ اپنی حقیقت میں عربی ہے، اپنے مثالی مقاصد میں انسانی ہے، پس اسلام کا پیغام درحقیقت انسانی عربی اخلاق ہے"[۵۳]

"۔۔۔ اس لیے وہ معنی جس کو اس اہم تاریخی دور میں اور ترقی و تغیر کے اس نازک مرحلہ میں اسلام آشکارا کر رہا ہے یہ ہے کہ ساری قوتیں عربوں کی طاقت بڑھانے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کی جائیں اور یہ ساری قوتیں عرب قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں۔"[۵۴]

"یورپ میں خالص قومی نظریہ منطقی بنیاد پر قائم ہے، جب کہ قومیت کا مذہب سے انفصال طے شدہ امر بن چکا ہے، اس لیے کہ یورپ میں مذہب باہر سے آیا ہے اور اس کے مزاج اور تاریخ کے لیے اجنبی ہے اور وہ عقیدۂ آخرت اور اخلاق کا خلاصہ ہے۔ وہ نہ ان کے ماحول کی ضروریات کا آئینہ دار ہے، نہ ان کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے جب کہ اسلام عربوں کے لیے صرف ایک اخروی عقیدہ یا بعض اخلاقیات کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے بارہ میں ان کے

---

۵۱ صفحہ ۳۵ ۵۲ صفحہ ۵۲ ۵۳ صفحہ ۴۷ ۵۴ صفحہ ۳۱۔

نقطۂ نظر، ان کے کائناتی شعور کا فصیح ترین ترجمان اور ان کی شخصیت کی وحدت کی طاقتور تعبیر ہے، جس میں الفاظ شعور اور فکر کے ساتھ وابستہ اور پیوست ہیں۔" [۱]

میرا اعتقاد ہے کہ عربوں کا خمیر دین کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ اب ان کو اس سے علیحدہ اور آزاد کرنا آسان نہیں اور باوجود اس کے کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ قومیت سے متاثر اس کا علم بردار اور داعی ہے جمہور کو اسلام سے محبت ہے اور وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں جانتے، اس کے بغیر کسی اور چیز سے اُن کے اندر جوش نہیں پیدا ہوتا اور یہی وہ جذبہ اور طاقت تھی جس نے اس سے ریف (مراکش) الجزائر اور معرکۂ سویز میں زبردست قربانیاں کرائیں، ان میں نشہ پیدا کیا اور ان کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

لیکن قوم پرستی کے اندر نوجوانوں کے لیے جو کشش اور اس کے علم برداروں کے پاس اپنے نظریہ کی تبلیغ واشاعت اور حقائق کی رنگ آمیزی کے جو وسیع وسائل و امکانات ہیں اور پھر بعض عظیم عرب حکومتوں نے اس تحریک کی جو کھلی سرپرستی اور پشت پناہی شروع کر دی ہے اور صحافت و دعایت، علم و ادب، فکر و فلسفہ کی زبردست طاقتوں کو اس کی توسیع و اشاعت پر مرکوز کر دیا ہے، پھر مغرب کی مسلسل بے اعتنائیوں اور غلطیوں نے عرب نوجوانوں میں جو اشتعال اور غم و غصہ کی لہر پیدا کر دی ہے اس سب کے ماسوا دینی گرفت کی کمزوری اور مادیت و الحاد کے سیلاب نے اس کے لیے جو زمین ہموار کر دی ہے اس کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ یہ عرب تعلیم یافتہ نوجوانوں اور بعض نوخیز عرب اقوام اور حکومتوں کا آئین اور منشور نہ بن جائے اور عربوں کے مزاج میں ایسا گہرا اور دیرپا تغیر نہ واقع ہو جائے جو دعوت اور فکر اسلامی کے لیے مستقل رکاوٹ اور عربوں کے اسلام سے اسی طرح دور ہو جانے کا ذریعہ نہ بن جائے جس طرح ترکی میں نظر آرہا ہے۔

یہ اندیشہ اور خلش (جو بے بنیاد نہیں ہے اور جس کی معقولیت کا ثبوت اوپر کے اقتباسات

---

[۱] ص ۴۰۔

اور تحریری نمونوں سے ہوا) ان لوگوں کو قومیت عربیہ کی تحریک کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے، جو ان تغیرات اور اس کے دور رس نتائج اور اثرات پر نظر رکھتے ہیں اور جو عربوں کو دعوتِ اسلامی کا راس المال اور بلادِ عربیہ کو اسلام کا اولین سرچشمہ اور آخری پناہ گاہ سمجھتے ہیں اور قومیت کے اس مغربی مفہوم سے واقف ہیں جو حقیقت میں دین کا حریف ورقیب اور الحاد و بے دینی کا پیش خیمہ ہے، وہ اس صورتِ حال کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور قدیم ایرانی شاعر کے الفاظ میں پکار اٹھتے ہیں ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

جو لوگ قومیت کے اس مغربی مفہوم سے واقف ہیں اور ان کی تحریک قوم پرستی (نیشنلزم) کے مغربی لٹریچر پر براہ راست نظر ہے وہ اس کو اسلام کا براہ راست حریف سمجھتے ہیں جو وحدتِ اسلامی کا داعی اور ایک عقیدہ کی بنیاد پر ایک ملت کی تاسیس اور ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے وہ اس قوم پرستی یا مغربی معنی میں وطنیت اور قومیت کو دنیا کی سب سے بڑی تخریبی طاقت اور نوعِ انسانی کی تفریق اور انتشار کا ذمہ دار سمجھتے ہیں انھیں اہلِ فکر و نظر میں علامہ اقبالؒ بھی تھے جن کی مغربی لٹریچر پر گہری اور نہایت وسیع نظر تھی، وہ اپنے ایک مقالہ میں جو مارچ ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا ہے قومیت وطنیت کے مغربی مفہوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں، ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں، کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہٰذا القیاس، چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا، ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے ...... مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن "ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے، چونکہ اسلام بھی ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا

ایک قانون ہے۔ اس لیے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے"

خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں:۔

"میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف ہوں اس لیے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آرہے ہیں، اور یہ جراثیم میرے نزدیک دورِ حاضر کی انسانیت کے لیے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ حبِ وطن ایک فطری امر ہے اور اس لیے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک جزو ہے، لیکن جو شئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب اور اس کا کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسانوں کو زندہ رہنا چاہیے اور جن کی خاطر انھیں اپنی جان قربان کرنی چاہیے۔ وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتا ہے اور جس کے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہوتی ہے اس لائق نہیں کہ اسے خدا اور مذہب سے برتر قرار دیا جائے۔"

دینی دعوت — ہندستان میں

از جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

حصہ اوّل

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ رسولوں کے ذریعہ ہم نے جو تعلیمات بھیجی ہیں ان سے دین کو سمجھو اور اسکی پیروی کرو (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ..... فبھداھم اقتدہ) مگر رسولوں کی تاریخ سے جب ہم یہ متعین کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دین اور وہ مطلوب الٰہی کیا ہے جس کی ہمیں پیروی کرنی ہے، تو ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ رسولوں کی زندگی اس طرح سے کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے جس طرح آج ہمارے لئے قرآن ایک واحد مجموعہ کی شکل میں موجود ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس اعتبار سے دو بڑے دوروں میں تقسیم ہے، ایک ہجرت سے پہلے اور دوسری ہجرت کے بعد۔ ہجرت سے پہلے آپ پر جس چیز کی وحی کی گئی ہے وہ دین کی بنیادی تعلیمات تھیں۔ اسی نوعیت کی تعلیمات دس بارہ سال تک بھیجی جاتی رہیں۔ اس دوران میں آپ کا کام یہ تھا کہ ان بنیادی چیزوں پر خود عمل کریں، اسی کی دعوت دیں اور ساتھیوں کو اسی کی تلقین کریں، اس کے بعد جب ہجرت ہوئی اور مسلمانوں کو "تمکین" حاصل ہوگئی تو سیاسی اور تمدنی نوعیت کے احکام نازل ہونے شروع ہوئے، گویا قبل از ہجرت رسول کے لئے دین جو معنی رکھتا ہے وہ اس سے مختلف تھا جو بعد از ہجرت آپ پر فرض ہوا۔

یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ غور طلب ہو جاتی ہے جب ہم دیگر انبیاء کو دیکھتے ہیں، کیونکہ نہ صرف یہ کہ دین اور وحی کی یہی نوعیت ہر نبی کے یہاں ملتی ہے بلکہ کتنے نبی ایسے ہیں جن پر دین کا صرف اتنا ہی حصہ اترا جو قبل از ہجرت آخری رسول پر نازل ہوا تھا۔ انبیاء میں سے جن بزرگوں نے صرف پہلا دور پایا، ان پر بنیادی تعلیمات کے سوا اس قسم کا کوئی قانون سرے سے نازل نہیں ہوا جو بعد از تمکین قابل نفاذ ہوتا ہے۔ اور جن حضرات کی جدوجہد دوسرے مرحلہ تک پہنچی ان کو آخری رسول کی طرح اس دور سے متعلق اجتماعی اور سیاسی قوانین بھی دے گئے۔

یہ تو خود نبی کی اپنی زندگی کے اعتبار سے اس کے دین کا فرق ہوا۔ اسی طرح مختلف انبیاء کی باہمی حیثیت کے اعتبار سے ان کے دین میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک پہلی نوعیت کے احکام ـــــ دین کی بنیادی تعلیمات ـــــ کا سوال ہے، وہ سب کے یہاں یکساں ہیں، وہ سب پر ایک ہی شکل میں اتری ہیں۔ مگر دوسری نوعیت کے احکام ـــــ بنیادی تعلیمات کا عملی انطباق ـــــ میں مختلف انبیاء کی تعلیمات مختلف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پہلی نوعیت کے احکام کے اعتبار سے تو ہم اس حکم کی تعمیل کر سکتے ہیں کہ "انبیاء کی پیروی کرو" کیونکہ اس قسم کے احکام میں تمام انبیاء کی تعلیمات مشترک ہیں۔ مگر دوسری نوعیت کے احکام میں ان کی مشترک پیروی ممکن نہیں ہے کیونکہ ان احکام پر ان کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے لئے یہ امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ کسی مخصوص حالت کے بارے میں آج حکم الٰہی کیا ہے۔ یہ مسئلہ صرف تعلیمات نبوت کی حکمت سمجھنے کے پہلو سے زیر بحث آتا ہے۔ نہ کہ کسی معاملہ خاص میں حکم الٰہی کے تعین کے پہلو سے، کیونکہ یہ امر متفق علیہ ہے کہ آخری رسول کی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہے۔ مثال کے طور پر آج اگر ایک شخص جائداد چھوڑ کر مرے تو اس کے ورثاء یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ ہم وراثت تقسیم نہیں کریں گے۔ کیونکہ کوئی ایسا واحد قانونِ وراثت ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس کی روشنی میں حقوق کا تعین کیا جا سکے، بلکہ انھیں لازمی طور پر متروکہ جائداد کو شریعت محمدیہ کے مطابق تقسیم کرنا ہوگا۔

مگر اس اصول سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر احکام کی "تکلیف" آج بھی کیا اسی اعتبار سے ہے جس اعتبار سے وہ ابتداءً نازل ہوئے

یا صحیح تر الفاظ میں جس اعتبار سے انبیاء اور ان کے پیرو دن کو ان احکام کا مکلف کیا گیا تھا۔ یا اب پورا قرآن نازل ہو جانے کے بعد صورت حال بدل گئی ہے اور اب حالات کے اعتبار سے ہمارے اوپر ان کا انطباق نہیں ہوگا جیسے کہ ابتدائی ہوا تھا، بلکہ اب ہم بیک وقت سارے احکام دین کے مکلف ہیں اور ان سب کے بارے میں ہمارے اوپر یہ فرض ہے کہ ایمان کا شعور ملتے ہی ان کی کامل تعمیل و نفاذ کی جدوجہد شروع کر دیں۔ اگر ہم پہلی صورت (تکلیف باعتبار حالات) کو مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم تعلیمات نبوت کے مندرجہ بالا دو قسموں کے درمیان اصل اور تفصیل کی نسبت مانتے ہیں اور اگر دوسری صورت کو صحیح سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تعلیمات نبوت کی ان دونوں قسموں کے درمیان ہم آغاز اور تکمیل کی نسبت قرار دے رہے ہیں۔

آغاز اور تکمیل کی نسبت ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں قسم کی تعلیمات یا ان دونوں ادوار کے درمیان وہی نسبت ہے جو پودے اور درخت کے درمیان ہوتی ہے۔ پودا ایک مکمل وجود کی صرف ابتدائی شکل ہے اور درخت بننے کے بعد ہی وہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ جو پودا صرف پودا بن کر رہ گیا، وہ گویا ناقص و ناتمام رہا اور جس نے اپنے آپ کو درخت تک پہنچایا وہ اپنی حالت کمال تک پہنچا۔

جہاں تک مجرد طور پر تنزل احکام کا تعلق ہے، یہ کہنا صحیح ہے کہ احکام میں باعتبار نزول آغاز و تکمیل پائی جاتی ہے، مگر کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مطلوب ہے اس کے اعتبار سے نسبت کی یہ تشریح صحیح نظر نہیں آتی۔

۱۔ آغاز اور تکمیل کی نسبت ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض انبیاء کا دین بعض دیگر انبیاء کے مقابلے میں ناقص تھا، حالانکہ قرآن کی تصریح کے مطابق سب کے سب یکساں اور مکمل طور پر ہدایت یاب تھے۔ (کلا ھدینا و نوحا ھدینا)

۲۔ پھر اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج امت مسلمہ حامل دین ہونے کی حیثیت سے ایک ایسی پوزیشن میں ہے جس پوزیشن میں کبھی کوئی نبی بھی نہیں تھا، کیونکہ انبیاء کو یا تو غیر کامل دین ملا تھا، یا اگر کسی کو کامل دین ملا تو وہ بھی اس کی عمر کے بالکل آخری حصہ میں۔ اور اس طرح اس کی زندگی کا بیشتر حصہ "ناقص" دین کے تحت گزر گیا، جب کہ آج ہم

آغاز کار ہی سے کامل دین کے حامل ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔

۳۔ اس نسبت کو ماننے کی رو سے ہماری تکلیف شرعی یہ قرار پاتی ہے کہ ہم جہاں اور جس حال میں ہوں سارے نازل شدہ احکام دین کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے بروئے کار لانے کی تحریک چلائیں، حالانکہ قرآن و سنت سے کسی بھی نبی کے دعوتی کام کی یہ حیثیت ثابت نہیں ہوتی اور دور دعوت میں پورا دین نازل شدہ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔

ان وجوہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ دوسری نسبت اصل اور تفصیل کی نسبت ہی اس مسئلہ کی زیادہ صحیح تشریح ہے۔ اور اصل تفصیل کی نسبت کو ہم روح اور جسم کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ روح اپنی ذات میں مکمل وجود ہے۔ بلکہ وہی اصل ہے۔ اگرچہ مادی دنیا کے اندر اس کا ظہور ایک جسم کی شکل میں ہوتا ہے۔ مگر جسم کا نہ ہونا یا جسم کے اجزاء میں کسی جزو کی عدم موجودگی بذات خود روح کو ناقص ثابت نہیں کرتی روح کے نقص کے اسباب اس کے اپنے اندر ہیں۔ وہ ایک کامل اور معیاری جسم میں رہتے ہوئے ناقص ہو سکتی ہے اور ایک بظاہر ناقص اور غیر مکمل جسم میں رہ کر کمال کے درجہ کو پہونچ سکتی ہے۔

اس نسبت کو ماننے کی صورت میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کیوں تمام انبیاء پر اولاً اور بیشتر پر کلاً صرف پہلی نوعیت کے احکام اترے۔ کیونکہ اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے۔ بقیہ کی مطلوبیت حالات کے اعتبار سے ہے نہ کہ علی الاطلاق۔ پھر یہ نسبت اس اشکال کو بھی رفع کر دیتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے بزرگان دین حتیٰ کہ انبیاء تک "ناقص" نظر آتے ہیں، کیونکہ جہاں تک مطلوب اصلی کا تعلق ہے وہ سب کو ملا اور سب نے اسے حاصل کیا۔ پھر اس میں ہمارے کام اور انبیاء کے کام کا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے کام کا آغاز اصل دین کا اتباع اور اس کی دعوت قرار پاتا ہے، جیسا کہ انبیاء کے ساتھ ہوا۔ اور پھر حالات کے اعتبار سے ہم بقیہ اجزائے دین تک پہونچتے ہیں جیسے کہ انبیاء پہونچے۔

یہاں میں امام رازی کا ایک اقتباس نقل کروں گا جس میں انھوں نے انبیاء کی تعلیمات کے باہمی فرق کی توجیہ کرتے ہوئے اسی بات کو اصول و فروع کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وردت آیات دالۃ علی عدم التباین　　طریقۂ انبیاء کے سلسلے میں دو طرح کی آیتیں ہیں

فی طریقۃ الانبیاء والرسل وآیات دالۃ علی حصول التباین فیھا اما النوع الاول فقولہ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا الی قولہ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ وقال اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ واما النوع الثانی فھو ھذہ الایۃ لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا (مائدہ) وطریق الجمع ان نقول النوع الاول من الآیات مصروف الی ما یتعلق باصول الدین والنوع الثانی مصروف الی ما یتعلق بفروع الدین

ایک وہ جو کہتی ہیں کہ تمام انبیاء کا طریقہ ایک تھا۔ دوسری وہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے طریقے باہم مختلف تھے۔ پہلی قسم کی مثال آیت "اقیموا الدین" اور "فبھداھم اقتدہ" ہے۔ اور دوسری قسم کی آیت کی مثال لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا ہے اور ان دونوں باتوں کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہم پہلی قسم کی آیات کو اصول دین سے متعلق مانیں اور دوسری قسم کی آیات کو فروع دین سے متعلق قرار دیں۔

(تفسیر کبیر، جلد ۳ صفحہ ۶۰۸)

اس اقتباس میں مجموعۂ شریعت کے جن اجزاء کو "فروع دین" کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غیر اہم ہیں اور ان کا کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ فرق باعتبار نوعیت ہے نہ کہ باعتبار تشریع۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے وہ علی الاطلاق ہر عاقل و بالغ انسان سے مطلوب ہیں، ان کو اپنی زندگی میں شامل کئے بغیر کوئی شخص رضائے الٰہی کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ مگر فروع اپنی نوعیت کے اعتبار سے مطلقاً مطلوب نہیں ہیں بلکہ حالات کے اعتبار سے مطلوب و مفروض ہوتے ہیں جیسا کہ صاحب وحی کے لیے وہ ہمیشہ حالات کے اعتبار سے مفروض کیے گئے ہیں۔ مگر اصل اور فرع کا یہ فرق اسی وقت تک ہے، جب تک فرع مطلوب ہوتی ہو مطلوب و مفروض ہونے کے بعد ادائیگی کے پہلو سے دونوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دین کی مندرجہ بالا دونوں قسم کی تعلیمات میں اصل اور

تفصیل کی نسبت ہے تو آیت اکمال دین (مائدہ ۳) کا مطلب کیا ہے؟ یہ مسئلہ مفسرین کے یہاں زیر بحث آیا ہے مگر اس آیت کو انھوں نے اس معنی میں تسلیم نہیں کیا ہے کہ دین کے اندر مندرجہ بالا معنوں میں آغاز اور تکمیل کی نسبت ہے، اور اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ ایسا ماننے کی صورت میں نزول آیت سے پہلے کا دین ناقص قرار پاتا ہے۔ یہاں پھر میں امام رازی کے الفاظ نقل کروں گا جو اس معاملے میں مفسرین کی بحث کا گویا خلاصہ ہے۔

فی الآیۃ سوال وھو ان قولہ الیوم اکملت لکم دینکم یقتضی ان الدین کان ناقصا قبل ذلک وذلک یوجب ان الدین الذی کان صلی اللہ علیہ وسلم مواظبا علیہ اکثر عمرہ کان ناقصا وانہ انما وجد الدین الکامل فی آخر عمرہ مدۃ قلیلۃ واعلم ان المفسرین لاجل الاحتراز عن ھذا الاشکال ذکروا وجوھا (الاول) ان المراد من قولہ اکملت لکم دینکم ھو ازالۃ الخوف عنھم واظھار القدرۃ لھم علی اعدائھم وھذا کما یقول الملک عند ما یستولی علی عدوہ ویقھرہ قھرا کلیا الیوم کمل ملکنا وھذا الجواب ضعیف لان ملک ذلک الملک کان قبل قھر العدو ناقصا۔ (الثانی) ان المراد انی اکملت لکم ما تحتاجون الیہ فی تکالیفکم من تعلیم الحلال والحرام وھذا ایضا ضعیف لانہ

اس آیت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ الیوم اکملت لکم دینکم کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے پہلے دین ناقص تھا۔ اور اس سے لازم آتا ہے کہ وہ دین جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عمر کے بیشتر حصہ میں عامل رہے وہ ناقص تھا۔ اور آپ نے کامل دین اپنی عمر کے بالکل آخری حصے میں صرف تھوڑے دنوں کے لیے پایا (کیونکہ تکمیل دین کی آیت کے نزول کے جلد ہی بعد آپ کی وفات ہو گئی) مفسرین نے اس اعتراض کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ اکملت لکم دینکم سے مراد ازالۂ خوف اور اپنے دشمنوں پر قدرت پانا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ جب اپنے دشمن پر پوری طرح قابو پا لیتا ہے تو کہتا ہے: الیوم کمل ملکنا (آج ہمارا اقتدار مکمل ہو گیا) مگر یہ جواب کمزور ہے کیونکہ بادشاہ کا اقتدار دشمن پر قابو پانے سے پہلے واقعۃً ناقص تھا۔ دوسری توجیہ یہ ہے اکملت لکم سے مراد یہ ہے کہ حلال و حرام کی جن حدود کو جاننے

لولم يكمل لهم قبل هذا اليوم ما
كانوا محتاجين اليه من الشرائع
كان ذلك تاخير البيان عن وقت
الحاجة وانه لا يجوز (الثالث) و
هو الذي ذكره القفال وهو المختار
ان الدين ما كان ناقصا البتة
بل كان ابدا كاملا يعني
كانت الشرائع النازلة من عند
الله في كل وقت كافية في ذلك
الوقت الا انه تعالى كان عالما
في اول وقت المبعث بان ما هو
كامل في هذا اليوم ليس بكامل
في الغد ولا صلاح فيه فلا جرم كان
ينسخ بعد الثبوت وكان يزيد
بعد العدم واما في آخر زمان المبعث
فانزل الله شريعة كاملة وحكم
ببقائها الى يوم القيامة فالشرع ابدا
كان كاملا الا ان الاول كمال الى
زمان مخصوص والثاني كمال الى يوم
القيامة فلاجل هذا المعنى قال
اليوم اكملت لكم دينكم

تفسیر کبیر جلد ثالث صفحہ ۲۸-۵۲۷

کہ تم محتاج تھے۔ اس کو میں نے مکمل طور پر
تمہیں بتا دیا مگر یہ توجیہہ بھی کمزور ہے کیونکہ
نزول آیت سے پہلے اگر انھیں وہ شرائع مکمل
طور پر نہیں بتائے گئے جن کے وہ محتاج تھے
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حاجت کے وقت
ان کو بتایا نہیں گیا، اور اس کے بیان میں
تاخیر کی گئی حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ تیسرا جواب
وہ ہے جس کو قفال نے ذکر کیا ہے اور یہی ہمارے
نزدیک صحیح ہے۔ وہ یہ کہ دین اس آیت کے نزول
سے پہلے ناقص نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ کامل تھا یعنی اللہ
کی طرف سے جس وقت جتنی شریعت نازل ہوئی وہ اس
وقت کی حد تک بالکل کافی تھی۔ البتہ اللہ تعالیٰ
کو ابتدائے بعثت ہی میں اس کا علم تھا کہ آج
جو کامل ہے وہ کل کے لیے اور آئندہ حالات کی
اصلاح کیلئے کامل نہیں ہے پس بلا شبہ وہ نازل
شدہ حکم کو منسوخ کرتا تھا اور غیر نازل شدہ حکم کو نازل
کرتا تھا یہاں تک کہ بعثت کے آخری دور میں اللہ تعالیٰ
نے کامل شریعت نازل فرمائی اور اسکو قیامت تک باقی
رکھنے کا فیصلہ فرمایا۔ پس شریعت ہمیشہ کامل ہی تھی فرق یہ
ہے کہ پہلے اسکا کامل ہونا ایک مخصوص زمانے کے اعتبار سے
تھا اور بعد کا کمال قیامت تک کیلئے ہے پس اسی مفہوم
کی بنا پر فرمایا کہ "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا"

اس کا مطلب ہے کہ کسی وقت خاص میں کسی شخص یا قوم سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہو

اس وقت اس کیلئے دین کامل وہی ہے جو اس سے اس وقت مطلوب ہے۔ البتہ امکانی مطلوب یا ممکن الوقوع حالات کے اعتبار سے احکام کی مفروضیت کا جہانتک تعلق ہے اسکے اعتبار سے قیامت تک کیلئے دین کامل اس پورے مجموعے کا نام ہے جو آخری طور پر نازل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے تو اسکی اپنی حد تک اس کا دین کامل ہو گیا۔ اسکے بعد اگر ایسا ہو کہ صاحب نصاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ سالانہ زکوٰۃ نہ نکال سکا عدالت میں سچی گواہی دینے کیلئے حاضر ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ وراثت تقسیم کرنیکا موقع اسے پیش نہیں آیا تو اس سے اس کے دین میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا کیونکہ ان احکام پر وہ صدق دل سے ایمان رکھتا ہے اور اس کیلئے بالکل آمادہ ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ اسے ایسے حالات میں لے جائیگا جب احکام بھی اس پر وارد ہو رہے ہوں تو وہ پوری طرح ان کی تعمیل کرے گا۔

حصہ دوم

اب ہم یہ معلوم کرینگے کہ دین کی اصل کیا ہے اور اسکے دوسرے متعلقات کیا ہیں جو اصل کے اعتبار سے اس میں پیدا ہوتے ہیں اس سلسلے میں جب ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۝ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ ذاریات - ۵۶

اس آیت کے مطابق انسان خدا کا بندہ ہے اور خدا نے اس کو جس غرض کے لیے پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے۔ "عبادت" کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکانا اور پست کرنا (اصل العبودیۃ الخضوع والتذلل لسان العرب) عبادت کا جو لغوی مفہوم ہے وہی اس کا شرعی مدلول بھی ہے۔ ابو حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ:۔

العبادۃ التذلل قالہ الجمھور عبادت کا مطلب پستی اور عاجزی ہے یہی جمہور کا قول ہے۔ البحر المحیط، جلد اول صفحہ ۲۳

عبادت کا اصل مفہوم اگرچہ خضوع اور تذلل ہی ہے مگر خدا کی نسبت سے جب یہ لفظ بولا جائے تو اس میں محبت کا تصور بھی شامل ہو جاتا ہے کیونکہ مومن کے لیے خدا کا تصور کسی ڈراونی چیز کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ ایک انتہائی محبوب آقا کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرنا ہے اسی لیے عبادت کا مکمل تصور دینے کے لیے علماء ان دونوں چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

العبادۃ فی اللغۃ من الذلۃ یقال
طریق معبد و بعیر معبد ای مذلل
وفی الشرع عبارۃ عما یجمع کمال
المحبۃ والخضوع والخوف

عبادت کے لغوی معنی پست ہونے کے ہیں۔ اسی
سے طریق معبد اور بعیر معبد کہا جاتا ہے۔ اور شریعت
میں اس سے مراد ایک ایسی چیز ہے جس میں انتہائی محبت
کے ساتھ انتہائی خضوع اور خوف جمع ہو گیا ہو

تفسیر القرآن، جلد اول صفحہ ۲۵

ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

لفظ العبودیۃ یتضمن کمال الذل
وکمال الحب

عبودیت انتہائی عاجزی اور انتہائی محبت
کے مجموعے کا نام ہے۔

رسالۃ العبودیۃ، صفحہ ۲۸

ابن قیم نے لکھا ہے:

العبادۃ تجمع اصلین: غایۃ الحب
بغایۃ الذل والخضوع۔

عبادت کے دو اجزا ہیں۔ انتہائی محبت
انتہائی عجز اور پستی کے ساتھ

تفسیر ابن قیم، صفحہ ۶۵

معلوم ہوا کہ عبادت کا مطلب اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا سے بے حد ڈرنا اور خدا سے بے حد محبت کرنا ہے۔ یہی ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اس دنیا میں ہمارا بہترین حاصل یہ ہے کہ ہم خدا کو اپنے محبوب یا لک کی حیثیت سے پالیں، ہم کو وہ دل ملا ہو جو خدا کی محبت اور اس کے خوف سے بھرا ہوا ہو، ہم کو وہ صبح و شام میسر آئیں جب ہم اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ اپنے رب کی طرف لپک رہے ہوں، ہم کو وہ نظر ملے جو ہر چیز میں خدا کو دیکھے اور وہ ذہن ملے جو ہر واقعہ سے خدا کی یاد حاصل کرے، ہم سب سے بڑھ کر اس کے اوپر اعتماد کریں، ہماری تمنائیں اور حوصلے اس کے لیے وقف ہوں، ہماری زندگی ہمہ تن اس کی طرف لگی ہوئی ہو، خدا ہمارا سب کچھ بن جائے۔

یہی دین کی اصل حقیقت ہے اور یہی ہمارے رب کو اصلاً ہم سے مطلوب ہے، لیکن جس طرح انسان اصل حقیقت کے اعتبار سے "روح" ہونے کے باوجود خارجی طور پر اپنا ایک "جسم" رکھتا ہے۔ اسی طرح دین کا بھی ایک مظہر اور اس کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اسی ڈھانچہ کا نام شریعت ہے ــــ جس طرح جسم

کے بغیر اس مادی دنیا میں "انسان" کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اس ڈھانچے کے بغیر اسلامی حقیقت بھی کہیں پائی نہیں جا سکتی۔ شریعت اسلام کے ساتھ اسی طرح لازمی ہے جس طرح روح کے ساتھ جسم۔ یہ در اصل جوارح کے اوپر اس خدا کو طاری کرنا ہے جس کو کیفیت کے طور پر ہم نے اپنے دل پر طاری کیا ہے۔ یہ اپنے محبوب آقا کے آگے جھکنا اور اسکی عملی اطاعت کرنا ہے۔ اور جب تک دونوں چیزیں نہ پائی جائیں اسلام کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں :-

لا یخفی ان تخصیص العبادۃ بہ تعالی	عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرنا اس وقت
لا یتحقق الا بتخصیص الطاعۃ ایضا	تک متحقق نہیں ہوتا جب تک اطاعت کو بھی اللہ
بہ تعالی ومتی لم یخص بہ جل	کیلئے خاص نہ کر دیا جائے جبتک اطاعت خدا
شانہ لم تخص العبادۃ بہ	کیلئے خاص نہ کی جائے اس وقت تک گویا عبادت
سبحانہ	بھی خدا کیلئے خاص نہیں ہوتی۔

روح المعانی جلد ۱۰، صفحہ ۷۵-۷۶

عبادت کا لفظ اگرچہ ایک لحاظ سے بہت وسیع ہے کیونکہ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جسکی غرض خدا کی خوشنودی ہو، خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عمل سے مگر احکام کے نوعی فرق کو سمجھنے کے لیے فقہاء اسکو متعین مفہوم میں لیتے ہیں عقیدہ یا دوسرے لفظوں میں اللہ سے صحیح ذہنی اور قلبی تعلق پیدا ہو جانے کے بعد ہم سے جو کچھ مطلوب ہے، وہ فقہا کی تقسیم کے مطابق تین ہے۔ عبادت اخلاق، معاملات اس تقسیم میں عبادت سے مراد پرستش ہے، یعنی وہ مخصوص اعمال جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کے اعتراف میں اس کے سامنے بجالاتا ہے مثلاً نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی دعا اور ذکر وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بذات خود بھی عبادت ہیں اور اخلاق سے مراد بندوں کے ساتھ الفت، محبت، نیکی اور بھلائی کا وہ برتاؤ ہے جس کی اسلام نے تلقین کی ہے اور معاملات سے مراد لوگوں کے ساتھ تعلقات اور کاروبار میں قانون الٰہی کی پابندی اور زندگی کی سرگرمیوں میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کی تعمیل ہے۔

جہانتک پرستش اور اخلاق سے متعلق چیزوں کا تعلق ہے وہ نہایت واضح ہے۔ البتہ آخری جزو کی کسی قدر تفصیل مناسب ہوگی۔

"معاملات" کا لفظ جن احکام کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے اس کے دو حصے ہیں، ایک انفرادی احکام اور دوسرے اجتماعی احکام انفرادی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جن کی تعمیل یا عدم تعمیل کا انحصار ایک شخص کی مرضی پر ہوتا ہے۔ یہ احکام ہر شخص سے ہر حال میں لازماً مطلوب ہیں اور "وسع" کے ہوتے ہوئے وہ کبھی ساقط نہیں ہوتے۔ مگر اجتماعی احکام کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان کی تعمیل کسی ایک شخص کی مرضی پر منحصر نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اسی وقت روبعمل آتے ہیں جب پورا معاشرہ ان کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ احکام ہمیشہ اس وقت نازل ہوئے جب اہل ایمان اس پوزیشن میں ہو گئے تھے کہ وہ ان کو اپنے درمیان بزور نافذ کر سکیں۔ گویا ——— دین کے اجتماعی تقاضے مطلقاً شروع نہیں ہیں بلکہ حالات کی نسبت سے شروع ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کا دائرہ جس نسبت سے پھیلتا ہے اسی نسبت سے دین کے تقاضے بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب تنہا ایک شخص مومن ہو تو اس پر احکام کا اتنا ہی حصہ فرض ہو گا جتنا اس کی ذات سے متعلق ہے۔ جب اہل ایمان ایک یا چند خاندان کی صورت اختیار کر لیں تو یہ خاندان اپنے دائرہ کے لحاظ سے اس کے مخاطب ہوں گے، اور جب اہل ایمان کا کوئی گروہ ایک با اختیار معاشرہ کی حیثیت حاصل کر لے تو اس وقت پورے معاشرے کا فرض ہو گا کہ ——— خدا کی طرف سے اس کے اجتماعی معاملات کے لیے جتنے بھی احکام دیئے گئے ہیں۔ وہ ان سب کی مکمل پابندی اختیار کرے۔ اور چونکہ معاشرہ کے پیمانہ پر عمل اقتدار کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جب اہل ایمان کا کوئی معاشرہ اس حکم کا مخاطب ہو تو لازمی طور پر یہ مفہوم بھی اس میں شامل ہو گا کہ وہ اپنے اوپر ایک سیاسی امیر مقرر کریں اور اس کے ماتحت اجتماعی زندگی بنا کر تمام شرعی قوانین کا اجراء عمل میں میں لائیں۔ کیونکہ:-

مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجبٌ — وہ چیز جس کے بغیر واجب کی ادائیگی ممکن نہ ہو وہ خود واجب ہو جاتی ہے۔

نصب امامت کا مسئلہ اسی آخری صورت حال سے متعلق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء اس بحث کو دار الاسلام کی بحث کے تحت اٹھاتے ہیں۔

حصہ سوم

اس وضاحت کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں دینی دعوت کے تحت ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ یہ خاص طور پر چار کام ہیں جن کو مندرجہ ذیل طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مسلمانوں میں حقیقت دین پیدا کرنا اور انکو صحیح معنوں میں خدا کا عابد اور پرستار بنانا۔

۲۔ ان اخلاق و اعمال کو اپنی زندگی میں شامل کرنے پر ابھارنا جن کے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے مکلف ہیں۔

۳۔ غیر مسلموں کے حلقہ میں اسلام کا تعارف

۴۔ مسلمانوں کے اندر باہمی تنظیم اور اجتماعیت پیدا کرنے کی کوشش۔

جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دین کا اصل اور اولیں کام یہ ہے کہ بندے اپنے خدا سے تعلق پیدا کریں اور اس کے عابد اور پرستار بن جائیں تو دینی دعوت کے پروگرام کا اولیں جزو بھی یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اس دینی حقیقت کو اپنی پوری کیفیات کے ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی طرح دوسرا جزو بھی نہایت واضح ہے کیونکہ مسلمان خلا میں نہیں ہیں بلکہ کچھ انسانوں کے درمیان ہیں۔ اور بہر حال ان سے تعلق قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی انسانی تعلق کو ـــــــ خواہ وہ مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلموں سے ـــــــ صحیح طور پر نبھانے کا نام اسلامی اخلاق ہے۔ اسی طرح دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے انھیں خاندان اور سماج کے دائرے میں بہت سے عمل کرنے ہوتے ہیں۔ ایک لقمہ جو کسی مسلمان کے حلق کے نیچے اترتا ہے اور کپڑے کا ایک ٹکڑا جو اس کے بدن پر نظر آتا ہے۔ وہ درجنوں سماجی تعلقات سے گزرنے کے بعد اسے حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام مواقع پر مسلمان عین اپنے ایمانی جذبے کے تحت مجبور ہے کہ وہ "عمل صالح" کا رویہ اختیار کرے۔ تیسری شق میں بھی کوئی ابہام نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا یہ یقین کہ اسلام ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے اور ہمارا یہ مشاہدہ کہ دنیا میں بہت سے لوگ اس راہ نجات سے محروم رہ کر تیزی سے تباہی کے راستے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ یہ

دونوں چیزیں مل کر ہمارے اس فرض کو متعین کر دیتی ہیں کہ ہم ان بھٹکے ہوئے بندگان خدا کو نجات کے راستہ پر لانے کی جدوجہد کریں۔ پھر ہمارا یہ ایمان کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہوگئی ہمارے اس احساس میں شرعی ذمے داری کا عنصر پیدا کر دیتا ہے کیونکہ نبوت کو ختم ماننے کا لازمی تقاضا ہے کہ نبوت کو ماننے والے اب اس کام کو انجام دیں جس کے لیے پہلے انبیاء تشریف لاتے تھے اور جو بدستور ابھی کرنے کے لیے باقی ہے

اب چوتھی شق رہ جاتی ہے یعنی اجتماعی تنظیم۔ یہ کام اگرچہ براہ راست اخروی قدروں سے متعلق نہیں ہے مگر اس حیثیت سے وہ بالواسطہ طور پر اس سے متعلق ہو جاتا ہے کہ دنیوی زندگی کے جس لازمی راستہ سے گزر کر اسے آخرت کی منزل کی طرف سفر کرنا ہے وہ ایک ایسی دنیا ہے جو مختلف اعتبارات سے اجتماعیت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اجتماعیت کے بغیر آدمی نہ تو زندہ رہ سکتا اور نہ کوئی عمل صحیح طور پر انجام دے سکتا۔ خدا سے تعلق اور اس کی عبادت اگر ہمارا فریضہ ہے تو اجتماعیت اس فریضہ کے لازمی معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں حکم ہے کہ تین مسلمان بھی اگر کہیں موجود ہوں تو وہ باہم مل کر اپنا ایک امیر بنا لیں۔ اور قرآن میں صریح الفاظ میں یہ حکم دیا گیا ہے:۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا		اللہ کی رسی میں سب کے سب بندھ جاؤ

ولا تفرقوا (آل عمران — ۱۰۳)		اور متفرق مت ہو۔

یہ تنظیم کیسی ہو اس کا تعین حالات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ ہجرت سے پہلے مکہ اور مدینہ میں جو حالات تھے، وہ صرف ایک ہلکی قسم کی غیر سیاسی اجتماعیت کا تحمل کر سکتے تھے چنانچہ اس وقت اسی قسم کی تنظیم اختیار کی گئی۔ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اس اجتماعیت اور تنظیم کا مرکز تھی۔ اسی طرح مدینہ میں جب ہجرت سے پہلے کچھ لوگ ایمان لائے تو ان کے درمیان اپنے بارہ آدمیوں کو بطور "نقیب" مقرر کیا اور ان سے فرمایا:۔

انتم کفلاء علی قومکم		تم اپنی قوم کی دینی نگرانی کے ذمہ دار ہو

اس کے بعد ہجرت ہوئی اور اسلام نے سیاسی استحکام حاصل کر لیا تو باقاعدہ سیاسی تنظیم قائم ہو گئی۔ جس کے سربراہ اپنی زندگی میں جناب رسالت مآب تھے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء

راشدین۔

ہندستان کے موجودہ حالات میں جس نوعیت کی تنظیم مسلمین ہمارا فریضہ ہے، وہ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے اور اس کا مقصد مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

و اقامت جمعہ در دار الحرب اگر از طرف کفار والی مسلمانان در مکان منصوب باشد باذن او درست است۔ و الا مسلمانان را باید کہ یک کس را کہ امین و متدین باشد رئیس قرار دہند کہ باجازت و حضور او اقامت جمعہ و اعیاد و انکاح من لا ولی من الصغار و حفظ مال غائب، و ایتام و قسمت ترکات متنازع فیہا علی حسب السہام محدودہ باشد بے آنکہ در امور ملکی تصرف کند و مداخلت نماید ۔ لہ	اگر کفار کی طرف سے (باختیار) مسلمان والی دار الحرب کے کسی مقام میں مقرر ہو تو اس والی مسلم کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے۔ ورنہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ ایک امین اور دیندار شخص کو خود ہی امیر مقرر کرلیں اور اس کے حکم سے جمعہ و عید کی نماز قائم ہو، جن نابالغوں کا کوئی ولی نہ ہو انکا نکاح پڑھایا جائے اور یتیموں اور غائب ہوجانے والوں کے مال کی حفاظت کی جائے اور موافق حصص شرعیان ترکات کی تقسیم کی جائے جس میں نزاع ہو۔ ملکی معاملات میں تصرف و مداخلت کے بغیر۔
فتاوی عزیزی جلد اول صفحہ ۳۲	

اوپر چند سطروں میں ہندستان کے مسلمانوں کے کرنے کا جو کام میں نے بتایا ہے یہی اس طرح کے مسلمانوں کی دینی ذمے داریوں کے بارے میں ہمیشہ سے تصور رہا ہے۔ پچھلی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان جہاں بھی کسی ایسے علاقہ میں جاکر آباد ہوئے ہیں جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت تھا۔ وہاں ان کا طریق عمل یہی رہا ہے۔ اولاً ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ خود ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزاریں وہ خدا کے سچے عابد اور مطیع بن جائیں۔ اسی کے ساتھ وہ گرد و پیش کی آبادی کو ایمان و اسلام کی دعوت دینا شروع کرتے تھے وہ انھیں جہنم کے راستہ سے ہٹاکر جنت کے راستہ پر لانے کے لیے اپنی ساری قوت لگا دیتے تھے، اور تیسرا کام وہ یہ کرتے تھے کہ اپنے دائرہ میں اپنی ایک تنظیم بنالیتے تھے اور ایک امیر کے تحت اپنے شرعی

فرائض ادا کرتے تھے۔

جہاں تک اس لائحہ عمل کی ابتدائی شقوں کا تعلق ہے، وہ بالکل واضح ہیں۔ ان مسلمانوں کے حالات اور ان کی تبلیغی کوششوں کے بارے میں کوئی بھی کتاب دیکھ کر آدمی معلوم کر سکتا ہے کہ وہ اپنی اسلامی ذمے داریوں کو کیسے ادا کرتے تھے اور ان کے دعوت و تبلیغ کا انداز کیا ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے بارے میں نظائر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ آخری شق کے بارے میں میں چند حوالے نقل کروں گا۔

چھٹی صدی ہجری میں جب کافر تاتاریوں نے ایران و خراسان و ترکستان و عراق پر قبضہ کر لیا تو علمائے وقت نے اس سے مسلمان والی کا مطالبہ پیش کیا[1]۔ مالابار میں جب مسلمان آکر آباد ہوئے تو وہاں انھوں نے باقاعدہ اپنا ایک نظام قضا قائم کیا جس کی تفصیل تحفۃ المجاہدین میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں صدر جہاں کے نام سے، اس قسم کا عہدہ قائم تھا جس کے تحت تمام قضاۃ و محتسب و ائمہ ہوتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم تک فلپائن، آسٹریلیا، ہنگری، بلگریا، زیکوسلاویہ، یونان اور پولینڈ کے مسلمانوں کے تمام قومی اور مذہبی صیغے ایک مفتی اعظم کے ماتحت ہوتے تھے۔ اور وہ ایک تنظیمی وحدت کے تحت اسلامی زندگی گزارتے تھے۔ اسی طرح مسلمان تجارتی ضرورتوں اور دوسرے اسباب سے جن غیر اسلامی سلطنتوں میں گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ وہاں انھوں نے اپنی اسلامی تنظیم بھی قائم کی۔

تیسری صدی ہجری میں مسلمان تاجروں کی نوآبادی چین کے شہر خانفو میں تھی۔ مگر وہ کس طرح رہتے تھے اور ان کے احکام و معاملات کیونکر فیصل پاتے تھے۔ سلیمان تاجر اپنے تیسری صدی ہجری کے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

ان بخانفو وھو مجمع التجار　　　شہر خانفو (چین) میں، جو (مسلمان) تاجروں

---

[1] ہندوستان میں نظام قضا قائم کرنے یا امور مسلمین کے تحفظ کے لیے اگر اسمبلیوں سے مدد ملنے کی امید ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ ان مقاصد کیلئے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جانا بالکل جائز ہے۔ اور چھٹی صدی کا یہ واقعہ اس سلسلہ میں ہمارے لیے قطعی نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسمبلی میں امور مسلمین کیلئے قانون پاس کرانا ایسا ہی ہے جیسے کافر تاتاری حکومت سے مسلمان والی کے تقرر کا مطالبہ کرنا۔

رجلا مسلما يوليه صاحب الصين	کا مرکز ہے ایک مسلمان ہے جس کو شاہ چین ان
الحكم بين المسلمين الذين يقصدون	مسلمانوں کے درمیان فصل احکام کے لیے
الى تلك الناحية وان التجار العراقيين	مقرر کرتا ہے جو اس ملک میں جاتے ہیں۔
لاينكرون من ولايته شيئا في	اور عراقی تاجر اس کی ولایت کے احکام
احكامه وعمله بالحق وبما في كتاب	اور حق کے ساتھ اور کتاب الٰہی اور احکام
الله عز وجل واحكام الاسلام	اسلامی کیا تھا اسکے جاری کردہ حکموں سے سرتابی نہیں کرتے

عراقیوں کی فارسی زبان میں اس مسلمان والی یا قاضی کا نام ہنرمند تھا جو عام استعمال میں ہنرمن بولا جاتا تھا۔ خود ہندستان کے مختلف ساحلی شہروں میں جہاں جہاں مسلمان آباد تھیں، یہ ہنرمند غیر اسلامی سلطنتوں میں اسلامی تنظیم و قضا کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے جہاز راں بزرگ بن شہریار اپنے سفرنامہ عجائب الہند میں صیمور (مدراس کے قریب) میں عباس بن ماہان سیرافی ہنرمند کا تذکرہ کرتا ہے۔

انه كان بصيمور رجل من اهل	صیمور میں سیراف کا ایک شخص تھا جس کو عباس
سيراف يقال له العباس بن ماهان	بن ماہان کہتے تھے۔ اور جو وہاں مسلمانوں
وكان هنرمن المسلمين بصيمور ذو جاه	کا ہنرمند تھا اور شہر کا ذی وجاہت اور۔ وہاں
البلد والمنضوى اليه من المسلمين	کے پناہ گزین مسلمانوں کا مرکز تھا۔

وہاں کا راجہ مسلمانوں کے متعلق اسی کے فتویٰ پر فیصلہ کرتا تھا۔ اسی مقام میں ۳۰۴ھ میں مشہور سیاح مسعودی پہونچتا ہے وہ کہتا ہے:۔

على الهنرمنة يومئذ ابو سعيد معروف	ہنرمندی کے منصب پر ان دنوں ابوسعید
بن زكريا والهنرمنة يراد به	معروف بن زکریا تھا اور ہنرمند سے مراد رئیس
رئيس المسلمين وذالك ان الملك	المسلمین ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ راجہ
يملك على المسلمين رجلا من رؤسائهم	مسلمانوں پر انکے رئیسوں میں سے ایک کو افسر بنا دیتا
تكون احكامهم مصروفة اليه۔	ہے مسلمانوں کے تمام مقدمات و احکام اسی کی طرف
	رجوع ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقلیت کے علاقے میں اسلامی زندگی کی آخری صورت بس یہی ہے کہ کفار کی ماتحتی میں مسلمان حسب استطاعت بس ایک امکانی زندگی گزارتے رہیں بلکہ اس کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ غیر مسلم اقتدار کے تحت ہم اپنی شرعی ذمے داریوں کا کیا تصور قائم کریں اور اپنی اسلامی جدوجہد کا آغاز کہاں سے کریں تاکہ ایک طرف ہم خدا کے حضور بری الذمہ ٹھہریں اور دوسری طرف خدا کی اس نصرت و معیت کے مستحق قرار پا سکیں جس سے دنیا میں مزید انعامات کی راہیں کھلتی ہیں اور اہل ایمان کے سارے کام بنا دیئے جاتے ہیں۔

جہاں تک غیر اسلامی اقتدار میں تغیر کیلئے جدوجہد کا سوال ہے۔ یہ مسلم علاقے میں تو فرض علی الکفایہ کے درجہ میں مطلوب ہے۔ مگر غیر مسلم علاقے میں اس کی یہ نوعیت نہیں ہے غیر مسلم علاقے میں شرعی نصب العین کے طور پر ہمارا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہاں ہم لازمی طور پر اسلامی حکومت برپا کرنے کی جدوجہد کریں۔ مگر شرعی فریضہ نہ ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت، اقتدار ہر فکر اور ہر عقیدہ کے لیے ایک اہم ترین عنصر ہے حکومت کا مسلمان ہونا ہر پہلو سے دین اور اہل دین کے لیے اپنے اندر بے شمار فوائد رکھتا ہے اور اس اعتبار سے وہ یقینی طور پر اہل ایمان کی ایک پسندیدہ چیز (اخری تحبونها) ہے۔ اور اگر حالات اور مواقع موجود ہوں تو یقیناً یہ جدوجہد بھی ہونی چاہیئے کہ اقتدار بدلے اور اسلامی نظام حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ اس طرح کی مہم میں حصہ لینا عین جہاد ہے اور اس کی راہ میں جان قربان کرنا یقینی طور پر شہادت کا درجہ پانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلم علاقے میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کا مسئلہ ایک نظریاتی مسئلہ ہے یعنی وہ عقیدے کے براہ راست تقاضے کے طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ غیر مسلم علاقے میں اسلامی اقتدار لانے کی کوشش ایک عملی سوال ہے جس کا شامل پروگرام ہونا حالات پر موقوف ہے نہ کہ عقیدے اور نظریے پر۔

حصہ چہارم

اس تحریر کے آخری حصہ میں مجھے طریق کار کے بارے میں اپنی معروضات پیش کرنی ہیں، مگر فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی متعین خاکہ نہیں پیش کروں گا، بلکہ صرف

چند اصولی باتوں پر اکتفا کروں گا۔ آئندہ حسب ضرورت تفصیلی پروگرام بھی پیش کیا جا سکتا ہے

۱۔ طریق کار کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ اصولی بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ کوئی بھی طریق کار اس طرح حقیقی نہیں ہوتا جیسے کہ اصل دعوت حقیقی ہوتی ہے۔ طریق کار قطعی طور پر ایک اضافی اور اجتہادی چیز ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ مختلف حالات میں اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ بلکہ ایک ہی ماحول میں اجتہاد کے اختلاف کی بنا پر اس کے ایک سے زیادہ خاکے سوچے جا سکتے ہیں۔ طریق کار در اصل نام ہے اس بات کا کہ انسان کی نفسیات۔ کسی وقت کے مخصوص طرز فکر اور زمانے کے سماجی اور سیاسی حالات کے سہ طرفہ تقاضوں کے درمیان دعوت کا ایک ہم آہنگ انطباق تلاش کیا جائے۔ اس میں کچھ اجزاء دائمی ہوتے ہیں اور کچھ وقتی ضرورت کے تحت پیدا ہوتے ہیں کچھ پرانی شکلیں ہوتی ہیں اور کچھ نئی شکلیں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ ایک نہایت نازک ترکیب ہے جو حکمت، دینی بصیرت اور ذہانت کے علم کے تحت وجود میں آتی ہے۔

۲. دوسری بات یہ کہ ایک طریق کار اگر کچھ دنوں کے تجربے سے بعض یا چند پہلوؤں سے کامیاب نظر آنے لگے، تو اس کا مطلب یہ لینا چاہیئے کہ وہ علی الاطلاق ایک کامیاب طریق کار ہے اصل میں بات یہ ہے کہ ہر دور اگرچہ بعض ابھری ہوئی خصوصیات کے اعتبار سے ایک خاص قسم کا دور شمار کیا جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ ہر دور میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بھی کام شروع کیا جائے وہ اگر کچھ دنوں تک جاری رکھا جائے تو اپنے مزاج کے مطابق انسانوں کی ایک تعداد کو متوجہ کر لیتا ہے۔ اس طرح ہر تحریک کو کروڑوں انسانوں میں سے ہزاروں انسان مل جاتے ہیں۔ اور ہوتے ہوتے کروڑوں انسانوں کے سمندر میں کچھ ہزار انسانوں کا ایک جزیرہ بن جاتا ہے یہ جزیرہ پریس، اجتماعات، ملاقاتیں، خط وکتابت، تحفے اور چندے وغیرہ کے ذریعہ اپنا ایک حدود اربعہ بنا لیتا ہے، جن کے درمیان خیالات، ملاقات اور وسائل و ذرائع کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں، اب جو لوگ اس حدود اربعہ میں بستے ہیں، وہ چونکہ عملاً کسی دوسرے طریق کار کے مقابلے میں اپنے حلقے کے طریقہ کا زیادہ تجربہ کر رہے ہوتے ہیں، نیز اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر ان نتائج کو کل نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو ان کے مخصوص عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اس لیے وہ ایک طرح کے مصنوعی یقین میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا طریق کار سب سے

زیادہ کامیاب اور صحیح طریق کار ہے۔ وہ اپنی جگہ پر برسرِ حق ہونے کے باوجود ایک ایسی غلطی کے مرتکب ہو جاتے ہیں جس کو نہ خارجی دنیا کی تصدیق حاصل ہوتی ہے اور نہ علمی تجزیہ اس کو تسلیم کرتا ہے۔

۳۔ پھر اس سلسلے میں یہ اہم بات بھی جان لینی چاہیئے کہ طریق کار اور تصورِ دعوت کے درمیان کوئی شئینی نوعیت کا تعلق نہیں ہے یعنی طریق کار کسی دعوت کی یکساں تکرار کا نام نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ قانونی الفاظ کی طرح کوئی مقررہ ڈگر ہے جس کو آنکھ بند کر کے بس ایک متعین شکل میں دہراتے رہنا ہے۔ دعوت اپنی علمی اور منطقی تشریح میں بلاشبہہ ایک متعین چیز نظر آتی ہے مگر عمل میں آنے کے بعد وہ اسی طرح غیر متعین چیز بن جاتی ہے جیسے پانی لیبارٹری کے آزمائشی گلاس میں تو ایک ساکن چیز ہے مگر دریا میں پہنچ کر وہ موج اور طوفان بن جاتا ہے دعوت کی منطقی تشریح اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کے بارے میں صحیح علمی تصور قائم ہو، صحیح ذہن بنیں اور نفسیات کی صحیح نشوونما ہو۔ مگر عملی زندگی اس قسم کی یکسانیت کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ عملی نقشے بدل جاتے ہیں، اگرچہ ذہن کا نقشہ پھر بھی اپنی اصل شکل میں باقی رہتا ہے۔

اس کی ایک واضح مثال تبدیلیٔ اقتدار کا مسئلہ ہے۔ اقتدار کی تبدیلی دین کی حکیمانہ تشریح میں جس مقام پر نظر آتی ہے عملی زندگی میں ہمیشہ بعینہ اسی مقام پر نہیں رہتی۔ ذہن کی حد تک تو یہ بہر حال ضروری ہے کہ وہ اپنے واقعی مقام سے کبھی تجاوز نہ کرے۔ مگر عملی اعتبار سے صورت حال مختلف ہے کیونکہ اقتدار کو مسلم بنانے کا یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ بعض حالات میں یہ مسلمانوں کا شرعی فریضہ بن جاتا ہے۔ بلکہ وہ سماج کا سب سے طاقتور ادارہ ہونے کی وجہ سے ہر قوم کی ایک ضرورت ہے۔ کسی بھی فکر یا عمل کا اس سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی طور پر تبدیلی اقتدار کا مکلف نہ ہونے کی صورت میں بھی حکومت اہل ایمان کی ایک پسندیدہ آرزو (آخری تجزیہ میں) ہے اور حالات اگر پائے جائیں تو قانونی حیثیت سے قطع نظر یقیناً اس کے لیے کوشش کی جائے گی اور اس وقت یہ کوشش اعلیٰ ترین ثواب کا کام ہوگا۔

۴۔ ہر شخص کی طرح میرے ساتھ بھی کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ٹرین کا سفر ایک ایسے موسم میں کرنا پڑا جبکہ غیر مسلموں کا کوئی مذہبی میلا چل رہا تھا، میں نے دیکھا کہ بے شمار مخلوق ریل کے

ڈبوں میں آکر اس طرح بھر گئی ہے کہ وہاں اتنی بھی جگہ نہیں ہے کہ وہ اپنے سر کی گٹھری کو سر سے اتار کر کہیں رکھ سکے۔ وہ زبردست بھیڑ کے درمیان اس طرح دبا ہوا کھڑا ہے کہ وہ خود گاڑی پر سوار ہے اور اس کی گٹھری اس پر سوار۔

"وہ کیا چیز ہے جو ان بے شمار انسانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے" —— ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ کوئی حقیقی چیز ایسی نہیں ہے جو اس عظیم حرکت کے پیچھے موجود ہو۔ اس کا محرک صرف روایت ہے نہ کہ حقیقت۔ تاریخی روایات نے بعض چیزوں کی اہمیت اس طرح ان کے ذہن میں بٹھا دی ہے کہ دلیل اور منطق کے فقدان کے باوجود وہ اس کو ماننے پر مجبور ہیں۔

یہی صورت دینی دعوت میں بھی ممکن ہے۔ ہمارے یہاں کچھ ایسے طریقے ہو سکتے ہیں۔ جن کے پیچھے اگرچہ منطق اور دلیل کی طاقت زیادہ موجود نہ ہو۔ مگر وہ اسلاف سے چلے آرہے ہوں اور اس طرح روایت کا وزن پوری طرح ان کے حق میں جمع ہو گیا ہو — اب اگر کوئی دینی دعوت اس روایتی غلاف میں ملفوف ہو کر لوگوں کے سامنے آتی ہے تو قدرتی طور پر بے شمار ایسے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے جو ان روایات کے سائے میں پلے اور بڑھے ہیں۔ اس طرح بہت جلد عوام کی ایک بھیڑ اس دینی دعوت کے گرد اکٹھا ہو جائیگی مگر اس رجوع کو لازمی طور پر اصل دعوت کی کامیابی نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اگر روایتی غلاف موجود نہ ہوتا تو صورت حال مختلف نظر آتی۔

یہ چند باتیں صرف طریق کار کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے عرض کر دی گئی ہیں۔ باقی موجودہ حالات میں طریق کار کا تفصیلی نقشہ کیا ہو۔ یہ مندرجہ بالا وضاحتوں کے بعد کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں رہتا۔ اور بوقت ضرورت اس کا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

مفید، علمی، فقہی اور تاریخی کتابیں

رحمۃ للعالمین از: قاضی سلیمان منصور پوری
مکمل غیر مجلد دو جلدوں میں =/۲۰

رسول اللہ کی سیاسی زندگی از: ڈاکٹر حمید اللہ
=/۸

حضرت ابوبکرؓ و فاروق اعظمؓ از: ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مجلد)
دونوں ایک جلد میں ۶/۷۵

تاریخ الخلفاء از: علامہ سیوطیؒ مترجمہ اقبال احمد۔
خلفائے راشدین سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کے دور کے مکمل تاریخ۔ قیمت =/۱۲

حیاۃ الصحابہ (اردو) حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی کی مشہور تالیف کا ترجمہ۔
حصہ اول ۲/۷۵ حصہ دوم ۲/۷۵ سوم ۲/۷۵

ائمہ اربعہ از: رئیس احمد جعفری
چاروں اماموں کے سوانح حیات اور اجتہادی خدمات۔ مجلد =/۱۰

تذکرہ امام غزالی مختصر سوانح حیات
مجلد =/۲

حیات امام ابن القیم بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب
قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبد العظیم کے قلم سے۔ مترجمہ سید رشید احمد ارشد =/۱۲

فقہ الاسلام از: حسن احمد الخطیب۔ مترجمہ ایضاً ارشد صاحب:۔
فقہ اسلامی کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ اور دور جدید کے پس منظر میں اصول شریعت پر گفتگو۔
مجلد =/۱۲

فتاویٰ دار العلوم دیوبند مکمل
=/۲۱

فتاویٰ رشیدیہ یعنی مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کا مجموعہ
=/۸

مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر
مقالات امینی
مولانا محمد تقی امینی
یہ دونوں کتابیں فقہ اسلامی کے اصول اور اس کے اجتہادی کردار پر مسلسل غور و فکر کرنے والے ایک عالم کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اہل علم نے اس محنت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ آپ بھی ان عالمانہ کاوشوں سے فائدہ اٹھائیں۔ قیمت علی الترتیب =/۲ اور =/۵۰/۱

کائنات میں انسان کا مقام از: مولانا امینی
اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات میں انسان کے مقام پر ایک پرمغز مقالہ ۵۰/ صرف

کیا ہم مسلمان ہیں از جناب شمس نوید
قرن اول کے مسلمانوں کے آئینہ میں آج کے مسلمانوں کی صورت، بہت ہی وجد انگیز اور مؤثر پیرایہ بیان قیمت مجلد ۲/۲۵

انتخاب صحاح ستہ (اردو مع عربی) صحاح ستہ کی ۸ سو حدیثوں کا مجموعہ مجلد =/۵

براہین قاطعہ (نیا ایڈیشن) یہ کتاب اہل بدعت کی تردید میں لاثانی ہے۔ =/۵

کلمات اکابر از: مولانا محمد اسحٰق نیارسی
بزرگان دین کے حکیمانہ، عارفانہ اور ایمان افروز ملفوظات کا مجموعہ۔ عمدہ کتابت طباعت وغیرہ ۱/

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف: مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے نا آشنا ہے۔ یہاں تک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت -/۴
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۔۔۔ ۔۔۔ ۶/-		اعزازی خریداروں سے
پاکستان سے ۔۔۔ ۔۔۔ ۷/-		پندرہ روپے
ششماہی		غیر ممالک سے ۔۔۔۔ ۱۲ شلنگ
ہندوستان سے ۔۔۔ ۔۔۔ ۳/۵۰		ہوائی ڈاک سے
پاکستان سے ۔۔۔ ۔۔۔ ۴/-		ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۴ھ مطابق اگست ۱۹۶۴ء | شمارہ (۳)

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکرٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کی پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی — **دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ**

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

ہندستان میں مسلمان بیشک اقلیت میں ہیں وہ ملک کی آبادی کا قریباً آٹھواں حصہ ہیں لیکن پھر بھی وہ ۵-۶ کروڑ کے قریب ہیں اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت سے علاقوں اور اہم شہروں میں ان کی آبادی کا تناسب ۲۰-۲۵ فیصدی اور کہیں کہیں اس سے بھی زائد ہے۔ ان میں علاقائی، لسانی، نسلی اور بہت سے اعتقادی و مسلکی اختلافات کے باوجود جس قدر دینی اور تہذیبی یگانگت اور ہم آہنگی ہے اور توحید، رسالت، قرآن اور قبلہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے ایمانی حقائق اور بنیادی تعلیمات پر جس حد تک اتفاق ہے اس کا دسواں حصہ بھی بہت سی قوموں اور ملتوں میں نہیں ہے، ....

.... پھر ان کے اَن پڑھ عوام تک میں دین کے تعلق سے ایک ایسا جذبہ یا ایسے جذبہ کا مادہ اور تخم موجود ہے جس کو بیدار اور متحرک کر کے ان کو بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایک شاندار تاریخ ہے جو ان میں عزم و ولولہ اور عالی حوصلگی پیدا کرنے کا نہایت مؤثر وسیلہ بن سکتی ہے ——

کسی ملک کی ۵-۶ کروڑ کی تعداد والی جس قوم میں یہ خصوصیات موجود ہوں وہ اس ملک میں ایسی بے وزن، بے اثر، بے وقار اور خوار ہو جیسی کہ ۱۶-۱۷ سال سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ہے۔ حیرت انگیز اور بہت سوچنے کی بات ہے اور یقیناً اس کی ذمہ داری ملت کی قیادت پر ہے، آج ہی کی قیادت پر نہیں، بلکہ گذشتہ پورے پچاس سالہ دور کی قیادت پر ہے جب سے کہ ملک میں عوامی تحریکات کا سلسلہ شروع ہوا۔

مسلمانوں کی سب سے پہلی عوامی تحریک خلافت کی تحریک تھی جو بیک وقت خلافت کی تحریک بھی تھی

اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی، یہ تحریک مسلمانوں کے جوش وخروش، ان کے باہمی اتحاد و اتفاق بلکہ ہندو مسلم اتحاد کے لحاظ سے بھی مثالی تحریک تھی، لیکن کمال اتاترک کے فیصلہ الغائے خلافت کے بعد خلافت کا مسئلہ ہی سرے سے ختم ہوگیا ____ تاہم مسلمانوں کے بہت سے بااثر لیڈر اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کا بھی ایک بڑا اور اہم طبقہ براہ راست کانگرس سے وابستہ رہ کر یا جمعیۃ العلماء یا مجلس احرار کے نام سے آزادی کی جد وجہد میں شریک رہا ____ پھر ۱۹۳۶ء کے جنرل الکشن کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کی کشمکش عوامی سطح پر شروع ہوگئی اور مسلمان لیڈر اور عوام دو حصوں میں بٹ گئے، ایک طبقہ کانگرس کے ساتھ رہا اور دوسرا طبقہ جس کے ساتھ آخر میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہوگئی مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگیا اور یہ دونوں اپنے اپنے راستہ پر چلتے رہے اور ان کے درمیان کشمکش اور کشیدگی بڑھتی گئی۔ یہانتک کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم پر یہ کشمکش ختم ہوئی اور دونوں حصوں میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد قومی حکومتوں کا نیا دور شروع ہوا ____ اس وقت سے ابتک ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی ایسی جد وجہد نہیں ہوئی ہے جسے عوامی تحریک کہا جاسکے لیکن مختلف جماعتوں کے پلیٹ فارم سے اور پریس سے ان تکلیف دہ حالات اور ناانصافیوں کے خلاف جن سے مسلمان اس ملک میں آزادی کے پہلے دن سے دوچار ہیں مسلسل احتجاج ہورہا ہے اور اپنی اپنی رائے یا مزاج کے مطابق مسلمانوں کو سرد یا گرم مشورے دیئے جارہے ہیں۔ یہ بھی دراصل ایک کام ہی ہے اور قوموں کی زندگی میں ایسے بڑے بڑے وقفے آتے ہیں جب ان کے لیے صرف اتنے ہی کام کا میدان ہوتا ہے پھر کسی وقت حالات کے سازگار ہونے پر یہی چیز کسی عوامی جد وجہد کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے۔

یہ ہے بہت ہی مختصر اور اجمالی جائزہ ہندوستانی مسلمانوں کی قریباً پچاس سالہ اُن عوامی تحریکات اور کوششوں کا جن کا تعلق سیاست وحکومت سے رہا ہے۔

جس قوم میں پچاس سال سے عوامی پیمانہ پر سیاسی کام ہورہا ہو وہ آج کے ہندوستان میں ۶.۵ کروڑ ہونے کے باوجود اور اپنی ان ملی خصوصیات کے باوجود جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور جن میں سے ہر خصوصیت طاقت کا ایک عظیم خزانہ ہے بالکل بے وزن، بے وقار اور بے اثر ہے، خالص ظاہری اسباب کے نقطۂ نظر سے یہ بات حیرت انگیز ہے اور آج کی گفتگو صرف اسی نقطۂ نظر سے ہے۔

اس عاجز نے جہاں تک غور کیا ہے اس میں بڑا دخل دو باتوں کا ہے۔ ایک یہ کہ اب تک مسلمانوں کی ہر تحریک اور ہر کام میں جوش و خروش اور جذبات ہی کی طاقت سے کام لیا گیا ہے ـــــ ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے، سیاسی مسائل اور عوامل کو سمجھنے اور غور کرنے اور حالات کے مطابق سرد یا گرم رویہ کا خوگر بنانے کا کام مختصر لفظوں میں سیاسی تربیت کا کام اس پچاس سالہ دور میں کبھی نہیں ہو سکا۔ اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ جن حالات میں جوش و خروش اور ہنگامہ خیزی مفید ہو اُن میں تو وہ اب بھی بہت اچھا رول ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ قیادت صحیح اور قابلِ اعتماد ہو، لیکن دوسرے حالات میں سوائے اس کے کہ اُن کے اکثر عوام و خواص کچھ جلی کٹی باتوں سے دل کی بھڑاس نکالیں یا ان کے کچھ قائدین صرف عاجزانہ درخواستیں اربابِ حکومت کی بارگاہ میں پیش کریں کوئی اور مفید اور نتیجہ خیز کام نہیں ہوتا اور نہ لوگوں کو اس کے امکانات نظر آتے ہیں۔

دوسری اہم چیز جس کو مسلمانوں کی اس سیاسی پسماندگی میں بڑا دخل ہے مسلمانوں کے دولت مند طبقہ کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سیاست سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتا اور اس کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھتا اس لیے اس میدان میں وہ اپنا فرض بالکل ادا نہیں کرتا ـــــ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اسی ملک میں رہنے والی وہ قوم جو ساری اقلیتوں کے مجموعہ کے مقابلہ میں بھی تنہا اسّی فیصدی ہے اور اس کی یہ عددی اکثریت اس کے ہر قسم کے مفادات کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اس کے دولتمند چونکہ سیاست کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اور دوررس اثرات کو جانتے سمجھتے ہیں اس لیے اتنی مضبوط اور محفوظ اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ کروڑوں روپیہ صرف پریس پر خرچ کرتے ہیں، ملک کے اکثر بڑے بلکہ قریب قریب سب ہی اخبارات ہندو سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں یا ان کی مدد سے چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں میں اور اسی طرح ریاستی قانون ساز مجلسوں کے ممبروں میں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے الکشن کے لاکھوں کے مصارف ہندو سرمایہ دار، بڑے تاجر اور ملوں کے مالک برداشت کرتے ہیں اور وہ وہاں اُن کے مفادات کی حفاظت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور آزادی کے دور سے پہلے کی یہ بات بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کانگریس کے ہندو لیڈروں میں جو لوگ جواہر لال جی کی طرح گھر کے دولتمند نہیں تھے اُن کی ضروریات کی کفالت ہندو سرمایہ دار کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ

بے فکری کے ساتھ سیاسی میدان میں کام کرتے تھے۔ خود گاندھی جی بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔

لیکن ہمارے مسلمان سرمایہ دار اجتماعی طور پر بھی آج تک ایک انگریزی روزنامہ کا انتظام نہیں کر سکے حالانکہ اس گئی گزری حالت میں بھی ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اگر اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیں تو ایک اعلیٰ درجہ کا روزنامہ بمبئی سے، ایک کلکتہ سے، ایک مدراس سے، ایک دہلی سے نکل سکتا ہے۔ لیکن سیاست سے بے تعلقی، بلکہ اس باب میں بے شعوری کا حال یہ ہے کہ جو لوگ بیٹوں بیٹیوں کی شادیوں میں ایک ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ خرچ کر دیتے ہیں اُن سے اگر کہا بھی جائے تو وہ اس مد میں ایک ہزار دینے کو آمادہ نہ ہوں گے۔ اور یہ حال صرف بے پڑھے یا کم تعلیمیافتہ سیٹھوں ہی کا نہیں ہو ہمارے تعلیمیافتہ طبقہ کے دولتمندوں کا حال بھی اس معاملہ میں قریب قریب یہی ہے ——— میرے ایک دوست ہیں بہت اونچے درجہ کے اور کامیاب وکیلوں میں ہیں، جہانتک مجھے معلوم ہے ایت معقول یافت ہے۔ دین سے بھی کافی لگاؤ ہے امور خیر میں خرچ کا حوصلہ بھی اللہ نے دیا، چند ہی مہینے کی بات ہو کہ کلکتہ کے مظلومین کے لیے بغیر کسی طلب اور تحریک کے ایک ہزار روپے لا کے خاموشی سے دیدیئے، اور دو چار ہی دن بعد ڈھائی سو مزید خود آ کے دے گئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کے بعض احباب نے دینی تعلیمی تحریک کی ضلعی انجمن کے لیے سرمایہ کی ضرورت کا ان سے تذکرہ کیا تو فوراً پانچسو روپے پیش کر دیئے لیکن جب مسلمانوں کے ایک نہایت اہم سیاسی قسم کے کام بلکہ کہنا چاہیے کہ قومی، ملکی اور حکومتی سطح پر ہندوستانی مسلمانوں کے مال و جان اور دین و ایمان کے تحفظ کے سلسلے کی ایک اجتماعی تحریک اور کوشش کے سلسلہ میں مالی تعاون کے لیے انہی کے طبقہ کے ان کے بعض قریبی دوستوں نے خود ان کے دولتکدہ پر جا کر ان سے بات کی تو پہلے تو انھوں نے اپنے ان دوستوں کو یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی کہ ان کوششوں سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا، مسلمانوں کے حالات یہاں یوں ہی بد سے بدتر ہوتے رہینگے۔ یہ ساری کوششیں جو آپ لوگ کرنا چاہتے ہیں بالکل فضول ہیں اور اس تلقین اور نصیحت کے بعد پہلے پانچ روپے پیش کرنے کیلئے کہا اور پھر خود ہی اسکو کم سمجھتے ہوئے کچھ زیادہ یعنی دس روپے دینے چاہے۔

یہ صرف ایک مثال ہو اس معاملہ میں ہمارے تعلیم یافتہ دولتمندوں کے رویہ کی۔ بلا شبہ اس طبقہ میں اسکے خلاف بھی مثالیں موجود ہیں لیکن اپنا تجربہ یہی ہے کہ وہ مثالیں بہت شاذ ہیں۔

بہرحال دوسرا بڑا سبب مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کا ہمارے دولتمندوں کا یہ رویہ ہو کہ نہ وہ بیدارئ

موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی طرح اپنے مالی وسائل کے ساتھ میدان میں آتے ہیں اور نہ یہ کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں اس راہ میں لگائیں اور انکے اپنے معاشی وسائل نہ ہوں تو انکی ضروریات خوبصورتی کے ساتھ اور باوقار طریقہ پر اپنے ذمہ لیکر انکو اس کام کیلئے اور اس میدان میں جدوجہد کیلئے فارغ کر دیا۔

مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کے ظاہری اسباب میں انکی اور بھی بعض داخلی کمزوریوں اور غلطیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک سب سے بڑا دخل ان دو باتوں کا ہے ــــــ اسلئے سب سے پہلی ضرورت تو ہے ان کی سیاسی تربیت کی، اور حالات کے مطابق اُن کا مزاج بنانے کی، یہ کام اردو اخبارات بھی اچھی خاصی حد تک کر سکتے ہیں، اور دوسری ضرورت ہے اس راہ میں مسلمان دولتمندوں کی فرض شناسی اور صحیح طور پر اپنے فرض کی ادائیگی کی ــــــ اور ان سب باتوں سے پہلے ضرورت ہے غیر مختلف فیہ چیزوں میں اُن کے مختلف عناصر کے باہم اجتماع اور تعاون و اشتراک عمل کی، اور ان سب باتوں کی توفیق اور اللہ کی فیصلہ کن مدد حاصل ہونے کیلئے ضرورت ہے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی ــــــ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ٥

معارف الحدیث

(مُسلسل)

حجۃ الوداع (۲)

[گذشتہ شمارہ میں حجۃ الوداع (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری اور رخصتی حج) سے متعلق حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی سب سے مفصل حدیث کا ایک حصہ ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں اس کا باقی حصہ آج نذر ناظرین کیا جارہا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے یہ حدیث چونکہ بہت طویل ہے اس لیے اس کے ایک ایک حصہ کا ترجمہ کرکے تشریح کی جارہی ہے اور پورا متن نقل کرنے کے بجائے ہر حصۂ متن کا صرف ابتدائی اور آخری فقرہ نقل کیا جارہا ہے، حدیث کا پورا متن صحیح مسلم یا مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے]

فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مِنًى فَأَهَلُّوا بِالْحَجِّ ...
..... إِلَى قَوْلِهِ فَأَجَازَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ فَنَزَلَ بِهَا۔

پھر جب یوم الترویہ (یعنی ۸ ذی الحجہ کا دن) ہوا تو سب لوگ منیٰ جانے لگے (اور جو صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صفا مروہ کی سعی کرکے اپنا احرام ختم کرچکے تھے اور حلال ہوگئے تھے) انھوں نے حج کا احرام باندھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ پر سوار ہوکر منیٰ کو چلے، پھر وہاں پہونچ کر آپ نے

(اور صحابہ کرام نے مسجد خیف میں) ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر پانچوں نمازیں پڑھیں پھر فجر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر آپ منیٰ میں اور ٹھہرے۔ یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا تو آپ عرفات کی طرف روانہ ہوئے اور آپ نے حکم دیا تھا کہ صوف کا بنا ہوا خیمہ آپ کے لیے نمرہ میں نصب کیا جائے (نمرہ دراصل وہ جگہ ہے جہاں سے آگے عرفات کا میدان شروع ہوتا ہے۔) آپ کے خاندان قریش کے لوگوں کو اس کا یقین تھا اور اس کے بارہ میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ آپ "مشعر حرام" کے پاس قیام کریں گے جیسا کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔ (لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ) آپ مشعر حرام کے حدود سے آگے بڑھ کے عرفہ پہونچ گئے اور آپ نے دیکھا کہ (آپ کی ہدایت کے مطابق) نمرہ میں آپ کا خیمہ نصب کر دیا گیا ہے تو آپ اس خیمہ میں اتر گئے۔

(تشریح) حج کی خاص نقل و حرکت کا سلسلہ ۸ ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے جس کو "یوم الترویہ" کہا جاتا ہے۔ اس دن صبح کو حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوتے ہیں، اِفراد یا قِران کے طریقہ پر حج کرنے والے تو پہلے سے احرام کی حالت میں ہوتے ہیں، ان کے علاوہ اور حجاج اسی دن یعنی ۸ ذی الحجہ کو احرام باندھ کے منیٰ کو جاتے ہیں اور نویں کی صبح تک وہیں قیام کرتے ہیں۔

——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ بعض صحابہ جو اپنی قربانیاں اپنے ساتھ لائے تھے وہ تو احرام کی حالت میں تھے، باقی صحابہ جنھوں نے عمرہ کر کے احرام ختم کر دیا تھا اُن سب نے آٹھویں کی صبح کو حج کا احرام باندھا اور حج کا یہ سارا قافلہ منیٰ کو روانہ ہو گیا اور اس دن وہیں قیام کیا۔ اور پھر نویں کی صبح کو سورج نکلنے کے بعد عرفات کے لیے روانگی ہوئی۔ عرفات منیٰ سے قریباً ۶ میل اور مکہ سے قریباً ۹ میل ہے اور یہ حدودِ حرم سے باہر ہے بلکہ اس جانب میں حرم کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے عرفات کا علاقہ شروع ہوتا ہے ——— عرب کے عام قبائل جو حج کے لیے آتے تھے وہ سب نویں ذی الحجہ کو حدود حرم سے باہر نکل کے عرفات میں وقوف کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والے یعنی قریش جو اپنے کو کعبہ کا مجاور و متولی اور "اہل حرم اللہ" کہتے تھے وہ وقوف کے لیے بھی حدود حرم سے باہر نہیں نکلتے تھے بلکہ اس کی حد کے اندر ہی مزدلفہ کے علاقہ میں مشعر حرام پہاڑی کے پاس وقوف کرتے تھے اور اس کو

اپنا امتیاز سمجھتے تھے، اپنے اس پرانے خاندانی دستور کی بنا پر قریش کو یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشعر حرام کے پاس ہی وقوف کریں گے، لیکن چونکہ ان کا یہ طریقہ غلط تھا اور وقوف کی صحیح جگہ عرفات ہی ہے اس لیے آپ نے منیٰ سے چلتے وقت ہی اپنے لوگوں کو ہدایت فرمادی تھی کہ آپ کے قیام کے لیے خیمہ نمرہ[۱] میں نصب کیا جائے چنانچہ اس ہدایت کے مطابق وادی نمرہ ہی میں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا اور آپ وہیں جاکر اترے اور اس خیمہ میں قیام فرمایا۔

حَتّٰى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ اَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَاَتٰى بَطْنَ الْوَادِىْ فَخَطَبَ النَّاسَ وَقَالَ .... الى قوله فَقَالَ بِاُصْبُعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا اِلَى السَّمَاءِ وَيَنْكُتُهَا اِلَى النَّاسِ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ اَذَّنَ بِلَالٌ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔

یہاں تک کہ جب آفتاب ڈھل گیا تو آپ نے اپنی ناقہ قصواء پر کجاوا کسنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس پر کجاوا کس دیا گیا، آپ اس پر سوار ہو کر وادی (وادئ عُرَنہ) کے درمیان آئے اور آپ نے اونٹنی کی پشت ہی پر سے لوگوں کو خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ ــــ "لوگو تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں (یعنی ناحق کسی کا خون کرنا اور ناجائز طریقہ پر کسی کا مال لینا تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہے) بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج یوم العرفہ کے دن ذی الحجہ کے اس مبارک مہینہ میں اپنے اس مقدس شہر مکہ میں (تم ناحق کسی کا خون کرنا اور کسی کا مال لینا حرام جانتے ہو)

خوب ذہن نشین کرلو کہ جاہلیت کی ساری چیزیں (یعنی اسلام کی روشنی کے دور سے پہلے تاریکی اور گمراہی کے زمانہ کی ساری باتیں اور سارے قصے ختم ہیں) میرے دونوں

---

[۱] نمرہ ٹھیک وہ جگہ ہے جہاں حرم کی حد ختم ہو کر عرفات کی حد شروع ہوتی ہے۔ موجودہ مسجد نمرہ عرفات کے بالکل سرے پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی جو دیوار مکہ کی جانب ہے وہ عرفات اور نمرہ کے درمیان حد فاصل ہے۔ حتیٰ کہ اگر خدانخواستہ وہ دیوار باہر کی جانب گرے تو عرفات کی حد سے باہر وادیٔ نمرہ میں گرے گی۔ ۱۲

قدموں کے نیچے دفن اور پامال ہیں (میں ان کے خاتمہ اور منسوخی کا اعلان کرتا ہوں).
اور زمانہ جاہلیت کے خون بھی ختم ہیں معاف ہیں (یعنی اب کوئی مسلمان زمانہ جاہلیت کے کسی خون کا بدلا نہیں لے گا)، اور سب سے پہلے میں اپنے گھرانہ کے ایک خون ربیعہ ابن الحارث بن عبد المطلب کے فرزند کے خون کے ختم اور معاف کیے جانے کا اعلان کرتا ہوں جو قبیلہ بنی سعد کے ایک گھر میں دودھ پینے کے لیے رہتے تھے اُن کو قبیلۂ ہذیل کے آدمیوں نے قتل کر دیا تھا[ل] (ہذیل سے اس خون کا بدلہ لینا ابھی باقی تھا لیکن اب میں اپنے خاندان کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ اب یہ قصہ ختم، بدلہ نہیں لیا جائے گا) اور زمانۂ جاہلیت کے سارے سودی مطالبات (جو کسی کے کسی کے ذمہ باقی ہیں وہ سب بھی) ختم اور سوخت ہیں (اب کوئی مسلمان کسی سے اپنا سودی مطالبہ وصول نہیں کرے گا) اور اس باب میں بھی میں سب سے پہلے اپنے خاندان کے سودی مطالبات میں سے اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کے سودی مطالبات کے ختم اور سوخت ہونے کا اعلان کرتا ہوں (اب وہ کسی سے اپنا سودی مطالبہ وصول نہیں کریں گے) اُن کے سارے سودی مطالبات آج ختم کر دیئے گئے ـــــــ اور اے لوگو عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں خدا سے ڈرو اس لیے کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اللہ کے حکم اور اس کے قانون سے اُن کے ساتھ تمتع تمہارے لیے حلال ہوا ہے۔ اور تمہارا خاص حق اُن پر یہ ہے کہ جس آدمی کا گھر میں آنا اور تمہاری جگہ اور تمہارے بستر پر بیٹھنا تم کو پسند نہ ہو وہ اس کو اس کا موقع نہ دیں ـــ لیکن اگر وہ یہ غلطی کریں تو تم (تنبیہ اور آئندہ سدباب کے لیے اگر کچھ سزا دینا مناسب اور مفید سمجھو) ان کو کوئی خفیف سی سزا دے سکتے ہو۔

ل ربیعہ بن الحارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے ان کا ایک شیر خوار بچہ جسکو عرب کے دستور کے مطابق قبیلۂ بنی سعد کی ایک عورت نے دودھ پلانے کیلئے اپنے گھر رکھ لیا تھا قبیلۂ ہذیل کے آدمیوں کے ہاتھ سے بنی سعد اور ہذیل کے ایک جھگڑے میں قتل ہو گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانہ کو اس کا بدلہ لینے کا حق تھا۔ آپ نے اس خطبہ میں اسی حق سے دستبرداری کا اعلان فرمایا تھا۔۱۲

——— اور ان کا خاص حق تم پر یہ ہے کہ اپنے مقدور اور حیثیت کے مطابق ان کے کھانے پہننے کا بندوبست کرو ——— اور میں تمہارے لیے وہ سامان ہدایت چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے اور اس کی پیروی کرتے رہے تو پھر کبھی تم گمراہ نہ ہوگے ——— وہ ہے کتاب اللہ ——— اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا (کہ میں نے تم کو اللہ کی ہدایت اور اس کے احکام پہونچائے یا نہیں) ——— تو بتاؤ کہ وہاں تم کیا کہوگے اور کیا جواب دوگے! ———
حاضرین نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور قیامت کے دن بھی گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام ہم کو پہونچا دیئے اور رہنمائی اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور نصیحت و خیرخواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس پر آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کے مجمع کی طرف اس سے اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ! اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!! اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!!!
یعنی اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تیرا پیام اور تیرے احکام تیرے بندوں تک پہونچا دیئے اور تیرے یہ بندے اقرار کر رہے ہیں ——— اس کے بعد (آپ کے حکم سے) حضرت بلال نے اذان دی پھر اقامت کہی اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی اس کے بعد پھر بلال نے اقامت کہی اور آپ نے عصر کی نماز پڑھائی۔

(**تشریح**) یہ معلوم ہے کہ اس دن (یعنی اس سال وقوف عرفہ کے دن) جمعہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال آفتاب کے بعد پہلے مندرجہ بالا خطبہ دیا۔ اس کے بعد ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں (ظہر ہی کے وقت میں) ساتھ ساتھ بلا فصل پڑھیں، حدیث میں صاف ظہر کا ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس دن جمعہ کی نماز نہیں پڑھی بلکہ اس کے بجائے ظہر پڑھی اور جو خطبہ آپ نے دیا وہ جمعہ کا خطبہ نہیں تھا بلکہ یوم العرفات کا خطبہ تھا ——— جمعہ نہ پڑھنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ عرفات کوئی آبادی اور بستی نہیں ہے بلکہ ایک وادی اور صحرا ہے، اور جمعہ بستیوں اور آبادیوں میں پڑھا جاتا ہے ——— واللہ اعلم

یوم العرفہ کے اس خطبہ میں آپ نے جو ہدایات دیں اُس وقت اور اس مجمع میں انہی چیزوں کا

اعلان اور تبلیغ و تلقین ضروری اور اہم تھی ـــــ خطبہ کے بعد آپ نے ظہر و عصر ایک ساتھ ظہر ہی کے وقت میں ادا فرمائیں اور درمیان میں سنت یا نفل کی دو رکعتیں بھی نہیں پڑھیں امت کا اس پر اتفاق ہے کہ وقوف عرفات کے دن یہ دونوں نمازیں اسی طرح پڑھی جائیں اور اسی طرح مغرب و عشا اس دن مزدلفہ پہونچ کر عشا کے وقت میں ایک ساتھ پڑھی جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا جیسا کہ آگے معلوم ہوگا ـــــ اس دن ان نمازوں کا صحیح طریقہ اور اُن کے صحیح اوقات یہی ہیں ـــــ اس کی ایک حکمت تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس دن کا یہ امتیاز ہر خاص و عام کو معلوم ہو جائے کہ آج کے دن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمازوں کے اوقات میں بھی یہ تبدیلی کر دی گئی ہے ـــــ اور دوسری حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس دن کا اصل وظیفہ جو ذکر اور دعا ہے اُس کے لیے پوری یکسوئی کے ساتھ بندہ فارغ رہے اور ظہر سے مغرب تک بلکہ عشا تک کسی نماز کی بھی فکر نہ ہو۔

آپ نے یوم العرفات کے اس خطبہ میں جو اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے آپ کی حیات طیبہ کا سب سے اہم خطبہ کہا جا سکتا ہے سب سے آخری بات اپنی وفات اور جدائی کے قرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمائی کہ "میں تمھارے لیے ہدایت و روشنی کا وہ کامل مکمل سامان چھوڑ کے جاؤں گا جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے بشرطیکہ تم اس سے وابستہ رہے اور اس کی روشنی میں چلتے رہے اور وہ ہے اللہ کی مقدس کتاب قرآن مجید ـــــ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مرض وفات کے آخری دنوں میں جبکہ شدت مرض کی وجہ سے آپ کو سخت تکلیف تھی آپ نے بطور وصیت کے ایک تحریر لکھانے کا جو خیال ظاہر کیا تھا جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ "تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو گے" اس میں آپ کیا لکھانا چاہتے تھے، حجۃ الوداع کے اس اہم خطبہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کتاب اللہ سے وابستگی اور اس کی پیروی کی وصیت لکھانا چاہتے تھے، آپ اس اہم خطبہ میں بھی بتا چکے تھے کہ یہ شان کتاب اللہ کی ہے۔ اور چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے آشنا تھے اور اللہ نے موقع پر بات کہنے کی جرأت بھی دی تھی اس لیے انھوں نے اس موقع پر یہ رائے ظاہر کی کہ آپ کی مسلسل تعلیم و تربیت سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ حیثیت کتاب اللہ کی ہے اس لیے اس سخت تکلیف کی حالت میں وصیت لکھنے لکھانے کی زحمت کیوں فرمائی جائے،

ہیں آپ کا پڑھایا ہوا سبق یاد ہے اور یاد رہے گا "حسبنا کتاب اللہ"۔

ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى الْمَوْقِفَ...... إِلَى قَوْلِهِ ثُمَّ رَكِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَفَاضَ إِلَى الْبَيْتِ فَصَلَّى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ فَأَتَى عَلَى بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَسْقُوْنَ عَلَى زَمْزَمَ فَقَالَ انْزِعُوْا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَلَوْلَا أَنْ يَغْلِبَكُمُ النَّاسُ عَلَى سِقَايَتِكُمْ لَنَزَعْتُ مَعَكُمْ فَنَاوَلُوْهُ دَلْوًا فَشَرِبَ مِنْهُ ــــــــــ رواہ مسلم

پھر (جب آپ ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ بلا فصل پڑھ چکے تو) اپنی ناقہ پر سوار ہو کر آپ میدان عرفات میں خاص وقوف کی جگہ پر تشریف لائے اور اپنی ناقہ قصواء کا رُخ آپ نے اس طرف کر دیا جدھر پتھر کی بڑی بڑی چٹانیں ہیں اور پیدل مجمع آپ نے اپنے سامنے کر لیا اور آپ قبلہ رو ہو گئے اور وہیں کھڑے رہے یہاں تک غروب آفتاب کا وقت آگیا اور (شام کے آخری وقت میں فضا جو زرد ہوتی ہے وہ) زردی بھی ختم ہو گئی۔ اور آفتاب بالکل ڈوب گیا تو آپ (عرفات سے مزدلفہ کے لیے) روانہ ہوئے اور اُسامہ بن زید کو آپ نے اپنی ناقہ پر اپنے پیچھے سوار کر لیا تھا یہاں تک کہ آپ مزدلفہ آگئے (جو عرفات سے قریباً تین میل ہے) یہاں پہونچ کر آپ نے مغرب اور عشا کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ (یعنی اذان ایک ہی دفعہ کہی گئی اور اقامت مغرب کے لیے الگ کہی گئی اور عشا کے لیے الگ کہی گئی) اور ان دونوں نمازوں کے درمیان بھی آپ نے سنت یا نفل کی رکعتیں بالکل نہیں پڑھیں۔ اس کے بعد آپ لیٹ گئے اور لیٹے رہے یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور فجر کا وقت آگیا تو آپ نے صبح صادق کے ظاہر ہوتے ہی اذان اور اقامت کے ساتھ نماز فجر ادا کی اسکے بعد آپ مشعر حرام کے پاس آئے (راجح قول کے مطابق یہ ایک بلند ٹیلہ سا تھا مزدلفہ کے حدود میں، اب بھی یہی صورت ہے اور وہاں نشانی کے طور پر ایک عمارت بنا دی گئی ہے) یہاں آکر آپ قبلہ رو کھڑے ہوئے اور دعا اور اللہ کی تکبیر و تہلیل اور توحید و تمجید میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ خوب اُجالا ہو گیا، پھر طلوع آفتاب سے ذرا پہلے

آپ وہاں سے منیٰ کے لیے روانہ ہو گئے اور اس وقت آپ نے اپنی ناقہ کے پیچھے فضل بن عباس کو سوار کر لیا اور چل دیئے یہاں تک کہ جب وادیٔ مُحَسِّر کے درمیان پہونچے تو آپ نے اونٹنی کی رفتار کچھ تیز کر دی، پھر اس سے نکل کر اس درمیان والے راستے سے چلے جو بڑے جمرہ پر پہونچاتا ہے پھر اس جمرہ کے پاس پہونچ کر جو درخت کے پاس ہو آپ نے اس پر رمی کی، سات سنگ ریزے اُس پر پھینک کے مارے جن میں سے ہر ایک کے ساتھ آپ تکبیر کہتے تھے، یہ سنگ ریزے "خذف کے سنگریزوں" کی طرح کے تھے (یعنی چھوٹے چھوٹے تھے جیسے کہ انگلیوں میں رکھ کر پھینکے جاتے ہیں جو قریباً چنے اور مٹر کے دانے کے برابر ہوتے ہیں) آپ نے جمرہ پر یہ سنگ ریزے (جمرہ کے قریب والی) نشیبی جگہ سے پھینک کے مارے، اور اس رمی سے فارغ ہو کر قربانگاہ کی طرف تشریف لے گئے وہاں آپ نے ترسٹھ[63] اونٹوں کی قربانی اپنے ہاتھ سے کی پھر جو باقی رہے وہ حضرت علی کے حوالے فرما دیئے ان سب کی قربانی انھوں نے کی اور آپ نے اُن کو اپنی قربانی میں شریک فرمایا، پھر آپ نے حکم دیا کہ قربانی کے ہر اونٹ میں سے گوشت کا ایک پارچہ لے لیا جائے، یہ سارے پارچے ایک دیگ میں ڈال کے پکائے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی دونوں نے اس میں سے گوشت کھایا اور شوربا پیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ پر سوار ہو کر طواف زیارت کے لیے بیت اللہ کی طرف چل دیئے اور ظہر کی نماز آپ نے مکہ میں جا کر پڑھی، نماز سے فارغ ہو کے (اپنے اہل خاندان) بنی عبدالمطلب کے پاس آئے جو زمزم سے پانی کھینچ کھینچ کے لوگوں کو پلا رہے تھے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ دوسرے لوگ غالب آکر تم سے یہ خدمت چھین لیں گے تو میں بھی تمھارے ساتھ ڈول کھینچتا، ان لوگوں نے آپ کو بھر کے ایک ڈول زمزم کا دیا تو آپ نے اس میں سے نوش فرمایا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) حج کے سلسلے کا سب سے بڑا عمل اور رکنِ اعظم "وقوف عرفہ" ہے یعنی ۹ ذی الحجہ کو ظہر و عصر کی نماز پڑھ کے میدان عرفات میں اللہ کے حضور میں کھڑا ہونا، اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وقوف کتنا طویل فرمایا تھا ـــــ ظہر و عصر کی نماز آپ نے ظہر کے شروع وقت ہی میں پڑھ لی تھی اور اس وقت سے لے کر غروب آفتاب تک آپ نے وقوف فرمایا اور اس کے بعد سیدھے مزدلفہ چل دیئے اور مغرب و عشا آپ نے وہاں پہونچ کر ایک ساتھ ادا فرمائیں اور جیسا کہ گزر چکا یہی اس دن کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

مزدلفہ کی اس رات میں آپ نے عشا سے فارغ ہو کر فجر تک آرام فرمایا اور اس رات تہجد بھی ناغہ کیا دو رکعتیں بھی نہیں پڑھیں (حالانکہ تہجد آپ سفر میں بھی ناغہ نہیں کرتے تھے) اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ نویں کے پورے دن آپ سخت مشغول رہے تھے۔ صبح کو منیٰ سے چل کر عرفات پہونچے، جہاں پہلے خطبہ دیا، پھر ظہر و عصر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد سے مغرب تک مسلسل وقوف فرمایا پھر اسی وقت عرفات سے مزدلفہ تک کی مسافت طے کی، گویا فجر سے لے کر عشا تک مسلسل حرکت اور مشقت، اور اگلے دن ۱۰ ذی الحجہ کو بھی اسی طرح مشغول رہنا تھا، یعنی صبح کو مزدلفہ سے چل کر منیٰ پہونچنا، وہاں جا کر پہلے رمی کرنا اس کے بعد صرف ایک دو یا دس بیس نہیں بلکہ ساٹھ سے بھی اوپر اونٹوں کی قربانی اپنے ہاتھ سے کرنا، اس کے بعد طواف زیارت کے لیے منیٰ سے مکہ جانا اور وہاں سے پھر منیٰ واپس آنا۔ بہرحال نویں اور دسویں ذی الحجہ کا پروگرام چونکہ اس قدر بھرا ہوا اور پُر مشقت تھا۔ اس لیے ان دو دنوں کی مزدلفہ والی درمیانی رات میں پوری طرح آرام فرمانا ضروری تھا، جسم اور جسمانی قوتوں کے بھی کچھ حقوق ہیں اور اُن کی رعایت خاصکر ایسے عام مجمعوں میں ضروری ہے تاکہ سہولت اور رعایت کا پہلو بھی عوام کے علم میں آئے اور وہ شریعت کے صحیح اور معتدل مزاج کو سمجھ سکیں۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث میں صراحۃً مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے قربان کیے، یہ غالباً وہی ترسٹھ[۶۳] تھے جو آپ مدینہ طیبہ سے اپنے ساتھ قربانی کے لیے لائے تھے۔ باقی سینتیس[۳۷] جو حضرت علی یمن سے لائے تھے وہ آپ نے انہی کے ہاتھ سے قربان کرائے، ترسٹھ[۶۳] کے عدد کی یہ حکمت بالکل کھلی ہوئی ہے کہ آپ کی عمر شریف ترسٹھ[۶۳] سال تھی گویا زندگی کے ہر سال کے شکر میں آپ نے ایک اونٹ قربان کیا۔ واللہ اعلم۔

آپ نے اور حضرت علی مرتضیٰ نے اپنی قربانی کے اونٹوں کا گوشت پکوا کے کھایا، اور شوربا

پیا۔ اس سے یہ بات سب کو معلوم ہوگئی کہ قربانی کرنے والا اپنی قربانی کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے اعزہ کو بھی کھلا سکتا ہے۔

۱۰ ذی الحجہ کو قربانی سے فارغ ہونے کے بعد آپ طواف زیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ مسنون اور بہتر یہی ہے کہ طواف زیارت قربانی سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰ ذی الحجہ ہی کو کرلیا جائے، اگرچہ تاخیر کی بھی اس میں گنجائش ہے۔

زمزم کا پانی کھینچ کھینچ کے حجاج کو پلانا یہ خدمت اور سعادت زمانۂ قدیم سے آپ کے گھرانے بنی عبدالمطلب ہی کے حصہ میں تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف زیارت سے فارغ ہونے کے بعد زمزم پر تشریف لائے وہاں آپ کے اہل خاندان ڈول کھینچ کھینچ کے لوگوں کو اس کا پانی پلا رہے تھے، آپ کا بھی جی چاہا کہ اس خدمت میں کچھ حصہ لیں لیکن آپ نے بالکل صحیح سوچا کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کے اتباع اور تقلید میں آپ کے سارے رفقاء بھی اس سعادت میں حصہ لینا چاہیں گے اور پھر بنی عبدالمطلب جن کا یہ قدیمی حق ہے وہ محروم ہوجائیں گے اس لیے آپ نے اپنے اہل خاندان کی دلداری اور اظہار تعلق کے لیے اپنی دلی خواہش کا اظہار تو فرمادیا، مگر ساتھ ہی وہ مصلحت بھی بیان فرمادی جس کی وجہ سے آپ نے اپنی اس دلی خواہش کے قربان کردینے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا تھا حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث حجۃ الوداع کے بیان میں سب سے زیادہ طویل اور مفصل حدیث ہے لیکن پھر بھی بہت سے واقعات کا ذکر اس میں چھوٹ گیا ہے۔ یہاں تک حلق اور دسویں تاریخ کے خطبہ کا بھی اس میں ذکر نہیں آیا ہے جو دوسری حدیثوں میں مذکور ہے۔

حضرت جابر کی اس حدیث کے بعض راویوں نے اسی حدیث میں یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ

نَحَرْتُ هٰهُنَا وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ — میں نے قربانی اس جگہ کی ہے لیکن منیٰ کا
فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ وَوَقَفْتُ — سارا علاقہ قربانی کی جگہ ہے اسلئے تم سب

هٰهُنَا وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ وَ وَقَفْتُ هٰهُنَا وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ

رواہ مسلم

لوگ اپنی اپنی جگہ قربانی کر سکتے ہو، اور میں نے عرفات میں وقوف یہاں (پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں کے قریب کیا ہی) اور سارا عرفات وقوف کی جگہ ہے (اس کے جس حصہ میں بھی وقوف کیا جائے صحیح ہو) اور میں نے مزدلفہ میں یہاں (مشعر حرام کے قریب) قیام کیا اور سارا مزدلفہ موقف ہے (اس کے جس حصہ میں بھی اس رات میں قیام کیا جائے صحیح ہے)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَحَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نِسَائِهٖ بَقَرَةً فِي حَجَّتِهٖ

رواہ مسلم

حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی فرمائی۔ (صحیح مسلم)

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰى بُدْنِهٖ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا وَجُلُوْدِهَا وَاَجِلَّتِهَا وَاَنْ لَا اُعْطِيَ الْجَزَّارَ مِنْهَا قَالَ نَحْنُ نُعْطِيْهِ مِنْ عِنْدِنَا۔

رواہ البخاری و مسلم

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ آپ کی قربانیوں کا انتظام و انصرام کروں اور ان کا گوشت اور کھالیں اور جھولیں صدقہ کر دوں اور قصاب کو (بطور اجرت اور حق المحنت کے) ان میں سے کوئی چیز نہ دوں آپ نے فرمایا کہ ہم ان کو اجرت الگ اپنے پاس سے دیں گے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى مِنًى فَاَتَى الْجَمْرَةَ

فَرَمَاهَا ثُمَّ اَتَى مَنْزِلَهُ بِمِنًى وَنَحَرَ نُسُكَهُ ثُمَّ دَعَا بِالْحَلَّاقِ وَنَاوَلَ الْحَالِقَ شِقَّهُ الْاَيْمَنَ فَحَلَقَهُ ثُمَّ دَعَا اَبَا طَلْحَةَ الْاَنْصَارِيَّ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ ثُمَّ نَاوَلَ الشِّقَّ الْاَيْسَرَ فَقَالَ اِحْلِقْ فَحَلَقَهُ فَاَعْطَاهُ اَبَا طَلْحَةَ فَقَالَ اِقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو مزدلفہ سے) منیٰ تشریف لائے تو پہلے جمرۃ العقبیٰ پر پہونچکر اس کی رمی کی پھر آپ اپنے خیمہ پر تشریف لائے اور قربانی کے جانوروں کی قربانی کی پھر آپ نے حجام کو طلب فرمایا اور پہلے اپنے سر مبارک کی داہنی جانب اسکے سامنے کی، اُس نے اس جانب کے بال مونڈے، آپ نے ابو طلحہ انصاری کو طلب فرمایا اور وہ بال اُن کے حوالے کر دیئے، اس کے بعد آپ نے اپنے سر کی بائیں جانب حجام کے سامنے کی اور فرمایا کہ اب اس کو بھی مونڈ دو اس نے اس جانب کو بھی مونڈ دیا تو آپ نے وہ بال بھی ابو طلحہ ہی کے حوالے فرما دیئے اور ارشاد فرمایا کہ ان بالوں کو لوگوں کے درمیان تقسیم کر دو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا مفصل حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر منڈوانے کا یہ واقعہ ذکر سے چھوٹ گیا ہے حالانکہ یہ حج کے سلسلہ کے دسویں ذی الحجہ کے خاص اعمال اور مناسک میں سے ہے۔

جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا حلق (سر منڈوانے) کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ پہلے داہنی جانب کے بال صاف کرائے جائیں پھر بائیں جانب کے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنے بال ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائے یہ ابو طلحہ آپ کے خاص محبین اور فدائیوں میں سے تھے۔ غزوۂ اُحد میں حضورؐ کو کافروں کے حملہ سے بچانے کے لیے انھوں نے اپنا جسم تیروں سے چھلنی کرا لیا تھا۔ اسکے علاوہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راحت و آرام اور آپ کے ہاں آنے والے مہمانوں کا بھی یہ بڑا خیال رکھتے تھے، الغرض اس قسم کی خدمتوں میں ان کا اور ان کی بیوی اُمّ سُلیم

(والدہ انسؓ) کا ایک خاص مقام تھا، غالباً ان کی انہی خصوصی خدمات کی وجہ سے آپ نے سر مبارک کے بال ان کو مرحمت فرمائے اور دوسروں کو بھی انہی کے ہاتھوں سے تقسیم کرائے۔

یہ حدیث اہل اللہ اور صالحین کے تبرکات کے لیے بھی واضح اصل اور بنیاد ہے۔

بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو "موئے مبارک" بتلائے جاتے ہیں ان میں سے جن کے بارے میں قابل اعتماد تاریخی ثبوت اور سند موجود ہے غالب گمان یہ ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے تقسیم کیے ہوئے انہی بالوں میں سے ہوں گے ــــــ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے لوگوں کو ایک ایک دو دو بال تقسیم کیے تھے اس طرح ظاہر ہے کہ وہ ہزاروں صحابۂ کرام کے پاس پہونچے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اور ان کے انتقال کے بعد اُن کے اخلاف نے اس مقدس تبرک کی حفاظت کا کافی اہتمام کیا ہوگا اس لیے اُن میں سے بہت سے اگر اب تک بھی کہیں کہیں محفوظ ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن قابل اعتماد تاریخی ثبوت اور سند کے بغیر کسی بال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "موئے مبارک" قرار دینا بڑی سنگین بات اور گناہ عظیم ہے اور بہر حال (اصلی ہو یا فرضی) اس کو اور اس کی زیارت کو ذریعہ تجارت بنانا جیسا کہ بہت سی جگہوں پر ہوتا ہے بدترین جرم ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ اَللّٰھُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَللّٰھُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَالْمُقَصِّرِیْنَ ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا اللہ کی رحمت ہو ان پر جنھوں نے یہاں اپنا سر منڈوایا، حاضرین میں سے بعض نے عرض کیا یا رسول اللہ رحمت کی یہی دعا بال ترشوانے والوں کے لیے بھی فرما دیجئے۔ آپ نے دوبارہ ارشاد فرمایا کہ "اللہ کی رحمت ہو سر منڈوانے والوں پر"۔ اُن لوگوں نے پھر وہی عرض کیا تو تیسری دفعہ آپ نے فرمایا کہ "اور ان لوگوں پر بھی اللہ کی رحمت ہو جنھوں نے یہاں بال ترشوائے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) عادت یا ضرورت کے طور پر بال منڈوانا یا ترشوانا کوئی عبادت نہیں ہے لیکن حج اور عمرہ میں جو بال منڈوائے یا ترشوائے جاتے ہیں یہ بندہ کی طرف سے عبدیت اور تذلل کا ایک اظہار ہے اس لیے خاص عبادت ہے اور اسی نیت سے منڈانا یا ترشوانا چاہیے۔ اور چونکہ عبدیت اور تذلل کا اظہار سر منڈانے میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہی افضل ہے اور اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے رحمت میں اس کو ترجیح دی۔ واللہ اعلم

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ النَّحْرِ قَالَ اِنَّ الزَّمَانَ اسْتَدَارَ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ السَّنَۃُ اِثْنَا عَشَرَ شَھْرًا مِنْھَا اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ ثَلٰثٌ مُتَوَالِیَاتٌ ذُو الْقَعْدَۃِ وَذُو الْحِجَّۃِ وَالْمُحَرَّمُ وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِیْ بَیْنَ جُمَادٰی وَشَعْبَانَ وَقَالَ اَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا قُلْنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّہٗ سَیُسَمِّیْہِ بِغَیْرِ اسْمِہٖ قَالَ اَلَیْسَ ذَا الْحِجَّۃِ قُلْنَا بَلٰی * قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ فَیَسْئَلُکُمْ عَنْ اَعْمَالِکُمْ اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضُلَّالًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ۔

*قَالَ اَیُّ بَلَدٍ ھٰذَا قُلْنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّہٗ سَیُسَمِّیْہِ بِغَیْرِ اسْمِہٖ قَالَ اَلَیْسَ الْبَلْدَۃَ قُلْنَا بَلٰی قَالَ فَاَیُّ یَوْمٍ ھٰذَا قُلْنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّہٗ سَیُسَمِّیْہِ بِغَیْرِ اسْمِہٖ قَالَ اَلَیْسَ یَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلٰی صح

(رواہ البخاری ومسلم)

ابوبکرہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجۃ الوداع میں) دسویں ذی الحجہ کو خطبہ دیا جس میں فرمایا، زمانہ گھوم پھر کر اپنی اس اصلی ہیئت پر آگیا ہے جس پر وہ زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت تھا ____ سال پورے بارہ مہینہ ہی کا ہوتا ہے، ان میں سے چار مہینے خاص طور سے قابل احترام ہیں۔ تین مہینے تو مسلسل، ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور چوتھا وہ رجب جو جمادی الاُخریٰ اور شعبان کے درمیان ہوتا ہے اور جس کو قبیلہ مضر زیادہ مانتا ہے ____ اسکے بعد

آپ نے فرمایا بتاؤ یہ کون مہینہ ہے؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ و رسول ہی کو زیادہ علم ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر آپ خاموش رہے یہانتک کہ ہم نے خیال کیا کہ اب آپ اس مہینہ کا کوئی اور نام مقرر کریں گے (لیکن) آپ نے فرمایا کیا یہ "ذی الحجہ" کا مہینہ نہیں ہے! ہم نے عرض کیا بے شک یہ ذی الحجہ ہی ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا بتلاؤ یہ کون شہر ہے؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ و رسول ہی کو زیادہ علم ہے۔ آپ کچھ خاموش رہے، یہانتک کہ ہم نے خیال کیا کہ اب آپ اس شہر کا کوئی اور نام مقرر کریں گے۔ (لیکن) آپ نے فرمایا کیا یہ "بلدہ" نہیں ہے! (مکہ کے معروف ناموں میں ایک "بلدہ" تھا) ہم نے عرض کیا بے شک ایسا ہی ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا یہ کون دن ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اسکے رسول ہی کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا کیا آج "یوم النحر" نہیں ہے! (یعنی ۱۰ ذی الحجہ جس میں قربانی کی جاتی ہے) ہم نے عرض کیا بے شک آج یوم النحر ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا تمھارے خون اور تمھارے اموال اور تمھاری آبروئیں حرام ہیں تم پر (یعنی کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ناحق کسی کا خون کرے یا کسی کے مال پر یا اس کی آبرو پر دست درازی کرے۔ یہ سب تم پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے) جیسا کہ آج کے مبارک اور مقدس دن میں خاص اس شہر اور اس مہینہ میں تم کسی کی جان لینا یا اس کا مال یا اسکی آبرو لوٹنا حرام سمجھتے ہو (بالکل اسی طرح یہ باتیں تمھارے واسطے ہمیشہ کے لیے حرام ہیں ــــــ اسکے بعد آپ نے فرمایا) اور عنقریب (مرنے کے بعد آخرت میں) اپنے پروردگار کے سامنے تمھاری پیشی ہوگی اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت سوال کرے گا۔ دیکھو میں خبردار کرتا ہوں کہ تم میرے بعد ایسے گمراہ نہ ہو جانا کہ تم میں سے بعض بعض کی گردنیں مارنے لگیں ــــــ (اسکے بعد آپ نے فرمایا) بتاؤ کیا میں نے اللہ کا پیام تم کو پہونچادیا؟ سب نے عرض کیا کہ بیشک آپ نے تبلیغ کا حق ادا فرمادیا۔ (اسکے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کہا) "اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ" (اے اللہ تو گواہ رہ!) (اس کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا) جو لوگ یہاں حاضر اور موجود ہیں (اور انھوں نے میری بات سنی ہے) وہ اُن لوگوں کو پہونچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ بہت سے وہ

لوگ جنکو کسی سننے والے سے بات پہنچے اس سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں (اور وہ اس علم کی امانت کا حق زیادہ ادا کرتے ہیں) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس خطبۂ نبوی کے ابتدائی حصہ میں زمانہ کے گھوم پھر کے اپنے اصلی ابتدائی ہیئت پر آجانے کا جو ذکر ہے اس کا مطلب سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ جاہلیت میں اہل عرب کا ایک گمراہانہ دستور اور طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی خاص مصلحتوں کے تحت کبھی کبھی سال تیرہ مہینہ کا قرار دے دیتے تھے اور اسکے لیے ایک مہینہ کو مکرر مان لیتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مہینوں کا سارا نظام غلط اور حقیقت کے خلاف تھا، اسلیے حج جو ان کے حساب سے ذی الحجہ میں ہوتا تھا در اصل ذی الحجہ میں نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جاہلیت کے پچاسوں یا سینکڑوں برس کے چکر کے بعد ایسا ہوا کہ ان اہل عرب کے حساب سے مثلاً جو محرم کا مہینہ تھا وہی اصل آسمانی حساب سے بھی محرم کا مہینہ تھا اسی طرح جو اہل عرب کے حساب سے ذی الحجہ کا مہینہ تھا وہی اصل آسمانی حساب سے ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے ابتدائی حصہ میں یہی بات فرمائی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ یہ ذی الحجہ جس میں یہ حج ادا ہو رہا ہے اصل آسمانی حساب سے بھی ذی الحجہ ہی ہے اور سال بارہ ہی مہینہ کا ہوتا ہے اور آئندہ صرف یہی اصلی اور حقیقی نظام چلے گا۔

خطبہ کے آخر میں آپ نے خاص وصیت و ہدایت امت کو یہ فرمائی کہ میرے بعد باہم جدال و قتال اور خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہو جانا اگر ایسا ہوا تو یہ انتہائی گمراہی کی بات ہو گی ـــــ اسی خطبہ کی بعض روایات میں "ضُلاَّلاً" کے بجائے "کُفَّاراً" کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ باہم جدال و قتال اور خانہ جنگی اسلام کے مقاصد اور اس کی روح کے بالکل خلاف کافرانہ رویہ ہو گا اور اگر امت اس میں مبتلا ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے اسلامی رویہ کے بجائے کافرانہ طرز عمل اختیار کر لیا۔

امت کو یہ آگاہی آپ نے بہت سے اہم خطبوں میں دی تھی اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر کسی درجہ میں یہ منکشف ہو چکا تھا کہ شیطان اس امت کے مختلف طبقوں کو باہم لڑانے اور بھڑکانے میں بہت کچھ کامیاب ہو گا ـــــ وَكَانَ ذَالِكَ قَدَراً مَقْدُوراً۔

تجلیات مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ:۔ ــــــــــ از:۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۴۲) خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کے نام

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ــــ واضح ہو کہ تم نے جو مکتوب مُلّا فتح اللہ کے ہاتھ بھیجا تھا ملا ــــ چونکہ وہ مکتوب، محبت واخلاص اور حرارت واشتیاق کے مضامین پر مشتمل تھا، اس لیے اس نے فرحت بخشی ــــ تمہارے مکتوب کے مطالعے کے وقت تمہاری نورانیت کی فراخی و وسعت ان اطراف (تمہارے علاقے) میں بہت زیادہ نظر آئی اور (اس چیز نے بہت کچھ) امیدوار کیا ــــ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں ــــ اور زیادہ کیا لکھوں محبت اطوار! یہ معلوم نہ ہوسکا کہ سیادت مآب میر محمد نعمان نے (مجھ سے) جو خط وکتابت ترک کردی اس کا باعث کیا ہے؟ اگر ان کو یہ وہم ہے کہ میں ان سے کچھ ناراض ہوگیا ہوں تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ وہ میری طرف سے انتہائی صفائی قلب تصور کریں ــ فقیر تو میر محمد نعمان کی گھبراہٹ کی بہت فکر اور سعی کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو طالبان حق کے کام میں (ان کے اندر) کوئی سستی آجائے ..... دو ماہ کے قریب ہوئے کہ فقیر کو ضعف عارض ہوگیا ہے ــــ مکتوب سابق میں جو سوالات تم نے کیے تھے فقیر اُن کے جوابات کی تحریر سے عاجز ہے۔ اگر صحت ہوئی تو اِن شاء اللہ تعالیٰ جوابات لکھوں گا ورنہ دوستوں سے التماس دعا وفاتحہ ہے حَسْبُنَا اللہُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل ـ والسّلام عليكم وعلىٰ سائر اهل الله۔

فرزندانِ گرامی کو دعا۔

مکتوب (۴۳) خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام

[سلطانِ وقت (جہانگیر) کی محفل میں دینی مذاکرات کا بیان]

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ اس طرف کے احوال و اوضاع لائق حمد ہیں۔ عجیب غریب صحبتیں حاصل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ کے اظہار و بیان میں بال برابر بھی سستی اور مداہنت داخل نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح اپنی خلوتوں اور خاص مجلسوں میں بیان کیا کرتا تھا اللہ کی توفیق سے بالکل اسی طرح سلطانی مجلسوں میں بھی بیان کرتا ہوں اگر ایک مجلس کی بھی روئداد لکھی جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ خصوصاً آج کی رات جو ۱۷ رمضان مبارک کی رات ہے حسب ذیل مضامین و عنوانات پر خوب گفتگو کی گئی۔

بعثتِ انبیاء علیہم السلام، عدمِ استقلالِ عقل، ایمان بہ آخرت، ثواب آخرت، اثباتِ دیدارِ حق بروز قیامت، خاتمیتِ نبوت خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وسلم، مجددِ ہر صدی، اقتدا بخلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، سنتِ تراویح، بطلانِ تناسخ، احوالِ جن و جنیاں اور ان کے لیے عذاب و ثواب وغیرہ وغیرہ ـــ بادشاہ نے بڑے غور سے تمام مضامین سُنے۔ اسی کے ضمن میں اقطاب، ابدال اور اوتاد کے احوال اور ان کی خصوصیات کا بھی تذکرہ ہوا۔ الحمد للہ کہ سلطانِ وقت (کا مزاج) ٹھیک حالت پر ہے اور کسی قسم کا تغیر (جو دینی باتوں سے بےتعلقی پر دلالت کرے) ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا ہے ـــ ان پیش آمدہ واقعات اور ان ملاقاتوں میں شائد اللہ تعالیٰ کی کچھ مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدنا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق ۔ (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں جس نے ہم کو اس جانب ہدایت کی۔ اور ہم راہ یاب نہ ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ہم کو راہ یاب نہ کرتا بیشک ہمارے رب کے رسول حق بات لے کر آئے)۔

دوسری بات یہ قابل تحریر ہے کہ میں نے حفظ قرآن کو سورۂ عنکبوت تک پہونچا دیا ہے

جدید تعلیم حاصل کرنے کا مسئلہ

از جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

"علماء وقت کے تقاضوں کو نہیں پہچانتے، وہ قدامت پرست اور دقیانوسی ہیں"۔

یہ علماء کے اوپر جدید طبقہ کا ایک عام اعتراض ہے۔ ان کے نزدیک اس کی ایک بہت واضح مثال یہ ہے کہ علماء انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم کو جائز نہیں سمجھتے جبکہ کسی زبان اور کسی علم میں کوئی خرابی نہیں، اور موجودہ زمانے میں تو یہ زبان اور یہ علم کسی قوم کی ترقی اور سربلندی کے لیے بالکل ضروری ہو گئے ہیں۔

یہ علماء کے بارے میں ایک عام بات ہے، مگر یہ بات جتنی عام ہے اتنی ہی غلط ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی واقعی عالم ایسا موجود نہیں ہے اور نہ کبھی موجود تھا جو نفس تعلیم جدید یا نفس انگریزی زبان کی تحصیل کو حرام سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شخص علماء کی طرف اس بات کو منسوب کرتا ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی مجرد تحصیل کے مخالف ہیں تو یہ ایک سراسر غلط الزام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ علماء کی مخالفت بہ اعتبار تعلیم نہیں بلکہ باعتبار انجام ہے۔ یعنی وہ اصلاً تعلیم جدید کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اس انجام کے مخالف ہیں جو عموماً اس تعلیم کے بعد نوجوانوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی بھر قائم رہتا ہے، اسی عمومی انجام کو دیکھ کر انھوں نے مسلم نوجوانوں کو اس تعلیم سے روکنا شروع کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ہرگز اس سے روکنے کی ضرورت نہ سمجھیں، بلکہ اس کی ترغیب دلانے والے بن جائیں۔

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ سوال آیا کہ "تحصیل علم منطق و انگریزی مثلاً شخصے اشتغال آں دارد، بر جواز و عدم آں چہ حکم است" آپ نے اس کا

جواب اس اُصول کی روشنی میں دیا کہ ـــــ لِلْاٰلَةِ حُکْمُ ذِی الْاٰلَةِ. یعنی علم منطق کی حیثیت ایک آلہ کی ہے اور جو چیز آلہ کی حیثیت رکھتی ہو اس کی حلت و حرمت کا حکم اس کو استعمال کرنے والے کے اعتبار سے ہوتا ہے، چنانچہ آپ نے لکھا کہ علم منطق کو اگر دین کی تقویت کے لیے استعمال کیا جائے تو عین جائز ہے اور دین کے خلاف استعمال کیا جائے تو حرام ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان سیکھنے کے بارے میں آپ نے لکھا:

تعلم انگریزی یعنے آئین خط و کتابت و	انگریزی تعلیم یعنی اس کے لکھنے کا طریقہ
لغت و اصطلاح اینہارا دانستن باکے	جاننا اس کی زبان اور اصطلاح کو سمجھنا
ندارد اگر بہ نیت مباح باشد زیرا کہ در	کوئی حرج نہیں رکھتا بشرطیکہ صرف مباح
حدیث وارد است کہ زید بن ثابت بحکم	کی نیت سے ایسا کرے کیونکہ حدیث میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ	آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
وسلم روش خط و کتابت یہود و نصاریٰ	حکم کے موافق زید بن ثابت نے یہود و
و لغت آنہارا آموختہ بود برائے ایں غرض	نصاریٰ کا خط و کتابت کا طریقہ اور ان
کہ اگر برائے آنحضرت صلعم خطے بایں لغت	کی زبان سیکھی تھی تاکہ اگر آنحضرت کی
و رسم خط برسد جواب آں تواند نوشت	خدمت میں اس زبان اور رسم الخط میں
و اگر بمجرد خوش آمد آنہا و اختلاط بآنہا	کوئی مراسلہ آئے تو اس کا جواب لکھ سکیں
تعلیم ایں لغت نماید و بایں وسیلہ پیش آنہا	اور اگر صرف ان کو خوش کرنے کی غرض
تقرب جوید پس البتہ حرمت و کراہت	سے اور ان سے اختلاط رکھنے کے لیے
دارد۔	اس زبان کو سیکھے اور اس ذریعہ سے ان
مجموعہ فتاویٰ عزیزی۔ جلد دوم	کے یہاں تقرب حاصل کرنا چاہے
صفحہ ۱۹۵	تو البتہ اس میں حرمت و کراہت ہے۔

کسی علم میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہوتی اور نہ کوئی زبان محض زبان ہونے کی حیثیت سے غلط ہوتی ہے۔ تاہم ہر زبان اور ہر علم کسی نہ کسی انسانی گروہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی گروہ اگر خیر پسند ہو تو اس کی زبان اور اس کے علوم پر خیر پسندی کی روح چھائی ہوئی ہوگی۔

اور اگر وہ شر پسند ہے تو اس کی زبان اور اس کے علوم بھی اپنے ساتھ اسی قسم کی فضا رکھتے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہر زبان اور ہر علم اپنے ساتھ ایک تہذیب بھی رکھتا ہے۔ اگر زبان وعلوم کو اس کی تہذیب سے الگ کرکے لیا جائے تو وہ خالص علمی چیز ہوگی۔ البتہ اگر علم کے ساتھ اس کے اندر لپٹی ہوئی تہذیب کو بھی قبول کر لیا جائے، تو گمراہ اقوام کی تہذیب ہونے کی صورت میں یہی چیز مضر اور قابل اجتناب بن جاتی ہے۔

زبان وعلوم میں تہذیب کے اثرات مختلف راستوں سے داخل ہوتے ہیں۔ یہاں میں اس کی چند مثالیں دوں گا۔

کسی تہذیب کے حامل افراد جو زبان لکھتے اور بولتے ہیں اور جو ان کے زیر سایہ ترقی کرتی ہے۔ قدرتی طور پر اس کے اسالیب، اس کی ترکیبیں اور اصطلاحات ان کے مخصوص تصور میں رنگ جاتے ہیں۔ قدیم عربی زبان ایک ایسی قوم کی زبان تھی جو گھوڑے اور شراب کی رسیا تھی۔ چنانچہ اس کی زبان بھی اس رنگ میں رنگ گئی۔ اس کے بعد اسلام کے ماننے والوں نے جب اس زبان کو اپنایا تو صرف آدھی صدی میں اس کو اس طرح بدل دیا کہ اس کے لفظ لفظ میں گویا اسلام کی بو محسوس ہونے لگی۔ یہی موجودہ زبانوں کا حال ہے۔ یونانیوں اور رومیوں نے چاند کی تانیث کرکے اسے دیوی قرار دیا۔ ان کے نزدیک یہ دیوی سیلین (ملکۂ شب) کے نام سے موسوم تھی۔ چنانچہ چاند کے جغرافیہ کے متعلق علم اب بھی سیلینو گرافی (SELENOGRAPHY) کہلاتا ہے۔ اسی طرح علمائے جدید اسلام کے لئے محمڈنزم (MOHAMMEDANISM) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی ان کے مخصوص ذہن کی پیداوار ہے۔ کیونکہ جدید ذہن مذہب کا تصور ایک الہامی یا خدائی چیز کی حیثیت سے نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس کو اسی طرح ایک شخص کی ذاتی تخلیق سمجھتا ہے جیسے شعر کسی شاعر کے اپنے ذہن کی تخلیق ہوتا ہے۔ اس مخصوص ذہن کے تحت جب اس نے اسلام کو ایک نام دینا چاہا تو خود لفظ اسلام اس کو ناکافی نظر آیا۔ کیونکہ اس میں تو صرف یہ مفہوم ہو کہ یہ دین اطاعت الٰہی کا دین ہے۔ چنانچہ اس کے تعارف کے لئے اس نے "محمڈنزم" کا نام اختیار کیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین جس کو محمدؐ نے شروع کیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے مارکسی اشتراکیت کو اس کے مصنف کی طرف منسوب کرتے ہوئے مارکسزم (MARXISM) کہا جاتا ہے۔

ہر تہذیب اسی طرح اپنے مخصوص تصورات کو اپنی زبان میں بھر دیتی ہے اور طویل مدت کے

عمل سے یہ تصورات اس طرح اس میں رچ بس جاتے ہیں کہ الگ سے انھیں دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور آدمی بے سوچے سمجھے ان کو اپنے ذہن میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ آدمی شعوری طور پر واقف نہیں ہوتا کہ اس نے فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کے ساتھ فلاں عقیدے کو بھی اپنے اندر نگل لیا ہے۔ مگر ذہن کی زمین بہر حال نئے تصورات کے لئے ہموار ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل نئی زمین بن جاتی ہے اور اس کے باوجود آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہو کہ اس کا ذہن وہی ہے جو پہلے تھا۔

۲۔ تہذیب کا یہ طرز فکر جو الفاظ اور ترکیبوں میں ظاہر ہوتا ہے، وہی زیادہ واضح شکل میں خود علوم کی مختلف شاخوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے کا ہر وہ علم اس کی مثال ہے جو بے خدا تہذیب کے زیر سایہ پرورش پا کر نکلا ہے۔ ایسے تمام علوم اپنے آغاز سے لے کر انجام تک اس طرح سفر کرتے ہیں کہ کہیں ادنیٰ شائبہ بھی اس کا نہیں جھلکتا کہ یہاں کوئی خدا ہے۔ یا کوئی دوسری زندگی ہے، یا کوئی علم بذریعہ الہام بھی انسان کے اوپر القاء ہوا ہے۔ اس قسم کے تمام حقائق کو موجودہ علوم اس طرح نظر انداز کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں جیسے کوئی میل ٹرین اپنی تیزی میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی چلی جا رہی ہو۔ گویا کہ یہ اسٹیشن اسٹیشن نہیں ہیں بلکہ محض فرضی گھروندے ہیں اور ٹرین کو انھیں تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علوم کو پڑھتے ہیں، وہ خواہ رسمی عقیدے کے طور پر خدا کو مانتے ہوں، مگر علمی اور شعوری حیثیت سے ان کا جو ذہن بنتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ یہاں خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔ زمین و آسمان کے کسی بھی مقام پر انھیں خدا کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ کائنات کا وجود ان کو اپنے مطالعہ میں ایک اتفاقی حادثہ کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کا سارا نظام ان کے علمی مشاہدہ میں اپنے آپ بالکل فطری قوانین کے تحت چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ تاریخ کو پڑھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ تاریخ محض انسانی ارادہ اور خارجی عوامل کے دو طرفہ اثرات کے تحت پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ غرض کسی علم میں ان کو فوق الفطری قوتوں کے آثار نظر نہیں آتے۔ بلکہ ہر جگہ معلوم فطری قوانین کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ سماجی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں تو جدید تحقیقات انھیں بتاتی ہیں کہ مذہب کوئی خدائی یا الہامی چیز ہی نہیں۔ وہ تو محض ایک سماجی عمل ہے جس طرح بہت سی سماجی روایات سماج میں غیر آسمانی اسباب کے تحت پیدا ہوئیں اور شکلیں بدل بدل کر باقی رہیں۔ اسی طرح مذہب بھی ایک سماجی پیداوار ہے۔ اس سے زیادہ مذہب کی کوئی حقیقت نہیں۔ موجودہ تعلیم گاہوں

کی مثال سینما ہال سے دی جا سکتی ہے جہاں نمائش کے وقت صرف پردہ پر تصویروں کو حرکت کرتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ اور بقیہ تمام روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے آدمی ان انتظامات سے بالکل اندھیرے میں ہو جاتا ہے جس کے تحت پردہ پر نظر آنے والے واقعات ظاہر ہو رہے ہیں۔ وہ واقعات کو دیکھتا ہے مگر ان انتظامات کو نہیں دیکھتا جو واقعات کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہماری جدید تعلیم گاہوں میں "کیا ہو رہا ہے" کا منظر دکھایا جاتا ہے اور وہ تمام روشنیاں گل کر دی گئی ہیں جو "کیوں ہو رہا ہے" کا منظر طالب علم کو دکھا سکتی تھیں۔ ان حالات میں ہمارے طالب علم کی مثال اس دیہاتی گنوار کی سی ہو گئی ہے جو پہلی بار سینما ہال کے اندھیرے میں داخل ہو اور اپنی ناواقفیت اور محدود مشاہدہ کی وجہ سے سمجھ لے کہ پردہ پر نظر آنے والے واقعات خود بخود دہوئے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی اور ہاتھ کام نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح جدید علوم، آدمی کو عملی طور پر بالکل بے دین بنا دیتے ہیں۔ اس کی زندگی میں مذہب کسی شکل میں باقی بھی ہو تو اس کی حیثیت چھنگلیا سے زیادہ نہیں ہوتی جسکو بعض خاص طبیعت کے لوگ لٹکائے پھرتے ہیں اور بعض غیر ضروری سمجھ کر اس کا آپریشن کرا دیتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح ماحول بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیب جس طرح الفاظ اور معانی میں اپنا رنگ بھرتی ہو اسی طرح وہ اپنے نظریات اور مزاج کے مطابق ماحول بھی بناتی ہے۔ جب ایک طالب علم داڑھی رکھنے کی وجہ سے اپنے کالج میں "مولوی جی" کا خطاب پاتا ہے اور جب ایک طالبہ کو گرلز اسکول میں دوپٹہ اوڑھ کر جانے کی بنا پر اس کی ہم سبق لڑکیاں "ملانی بی" کہہ کر چڑاتی ہیں، تو یہ دراصل ایک تہذیب ہوتی ہے جو ماحول کی زبان سے بول رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح تہذیب پورے ماحول کو اپنے مخصوص مزاج کے مطابق ایک لباس[1] عطا کرتی ہے اور اس کو مختلف پہلوؤں سے اس طرح مزین کرتی ہے کہ اس کے دائرے میں صرف وہی ایک باوقعت لباس نظر آتا ہے اب جو شخص اس کے احاطہ میں کوئی مختلف لباس پہن کر داخل ہوتا ہے۔ وہ کچھ دن تک تو اپنی سابقہ عادت کو برقرار رکھتا ہے۔ مگر بہت جلد ماحول اسے محسوس کرا دیتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو کارٹون بنائے ہوئے ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ دن نہیں گزرنے پاتے کہ وہ اپنے سابق کارٹونی لباس کو اتار کر اپنے ماحول کا لباس پہن لیتا ہے اور "مہذب" انسانوں کی طرح اس کے اندر رہنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال اسقدر عام

---

[1] یہاں لباس کا لفظ مخصوص طور پر کپڑے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ پوری زندگی کے طور طریقوں کے بارے میں ہے۔

ہے اور ہر بستی میں اس کی اتنی کثیر مثالیں موجود ہیں کہ اس پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔

۴۔ اس سلسلے میں یہاں میں ایک اور چیز کو شامل کروں گا جو مخصوص طور پر کسی تہذیب کا منطقی نتیجہ تو نہیں ہے مگر موجودہ تہذیب کے ساتھ کم از کم فی الحال وہ یقینی طور پر وابستہ ہے۔ اس سے میری مراد آمدنی کی زیادتی ہے۔ کسی عربی درس گاہ کا طالب علم اپنے مدرسہ میں اوّل آئے تو اس کو زبانی شاباش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا جبکہ جدید علوم والا ایک طالب علم امتیازی نمبروں سے پاس ہو تو وہ فوراً قیمتی وظائف کا مستحق قرار پاجاتا ہے قدیم طرز کی درس گاہوں میں ریسرچ کے طلبا کو پچاس ساٹھ روپئے مہینے پانا بھی مشکل ہے جب کہ جدید یونیورسٹیوں میں ریسرچ اسٹوڈنٹس کو سیکڑوں روپئے ماہوار اور دیگر الاؤنس دئے جاتے ہیں پھر جب وہ کامیابی کے ساتھ اپنے تعلیمی مرحلے کو پار کرلے تو اسی کے لئے بیش قیمت بیرونی وظائف اور اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

جدید تعلیم کے ساتھ اس مادی پہلو کے الحاق نے اسکو زبردست فتنہ بنادیا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جو شخص اس میدان میں کامیاب ہوا، فوراً اس کا معیار زندگی بڑھ جاتا ہے، زندگی کے تعیشات اس کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں، ترقی کے امکانات کی موجودگی کی وجہ سے ہمیشہ اس کی بہترین توجہ ایسے سراغ ڈھونڈھنے میں لگی رہتی ہے جس سے وہ اور زیادہ بڑی تنخواہ پائے اور زیادہ اونچا منصب حاصل کرے۔ وہ دیکھتے دیکھتے دنیا پرست بنجاتا ہے۔ وہ عیش اور سہولت کا عادی ہو جاتا ہے، وہ دولت کو سب سے بڑی چیز سمجھنے لگتا ہے، دنیا کے ساز و سامان کے ہجوم میں آخرت کا خیال اس کے ذہن سے یا تو نکل جاتا ہے یا کم از کم دھندلا پڑ جاتا ہے۔ وہ ان سطحی آدمیوں کی طرح بن کر رہ جاتا ہے جو بس مادی ظواہر میں لپٹے رہتے ہیں اور لطیف حقیقتوں کی انھیں کوئی خبر نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے اتنا زیادہ نا آشنا ہو جاتے ہیں کہ ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں، گویا ایسی حقیقتیں سرے سے موجود ہی نہیں۔

جدید تعلیم کے ساتھ قباحت کے یہی پہلو ہیں جو اس طرف سے لوگوں کو متوحش بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ مجرد تعلیم ہوتی اور اس کے ساتھ تہذیب کی خرابیاں لپٹی ہوئی نہ ہوتیں تو اس سے رد کنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ واحد چیز جس نے اس سے قطع تعلق کا ذہن پیدا کیا وہ اس کا یہی پہلو ہے۔ یہ پہلو اگرچہ اضافی ہے مگر وہ اس کے ساتھ اس طرح شامل ہو گیا ہے کہ ہم دونوں کو الگ نہیں کر سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے لئے امید کی کوئی صورت نہیں۔ کیا لازماً اس تعلیم سے الگ رہنا ہی ہمارے لئے ایک صحیح رویہ ہے اور اس سے وابستگی کی کوئی صحیح شکل نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے لئے امید کی ایک

صورت موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ اس تعلیم کو فی الحال ہم اس کے اپنے دائرے میں تہذیب سے الگ نہیں کر سکتے، مگر اپنے ذہن میں یقینی طور پر اس کو الگ کر سکتے ہیں اور اس وقت ہم کو یہی کرنا چاہیئے۔

ہماری قوم کے نوجوان اگر پہلے اپنے دین کو جان چکے ہوں، اس کو سختی سے پکڑ لیں اور لینے کے لئے نہیں بلکہ دینے کے جذبے کے تحت جدید اداروں میں گھسیں تو یقیناً ان کا تحصیل علم نہایت مبارک ہوگا اور خود دین کے لئے بیحد مفید ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان نوجوان جدید علم کو پڑھ پڑھ کر جس انجام سے دوچار ہوئے، اس کا سبب کالجوں اور یونیورسٹیوں سے بڑھ کر خود ان کے اپنے اندر ہے۔ ان کی سطحیت اور دین سے بے تعلقی نے یہ نتائج اس شدت کے ساتھ پیدا کئے ہیں۔ اگر وہ اپنے دین کی عظمت کو سمجھتے اور سطحی چیزوں سے متاثر ہونے کے بجائے اعلیٰ مقاصد پر ان کی نگاہ ہوتی تو وہ فرعون کے گھر سے موسیٰ بن کر نکلتے۔ اور یہی مسلمان کی اصلی شان ہے۔

قوم کے نوجوانو! مغربی زبانیں سیکھو مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے الفاظ میں اسلام کی ترجمانی کرنے کے لئے۔ یورپ اور امریکا جاؤ مگر وہاں متاع ایمان لٹانے کے لئے نہیں بلکہ گمراہ دنیا کو حق کا پیغام پہنچانے کا شدید احساس حاصل کرنے کے لئے، زندگی کے ہر شعبے میں گھسو اور ہر بلندی پر پہنچو مگر سچا اور پکا مسلمان ہونا تمھاری نمایاں ترین خصوصیت ہو۔ جدید علوم حاصل کرو مگر عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی زندگیاں تمھارے سامنے ہوں، اعلیٰ مناصب پر فائز ہو مگر صدیق حسن بن کر رہو، تہذیب کے مرکزوں میں جاؤ مگر محمد علی اور اقبال بن کر لوٹو۔ تمھارا صرف ماضی شاندار نہیں ہے بلکہ آج بھی اعلیٰ ترین مثالیں تمھارے درمیان موجود ہیں۔

تم ایک ایسے دین کے حامل ہو جو سارے ازموں اور تہذیبوں سے برتر ہے، پھر تم کہاں کھوئے جا رہے ہو۔ تم نے زندگی کا ایک ایسا اعلیٰ مقصد وراثت میں پایا ہے جس کے آگے ساری دنیا ہیچ ہے پھر دنیا کی سطحی کامیابیوں میں کیسے کھوئے جا رہے ہو۔ جدید علوم کا شکار ہونے کے بجائے خود جدید علوم کے میدان کو اپنی شکارگاہ بناؤ، دنیا سے متاثر ہونے کے بجائے خود دنیا پر چھا جانے کا ذہن پیدا کرو، زمانے کے رنگ میں رنگنے کے بجائے خود زمانے کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالو۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

جدید علوم کے ساتھ گمراہ اقوام کی تہذیب کے وہ ناخوشگوار پہلو جن کا میں نے اوپر ذکر کیا، وہ ایسے نہیں ہیں جن کے بغیر علوم کو لینا ممکن نہ ہو۔ اگر ایک من نمک میں ایک سیر گھانڈ ملا کر ڈال دیں تو چیونٹی کھا لے گی

کو چین لے گی اور نمک کو چھوڑ دے گی۔ پھر جو چیز چیونٹی جیسے حقیر جاندار کے لئے ممکن ہے وہ کیا انسان کے لئے ممکن نہیں ہو سکتی۔

الف۔ زبان اور اسالیب بیان کی قسم کے جو اثرات ہیں، ان کو معمولی غور وفکر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو تو ان کو سمجھ لینا ہی ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ہو۔ المنجد موجودہ زمانے میں عربی کا ایک مشہور ترین مختصر لغت ہے جو جدید طرز ترتیب کا حامل ہونے کی وجہ سے مسلم طلبہ میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ اس لغت کا مصنف ایک عیسائی ہے۔ چنانچہ اس نے کتاب کے مختلف مقامات پر عیسائیت کے مخصوص عقائد کو لغت میں ٹھونسنے کی کوشش کی ہے مثلاً لفظ عذرا کی تشریح میں یہ الفاظ درج ہیں:

لقب السیدة مریم والدة الاله المتجسد — عذرا حضرت مریم کا لقب ہے جو والدہ ہیں خدائے جسمانی کی

اسی طرح لفظ مسیح کے تحت لکھا ہوا ہے۔

لقب الرب یسوع ابن الله المتجسد — مسیح خدائے یسوع کا لقب ہے جو اللہ کے بیٹے ہیں جسمانی۔

ایک طرف تو بیان لغت کے پردے میں ادنیٰ ادنیٰ مناسبتوں کو ڈھونڈ کر خالص فنی کتاب میں عیسائی عقائد کا پرچار کیا گیا ہے۔ اور دوسری جانب یہ حال ہے کہ لفظ احمد اور محمد کا ذکر آتا ہے تو صرف لفظی ترجمہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کا ذکر تک نہیں آتا کہ یہ لفظ دنیا میں کسی ہستی کا نام بھی ہے۔

یہ کتاب کم از کم چوتھائی صدی سے عربی درسگاہوں میں کثرت سے استعمال ہو رہی ہے مگر مسلم طلبہ کے عقائد میں اس کی وجہ سے ادنیٰ نقصان بھی نہیں ہوا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ لغت مسلمانوں میں عموماً ایسے لوگ استعمال کرتے ہیں جو اسلام اور غیر اسلام سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کے ان طلباء کو اس طرح کے بیانات صرف مضحکہ خیز نظر آتے ہیں وہ کسی طرح ان کو متاثر کرنے کا باعث نہیں بنتے۔ اسی طرح جدید علوم کے طلبہ اگر دین سے واقفیت کا اہتمام کر لیں اور اس کے بارے میں پہلے سے باشعور ہوں تو یقینی طور پر وہ زبان وبیان میں نفوذ کی ہوئی گمراہیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اس طرح کی چیزوں کو پڑھ کر حقارت کے ساتھ انھیں رد کر دیں گے۔ نہ یہ کہ ان سے متاثر ہوں۔

جب مجلسِ سلطانی سے واپس آتا ہوں تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں ۔ حفظ قرآن کی یہ دولت عظمیٰ، ان اوقاتِ فرصت میں جو کہ اوقاتِ جمعیت قلب ہیں ۔ حاصل ہو گئی ـــــ الحمد للہ اولاً و آخراً

مکتوب (۴۴) میر عبد الرحمٰن ولد میر محمد نعمان کے نام

[قیامت کے دن دیدار باری تعالیٰ کا انکار کرنے والوں کے رد میں]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــ منکرینِ رویتِ باری تعالیٰ، مسئلہ دیدار پر جو اعتراض کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو دلیل وہ نفیٔ دیدار کے سلسلے میں لاتے ہیں وہ یہ ہے کہ "ان ظاہری آنکھوں سے دیکھنا اس بات پر موقوف ہے کہ دیکھنے والے اور دیکھی ہوئی چیز میں محاذات و مقابلہ ہو ـــ اور یہ بات واجب تعالیٰ کے حق میں مفقود اور غیر موجود ہے اس لیے کہ اس سے جہت و سمت لازم آتی ہے جو احاطہ و تحدید تک پہونچانے والی ہے اور اس احاطہ و تحدید سے نقص لازم آتا ہے جو منافیٔ الوہیت ہے ـــ اللہ تعالیٰ کی شان احاطہ تحدید سے بہت اونچی ہے" جواب (اس اعتراض و دلیل کا) یہ ہے کہ جو قادرِ مطلق اس دنیا میں جو کہ ضعیف و فانی ہے آنکھوں کو جو محض دو خولدار بے حس و حرکت پیٹھے ہیں ۔ یہ قدرت دیدیتا ہے کہ بشرطِ مقابلہ و محاذات وہ احساس و دیدارِ اشیاء کر لیتی ہیں وہی قادرِ مطلق ایسا کیوں نہیں کر سکتا کہ عالمِ آخرت میں جو کہ قوی و باقی ہے ۔ انھیں آنکھوں کو یہ قوت عطا فرما دے کہ وہ بے شرطِ مقابلہ و محاذات کسی چیز کو دیکھ سکیں خواہ وہ چیز جہت میں ہو یا بے جہت ہو ـــ آخر اس مسئلہ رویت کو بعید سمجھنے کی وجہ کیا ہے؟ اور اس کو محال کیوں سمجھا جا رہا ہے؟ درانحالیکہ فاعل جل سلطانہٗ قدرت و توانائی کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہے اور قابل (یعنی آنکھ جو اثرِ فاعل کو قبول کرنے والی ہے) میں احساس اور دیکھنے کی استعداد موجود ہے ـــــ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض زمان اور بعض مکان (یعنی دنیا میں) بعض حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر آنکھوں کے دیکھنے کے لیے شرطِ محاذات و تعین جہت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور بعض مکان اور بعض زمان (یعنی عالمِ آخرت) میں اس شرط کا اعتبار نہیں فرمایا گیا ہے بغیر اس شرط کے ہی رویت بصر کو مقرر کیا ہے ـــــ ایک مقام

کو دوسرے مقام پر قیاس کیا۔ حالانکہ دونوں مقاموں میں بہت زیادہ اختلاف ہے ——— انصاف سے دور ہے ——— نیز اپنی نظر کو مکشوفاتِ عالمِ ظاہری تک محدود رکھنا اور خالقِ زمین و آسمان کے عالمِ ملکوت سے انکار کرنا ہے ——— سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ (قیامت میں ان ظاہری آنکھوں سے) دکھائی دیں گے تو اس صورت میں ان کا ہماری بصر سے احاطہ کیا ہوا اور ادراک کیا ہوا ہونا لازم آئے گا۔ یہ بات متلزم حدّ و نہایت ہے اور حدّ و نہایت سے اللہ تعالیٰ وراء الوراء ہے ——— جواب یہ ہے کہ جائز و ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ دکھائی دے اور نظر کا احاطہ کیا ہوا اور ادراک کیا ہوا نہ ہو اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے) "اللہ کا نظریں احاطہ و ادراک نہیں کرسکتیں البتہ وہ نظروں کا احاطہ و ادراک کرتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے" ——— مومنین آخرت میں حق تعالےٰ کو دیکھیں گے اور یقینِ وجدانی سے یہ محسوس کریں گے کہ ہم اللہ تعالےٰ کو دیکھ رہے ہیں اور وہ لذت جو دیدار پر مرتب ہوتی ہے اس لذت .... کو بھی انتہائی درجے میں اپنے اندر محسوس کریں گے لیکن جس ذات کو وہ دیکھ رہے ہیں اس کو احاطہ و ادراک نہ کرسکیں گے ——— اس ذات کا پورا پورا حصول نہ ہوسکے گا اور سوائے وجدانِ رویت اور لذتِ دیدار کے مرئی (دیکھی ہوئی شے) سے کوئی چیز ان کے لیے نقدِ وقت نہ ہوگی۔

ھ عنقا شکار کس نشود دام باز چین کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

(اس) رویت میں جو کمی منصور ہے وہ بس ذات کے احاطہ و ادراک کی ہے کہ وہاں احاطہ و ادراک نہ ہوگا لیکن محض ثبوتِ رویتِ بے جہت میں اور اس لذت میں جو دیکھنے والے کو اس ذاتِ اقدس کے دیکھنے سے حاصل ہوگی ——— کوئی کمی اور نقصان نہیں ہے بلکہ یہ تو اس ذاتِ عالی کا کمالِ انعام و احسان ہے کہ وہ اپنے جمالِ پر کمال کو سوختگانِ آتشِ محبت کے سامنے جلوہ گر فرمائے اور شربتِ وصالِ دیدار سے ان کو لذت یاب اور

ھ۔ عنقا کسی سے شکار نہیں ہوتا ہے اپنے جال کو اٹھا کر رکھ لے اس جگہ جال کے لیے سوائے ہوا کے اور کچھ حاصل نہیں ہے۔

سیراب کرے ۔ اس سے کوئی بھی نقص جناب قدس کی طرف عائد نہیں ہوتا اور کوئی جہت و احاطہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

از آنطرف پذیرد کمال او نقصان — وزیں طرف شرف روزگار ما باشد[ع]

یا ہم کہیں کہ مقابلہ و محاذات اگر حصولِ رویت میں شرط ہے تو چاہیئے کہ جس طرح دیکھی ہوئی چیز میں شرط ہے دیکھنے والے کے لیے بھی شرط ہو اس لیے کہ مقابلہ تو ایک نسبت ہے جو دیکھی ہوئی چیز اور دیکھنے والے دونوں میں قائم ہے ۔ پس اس بات سے یہ لازم آیا کہ حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ بھی اشیاء کو نہ دیکھیں اور ان کے لیے بھی رویتِ اشیاء کی صفت ثابت نہ ہو حالانکہ یہ بات مخالف نصوصِ قرآنی ہے ۔ نیز مستلزم نقص ہے اور اللہ تعالےٰ کے لیے صفت کاملہ کی نفی کرنا ہے ۔ قرآن میں ہے ۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (تم جو عمل کرتے ہو اللہ تعالےٰ اس کو دیکھنے والا ہے) وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے) وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ (عنقریب اللہ تعالےٰ تمہارے عمل دیکھے گا) ......

حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ (منکرین رویت کو) انصاف کی توفیق دیں کہ وہ اپنے توہمات و تخیلاتِ فاسدہ کی بنا پر نصوصِ قرآنی کا انکار اور احادیث صحاح نبوی کی تکذیب نہ کریں ۔ اس قسم کے احکام پر ایمان لانا اور ان احکام کی کیفیت کے علم حق تعالےٰ کے سپرد کرتے ہوئے ادراک کیفیت کے قصور کو اپنی طرف راجع و عائد کرنا چاہیئے یہ نہ ہو کہ اپنے ادراک کو مقتدیٰ بنا کر احکام کی نفی کی جائے ۔ ایسا کرنا سلامتی و صواب سے بعید ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سی چیزیں حقیقت میں صادق ہوں اور ہماری عقولِ ناقصہ کے ادراک سے بعید سمجھی جائیں ۔ اگر محض عقل کافی ہوتی تو شیخ بو علی سینا جیسا شخص جو کہ مقتدائے اربابِ معقول ہے تمام احکامِ عقلیہ میں حق پر ہوتا اور غلطی نہ کرتا حالانکہ "الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد" (واحد سے ایک چیز سے زیادہ صادر نہیں ہوتی)، اس قول اور اس مسئلے میں بو علی سینا نے اس قدر غلطی کی ہے کہ ناظر منصف پر تھوڑے سے تامل سے واضح ہو جاتی ہے ۔ بو علی سینا کے اس

ع (دیدار سے) اس جانب تو کمال میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا اور اس جانب یعنی ہمارے لیے باعث شرف ہوتا ہے

قول پر امام فخر الدین رازیؒ نے سخت اعتراض کیا ہے اور یوں فرمایا ہے کہ "تعجب ہے اس شخص پر جس نے اپنی تمام عمر اس علم (منطق) کی تعلیم و تعلم میں ضائع کی جس علم کو خطار فی الفکر سے بچانے کا آلہ کہا جاتا ہے ـــ پھر جب وہ شخص مطلب اشرف و اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوا تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں جن پر بچے بھی ہنسیں ـــ علماءِ اہلِ سنت جمیع امور شرعیہ کو قبول کرتے اور مانتے ہیں چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں ـــ ایسا نہیں کرتے کہ ان امور کی کیفیت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نفی کر دیں ـــ عذابِ قبر، سوالِ منکر و نکیر، پُل صراط، میزانِ عمل اور ان جیسے بہت سے امور میں جن کے ادراک سے عقولِ ناقصہ عاجز ہیں علماءِ اہلِ سنت نے اپنا مقتدیٰ کتاب و سنت کو بنا کر عقول کو کتاب کا تابع کیا ہے۔ اگر عقلیں ادراک کر سکیں تو اچھی بات ہے ورنہ وہ احکامِ شرعیہ کو قبول کرتے ہوئے اپنے عدمِ ادراک کو اپنے قصورِ فہم پر محمول کرتے ہیں ـــ دوسروں کی طرح یہ نہیں کہ جس چیز کو ان کی عقلیں قبول کریں اور معلوم کر لیں اس چیز کو تو وہ قبول کر لیں اور جو چیز ان کی عقلوں کی دسترس سے باہر ہو اس کو قبول ہی نہ کریں۔ ان (عقل پرستوں) کو شائد معلوم نہیں کہ بعثتِ انبیاءؑ اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ عقلیں بعض بلند حقائق کے سمجھنے سے قاصر ہیں ـــ عقل اگرچہ حجت ہے مگر حجتِ کاملہ نہیں ہے ـــ حجتِ کاملہ، بعثتِ انبیاء سے مکمل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۔ (ہم نہیں ہیں عذاب دینے والے یہاں تک کہ بھیجیں ہم رسول کو) .... اس ذاتِ بیچون و بےچگونہ کا دیدار بھی بیچون بےچگونہ ہے اس لیے کہ چون و چرا کا اس ذاتِ بیچوں کے معاملے میں کوئی راستہ نہیں ہے...... اس دیدارِ بیچوں کو مخلوق کی رویت پر جس کا تعلق دنیا کی چیزوں سے ہے ـــ قیاس کرنا نامناسب اور انصاف سے دور ہے ـــ واللہ سبحانہ الموفق للصواب

مکتوب (۴۵) مولینا سلطان سرہندی کے نام

[قلب مومن کی بلندیٔ مقام اور اس کو ایذا دینے کی ممانعت کے بیان میں]

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ محمد و آلہٖ اجمعین

بعد حمد و صلوٰۃ واضح ہو کہ قلب ہمسایۂ حق سبحانہ ہے اور قلب کی مانند کوئی چیز جناب قدس سے

نزدیک تر نہیں ہے۔ پس قلب کے ستانے سے مطلقاً پرہیز کرو خواہ کوئی بھی ہو مطیع ہو یا عاصی۔
اس لیے کہ ہمسایہ کی حمایت وحفاظت کی جاتی ہے اگرچہ وہ عاصی کیوں نہ ہو۔ پس ایذائے
قلب سے ذرہ اور بہت ڈرو کیونکہ کفر کے بعد جو کہ باعثِ آزارِ حق تعالیٰ ہے ۔ کوئی گناہ ایسا
نہیں ہے جو قلب کو تکلیف پہونچانے سے زیادہ ہو اس لیے کہ قلب ایک ایسی قریب ترین شے ہے
جس کے ذریعہ حق تعالےٰ سے واصل ہوتے ہیں ۔ تمام مخلوق بندگانِ خدا میں شامل ہے۔
اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کسی کے غلام کو مارنا اور اس کی توہین کرنا اس کے آقا کی ایذار
کا سبب ہے پس خیال کرنا چاہیئے اس آقائے حقیقی کی عظمتِ شان کا جو مالک علی الاطلاق ہو
اور اس کا لحاظ کر کے اس کی مخلوق میں تصرف نہ کرے مگر اسی قدر جس کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ
اتنا تصرف، داخل ایذا نہیں ہے بلکہ بجا آوریٔ حکم ہے ۔ جیسا کہ بے شادی شدہ زانی کہ اسکی
سزا سنو کوڑے ہیں پس اگر کوئی شخص ان سنو پر زیادتی کرے گا تو یہ فعل ظلم اور داخل ایذا
ہو جائے گا نیز جاننا چاہیے کہ قلب مخلوقات میں افضل واشرف ہے اور جس طرح انسان
مخلوقات میں افضل ہے اپنی اجمالیت اور شمولیت کی بنا پر کہ عالم کبیر میں جو کچھ موجود ہے
وہ اس کے اندر موجود ہے اسی طرح قلب بھی اپنے کمالِ عدم ترکب اور اجمالیت و شمولیت
میں افضل ہے یعنی انسان میں جو خصوصیت ہے وہ قلب میں بھی موجود ہے اور جب کوئی شے
از روئے اجمال قوی تر ہو اور از روئے جمعیت و شمولیت کثیر تر ہو تو وہ جنابِ قدس تعالےٰ
سے قریب تر ہوتی ہے ۔ ــــــــــ ....

...... ــــــــ

مکتوب (۴۷) سلطان وقت (جہانگیر بادشاہ) کے نام [اسرارِ دعا اور مدحتِ علماء و صلحاء]

کمترین دُعا گویاں احمد عرض کرتا ہے اور اپنی شکستگی دنیا زمندی کا اظہار کرتے
ہوئے اس نعمتِ امن وامان کا شکر ادا کرتا ہے جو آپ کی بدولت عوام وخواص کو حاصل
ہے۔ نیز ان اوقات میں جن میں دعا کی قبولیت کا گمان ہے اور اجتماع فقراء کے موقع
پر آپ کے لشکرِ ظفر پیکر کے لیے فتح ونصرت کی دعا کرتا ہے اس لئے کہ ع ۔

ع ہر کے راہ بہر کارے ساختند۔ (ہر ایک کو کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے)
کارخانۂ خداوندی میں کسی چیز کا عبث ولغو ہونا محال ہے ــــ جو کام لشکرِ غزا و جہاد سے
وابستہ ہے وہ پایۂ دولت قاہرۂ سلطنت کی تقویت و تائید ہے کیونکہ اسی سے شریعت روشن
کی ترویج و اشاعت متعلق ہے ...... اور یہی کارِ جلیل الاعتبار اس لشکرِ دعا سے بھی تعلق
رکھتا ہے جو ارباب فقر او راصحابِ مصیبت و بلا کا لشکر ہے۔ فتح ونصرت دو قسم کی ہے۔
ایک قسم وہ ہے جو اسباب سے مربوط کی گئی ہے اور وہ صورتِ فتح ونصرت ہے اس کا
تعلق لشکر غزا و جہاد سے ہے۔ دوسری قسم حقیقت فتح ونصرت ہے جو مسبّب الاسباب
کے پاس سے آتی ہے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (نہیں ہے نصرت و مدد مگر
اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے) یہ آیت اسی (دوسری قسم) کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور
اس کا تعلق فقط لشکر دعا سے ہے ــــ لشکر دعا اپنی عاجزی و انکساری کی بنا پر
لشکر غزا سے سبقت لے گیا ہے اور اس نے سبب سے مُسَبِّب کی طرف رہنمائی کی ہے۔

ع بُردند شکستگاں ازیں میداں گوئے

(شکستہ دل اور ٹوٹے پھوٹے حال والے ہی اس میدان میں سبقت لے گئے)
نیز دُعا ردِّ قضا کرتی ہے۔ چنانچہ مخبر صادق صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ
اِلَّا الدُّعَاءُ۔ یعنی قضا کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں رد کر سکتی ــــ سیف و
جہاد میں یہ قوت نہیں ہے کہ رد قضا کرے ــــ پس لشکرِ دعا ضعف و شکستگی کے
باوجود لشکرِ غزا سے زیادہ قوی ہے نیز لشکر دُعا لشکرِ غزا کے لیے مانند روح ہے اور
لشکر غزا، لشکر دعا کا جسم و قالب ہے پس لشکر غزا کو لشکرِ دعا کے بغیر چارۂ کار نہیں کیونکہ جسم بے
روح قابلِ تائید و نصرت نہیں ہوا کرتا ــ اسی وجہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے
منقول ہے کہ آپ فقرائے مہاجرین کے توسل سے فتح ونصرت طلب فرمایا کرتے تھے حالانکہ
لشکرِ غزا موجود تھا اور محاربین و مجاہدین کو غلبہ بھی حاصل تھا ــ پس فقرا جو کہ لشکرِ دعا
ہیں کسی دن کام آجاتے ہیں باوجود اپنی خواری وزاری اور بے اعتباری کے کہ الفقر
سواد الوجہ فی الدارین (مفلسی و کم مائیگی دونوں جہان کی روسیاہی کا باعث

ہوجاتی ہے) اس جملے کو ان کے بارے میں کہا گیا ہے ___ اور اس بے اعتباری کے ہوتے اعتبار پیدا کرلیتے ہیں اور سب سے آگے ہوجاتے ہیں ___ مخبرِ صادق صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن خونِ شہدار کو علما رکی روشنائی کے ساتھ وزن کریں گے۔ علمار کی روشنائی کا پلہ جھک جائے گا سبحان اللہ یہ سیاہی اور سیاہ روی ان کے لیے باعثِ عزت وسرخروئی بن گئی اور اس نے ان کے درجے کو پستی سے بلندی تک پہونچا دیا۔

ع۔ بتاریکی درون آب حیاتست (آب حیات' تاریکی کے اندر ہے) ایک شاعر نے (کیا اچھا) کہا ہے۔

ے غلامِ خویشتنم خواند لالہ رخسارے سیاہ روئی من کرد عاقبت کارے

ہر چند یہ کمترین اس قابل نہیں ہے کہ اپنے آپ کو شکر دعا کے افراد میں شمار کرے لیکن محض اسمِ فقرا اور احتمالِ اجابت دعا کی بنا پر خود کو دعائے دولتِ قاہرہ سے فارغ نہیں رکھتا۔ اور زبان حال وقال سے دعائے سلامتی کے ساتھ تر زبان رہتا ہے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم۔

مکتوب (۵۰) خواجہ میر محمد نعمان کے نام

الحمد للہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ بندوں کو اَنفُسْ کا (اپنی ذات کا) علم حضوری ہوتا ہے اور آفاق کا (باہری چیزوں کا) حصولی' اور جب کامل المعرفت عارف حق تعالیٰ کی اقربیت (نہایت قرب) کے خاص الخاص مقام تک پہونچ جاتا ہے تو اس کے لیے اپنا نفس آفاقی کے حکم میں ہوجاتا ہے پھر اس کا اپنے نفس کا علم بجائے حضوری کے حصولی ہوجاتا ہے اور حق تعالیٰ کی اقربیت اس کے لیے خود اپنے نفس کے حکم میں ہوجاتی ہے اور وہ علم حضوری جو پہلے اپنے نفس سے متعلق تھا اس سے متعلق ہوجاتا ہے ___ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود کو عین واجب محسوس کرنے لگتا ہے اور جو علم حضوری اس کے نفس سے متعلق تھا وہ بعینہٖ متعلق بحق تعالیٰ ہوجاتا ہے۔ (ایسا ہرگز نہیں)

ے ایک لالہ رخسار (محبوب) نے مجھے اپنا غلام کہا آخر کار میری سیاہی رُخ نے میرا کام بنا دیا۔

حق تعالیٰ اس سے وراء الوراء اور بالاتر ہے —— یہ بذات خود توحید کا ایک حال اور مقام ہے اور اس کا تعلق مقامات قرب سے ہے کیونکہ "نہایت قرب" بھی ایک طرح کا اتحاد ہے یہ مقام اقربیت اور چیز ہے اور اس کا معاملہ دوسرا ہے۔ اتحاد کے مقام سے آگے گزر جانا چاہیئے اور اثنینیت (دوئی) کے مقام پر آجانا چاہیئے تاکہ "اقربیت" مقصود ہو سکے —— کسی کوتاہ فہم کو یہاں اثنینیت (دوئی) کے لفظ سے خواہ مخواہ کا وہم نہ ہو اور وہ اس کو "اتحاد و یگانگت" کے مقام سے نیچے کے درجہ کی چیز نہ سمجھ بیٹھے اصل بات یہ ہے کہ اثنینیت کا وہ مقام جو مقام اتحاد سے نیچے کے درجہ کا ہے وہ تو بیچارے عوام کالانعام کا مقام ہے۔ اور یہ خاص مقام اثنینیت (جس میں یہاں کلام ہو رہا ہے) مقام اتحاد سے ہزاروں درجہ بالاتر ہے۔ اور یہ انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے —— اور یہ بات بالکل ایسی ہے کہ صحو جو سکر سے پہلے ہوتا ہے وہ عوام کا حال ہے اور جو سکر کے بعد آتا ہے وہ خواص بلکہ اخص الخواص کا مقام ہے اسی طرح اسلام جو "کفر طریقت" سے پہلے ہوتا ہے وہ عوام مسلمین کا اسلام ہے اور جو درجہ اسلام کا "کفر طریقت" کے بعد نصیب ہوتا ہے وہ خواص بلکہ اخص الخواص کا اسلام ہے۔

بہر حال عجیب معاملہ ہے کہ (اس مقام اقربیت میں) عارف اگرچہ اپنے کو عین واجب تعالیٰ نہیں جانتا لیکن علم حضوری جو اس کے اپنے نفس سے متعلق تھا وہ واجب تعالیٰ سے متعلق ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کا علم حضوری علم حصولی بن جاتا ہے (اور گویا اپنا نفس اسکے لیے غیر اور باہر کی چیز ہو جاتی ہے)

ع　در عشق چنیں بو العجبیہا باشد[1]

ہماری عقل ان دقیق حقیقتوں کا سراغ بھی نہیں پاتی اور نارسائی سے اس قسم کی باتوں کو جمع ضدین قرار دیتی ہے اور حقیقت شناس عارف کہتا ہے کہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِجَمْعِ الْاَضْدَادِ" (میں نے تو اس جمع اضداد ہی سے اپنے رب کو پہچانا ہے)

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ ۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

---

[1] عشق میں ایسے ہی عجیب و غریب واردات ہوتے ہیں۔

ب۔ یہی صورت علمی نظریات کے سلسلے میں پیش آئے گی حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کا کوئی بھی واقعہ بذات خود مذہب کی تردید نہیں کرتا۔ یہ صرف واقعات کی خود ساختہ توجیہات ہیں جنھوں نے سارے علوم کو مذہب سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ چند مثالیں لیجئے:۔

"کچھ سُنا آپ نے، روس کا بنایا ہوا راکٹ، چاند پر پہونچ گیا۔"

"ہاں، میں نے بھی آج ہی یہ خبر پڑھی ہے۔"

"اب مذہب کا کیا ہوگا، اب تو خدا، مذہب کے تصورات پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔"

ستمبر ۱۹۵۹ کے وسط میں جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ روس نے ۱۲ ستمبر کو جو راکٹ (لیونک نمبر ۲) فضا میں چھوڑا تھا، وہ سات ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر ۳۴ گھنٹے میں چاند پر پہونچ گیا تو بہت سے "قدامت پرستوں" کو "جدت پسندوں" کی زبان سے اس قسم کے فقرے سننے پڑے۔ منکرین کے نزدیک یہ خدا کی تردید کا اتنا بڑا ثبوت تھا کہ ماسکو ریڈیو نے اعلان کیا کہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نہیں ملا۔ اس طرح کی باتوں سے بہت سے سادہ لوح متاثر ہو گئے۔ حالانکہ راکٹ کا چاند تک یا کسی اور سیارہ تک جانا سائنسی نقطہ نظر سے صرف نظام فطرت کے ایک امکان کو استعمال کرنا ہے۔ یہ امکان نیوٹن کے زمانے ہی میں معلوم ہو گیا تھا۔ مگر اس کے لئے اس حد تک کوشش کہ اس کو قابل عمل بنایا جا سکے، مخصوص اسباب کے تحت اب ہو سکی ہے، اس طرح راکٹ کی اڑان کی حقیقت صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو امکانات رکھ دئے ہیں اور جن کو ہمارے لئے اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ ہم ان کو استعمال میں لا سکیں، ان کو انسان استعمال میں لایا ہے۔ یہ صرف سخرلکم مافی السماوات والارض کی ایک تصدیق ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جو شخص ٹامس ہارڈی (۱۸۴۰-۱۹۲۸) کی کہانیاں خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ بلاشبہ کہنے لگے گا کہ اس دنیا میں آدمی بے رحم قسمت کے ہاتھ میں محض کھلونا ہے۔ کائنات پر کشش تو ہے مگر وہ کسی معنی میں ہماری ہمدرد نہیں ہے۔ فطرت کے ساتھ فرد کی جد و جہد ایک نہایت غیر مساوی فریق کے ساتھ افسوس ناک جنگ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر خدا کی قسم کی کوئی چیز یہاں موجود ہے تو وہ بالکل بے اعتنائی کے ساتھ بے بس انسان کی مصیبتوں کا محض خاموش تماشا دیکھ رہا ہے۔ مگر دنیا کے بارے میں یہ بھیانک تصور صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم آخرت کو نہ مانیں۔ آخرت کو ماننے کے بعد صورت حال بالکل

بدل جاتی ہے۔ کیونکہ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور آدمی یہاں اچھا برا دونوں قسم کا عمل کرنے کے لئے آزاد ہے۔ اس لئے صرف موجودہ دنیا کے پیش نظر اس کی معنویت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اس کی معنویت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسری دنیا کو ملا کر اسے دیکھا جائے۔

نظریہ ارتقاء کے وجود میں آنے کے بعد یہ بات کثرت سے دہرائی گئی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا، دوسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے کسی باشعور خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے یہ تو صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے، جو خاص طور پر تین ہیں:

REPRODUCTION, VARIATION, and DIFFERENTIAL SURVIVAL.

یعنی توالد و تناسل کے ذریعہ مزید زندگیوں کا پیدا ہونا، پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فرقوں کا پشت ہا پشت میں ترقی کر کے مکمل ہو جانا ــــ اس طرح ڈاروِن کے انتخاب طبیعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشوونما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

ارتقاپسند علماء کی تشریحات کا میں نے جتنا مطالعہ کیا ہے، اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انواع حیات فی الواقع اسی طرح وجود میں آئی ہیں جیسا یہ لوگ بتاتے ہیں۔ تاہم اگر اسکو بلا بحث مان لیا جائے جب بھی اس سے ایمان کے تزلزل کا سوال تو کسی طرح پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انواع حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت وجود میں آئی ہوں جب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہو کہ یہ خدائی تخلیق کا طریقہ ہے نہ کہ اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ۔ حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء (MECHANICAL EVOLUTION) کو نہایت آسانی کیساتھ تخلیقی ارتقاء (CREATIONAL EVOLUTION) ثابت کیا جا سکتا ہے اور مادی علماء کے پاس اس کی تردید کی کوئی ذاتی بنیاد نہ ہوگی[1]

یہ چند مثالیں میں نے صرف یہ سمجھنے کے لئے دی ہیں کہ جدید دریافتیں اصلاً مخالف مذہب نہیں ہیں بلکہ منکرین مذہب ان کی غلط توجیہہ کر کے بہانے نوجوانوں کو دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔

[1] واضح ہو کہ میں نظریۂ ارتقاء کو بطور طریق کار بھی بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ یہ بات میں نے برسبیل تنزل کہی ہو نہ کہ اس کو تسلیم کرتے ہوئے۔

اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل پہلے دین کا علم حاصل کرے اور دینی شعور سے پوری طرح مسلح ہو کر جدید علوم کے میدان میں اترے ۔ اس وقت اس کے پاس ہر بات کا صحیح جواب ہوگا اور اس کا ذہن ہر واقعہ کی صحیح توجیہہ ڈھونڈ لیا کرے گا ۔ علم دین دوسرے لفظوں میں حقیقت اشیاء کو جاننے کا علم ہے ۔ پھر جو حقیقی علم کو پالے اس کو ایک ایسی روشنی مل جاتی ہے جس سے وہ ہر غلطی کو پکڑ لے اور ہر بات کی تہ تک پہونچ جائے ۔

ج ۔ جہاں تک غلط ماحول اور دنیوی خوش حالی کے دروازے سے آنے والی خرابیوں کا معاملہ ہو اسکا تعلق علم سے نہیں بلکہ قلبی حالت سے ہے ۔ اگر ہمارے دلوں میں ایمان اس طرح راسخ ہو کہ اسکے اثر سے ہمارے قلوب ایمان کی چٹانیں بن گئے ہوں تو کسی قسم کا ماحول ہم کو متاثر نہیں کر سکتا ۔ پھر آدمی طوفانی سمندر میں بھی اپنا ایک جزیرہ بنا کر رہ سکتا ہے ۔ اسی طرح اگر آخرت کا واقعی احساس پیدا ہو جائے تو دنیوی خوش حالی آدمی کو کاٹنے لگتی ہے ۔ کجا کہ وہ ذہن کو خراب کرے اور آدمی کا مزاج بدل دے ۔

معلوم ہوا کہ علوم جدید کے مسلم طلبہ میں بے دینی کے اثرات لازمی طور پر خود ان علوم کا نتیجہ نہیں ہیں ۔ بلکہ یہ زیادہ تر خود اپنی کوتاہیوں کے ثمرات ہیں ۔ اگر ہمارے مسلم نوجوانوں کا دینی شعور بیدار ہو ، وہ حق و ناحق کی تمیز رکھتے ہوں ۔ اور اسی کے ساتھ ان کا ایمانی جذبہ اسقدر زندہ ہو کہ ناحق سے آلودگی کو گوارا نہ کرے اور پھسلن پر پھسل جانے کے بجائے سنبھل کر چلنے کی طاقت ان میں موجود ہو تو یہ علوم بذات خود ایسے نہیں ہیں کہ آدمی کی متاع ایمان کو لوٹ لیجائیں ۔ بلاشبہ موجودہ صورت حال یہی ہو کہ ایک شخص اس میں مسلمان کی حیثیت سے داخل ہوتا ہو اور کافر بن کر نکلتا ہو لیکن اگر ہم کر سکیں تو یہ بھی ممکن ہو کہ ایک شخص مسلمان داخل ہو اور مسلمان تر بن کر نکلے ۔

مسلم نوجوانو ! زندگی کے ہر شعبے میں گھسو ، ہر بلندی پر چڑھو اور " حکمت " کی تمام باتوں کو سیکھو ۔ مگر مسلمان بن کر اور اسلام کا کلمہ سر بلند کرنے کے لئے ۔ اگر تم ایسا کر سکو تو میں سارے اہل دین کی طرف سے تم کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ لیکن اگر تم نے اہل دنیا کے ساتھ گڑھے میں گرنا ہی اپنے لئے پسند کر لیا ہو تو نہ خدا کے دین کو تمھاری ضرورت ہو اور نہ خدا کے یہاں تمھارا کوئی مقام ہو ۔ تمھارے لئے ذلت ہی ذلت ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

دور جدید مسلم نوجوانوں کے عزم اور حوصلے کا امتحان لے رہا ہو ۔ مستقبل بتائے گا کہ وہ اس امتحان میں پورے اترے یا فیل ہو گئے ۔

مُطالعہ

قرآن کی قسمیں

جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اس دور میں علوم قرآنی کے بے مثال عالم تھے۔ موصوف نے اپنے پیچھے مسودات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جن میں سے اکثر ناتمام ہونے کی وجہ سے ابھی تک شائع نہیں کیے جا سکے اور کچھ چیزیں جو مکمل تھیں وہ دائرہ حمیدیہ کی طرف سے شائع کر دی گئی ہیں۔ انھیں شائع شدہ تصنیفات میں سے ایک — امعان فی اقسام القرآن ہے جو موصوف کی دوسری تصانیف کی طرح اصلاً عربی زبان میں تھی اور دائرہ حمیدیہ نے اس کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع کر دیا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں قرآن کی قسموں پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا فراہی نے قرآن اور اس کے متعلق موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے، اس سلسلے میں آپ کے پیش نظر خاص طور پر یہ چیز رہی ہے کہ ان مسائل پر تحقیق کی جائے جو سابق علماء اور مفسرین کی قابل قدر کوششوں کے باوجود ابھی تک تشنہ رہ گئے ہیں۔ قرآن کی قسموں کا معاملہ بھی انھیں مسائل میں سے ایک ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم و برتر ہو۔ قسم کے اس تصور کے تحت قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی مخلوقات کی قسم کیوں کھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی اس کائنات میں ہے وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے مقابلہ میں حقیر ہی ہے۔ پھر خدا کی طرف سے ان چیزوں کی قسم کھانے کا کیا مطلب۔

مفسرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر عام طور پر جو جوابات دیئے گئے ہیں اُن سے قسم کی ان مختلف نوعیتوں کی حکمت واضح نہیں ہوتی جو قرآن میں آئی ہیں۔ اکثر

جوابات گویا اس بات کا اعتراف ہیں کہ جہاں کوئی قسم آئی ہے وہاں اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے حتیٰ کہ اگر اس قسم کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کلام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

مولانا فراہی نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں یہ ثابت کیا ہے کہ کسی شے کی قسم کھانے کا مطلب دراصل اپنی بات کے لیے اُس شے کی گواہی پیش کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی تعظیم کو بیان کرنا۔ گویا جہاں والقرآن المجید کہا گیا ہے وہاں اصل میں کہنا یہ تھا کہ قرآن کا غیر معمولی انداز بیان اور اس کی اعلیٰ تعلیمات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ ایک برتر ہستی کا کلام ہے۔ مگر اسی کو یوں فرمایا ـــــ "قرآن مجید کی قسم" یہ کلام کو مدلل و مؤثر بنانے کا ایک اسلوب ہے۔ چنانچہ قرآن میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، وہ بالعموم وہی ہیں جن کو دوسرے مقام پر قسم کے بغیر براہ راست دلیل اور آیت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کہیں کہتا ہے کہ ـــــ "میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی جس کو تم دیکھتے ہو اور اس چیز کی جس کو تم نہیں دیکھتے۔" (الحاقہ۔ ۳۸۔ ۳۹) اور دوسرے مقامات پر انھیں تمام موجودات کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ یہ عالم گواہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ بات دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک جگہ جو بات سادہ اسلوب میں کہی گئی تھی۔ اُس کو دوسرے مقام پر قسم کے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

قسم کی اس توجیہ کے بعد قرآن کی تمام قسمیں بامعنی ہو جاتی ہیں۔ وہ استدلال کے اس سلسلے کا ایک اہم جزو بن جاتی ہیں جن سے قرآن اپنی دعوت کو مدلل اور مؤثر بنانے میں مدد لیتا ہے اور اس کی روشنی سے طالب قرآن کے سامنے بھی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس سے وہ قرآن کی قسموں کا مطالعہ کرتے ہوئے صحیح نقطۂ نظر سے اپنے غور و فکر کا آغاز کر سکتا ہے۔

جیسا کہ مولانا فراہی نے خود واضح کیا ہے، قرآن کی قسموں کے متعلق یہ تصور بالکل مولانا کا طبع زاد نہیں ہے بلکہ پچھلے علماء نے بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں:

مما ذکرنا من اقوال العلماء فی	علماء کے اقوال جو ہم نے نقل کیے ہیں،
الفصول السابقة نری ان هذا	اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم کا یہ مفہوم
المعنی للقسم لیس ببدع	بالکل نیا نہیں ہے۔

امعان فی اقسام القرآن (قاہرہ ۱۳۴۹ھ) صفحہ ۴۵

سابق مفسرین، قسم کی بحث میں دوسری توجیہات کے ساتھ اس کا ذکر بھی کرتے رہے ہیں مثلاً صاحب تفسیر کبیر نے سورۂ ذاریات کی قسموں کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

انھا کلھا دلائل اخرجھا فی صورۃ الایمان۔	یہ سب دراصل دلیلیں ہیں جو قسم کی شکل میں بیان کی گئی ہیں۔

مگر مولانا فراہی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس سلسلے میں قدیم مفسرین کا ذہن پوری طرح صاف نہیں تھا۔ وہ قسم کی اس صحیح توجیہ کے ساتھ بہت سی دوسری کمزور توجیہات بھی اختیار کر لیتے ہیں (امعان، صفحہ ۴۵) چنانچہ امام رازی جو سورۂ ذاریات کی قسموں میں دلیل و شہادت کی جھلک دیکھتے ہیں سورۂ تین کی قسموں میں انجیر و زیتون کے فضائل بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گویا ایک جگہ ان کے نزدیک قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ اس سے اپنے دعوے پر دلیل قائم کرنی مقصود تھی اور دوسری جگہ اس لیے قسم کھائی کہ وہ چیز قابل عظمت تھی یا بجائے خود کوئی اہمیت رکھتی تھی۔

یہ کتاب ایک اعلیٰ تحقیقی کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جو اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور پھر اس کتاب کو پڑھے، البتہ ایک چیز جو میری سمجھ میں نہیں آئی اور کافی غور و خوض کے بعد بھی جس پر میرا ذہن مطمئن نہ ہو سکا ـــــ اس کو یہاں درج کرتا ہوں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ مولانا فراہی نے اس تصور کی تردید کی ہے کہ جب کسی چیز کی قسم کھائی گئی ہو تو اس سے مقسم بہ (جس چیز کی قسم کھائی جائے) کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔ یہاں تک بات بالکل واضح ہے، مگر اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مقسم بہ قسم کا کوئی ضروری جزو نہیں ہے۔ یہ گویا ان کے نزدیک قسم برائے تعظیم ہونے کی ایک مزید تردید ہے۔ کیونکہ اگر قسم برائے تعظیم ہوتی تو مقسم بہ کا ذکر ضروری ہوتا۔ کیونکہ کسی چیز کی تعظیم کے لیے اس کی قسم کھانا اور پھر اس چیز کا ذکر نہ کرنا ایک بے معنی بات ہے۔ لکھتے ہیں:

فتبین مما مرّ بِکَ فی ھذا الفصل	پچھلی تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی
والذی قبلہ ان القسم لا یلزمہ	کہ مقسم بہ کی تعظیم کا مسئلہ تو درکنار، قسم کیلئے

المقسم به فضلا عن تعظيمه۔ مقسم بہ خود کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔

صفحہ ۲۱

اسی لیے مولانا اس عام خیال کے مخالف ہیں کہ جہاں قسم کے ساتھ کوئی مقسم بہ مذکور نہ ہو وہاں وہ محذوف ہوتا ہے:

ان القسم ليس الا التاكيد ولا تحتاج الى تقديرا لمقسم به فى كل موضع
قسم کی حقیقت صرف تاکید ہے اسی لیے ہر جگہ مقسم بہ محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صفحہ ۱۹

یہ صحیح ہے کہ بہت سے قسمیہ فقروں میں مقسم بہ مذکور نہیں ہوتا لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ وہاں مقسم بہ محذوف بھی نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ اس میں تاکید کس پہلو سے پیدا ہوئی۔ مولانا نے خود نہایت تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ قسمیہ فقروں میں کسی چیز کو بطور شہادت پیش کر کے کلام کو موکد کیا جاتا ہے:

ان القسم بالشئ اصله الاستشهاد به۔
کسی چیز کی قسم کھانے کا مطلب دراصل اپنی بات کے حق میں اس چیز کی شہادت پیش کرنا ہے۔ صفحہ ۲۳

قسم تاکید کی وہ قسم ہے جس میں کسی چیز کو بطور شہادت پیش کر کے کلام کو موکد کیا جاتا ہے۔ پھر جب آدمی صرف اتنا کہے کہ "میں قسم کھاتا ہوں" یعنی صرف لفظ قسم بولے اور اس چیز کا ذکر نہ کرے جس سے شہادت کا پہلو پیدا ہوتا ہوتا ہے تو آخر اس کی بات میں قسم والی تاکید کیونکر آجائیگی اور شہادت کیسے پیدا ہوگی۔ قسم کی تعریف کے مطابق ضروری ہے کہ قسم مقسم علیہ (جس بات کو موکد کرنے کے لیے قسم کھائی گئی ہے) پر دلیل ہو۔ لیکن اگر مقسم بہ کو ختم کر دیا جائے تو کیا چیز دلیل بنے گی۔ کیا محض لفظ قسم۔ حقیقت یہ ہے کہ قسم برائے تعظیم جس طرح تقاضا کرتا ہے کہ اس کے لیے کوئی مقسم بہ ہو۔ اسی طرح قسم برائے استدلال کا بھی تقاضا ہے کہ مقسم بہ موجود ہو۔ اسکے بغیر استدلال و شہادت کی بات مکمل نہیں ہوتی۔

مولانا فراہی کی تشریح کے مطابق قسم ایک تاکیدی کلمہ ہے جو کوئی شخص اپنے دعوے کے موقع پر استعمال کرتا ہے، یہ تاکید کبھی مقسم بہ کا حوالہ دے کر پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک

"مقسم بہ والی قسموں کی حقیقت بس یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعوے کے گواہ کے طور پر مقسم بہ کو ملایا کرتا ہے۔" (صفحہ ۲۲) اور کبھی یہ تاکید مقسم بہ کے بغیر محض لفظ قسم بول کر پیدا کی جاتی ہے۔ یعنی آدمی کسی متعین چیز کی قسم نہیں کھاتا بلکہ اس طرح کی کسی چیز کا صراحۃً یا کنایۃً حوالہ دیئے بغیر صرف یہ کہتا ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں:

ربما یکون مجردا عن المقسم بہ		کبھی قسم مقسم بہ کے بغیر ہوتی ہے۔ ایسے
وحینئذ لا یراد بہ الا التاکید		مواقع پر قسم کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں
والجزم المحض۔	صفحہ ۲۱	ہوتا کہ مجرد تاکید اور جزم کا اظہار کیا جائے۔

مگر میری رائے ناقص میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ تاکید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجرد لفظی تاکید اور دوسرے قسمیہ تاکید۔ لفظی تاکید میں بے شک، ہرگز اور یقیناً وغیرہ الفاظ بول کر کلام کو مؤکد بنایا جاتا ہے اور قسمیہ تاکید کی صورت میں کسی ایسی چیز کا حوالہ دیا جاتا ہے جو کسی پہلو سے آدمی کی صداقت کا ثبوت بن سکتی ہو۔ اسی دوسرے طریق تاکید کا نام قسم ہے۔

قسمیہ تاکید کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جن کو مصنف مرحوم نے "دینی قسم" کہا ہے (صفحہ ۲۸) اور دوسری وہ جس کو "استدلالی قسم" کہا جا سکتا ہے، دینی قسم کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے ایسی ہستی کا حوالہ دے جو اس کے نزدیک نافع وضار ہے۔

مثلاً ایک شخص میرا محسن ہے اس کو یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کے احسانات کو بھول گیا ہوں اور اس کے ساتھ غداری کر رہا ہوں اب ایسے موقع پر اگر میں کہوں کہ:

"میں ہرگز تم سے غداری نہیں کر سکتا۔"

تو یہ لفظی تاکید ہے۔ لیکن اگر اسی بات کو اس طرح کہا جائے کہ:

"خدا کی قسم میں تمھارے ساتھ غداری نہیں کروں گا۔"

تو یہ دینی قسم کی مثال ہو گی جس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں کیسے تمھارے ساتھ غداری کر سکتا ہوں جبکہ خدا میرے اور تمھارے درمیان ہے جو بُرا عمل کرنے والے کو اس کی برائی کی سزا دیتا ہے۔

قسم کی یہی وہ صورت ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو قسم کھائے اللہ کی قسم کھائے، ورنہ خاموش رہے۔"

کیونکہ اس طرح کی قسموں میں کسی غیر اللہ کا حوالہ دینا اس کو حاضر وناظر اور نافع و ضار ماننا ہے جو شرک ہے۔

تیسری شکل یہ ہے کہ میں اس طرح کہوں:

"تمہارے احسانات کی قسم میں تم سے غداری نہیں کر سکتا"

یہ استدلالی قسم ہوگی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو احسانات میرے اوپر کیے ہیں وہ خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایسا ممنون احسان شخص اپنے محسن کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا ـــــ قرآن کی قسمیں اسی استدلالی نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔

قسم کی اس تشریح کے مطابق ہر حال میں اس کے لیے مقسم بہ ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا کہ بہت سی قسموں میں مقسم بہ مذکور نہیں ہوتا۔ کیونکہ جہاں قسم کے ساتھ مقسم بہ مذکور ہے، وہ اس بات کا قرینہ ہے کہ جہاں وہ مذکور نہیں ہے وہاں وہ محذوف ہے۔

مقسم بہ کو غیر ضروری قرار دینے کے لیے مولانا فراہی نے جو استدلال کیا ہے، وہ مجھے اثبات مدعا کے لیے کافی نظر نہیں آتا۔ مثلاً مولانا نے قرآن اور کلام عرب سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں مقسم بہ مذکور نہیں ہے یہ ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر قسم کے ساتھ مقسم بہ ضروری ہوتا تو ان قسموں میں وہ بھی موجود ہوتا، مگر کم از کم ان مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پیش کردہ کلام میں فی الواقع کوئی مقسم بہ موجود نہیں تھا۔ ان تمام مثالوں میں ایک ہی خلا پایا جاتا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لیے میں دو مثالیں یہاں نقل کروں گا۔

ربطہ سلمیہ کا شعر ہے:

فاقسمت لا انفک احدر عبرۃ　　تجود بہا العینان منی لتسجما

(میں نے قسم کھائی کہ برابر میری دونوں آنکھیں کثرت سے آنسو بہاتی رہیں گی)

دوسری مثال سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ خدا کی رحمت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اعراف - ۴۹

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

انتخاب

خاتم النبیین کے بعد کسی دوسری نبوت کی ضرورت نہیں

(مولانا محمد اسحٰق سندیلوی)

ابر رحمت اس وقت برستا ہے جب زمین کے لب خشک صدائے العطش بلند کرتے ہیں۔ بادِ بہاری چمن کے لیے حیات تازہ کا پیام اس وقت لاتی ہے جب وہ بیدادِ خزاں سے عاجز آکر سراپا فریاد والغیاث بن جاتا ہے۔ مہر عالم افروز اپنا رخِ انور اُس وقت بے نقاب کرتا ہے جبکہ تیرگی شب حد سے گذر جاتی ہے اور ردائے ظلمت میں دنیا کا دم گھٹنے لگتا ہے، دُنیا کے حوادث و تغیرات پر غور کرو، تم دیکھو گے کہ ان میں سے کوئی بھی بغیر احتیاج و ضرورت کے وجود میں نہیں آتا تو کیا عقلِ سلیم یہ باور کر سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی و رسول اس خاکدانِ عالم میں اس وقت آیا ہوگا یا آسکتا ہے جب اس کی کوئی احتیاج و ضرورت نہ ہو۔؟

مقامِ نبوت، انسانیت کی آخری معراج اور ارتقاء انسانی کی اعلیٰ ترین منزل ہے، اس اعلیٰ منزلت کی شخصیت ایسے وقت اور ایسے ظروف و احوال میں بھیجی جائے جبکہ اس کی کوئی احتیاج و ضرورت نہ ہو یہ بات بالکل عقل و فہم کے خلاف ہے۔

کیا خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو تاجِ نبوت سے سرفراز فرمایا گیا ہے یا قیامت تک اس کا امکان ہو کہ کسی کو یہ خلعتِ اکرام عطا فرمایا جائے؟ یہ دونوں مسئلے سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے جب تک یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ سید المرسلین کے تشریف لانے کے بعد دُنیا کے لیے کسی نبی کی احتیاج و ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا بارِ ثبوت منکرین ختم نبوت پر ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس باب میں

ہم نے یہ اسلوب نہیں اختیار کیا ہے یہاں ہم ان اسباب کو بیان کرتے ہیں جن کا وجود یقینی طور پر کسی نبی کی آمد و بعثت کی ضرورت کو معدوم کر دیتا ہے۔ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہدایت خلق اللہ کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ ان کی تشریف آوری کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ بندوں کا تعلق ان کے معبود حقیقی کے ساتھ قائم اور مستحکم کر دیں۔

انبیاء علیہم السلام اس مقصد کو تین طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔

- کتاب الٰہی کی تعلیم و تشریح سے
- خود اپنے اعمال و افعال سے
- اپنی شخصیت عظیمہ سے۔

انبیاء علیہم السلام کتاب الٰہی کا مفہوم اور اس کے مقاصد واضح فرماتے ہیں۔ اسکے کلیات کو جزئیات پر منطبق فرما کر اور جزئیات سے کلیات اخذ فرما کر نہج استنباط و اجتہاد روشن فرماتے ہیں۔ اپنے اقوال و افعال سے کتاب الٰہی کے احکام کی عملی شکل متعین فرماتے ہیں، مجموعی طور پر کتاب الٰہی جس طرز زندگی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا عملی نمونہ پیش فرماتے ہیں، انھیں اقوال و اعمال کے مجموعہ کا نام سنت ہے۔ ان کی شخصیت و ذات کا اصل فائدہ ان لوگوں کو پہونچتا ہے جو نبی کی شاگردی کا شرف براہ راست حاصل کرتے ہیں اس طرح انبیاء ایک ایسا گروہ تیار کر دیتے ہیں جو ان کے علوم و معارف کا حامل ہو کر آئندہ نسلوں تک انھیں منتقل کر سکے۔ ایک ایسی جماعت تیار کرنے کے بعد انبیاء کا کام ختم ہو جاتا ہے اور وہ اس امانت الٰہیہ کو اپنے صحابہ کے سپرد کر کے بحکم الٰہی اس عالم دنیا سے سفر کر جاتے ہیں، تاریخ پر نظر ڈالو، ان برگزیدہ ہستیوں کے متعلق حق تعالیٰ کا یہی طرز عمل پاؤ گے اور معاند سے معاند بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور رہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی زمانہ کے بکثرت بلکہ اکثر ایسے حصے ہیں جو نبی کی شخصیت سے بالکل خالی ہیں اور ان میں ہدایت عالم کا ذریعہ صرف کتاب و سنت ہی ہیں اگر کتاب و سنت کی موجودگی ناکافی ہوتی اور شخصیت نبی کا موجود ہونا ہر زمانہ میں ناگزیر ہوتا تو یقیناً کوئی زمانہ بھی ایسی شخصیت سے خالی نہ ہوتا۔ اسکے علاوہ یہ بھی دیکھئے کہ کیا نبی کے زمانۂ حیات میں بھی ہر شخص ان کی شخصیت عظیمہ سے براہ راست استفادہ کرتا ہے یا کر سکتا ہے؟ کیا بنو اسرائیل کے لاکھوں افراد میں ہر فرد حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام

کا حاشیہ نشین اور اُن کے نفوسِ قدسیہ سے براہ راست مستفید ہوا تھا؟ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس زمانہ میں اسلام پورے عرب پر چھا چکا تھا اس کی سرعتِ رفتار کا اندازہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے :-

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔ (النصر) اور آپ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔

مسافت کے لحاظ سے اسلام کی رفتار دو سومیل یومیہ سے زائد تھی مگر کیا عرب کا ہر مسلم باشندہ شرف صحابیت حاصل کر سکا تھا؟ یا معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلا واسطہ زانوئے تلمذ تہ کر سکا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، اگر کتاب و سنت کا وجود ہدایت کے لیے کافی نہ ہوتا بلکہ نبی کی شخصیت سے براہ راست وابستگی لازم ہوتی تو دور افتادہ لوگوں نیز مابعد کی نسلوں کا اسلام ہی صحیح نہ ہوتا، اگر ایسا نہیں ہے تو یہ لازم تھا کہ ہادی حقیقی کی طرف سے اس قسم کا کوئی انتظام ہوتا کہ کم از کم نبی کے دورِ حیات میں ہر شخص ان کی شخصیتِ عظیمہ سے براہِ راست مستفید ہو سکتا۔

ان بدیہی دلائل سے صراحتہً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کتاب و سنت موجود و محفوظ ہو تو ہدایت اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے نبی کی شخصیت کی کوئی احتیاج باقی نہیں رہتی، صراطِ مستقیم کو معلوم کرنے کے لیے یہ دو ذریعے کتاب و سنت تو مستقل ہیں اور تیسرا ذریعہ یعنی نبی کی شخصیت غیر مستقل بالفاظ دیگر دو مختصر، رشد و ہدایت کے لیے تعلیماتِ نبوی ناگزیر اور کافی ہیں، جب تک یہ موجود ہوں اس وقت تک ان سے ہر زمانہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے خواہ خود نبی موجود ہوں یا نہ ہوں یہ ایسا واقعہ ہے جس کا ثبوت مشاہدہ ہے اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ ذاتِ نبوی سے وابستگی بھی اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتی جب تک تعلیم نبوی پر عمل نہ کیا جائے اگر کوئی شخص کسی نبی کو دیکھنے پر بھی ایمان نہ لائے اور اس کی دعوت و تعلیم کو ٹھکرا دے تو کیا نبی کی خدمت میں حاضری اور انکی زیارت اسے ذرہ برابر بھی فائدہ پہونچا سکتی ہے؟ بخلاف اس کے جو شخص احکامِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو خواہ نبی کی زیارت سے مشرف ہوا ہو یا نہ ہوا ہو یقیناً ہدایت یافتہ اور فائز المرام ہے۔

الحاصل جس پہلو سے بھی غور کیجیے یہ حقیقت روز روشن سے بھی زیادہ روشن ہوجاتی ہے کہ ہدایت و رشد کا پائدار و مستقل ذریعہ کتاب و سنت یا بالفاظ دیگر نبی کی تعلیم ہوتی ہے خود نبی کی موجودگی کی ضرورت اُس وقت تک رہتی ہے جب تک ایک جماعت ایسی نہ پیدا ہوجائے جو اسی کے علم و طریق کو علماً و عملاً محفوظ کرلے اور اسے دوسروں تک منتقل کرنے کا کام کر سکے، ایسی جماعت تیار کرنے کے بعد نبی کا کام ختم ہوجاتا ہے چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام عموماً اس کام کی تکمیل کے بعد دُنیا سے اُٹھا لیے گئے۔

یہاں بحث یہ ہے کہ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اوپر کی سطروں میں ہم نے ایک عام اصول بیان کیا ہے، اسے اس خاص اور جزئی مسئلہ پر منطبق کیجیے، آفتاب نصف النہار کی طرح یہ بات واضح ہوجائے گی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کسی نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیئیس سال تک اپنے وجود مسعود اور انفاس قدسیہ سے اس عالم تیرہ و تار کو منور فرماتے رہے اس کے بعد اس عالم دنیا سے عالم آخرت میں اپنے رب کریم کے حضور میں تشریف لے گئے، اپنے ترکہ میں تین چیزیں آپ نے چھوڑیں، اللہ کی نورانی کتاب یعنی قرآن کریم، اپنی سنت سنیہ یعنی اپنے اقوال و افعال و تقریرات[1]، تیسری چیز جماعت صحابہ یعنی ایک لاکھ سے زائد ایسی منور، ربانی اور پاکیزہ شخصیتیں جو براہ راست معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفید ہوئی تھیں اور اُن کے علوم عالیہ کی حامل و محافظ اور اُن کا عملی نمونہ تھیں، یہی نہیں بلکہ اس امانت نبویہ کو دوسروں تک پہونچانے کی حریص تھیں۔ قرآن کریم سینوں اور سفینوں میں اس طرح محفوظ رہا کہ اس کا ایک ایک حرف ایک ایک شوشہ آج تک محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کے جو اسباب حق تعالیٰ نے مہیا فرمائے ہیں اور جو طریقے مقرر فرما دیے ہیں انھیں دیکھ کر ہر شخص یقین کرنے پر مجبور ہے کہ اللہ کا یہ کلام تا قیام قیامت محفوظ اور ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے گا، اس کی حفاظت

---

[1] تقریرات تقریر کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام آنحضور کے سامنے کیا گیا ہو اور آپ نے اس سے منع نہ فرمایا ہو۔ ۱۲ منہ۔

ایسی ہو گی کہ معاند سے معاند غیر مسلم بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے مبرا ہے نہ اس میں کمی ہوئی نہ زیادتی، نہ اس کے الفاظ یا آیتوں کی ترتیب میں کوئی فرق پڑا ہے۔ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور جو آنحضور ؐ نے قبل از وفات اُمت کے سپرد فرمایا تھا، قرآن مجید کا ایک ایک حرف متواتر ہے، سنت کو اگرچہ یہ بات حاصل نہیں ہے مگر مجموعی طور پر سنت بھی متواتر ہے اگرچہ اس کے سب اجزاء متواتر نہیں ہیں تاہم یہ یقینی ہے کہ سنتِ نبوی ؐ بھی محفوظ ہے اور تعامل، پریس کی قوت اور دیگر اسباب نے اسے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

کتاب و سنت کی اسی موجودگی کی صورت میں کسی نبی کی بعثت کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ رشد و ہدایت کے یہ دو سرچشمے موجود ہیں اور سارے عالم کو سیراب کرنے کے لیے بالکل کافی و وافی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ کسی نبی کی بعثت کی بھی ضرورت ہے ایک سفیہانہ بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ دین قیامت تک باقی رہے گا، ظاہری اسباب بھی یہی بتاتے ہیں کہ اسلام دائمی و ابدی دین ہے اور کتاب و سنت ہدایت کے ایسے سرچشمے ہیں جو کبھی خشک نہیں ہو سکتے آبِ حیات کے ان لافانی اور ابدی چشموں کے ہوتے ہوئے کسی نبی کے وجود کی پیاس جھوٹی پیاس ہے جو دل و دماغ کی بیماری اور عقل و فہم کی خطرناک علالت کی علامت ہے۔

اگر ہم کسی نئے نبی کی بعثت فرض کریں تو فطرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کا کام کیا ہوگا؟ وہ شریعتِ محمدیہ علیہ الف الف تحیۃ کو منسوخ کر کے کسی نئی شریعت کی تعلیم دے گا؟ یا اسی شریعت کا اجراء کرے گا؟ کسی نئی کتاب اور نئی بعثت سے قرآن مجید اور سنت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منسوخ کرے گا یا اسی کتاب اور اسی سنت کی تشریح و تفصیل کرے گا؟ اگر پہلی صورت فرض کی جائے تو پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ قرآن و سنت سراپا ہدایت ہیں، ان میں کیا کمی ہے جس کی تکمیل کسی نئی کتاب اور نئے نبی کے ذریعے کی جائے؟[1]

---

[1] شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور اسے ناقص سمجھتے ہیں، اہل سنت کے ذخیرۂ احادیث کو صحیح نہیں تسلیم کرتے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو شخص بھی اسلام کا مدعی ہے ہرگز یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ قرآن و حدیث ہدایت کے لیے ناکافی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کے لیے بھی یہ بات کہنا مشکل ہے، جو شخص ایسا کہتا ہے اس کے ذمہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کو ہدایت کے لیے ناکافی یا ناقص ثابت کرے کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ جس کا تعلق دین کے ساتھ ہو قرآن مجید اور حدیث نبوی کے سامنے پیش کرو، تم دیکھو گے کہ وہ مشکل کیسی آسان ہو جاتی ہے اور مسئلہ کا کیا عمدہ و اعلیٰ حل نکل آتا ہے، البتہ فہم سلیم اور علم صحیح کی احتیاج ہے۔

دوسری شق اختیار کرنے پر بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تشریح و تفصیل کے لیے کسی نبی ہی کے آنے کی کیا حاجت ہے، اگر امتی اس بیان و تشریح سے عاجز و قاصر ہیں تو ہر زمانہ میں کسی نہ کسی نبی کا وجود لازم ہے، حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے جس کی غلطی مشاہدے سے ثابت ہے۔

علاوہ بریں نبی کی موجودگی کی صورت میں عادتاً بھی یہ ناممکن و محال ہو کہ وہ ہر شخص کے سامنے پیش آنے والے ہر جزئی مسئلہ کے متعلق قرآن و حدیث کا بیان اور اس کی تشریح پیش کریں۔ ذرائع خبر رسانی کی اتنی ترقی کے باوجود ایک شخص کے لیے یہ ناممکن ہے کہ کروڑوں سوالات کا جواب روزانہ دیتا رہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بہت سے مسائل و جزئیات کے متعلق مسلمانوں کو اجتہاد کرنا پڑتا تھا اگرچہ اس قسم کے مسائل کی تعداد قلیل ہے مگر پھر بھی خاصی ہے۔ جن میں صحابۂ کرام نے خود اجتہاد کیا ہے اور نصوص کا بیان اپنی فہم سے کیا ہے، یہ صرف صحابۂ کرام کا فعل ہی نہیں ہے بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کار کی تعلیم دی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آنحضورؐ نے نص صریح کی عدم موجودگی کی صورت میں اسی اجتہاد و استنباط کی ہدایت فرمائی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ ہر جزئی مسئلہ کی

(حاشیہ برصفحہ گزشتہ)

لیکن اول تو ان کا دعوئ اسلام قابل تسلیم نہیں ہے اس لیے ان کے کسی قول و فعل کی ذمہ داری ہمارے اوپر عائد نہیں ہوتی، دوسرے وہ بھی اپنے عقیدۂ تحریف و نقص قرآن کو چھپاتے ہیں اور برملا اس کے اظہار کی جرأت نہیں کرتے۔ ۱۲ منہ

تشریح کے لیے نبی کی احتیاج نہیں ہے بلکہ نبی کے بیان کی احتیاج ایک خاص دائرہ تک محدود ہے۔ اس دائرہ کی وسعت کے متعلق عقل خالص پہلے سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، مگر نبی کے تشریف لے جانے کے بعد وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کے حدود ختم ہو چکے ہیں اور اس کے بعد کسی دوسرے نبی کا اس مقصد سے آنا بالکل بے ضرورت ہے اور جب تک کسی دلیل شرعی قطعی یقینی سے کسی نبی کی ضرورت و احتیاج نہ ثابت ہو جائے اس وقت تک وہ اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی، ظاہر ہے کہ اگر امت بعض مسائل کے متعلق قرآن و حدیث کی تشریح خود کر سکتی ہے تو کل غیر منصوص مسائل میں اسے ایسا کرنے سے کون مانع ہے؟ اور اس کی اس استطاعت کے بعد کسی نبی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اس برہان روشن سے بھی عقیدۂ ختم نبوت واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی بعثت کی کوئی احتیاج و ضرورت نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کی رہنمائی قیام قیامت تک کافی و وافی ہے۔

(اقتباس از مسئلہ ختم نبوت) پرہ سلسلہ ۶ صفحہ ۴۹

اس طرح کی مثالیں مولانا نے یہ ثابت کرنے کے لیے دی ہیں کہ "۔۔۔۔۔ کبھی ایسا ہوتا ہو کہ سرے سے قسم یہ ہوتا ہی نہیں۔ ایسے مواقع پر محض تاکید اور جزم کا اظہار مقصود ہوتا ہے" (صفحہ ۲۱) مگر ان مثالوں سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان تمام مثالوں میں قائل اپنی اصل قسم کے الفاظ نقل نہیں کر رہا ہے بلکہ صرف اس واقعہ کا ذکر کر رہا ہے کہ اس نے قسم کھائی تھی اگر ایک شخص اپنے قرضدار سے کہے کہ تم نے روپیہ لیتے وقت قسم کھا کر کہا تھا کہ میں اس کو وقت پر ادا کر دوں گا، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ ۔۔۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں وقت پر تمہارا روپیہ واپس کر دوں گا۔" اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے کہا ہو کہ "خدا کی قسم میں وقت پر روپیہ ادا کر دوں گا"۔ مولانا کی پیش کردہ تمام مثالیں اسی نوعیت کی ہیں۔ کلام عرب کی جو مثالیں مولانا نے دی ہیں، ان میں شاعر صرف یہ کہتا ہے کہ "اس نے قسم کھائی تھی"۔ یعنی اپنی بات کے اظہار کے لیے قسم کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ اس نے کیا قسم کھائی تھی۔ اسی طرح قرآن میں بھی صرف قسم کھانے کے واقعہ کا ذکر ہے، قسم کا پورا فقرہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ کلمۂ قسم کی طرف اشارہ ہے نہ کہ اصل کلمۂ قسم کا اعادہ۔

الفرقان لکھنؤ
مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی
مسئول
منظور نعمانی
فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے، یہاں تک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے
جس میں ۴۲ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ پیش کیا گیا
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت، طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۲ صفحات، خوبصورت گرد پوش، قیمت ۴/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ اعزازی خریداروں سے پندرہ روپے غیر ممالک سے ...... ۱۲ شلنگ ہوائی ڈاک سے ایک پونڈ	ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ	سالانہ چندہ ہندوستان سے .... ۶/- پاکستان سے .... ۸/- ششماہی ہندوستان سے ...... ۳/۵۰ پاکستان سے ۴/-

شمارہ (۴)	بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۴ء	جلد ۳۲

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ اکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت الفرقان ہر انگریزی مہینہ کی پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

منیجر الفرقان لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— محمد منظور نعمانی

اب تک کے حالات اور بعض سامنے کے تجربات پر نظر کرتے ہوئے ایک ڈر سا لگتا ہے کہ کسی پہلے ہی امید آفریں قدم پر مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ لیے جائیں۔ لیکن اگر خدا کی رحمت سے مایوسی نہیں ہے تو دست بدعا ہو کر امید کرنی ہی چاہیے کہ ۹ اگست ۱۹۶۴ء کو مسلمانانِ ہند کے مختلف نمائندہ عناصر نے اجتماعیت کی طرف جو پہلا قدم مشاورتی کاؤنسل کی تشکیل کے فیصلے کی صورت میں سرزمین لکھنؤ پر ثبت کیا ہے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا قافلہ آئندہ سے اب اسی مبارک قدم کے رُخ پر چلے گا۔ اور امید کا جو چراغ قوم کے مایوس دلوں میں بڑی تمناؤں کے بعد روشن ہوا ہے اسے اب کسی مایوس کن طرزِ عمل کا منھ دیکھنا نہیں پڑے گا۔

یہ ہماری دُعا ہو، امید ہو اور ——— تمنا ہو۔ اور ہم بلا کسی شک و تردّد کے سمجھتے ہیں کہ یہ پوری قوم کے ہر مخلص خاص و عام کے دل کی صدا ہے۔

لیکن اپنی امید کے اس چراغ کی حفاظت (جو ایک ٹھوس اور سنجیدہ فیصلے سے روشن ہوا ہے) صرف ان نمائندہ اشخاص ہی کا کام نہیں جنھوں نے اس فیصلے پر دستخط ثبت کیے ہیں بلکہ یہ ذمہ داری پوری قوم کی ہے، اور در اصل اسی کے احساس ذمہ داری اور خطرات سے ہوشیاری کے ذریعہ اس چراغ کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

اجتماعیت کی راہ کے اس پہلے قدم تک پہونچنے میں جیسی جیسی مشکلات کام کرنے والوں کو پیش آئیں وہ کوئی راز نہیں ہو۔ الفرقان (ماہ جون) کے ان صفحات ہی میں پہلی مرتبہ اس عاجز کے قلم سے بس ایسی چند سطروں کا نکلنا تھا جن سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کے عمائد و اکابر کا

کوئی نمائندہ مشاورتی اجتماع واقعۃً ہونے والا ہو کر مسلمانوں ہی کے ایک خاص ذہن و فکر رکھنے والے طبقہ کی طرف سے یلغار شروع ہو گئی۔ الفرقان کی ان سطروں سے لوگوں نے قیاس کیا کہ اس اجتماع کی تحریک اور اسکے لیے جدوجہد میں محمد منظور اور اسکے ہر کام کے رفیق مولانا ابو الحسن علی کا خاص حصہ ہے۔ چنانچہ اس طبقہ کے دو طاقتور اخباروں نے سب کام چھوڑ چھاڑ کے اپنی ساری توت ان دو رفیقوں کی ایسی عیب چینی پر لگا دی جس سے لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جا سکے کہ یہ محض قیادت کی ہوس کا کھیل ہے اور اسکے پیچھے کوئی سنجیدہ عزم اور ٹھوس فکر بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کا کچھ بھی بھلا ہو سکے۔

پھر جلد ہی جب یہ صورت حال ان لوگوں کے سامنے آئی کہ جمعیۃ علماء جسے یہ اپنے ذہن و فکر سے قریباً درہم دونوں سے بعید سمجھتے تھے، اسکے عمائد و قائدین بھی اس اجتماع کے تخیل سے متفق ہیں تو پورا زور ایسی فضا پیدا کرنے پر لگا دیا گیا جس سے اہل جمعیۃ کی راہ میں ایسی ذہنی اور نفسیاتی مشکلات کھڑی ہو جائیں کہ اس اجتماعی قافلہ میں شرکت کی جس "غلطی" پر وہ آمادہ ہو چکے تھے اس سے باز رہ سکیں ــــ لیکن خدا کو منظور تھا کہ یہ خطرناک کوشش بھی کچھ کارگر نہ ہو سکی اور اس اجتماع میں ایسا کوئی خلا پیدا نہ کیا جا سکا جسکی بدولت اسکی نمائندہ حیثیت پر کوئی قابل لحاظ اعتراض اٹھایا جا سکتا۔ اسمیں ایک طرف جماعت اسلامی اور مسلم لیگ تھی، دوسری طرف جمعیۃ علماء اور اس سے باہر کے وہ کانگریسی مسلمان جو مسلمانوں کیلئے صرف کانگریس کے دائرہ ہی میں رہ کر نہیں سوچتے۔ اسی طرح ایک طرف دیوبندی عمائد اسمیں تھے تو دوسری طرف بریلی اور فرنگی محل کے نمائندہ بھی۔ اور اسکے علاوہ وہ غیر جماعتی افراد بھی جو مسلمانانِ ہند کے اس وقت کے خاص مسائل سے عملی دلچسپی رکھتے ہوئے کسی عمومی یا خصوصی اثر کی طاقت بھی مسلمانوں میں رکھتے ہیں۔

ان مختلف عناصر کی شرکت اور نمائندگی کا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا تو بروقت رخنہ اندازی کا ایک منصوبہ عین اجتماع کی تاریخوں میں بے نقاب ہوا۔ لکھنؤ کے بالکل قریب سے نکلنے والا ایک مسلم روزنامہ جو اپنے ایک خاص مزاج کی وجہ سے مسلم عوام میں کافی پڑھا جاتا ہے اور اجتماع کے بارے میں حیرت انگیز طور پر بالکل سکوت کی پالیسی پر چل رہا تھا یکا یک ۶ اگست سے اس نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جسمیں خاص ہدف اور نشانہ اجتماع کے داعی اور صدر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو بنایا، ان کو اپنوں اور پرایوں کی نگاہ میں بے وقار اور بے اعتبار کرنے اور گرانے کی کوشش کی۔ اور غیر صاف کہے ہوئے پوری قوت سے مسلمانوں میں یہ تاثر پھیلانا چاہا کہ یہ اجتماع کانگریس نواز ہے۔ اور اسی سلسلہ کے درمیان میں اگلے روز (یعنی ٹھیک اجتماع کے آغاز کے دن) یہ شعلہ چھوڑا کہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد منظور نعمانی نے کلکتہ ریلیف فنڈ کا جو تقریباً اسی ہزار روپیہ بڑی دردمندانہ اپیلوں کے ذریعہ مسلمانوں سے جمع کیا تھا وہ بڑی حفاظت سے آج تک اسکی تجوری میں رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا مسلم مشاورتی اجتماع کو چاہیے کہ

اس معاملہ میں احتساب کرے اور تمام روپیہ اپنی تحویل میں لے کر مستحقین پر خرچ کیے جانے کا معقول انتظام کرے۔

محمد منظور بہرحال اسی دُنیا کا ایک انسان ہو جسمیں دن رات ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے لیکن اس کا عقلی امکان تو بہرحال ہو کہ اس نے بھی پیدا بالوں کی عمر میں پہونچ کر یہ سیاہی لگائی ہو لیکن اس کے انکشاف کا یہی موقع کیوں تھا؟ یہ کام چار دن پہلے اور چار دن بعد بھی ہو سکتا تھا، اور اگر فی الواقع کسی کو غلط فہمی یا شک و شبہ تھا تو وہ زبانی یا خط لکھ کر یا اخبار ہی کے ذریعہ شریفانہ طریقہ پر بھی پوچھ سکتا تھا۔ لیکن ہاں اجتماع میں انتشار اور بدانجامی پیدا کرنے کا مقصد ٹھیک یہی دن اور اس کام کے لیے یہی سنسنی خیز طریقہ چاہتا تھا۔ [۵]

بہرحال یہ ہیں وہ چیزیں جو ملتِ اسلامیہ ہند کی اجتماعیت کی ان کوششوں کی راہ میں پے بہ پے آئیں جن کا نتیجہ خدا کے فضل سے ایک مبارک فیصلے کی شکل میں ہمارے سامنے آچکا ہو، مشکلات اور رکاوٹوں کی یہ تفصیل ہرگز نہ بیان کی جاتی اگر اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ اس طرح کی فتنہ آرائیاں اور رخنہ اندازیاں آئندہ بھی جاری رہیں گی! اور مختلف محرکات کے ماتحت چھپی اور کھلی، ذاتی اور فرمائشی، بھدّی اور ستھری، شائستہ اور ناشائستہ ہر نوع کی سر توڑ کوششیں اس اجتماعیت اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کی جائیں گی جو دراصل برسوں کی محنت کے بعد وجود میں آئی ہو۔ ان نامبارک کوششوں کا مقابلہ جہاں اس اجتماعیت میں شریک ہونے والے تمام نمائندہ عناصر پر اپنے واضح طرزِ عمل اور قول و قرار پر مخلصانہ استقامت اور پختگی سے کرنا فرض ہو وہاں قوم کے ان تمام افراد کا بھی جو اپنی تمام جماعتوں کے اتحاد کے خواہاں اور ان کی وحدت کے لیے دُعا گو تھے یہ فریضہ ہو کہ وہ اپنی ہر ممکن طاقت سے ان بُری کوششوں کا مقابلہ کریں وہ اپنے نمائندہ عناصر کے طرزِ عمل کی بھی نگرانی کریں کہ کوئی بات اجتماعیت کی اسپرٹ سے ہٹ کر تو نہیں کی جارہی ہو اور معترض عناصر کے بارے میں بھی چوکنا رہیں کہ وہ قوم کو خواہ مخواہ تو کسی بدگمانی یا مایوسی میں ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

---

[۱] اسّی ہزار روپے کے اس قصے کی حقیقت کیا ہے؟ اسکی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں۔ لیکن جب ذکر آگیا ہے تو اتنا بتا دینا مناسب ہے کہ-----

مظلومین کلکتہ کی امداد کے لئے محمد منظور نے تو نہیں ہاں ٹرسٹ ندائے ملت نے (جسکے سات ارکان میں سے وہ بھی ایک ہے) اپیل کی تھی جسکے نتیجہ میں صرف اسّی ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ سے بھی اوپر روپیہ ٹرسٹ کے پاس آیا جسکی تفصیل ٹرسٹ کے اخبار ندائے ملت میں شائع ہوتی رہی ہو اور منیجر ٹرسٹ کی اجمالی رپورٹ قریب ہی کی اس کی دو اشاعتوں میں شائع ہوئی ہو۔ ۱۲

کتاب الحج

معارفُ الحدیث

مُسلسَل

[حجۃ الوداع کے سلسلہ میں حج کے قریباً سارے ہی اعمال و مناسک کا ذکر واقعہ کی شکل میں آچکا ہے، اب اُسکے اہم افعال و ارکان کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی ہدایات اور آپ کا طرزِ عمل معلوم کرنے کے لئے مندرجۂ ذیل حدیثیں پڑھئے۔]

مکہ میں داخلہ اور پہلا طواف :-

مکہ معظمہ کو اللہ تعالیٰ نے کعبۂ مکرمہ کی نسبت سے جو خاص شرف بخشا ہے اور اس کو بَلَدُ اللہ الحرام اور مرکزِ حج قرار دیا ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس میں داخلہ اہتمام اور احترام کے ساتھ ہو اور اُس کے بعد کعبۂ مقدسہ کا حق ہے کہ سب سے پہلے اس کا طواف کیا جائے، اور پھر اسی کعبہ کے ایک گوشہ میں جو ایک خاص مبارک پتھر (حجر اسود) لگا ہوا ہے (جس کو اللہ تعالیٰ سے اور جنت سے خاص نسبت ہے) اس کا حق ہے کہ طواف کا آغاز ادب اور محبت کے ساتھ اُس کے استلام سے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا اور صحابہ کرام نے آپ سے یہی سیکھا تھا۔

عَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ لَا يَقْدِمُ مَكَّةَ اِلَّا بَاتَ بِذِي طُوًى حَتّٰى يُصْبِحَ وَيَغْتَسِلَ وَيُصَلِّيَ فَيَدْخُلُ مَكَّةَ نَهَارًا

وَاِذَا نَفَرَ مِنْهَا مَرَّ بِذِي طُوًى وَبَاتَ بِهَا حَتّٰى يُصْبِحَ وَيَذْكُرُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَفْعَلُ ذَالِكَ ـــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے خادم نافع سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر جب بھی مکہ آتے تو اس میں داخلہ سے پہلے رات ذی طُوی میں گزارتے (جو مکہ کے قریب ایک بستی تھی) یہاں تک کہ صبح ہونے پر غسل کرتے اور نماز پڑھتے اور اس کے بعد دن کے وقت میں مکہ معظمہ میں داخل ہوتے اور جب مکہ معظمہ سے واپس لوٹتے تو بھی ذی طوی میں رات گزار کے صبح کو وہاں سے روانہ ہوتے اور عبد اللہ بن عمر بتاتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور بھی یہی تھا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ اَتَى الْحَجَرَ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ مَشٰى عَلٰى يَمِيْنِهٖ فَرَمَلَ ثَلٰثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا ـــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پہنچے تو سب سے پہلے حجر اسود پر آئے اور اس کا استلام کیا پھر آپ نے داہنی طرف سے طواف کیا، جس میں پہلے تین چکروں میں آپ نے رمل کیا اور اس کے بعد چار چکروں میں آپ اپنی عادی رفتار سے چلے۔ (صحیح مسلم)

(**تشریح**) ہر طواف حجر اسود کے استلام سے شروع ہوتا ہے، استلام کا مطلب ہے حجر اسود کو چومنا، یا اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر یا ہاتھ اس کی طرف کرکے اپنے اُس ہاتھ ہی کو چوم لینا، بس یہ استلام کرکے طواف شروع کیا جاتا ہے اور ہر طواف میں خانہ کعبہ کے سات چکر لگائے جاتے ہیں۔

رَمل ایک خاص انداز کی چال کو کہتے ہیں جس میں طاقت و قوت کا اظہار ہوتا ہے روایات میں ہے کہ سنہ ۷ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ عمرہ کے لئے مکہ معظمہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپس میں کہا کہ یثرب یعنی مدینہ کی

آب وہوا کی خرابی اور بخار وغیرہ وہاں کی بیماریوں نے ان لوگوں کو کمزور اور دُبلا پتلا کر دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات پہنچی تو آپ نے حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکروں میں رَمَل کی چال چلی جائے، اور اس طرح طاقت وقوت کا مظاہرہ کیا جائے، چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا ـــــ لیکن اللہ تعالیٰ کو اس وقت کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس کو مستقل سنت قرار دے دیا گیا۔ اب یہی طریقہ جاری ہے کہ حج یا عمرہ کرنے والا جو پہلا طواف کرتا ہے جس کے بعد اس کو صفا، مروہ کے درمیان سعی بھی کرنی ہوتی ہے اس کے پہلے تین چکروں میں رمل کیا جاتا ہے اور باقی چار چکر اپنی عادی رفتار سے کئے جاتے ہیں۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ مَكَّةَ فَاَقْبَلَ اِلَى الْحَجَرِ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ اَتَى الصَّفَا فَعَلَاهُ حَتّٰى يَنْظُرَ اِلَى الْبَيْتِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يَذْكُرُ اللّٰهَ مَا شَاءَ وَيَدْعُوْ ـــــ رواہ ابو داؤد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو مکہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے حجر اسود کے قریب پہنچکر آپ نے اُس کا استلام کیا، پھر آپنے طواف کیا، پھر صفا پہاڑی پر آئے اور اس کے اتنے اوپر چڑھ گئے کہ بیت اللہ نظر آنے لگے پھر آپنے ہاتھ اٹھائے (جس طرح دعا میں اٹھائے جاتے ہیں) اور پھر جتنی دیر تک آپنے چاہا آپ اللہ کے ذکر و دعا میں مشغول رہے۔

(سنن ابی داؤد)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ طَافَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ عَلٰى بَعِيْرٍ يَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ ـــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا، آپکے ہاتھ میں ایک خمدار چھڑی تھی اسی سے آپ حجر اسود کا استلام کرتے تھے ـــــ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اوپر صحیح مسلم کے حوالہ سے حضرت جابر کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف کے بارہ میں یہ صریح الفاظ ہیں "ثُمَّ مَشٰى عَلٰى يَمِيْنِهٖ فَرَمَلَ ثَلٰثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا" (آپ حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد داہنی جانب کو چلے (اور طواف شروع کیا) پھر تین چکروں میں تو آپ نے رَمل کیا اور چار چکر آپ نے اپنی عادی رفتار سے لگائے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طواف اپنے پاؤں پر چلکر کیا تھا اور حضرت ابوہریرہ کی اس روایت میں اونٹ پر سوار ہو کر طواف کا تذکرہ ہے لیکن ان دونوں بیانوں میں کوئی تضاد نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد پہلا طواف پیادہ پا کیا تھا، حضرت جابر نے اسی کا ذکر کیا ہے اور اُس کے بعد دسویں ذی الحجہ کو منیٰ سے مکہ آکر جو طواف کیا تھا وہ اونٹ پر کیا تھا، تاکہ سوالات کرنے والے آپ سے سوالات کر سکیں، گویا آپ کی اونٹنی اُس وقت آپ کے لئے منبر بنی ہوئی تھی، اور غالباً اپنے عمل سے اس کا اظہار بھی مقصود تھا کہ خاص حالات میں سواری پر بھی طواف کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ شَكَوْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنِّىْ اَشْتَكِىْ فَقَالَ طُوْفِىْ مِنْ وَّرَاءِ النَّاسِ رَاكِبَةً فَطُفْتُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّىْ اِلٰى جَنْبِ الْبَيْتِ يَقْرَءُ بِالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ ــــــ

رواہ البخاری و مسلم

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (حجۃ الوداع میں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے بیماری کی تکلیف ہے (میں طواف کیسے کروں؟) آپ نے فرمایا کہ تم سوار ہو کر لوگوں کے پیچھے پیچھے طواف کر لو، تو میں نے اسی طرح طواف کیا اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی جانب کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور اس میں سورۂ طور تلاوت فرما رہے تھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لَا نَذْكُرُ اِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا كُنَّا بِسَرِفَ طَمِثْتُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبْكِي فَقَالَ لَعَلَّكِ نَفِسْتِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ ذَالِكِ شَيْئٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ اٰدَمَ فَافْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ اَنْ لَا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ حَتّٰى تَطْهُرِي ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم لوگ (حجۃ الوداع والے سفر میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے چلے، ہماری زبانوں پر بس حج ہی کا ذکر تھا، یہاں تک کہ جب (مکہ کے بالکل قریب) مقام سرف پر پہنچے (جہاں سے مکہ صرف ایک منزل رہ جاتا ہے) تو میرے وہ دن شروع ہو گئے جو عورتوں کو ہر مہینے آتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خیمہ میں) تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ میں بیٹھی رو رہی ہوں، آپ نے فرمایا شاید تمھارے ماہواری ایام شروع ہو گئے ہیں؟ ——— میں نے عرض کیا کہ ہاں یہی بات ہے، آپ نے فرمایا (رونے کی کیا بات ہے) یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو اللہ نے آدم کی بیٹیوں یعنی سب عورتوں کے ساتھ لازم کر دی ہے تم وہ سارے عمل کرتی رہو جو حاجیوں کو کرنے ہوتے ہیں سوائے اس کے کہ بیت اللہ کا طواف اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ اس سے پاک صاف نہ ہو جاؤ ———

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلٰوةِ اِلَّا اَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُوْنَ فِيْهِ فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهِ فَلَا يَتَكَلَّمَنَّ اِلَّا بِخَيْرٍ ———

رواہ الترمذی والنسائی والدارمی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا طواف نماز کی طرح کی عبادت ہے بس یہ فرق ہو کہ طواف

میں تم کو باتیں کرنے کی اجازت ہے تو جو کوئی طواف کی حالت میں کسی سے بات کرے تو نیکی اور بھلائی ہی کی بات کرے (لغو و فضول یا ناجائز باتوں سے طواف کو مکدر نہ کرے)۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن دارمی)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُولُ اِنَّ مَسْحَھُمَا (الرُّکْنَیْنِ الیمانی) کَفَّارَۃٌ لِّلْخَطَایَا وَسَمِعْتُہٗ یَقُولُ مَنْ طَافَ بِھٰذَا الْبَیْتِ اُسْبُوْعًا فَاَحْصَاہُ کَانَ کَعِتْقِ رَقَبَۃٍ وَسَمِعْتُہٗ یَقُولُ لَا یَضَعُ قَدَمًا وَّلَا یَرْفَعُ اُخْرٰی اِلَّا حَطَّ اللّٰہُ عَنْہُ بِھَا خَطِیْئَۃً وَّکَتَبَ لَہٗ بِھَا حَسَنَۃً۔

رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ حجر اسود اور رکن یمانی ان دونوں پر ہاتھ پھیرنا گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ ہے۔ اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا آپ فرماتے تھے کہ جس نے اللہ کے اس گھر کا سات بار طواف کیا اور اہتمام اور فکر کے ساتھ کیا (یعنی سنن و آداب کی رعایت کے ساتھ کیا) تو اس کا یہ عمل ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ہوگا۔ اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا آپ فرماتے تھے کہ بندہ طواف کرتے ہوئے جب ایک قدم رکھے گا اور دوسرا قدم اٹھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلہ ایک گناہ معاف کرے گا اور ایک نیکی کا ثواب اس کے لئے لکھائے گا۔

(جامع ترمذی)

(**تشریح**) حدیث کے لفظ "مَنْ طَافَ بِھٰذَا الْبَیْتِ اُسْبُوْعًا"، کا ترجمہ ہم نے سات بار طواف کرنا کیا ہے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں تین احتمال ہیں اوّل طواف کے سات چکر، (اور یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ ایک طواف میں بیت اللہ کے سات چکر کئے جاتے ہیں) اور دوسرا احتمال ہے پورے سات طواف جس کے اُنچاس چکر ہوں گے۔ اور تیسرا احتمال ہے بلا ناغہ سات دن طواف ۔ لیکن بظاہر پہلا مطلب راجح ہے۔ واللہ اعلم۔

حجر اسود :۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْحَجَرِ وَاللّٰہِ لَیَبْعَثَنَّہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لَہٗ عَیْنَانِ یُبْصِرُ بِھِمَا وَلِسَانٌ یَنْطِقُ بِہٖ یَشْھَدُ عَلٰی مَنِ اسْتَلَمَہٗ بِحَقٍّ۔

رواہ الترمذی و ابن ماجۃ والدارمی

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کے بارہ میں فرمایا خدا کی قسم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو نئی زندگی دے کر اس طرح اٹھائے گا کہ اُس کے دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا اور جن بندوں نے اُس کا استلام کیا ہوگا ان کے حق میں سچی شہادت دے گا۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(تشریح) حجر اسود دیکھنے میں پتھر کا ایک ٹکڑا ہے لیکن اس میں ایک روحانیت ہے اور وہ ہر اُس شخص کو پہچانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ادب اور محبت کے ساتھ اس کو بلا واسطہ یا بالواسطہ چومتا ہے اور اس کا استلام کرتا ہے، قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو ایک دیکھنے اور بولنے والی ہستی بنا کر کھڑا کرے گا اور وہ اُن بندوں کے حق میں شہادت دے گا جو اللہ کے حکم کے مطابق عاشقانہ اور نیازمندانہ شان کے ساتھ اُس کا استلام کرتے تھے۔

عَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِیْعَۃَ قَالَ رَاَیْتُ عُمَرَ یُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَیَقُوْلُ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ اِنَّکَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْلَا اَنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُ مَا قَبَّلْتُکَ۔

رواہ البخاری ومسلم

عابس بن ربیعہ تابعی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے اور کہتے تھے میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے (تیرے اندر کوئی خدائی صفت نہیں ہے) نہ تو کسی کو نفع پہنچا

سکتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات بالاعلان اور علی رؤس الاشہاد اس لئے کہی کہ کوئی ناتربیت یافتہ نیا مسلمان حضرت عمر اور دوسرے اکابر مسلمین کا حجر اسود کو چومنا دیکھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ اس پتھر میں کوئی خدائی کرشمہ اور خدائی صفت اور بناؤ بگاڑ کی کوئی طاقت ہے اور اس لئے اس کو چوما جارہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے ایک اصولی اور بنیادی بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی چیز کی جو تعظیم و تکریم اس نظریہ سے کیجائے کہ اللہ و رسول کا حکم ہے وہ تعظیم برحق ہے لیکن اگر کسی مخلوق کو نافع اور ضار اور بناؤ بگاڑ کا مختار یقین کر کے اسکی تعظیم کی جائے تو وہ شرک کا ایک شعبہ ہے اور اسلام میں اسکی گنجائش نہیں ——

طواف میں ذکر اور دعا:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا بَیْنَ الرُّکْنَیْنِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ——

رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (طواف کی حالت میں) رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان (کی مسافت میں) یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

(سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ وُکِّلَ بِہٖ سبعون مَلَکًا (یعنی الرکن الیمانی) فَمَنْ قَالَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ رَبَّنَا

اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالُوْا اٰمِیْن ـــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر ہیں جو ہر اس بندے کی دعا پر آمین کہتے ہیں جو اس کے پاس یہ دعا کرے ـــ کہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ	اے اللہ میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت مانگتا ہوں۔
رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔	اے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا۔!

(سنن ابن ماجہ)

وقوف عرفہ کی اہمیت اور فضیلت :۔

حج کا سب سے اہم رکن نویں ذی الحجہ کو میدان عرفات کا وقوف ہے اگر یہ ایک لحظہ کے لئے بھی نصیب ہو گیا تو حج نصیب ہو گیا اور اگر کسی وجہ سے حاجی ۹ ذی الحجہ کے دن اور اس کے بعد والی رات کے کسی حصہ میں بھی عرفات میں نہ پہنچ سکا تو اس کا حج فوت ہو گیا۔ حج کے دوسرے ارکان و مناسک طواف، سعی، رمی جمرات وغیرہ اگر کسی وجہ سے فوت ہو جائیں تو ان کا کوئی نہ کوئی کفارہ اور تدارک ہے لیکن اگر وقوف عرفہ فوت ہو جائے تو اس کا کوئی تدارک نہیں ہے۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ یَعْمَرَ الدِّیْلِیِّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَلْحَجُّ عَرَفَۃُ مَنْ اَدْرَکَ عَرَفَۃَ لَیْلَۃَ جَمْعٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ فَقَدْ اَدْرَکَ الْحَجَّ ـــ اَیَّامُ مِنًی ثَلٰثَۃٌ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ ـــ رواہ الترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی

عبدالرحمن بن یعمر دُئلی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے حج (کا خاص الخاص رکن جس پر حج کا دار و مدار ہے) وقوف عرفہ ہے، جو حاجی مزدلفہ والی رات میں (یعنی ۹ اور ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں) بھی صبح صادق سے پہلے عرفات میں پہنچ جائے تو اُس نے حج پالیا اور اس کا حج ہوگیا ———— (یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ کے بعد) منیٰ میں قیام کے تین دن ہیں (جن میں تینوں جمروں کی رمی کی جاتی ہے ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ) اگر کوئی آدمی صرف دو دن میں یعنی (۱۱، ۱۲ کو رمی کر کے) جلدی منیٰ سے چلدے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر کوئی ایک دن مزید ٹھیر کے (۱۳ ذی الحجہ کی رمی کر کے) وہاں سے جائے تو اس پر بھی کوئی گناہ اور الزام نہیں ہے (دونوں باتیں جائز ہیں)۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(**تشریح**) چونکہ وقوف عرفات پر حج کا دار و مدار ہے اس لئے اُس میں اتنی وسعت رکھی گئی ہو کہ اگر کوئی آدمی نویں ذی الحجہ کے دن میں عرفات نہ پہنچ سکے (جو وقوف کا اصلی وقت ہے) وہ اگر اگلی رات کے کسی حصّہ میں بھی وہاں پہنچ جائے تو اُس کا وقوف ادا ہو جائے گا اور وہ حج سے محروم نہ سمجھا جائے گا۔

یوم العرفہ کے بعد ۱۰ ذی الحجہ کو یوم النحر ہے جس میں ایک جمرہ کی رمی اور قربانی اور حلق وغیرہ کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اسی دن مکہ جاکر طواف زیارت کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد منیٰ میں زیادہ سے زیادہ تین دن اور کم سے کم دو دن ٹھیر کے تینوں جمروں پر کنکریاں مارنا مناسک میں سے ہے ———— پس اگر کوئی شخص صرف دو دن ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو رمی جمرات کر کے منیٰ سے چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اگر کوئی ۱۳ کو بھی ٹھیرے اور رمی کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ مِنْ اَنْ يُّعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِّنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّهٗ لَيَدْنُوْ ثُمَّ يُبَاهِيْ بِهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ فَيَقُوْلُ

مَا اَرَادَ هٰؤُلَاءِ ــــــــ　　(رواہ مسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن سے زیادہ اپنے بندوں کے لئے جہنم سے آزادی اور رہائی کا فیصلہ کرتا ہو (یعنی گنہگار بندوں کی مغفرت اور جہنم سے آزادی کا سب سے بڑے اور وسیع پیمانہ پر فیصلہ سال کے ۳۶۰ دنوں میں سے ایک دن یوم العرفہ میں ہوتا ہے) اس دن اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمت و رافت کے ساتھ (عرفات میں جمع ہونے والے) اپنے بندوں کے بہت ہی قریب ہو جاتا ہے اور اُن پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں سے کہتا ہے "مَا اَرَادَ هٰؤُلَاءِ؟" دیکھتے ہو! میرے یہ بندے کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟　　(صحیح مسلم)

(تشریح) عرفات کے مبارک میدان میں ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو جو رحمتوں اور برکتوں کے نزول کا خاص دن ہے جب ہزاروں یا لاکھوں کی تعداد میں اللہ کے بندے فقیروں محتاجوں کی صورت بنا کر جمع ہوتے ہیں اور اس کے حضور میں اپنے اور دوسروں کے لئے مغفرت اور رحمت کے لئے دعائیں اور آہ وزاری کرتے ہیں اور اس کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں تو لامحالہ ارحم الراحمین کی رحمت کا اتھاہ سمندر جوش میں آجاتا ہے اور پھر وہ اپنی شان کریمی کے مطابق گنہگار بندوں کی مغفرت اور جہنم سے رہائی وآزادی کے وہ عظیم فیصلے فرماتا ہے کہ شیطان بس جل بھن کے رہ جاتا ہے اور اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔

عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ كَرِيْزٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا رُئِيَ الشَّيْطَانُ يَوْمًا هُوَ فِيْهِ اَصْغَرُ وَلَا اَدْحَرُ وَلَا اَحْقَرُ وَلَا اَغْيَظُ مِنْهُ فِيْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَمَا ذَاكَ اِلَّا لِمَا يَرٰى مِنْ تَنَزُّلِ الرَّحْمَةِ وَتَجَاوُزِ اللّٰهِ عَنِ الذُّنُوْبِ الْعِظَامِ ــــــ　　رواہ مالک مرسلاً

طلحہ بن عبید اللہ بن کریز (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان کسی دن بھی اتنا ذلیل، اتنا خوار، اتنا دھتکارا اور پھٹکارا ہوا

اور اتنا جلا بھنا ہوا انہیں دیکھا گیا جتنا کہ وہ عرفہ کے دن ذلیل و خوار رسوا اور جلا بھنا دیکھا جاتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ وہ اس دن اللہ کی رحمت کو (موسلا دھار) برستے ہوئے اور بڑے بڑے گناہوں کی معافی کا فیصلہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ (اور یہ اس لعین کے لئے ناقابل برداشت ہے)

(موطا امام مالک مرسلاً)

رمیِ جمرات :-

منیٰ میں کافی فاصلہ سے تین جگہوں پر تین ستون بنے ہوئے ہیں۔ انہی ستونوں کو جمرات کہا جاتا ہے ان جمرات پر کنکریاں پھینکنا بھی حج کے اعمال اور مناسک میں سے ہے، دسویں ذی الحجہ کو صرف ایک جمرہ پر سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں اور ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کو تینوں جمروں پر سات سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں ـــــ ظاہر بات ہے کہ کنکریاں پھینکنا بذات خود کوئی نیک عمل نہیں ہے لیکن اللہ کے حکم سے ہر عمل میں عبادت کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اور بندگی یہی ہے کہ بے چون وچرا اللہ کے حکم کی تعمیل کی جائے، علاوہ ازیں اللہ کے بندے جب اللہ کے حکم سے اُس کے جلال وجبروت کا دھیان کرتے ہوئے اور اس کی کبریائی کا نعرہ لگاتے ہوئے شیطانی خیالات وعادات اور نفسانی خواہشات ومعصیات کو عالم تصوّر میں نشانہ بنا کر ان جمروں پر کنکریاں مارتے ہیں اور اس طرح گمراہی اور معصیت کو سنگسار کرتے ہیں تو اُن کے قلوب کی اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے اور ان کے ایمان والے سینوں کو جو انشراح اور سرور وانبساط اُس سے نصیب ہوتا ہے اس کا ذائقہ بس وہی جانتے ہیں ـــــ بہرحال اللہ کے حکم سے اور اس کا نام لے کر جمروں پر کنکریاں پھینکنا بھی اہل بصیرت کی نگاہ میں ایک ایمان افروز عمل ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ رَمْيُ الْجِمَارِ وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ لِاِقَامَةِ ذِكْرِ اللّٰهِ ـــــ

رواہ الترمذی والدارمی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمرات پر کنکریاں پھینکنا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا اور پھیرے لگانا (لہو و لعب کی باتیں نہیں ہیں بلکہ) یہ ذکر اللہ کی گرم بازاری کے وسائل ہیں۔

(جامع ترمذی، سنن دارمی)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَمٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْجَمْرَۃَ یَوْمَ النَّحْرِ ضُحًی وَاَمَّا بَعْدَ ذٰلِکَ فَاِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔

رواہ البخاری و مسلم

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کی رمی چاشت کے وقت فرمائی اور اس کے بعد ایام تشریق میں جمرات کی رمی آپ نے زوال آفتاب کے بعد کی۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہی سنت ہے کہ ۱۰ ذی الحجہ کو جمرۃ العقبہ کی رمی دوپہر سے پہلے کرلی جائے اور بعد کے دنوں میں زوال کے بعد۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّہٗ اِنْتَھٰی اِلَی الْجَمْرَۃِ الْکُبْرٰی فَجَعَلَ الْبَیْتَ عَنْ یَّسَارِہٖ وَمِنًی عَنْ یَّمِیْنِہٖ وَرَمٰی بِسَبْعِ حَصَیَاتٍ یُکَبِّرُ مَعَ کُلِّ حَصَاۃٍ ثُمَّ قَالَ ھٰکَذَا رَمَی الَّذِیْ اُنْزِلَتْ عَلَیْہِ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ ــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رمی کے لئے جمرۂ کبریٰ کے پاس پہنچے، پھر اس طرح اس کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوئے کہ بیت اللہ یعنی مکہ اُن کے بائیں جانب تھا اور منیٰ داہنی جانب اس کے بعد انھوں نے اُس جمرہ پر سات کنکریاں ماریں ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے اس کے بعد فرمایا کہ اسی طرح رمی کی تھی اس مقدس ہستی نے جس پر سورۂ بقرہ نازل ہوئی تھی (جس میں حج کے احکام اور مناسک کا بیان ہے۔) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رمی کرنے کے طریقہ کو تفصیل سے یاد رکھا تھا اور اسی کے مطابق عمل کر کے لوگوں کو دکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر اللہ نے حج کے احکام نازل کئے تھے اس طرح رمی کیا کرتے تھے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْمِيْ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ يَوْمَ النَّحْرِ وَيَقُوْلُ لِتَاْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ فَاِنِّيْ لَا اَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَا اَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِيْ هٰذِهٖ۔

رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (۱۰ ذی الحجہ کو) اپنی ناقہ پر سے رمی کرتے ہوئے دیکھا، آپ اس وقت فرما رہے تھے کہ تم مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو میں نہیں جانتا کہ شاید اس حج کے بعد میں کوئی اور حج نہ کروں (اور پھر تمہیں اس کا موقع نہ ملے)۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) دسویں ذی الحجہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ پر مزدلفہ سے روانہ ہو کر منیٰ پہنچے تو اس دن آپ نے ناقہ پر سوار ہونے ہی کی حالت میں جمرۂ عقبہ کی رمی کی تاکہ سب لوگ آپ کو رمی کرتا ہوا دیکھ کر رمی کا طریقہ سیکھ لیں اور آسانی سے مسائل اور مناسک پوچھ سکیں، لیکن دوسرے اور تیسرے دن آپ نے رمی پاپیادہ کی ـــــ بہرحال رمی سوار ہو کر بھی جائز ہے اور پاپیادہ بھی۔

یہ اشارہ حجۃ الوداع میں آپ نے بار بار فرمایا کہ اہل ایمان مجھ سے مناسک اور دین و شریعت کے احکام سیکھ لیں شاید اب اس دنیا میں میرا قیام بہت زیادہ نہیں ہے۔

عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَرْمِيْ جَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عَلٰى اِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ حَتّٰى يُسْهِلَ فَيَقُوْمُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ طَوِيْلًا وَيَدْعُوْ

وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ ثُمَّ يَرْمِي الْوُسْطَى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ كُلَّمَا رَمَى بِحَصَاةٍ ثُمَّ يَأْخُذُ بِذَاتِ الشِّمَالِ فَيُسْهِلُ وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ يَدْعُو وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ وَيَقُومُ طَوِيلًا ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقَبَةِ مِنْ بَطْنِ الْوَادِي بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عِنْدَ كُلِّ حَصَاةٍ وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ فَيَقُولُ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهُ — رواہ البخاری

سالم بن عبداللہ اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ بن عمر کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ رمی جمرات کے بارہ میں اُن کا معمول اور دستور تھا کہ وہ پہلے جمرہ پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے، اس کے بعد آگے نشیب میں اتر کے قبلہ رو کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کے دیر تک دعا کرتے، پھر درمیان والے جمرہ پر بھی اسی طرح سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری پر تکبیر کہتے پھر بائیں جانب نشیب میں اتر کے قبلہ رو کھڑے ہوتے اور دیر تک کھڑے رہتے اور ہاتھ اٹھا کے دعا کرتے۔ پھر آخری جمرہ (جمرۃ العقبہ) پر بطن وادی سے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے اور اس جمرہ کے پاس کھڑے نہ ہوتے بلکہ واپس ہو جاتے اور بتاتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اور دوسرے جمروں کی رمی کے بعد قریب میں قبلہ رو کھڑے ہو کر دیر تک دعا کرتے تھے اور آخری جمرہ کی رمی کے بعد بغیر کھڑے ہوئے اور دعا کئے واپس ہو جاتے تھے۔ یہی سنت ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس سنت پر عمل کرنے والے بلکہ اس کے جاننے والے بھی بہت کم ہیں۔

قربانی — قربانی کی عام فضیلت اور اس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی عام ہدایات کتاب الصلوٰۃ میں عید الاضحیٰ کے بیان میں ذکر کی جا چکی ہیں اور حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے ۶۳ اونٹوں کی اور آپ کے حکم سے حضرت علی مرتضیٰ نے ۳۷ اونٹوں کی جو قربانی تھی اس کا ذکر حجۃ الوداع کے بیان میں گزر چکا ہو یہاں قربانی کے بارہ میں صرف دو تین حدیثیں اور پڑھ لی جائیں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ قُرْطٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَيَّامِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ يَوْمُ الْقَرِّ (قَالَ ثَوْرٌ وَهُوَ الْيَوْمُ الثَّانِي) قَالَ وَقُرِّبَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدَنَاتٌ خَمْسٌ اَوْ سِتٌّ فَطَفِقْنَ يَزْدَلِفْنَ اِلَيْهِ بِاَيَّتِهِنَّ يَبْدَءُ ــــــــ رواہ ابوداؤد

عبداللہ بن قرط رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت والا دن یوم النحر (قربانی کا دن یعنی ۱۰ ذی الحجہ کا دن) ہے (یعنی یوم العرفہ کی طرح یوم النحر بھی بڑی عظمت والا دن ہے) اس کے بعد اس سے اگلا دن یوم القر (۱۱ ذی الحجہ) کا درجہ ہے (اسلئے قربانی جہاں تک ہوسکے ۱۰ ذی الحجہ کو کرلی جائے اور کسی وجہ سے ۱۰ ذی الحجہ کو نہ کی جاسکے تو ۱۱ کو ضرور کرلی جائے اس کے بعد یعنی ۱۲ ذی الحجہ کو اگر کی جائے گی تو ادا تو ہو جائے گی لیکن فضیلت کا کوئی درجہ ہاتھ نہ آئے گا۔ حدیث کے راوی عبداللہ بن قرط (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرنے کے بعد اپنا یہ عجیب وغریب مشاہدہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ پانچ یا چھ اونٹ قربانی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے قریب لائے گئے تو اُن میں سے ہر ایک آپ کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا تاکہ پہلے اسی کو آپ ذبح کریں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ جانوروں میں بلکہ مٹی، پتھر جیسے جمادات میں حقائق کا شعور پیدا کردے۔ یہ ۵-۶ اونٹ جو قربانی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے قریب کئے گئے تھے اُن میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ شعور پیدا فرما دیا تھا کہ اللہ کی راہ میں اور اُس کے محبوب اور برگزیدہ رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قربان ہونا ان کی کتنی بڑی خوش نخبتی ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک اس خواہش کے ساتھ آپ کے قریب ہونا چاہتا تھا کہ پہلے آپ اُسی کو ذبح کریں۔

ہمہ آہوان صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَفِىْ بَيْتِهٖ مِنْهُ شَيْئٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَفْعَلُ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِىْ قَالَ كُلُوْا وَاَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا فَاِنَّ ذَالِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جَهْدٌ فَاَرَدْتُّ اَنْ تُعِيْنُوْا فِيْهِمْ ۔۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک سال عید الاضحیٰ کے موقع پر) ہدایت فرمائی کہ تم میں سے جو کوئی قربانی کرے تو (اُس کا گوشت بس تین دن تک کھا سکتا ہے) تیسرے دن کے بعد اس کے گھر میں اس قربانی کے گوشت میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہنا چاہئے ۔۔۔ پھر جب اگلا سال آیا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا ہم اس سال بھی (ویسا ہی) کریں جیسا کہ گزشتہ سال آپ کی ہدایت کے مطابق ہم نے کیا تھا تو آپ نے فرمایا (نہیں اس سال تین دن والی وہ پابندی نہیں ہے بلکہ اجازت ہے کہ جب تک چاہو) کھاؤ، کھلاؤ اور محفوظ رکھو، گزشتہ سال وہ ہدایت اس لئے دی گئی تھی کہ عوام کو (غذا کی کمی اور تنگدستی کی وجہ سے) کھانے پینے کی تکلیف تھی اس لئے میں نے چاہا تھا کہ قربانی کے گوشت سے تم ان کی پوری مدد کرو (اس لئے میں نے عارضی اور وقتی طور پر وہ حکم دیا تھا۔ اب جب کہ وہ ضرورت باقی نہیں رہی تھا لئے

لئے کھانے کھلانے اور محفوظ رکھنے کی پوری گنجائش ہے۔) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ نُبَيْشَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا كُنَّا نَهَيْنَاكُمْ عَنْ لُحُومِهَا أَنْ تَأْكُلُوهَا فَوْقَ ثَلٰثٍ لِكَيْ تَسَعَكُمْ جَاءَ اللهُ بِالسَّعَةِ فَكُلُوا وَادَّخِرُوا وَاتَّجِرُوا أَلَا وَإِنَّ هٰذِهِ الْأَيَّامَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

نُبیشہ ہُذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (عید الاضحیٰ کے موقع پر فرمایا) پہلے ہم نے قربانیوں کے گوشت تین دن سے زیادہ کھانے کی ممانعت کر دی تھی اور یہ پابندی اس لئے لگائی گئی تھی کہ سب لوگوں کو گوشت اچھی طرح ملجائے اب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے (وہ تنگدستی اور فقر و فاقہ والی بات اب نہیں رہی ہے بلکہ اللہ کے کرم سے لوگ اب خوشحال ہیں اس لئے (اب وہ پابندی نہیں ہے) اجازت ہے لوگ کھائیں اور محفوظ رکھیں اور (قربانی کا ثواب بھی حاصل کریں — یہ دن کھانے پینے کے اور اللہ کی یاد کے ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) جیسا کہ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا قربانی کے گوشت کے بارہ میں اجازت ہے کہ جبتک چاہیں کھائیں اور رکھیں اور آخری حدیث کے آخری جملہ سے معلوم ہوا کہ ایام تشریق میں بندوں کا کھانا پینا بھی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے گویا یہ دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی ضیافت کے دن ہیں لیکن اس کھانے پینے کے ساتھ اللہ کی یاد اور اسکی تکبیر و تحمید تقدیس و توحید سے بھی زبان تر رہنی چاہیئے — اسکی آمیزش کے بغیر اللہ کے بندوں کے لئے ہر چیز بے ذائقہ ہے۔۔

اَللهُ أَكْبَرُ اللهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ اللهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

تجلیاتِ مجدّد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ :۔ از ، مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۴۷) خاں جہاں کے نام [اتباع شریعت اور سرکوبی اعدائے دین کے بیان میں]

حق سبحانہٗ وتعالیٰ آپ کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرما کر سلامت اور معزز و محترم رکھے۔

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند[1]

کس بمیدن در نمی آید سواراں راچہ شد

دنیائے فانی کے تلذذات اور تنعمات اُس وقت خوش گوارا اور قابل ہضم ہوتے ہیں جبکہ اُن کے ضمن میں شریعتِ منوّرہ کے تقاضوں پر بھی عمل ہوا اور آخرت کو بھی اُنکے ساتھ شامل کرلیا گیا ہو۔ ورنہ یہ دنیا کی لذتیں شکر میں ملے ہوئے اُس زہر قاتل کا حکم رکھتی ہیں جس سے کسی بیوقوف کو (بآسانی) فریب دیا جاسکے۔ اگر اس زہر کا علاج، حکیم مطلق جلّ شانہٗ کے تریاق سے نہ کیا جائے اور اس (زہریلی) شیرینی کی تلافی اوامر و نواہیٔ شرعیّہ کی تلخی سے نہ کی جائے تو بڑے خسارے اور بڑے افسوس کی بات ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بموافقِ شریعت ـــــ جس کا دار و مدار سہولت پر ہے ـــــ

---

[1] توفیق وسعادت کی گیند قضا و قدر نے میدان میں پھینک دی ہے۔ شہسواروں کو کیا ہوگیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی میدان میں نہیں آتا (اور توفیق وسعادت کو حاصل نہیں کرتا)

تھوڑی سی جد وجہد سے ملک ابدی حاصل ہوتا ہے اور تھوڑی سی غفلت اور بے پرواہی سے یہ دولت جاودانی ہاتھ سے نکل جاتی ہے ــــ عقل دوراندیش کر کام میں لایا جائے اور (نادان) بچوں کی طرح معمولی چیزوں کو (اس دولت جاودانی کا) بدل اور عوض نہ ٹھہرایا جائے ــــ یہی ڈیوٹی جو آپ سے متعلق ہے اگر اس کو شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ادائیگی کے ساتھ ملائیں تو کار انبیاء انجام دیں گے اور دین متین کو منور و معمور کر دیں گے ہم فقیر اگر سالہا سال جان کھپائیں تب بھی اس عمل میں آپ جیسے شاہبازوں کی گرد کو نہ پہونچ سکیں گے۔

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد

اے اللہ تو ہم کو توفیق دے اس کام کی جس کو تو پسند کرتا ہے اور جس سے تو راضی ہوتا ہے ......

مکتوب (۵۵) ممریز خاں افغان کے نام ــــ

[فقر سے غنا کی طرف متوجہ ہونے کی مذمت میں]

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ــــ برادرم میاں ممریز خاں، فقر کی تنگیوں سے بھاگ کر اغنیاء کے پاس اپنی التجا لے گئے اور [illegible] ومتنعمات سے ساز باز کر لی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــ [illegible] اس سلسلے میں اچھی طرح غور نہیں کیا ہے اگر وہ صحبت اغنیاء میں رہ کر بہت ترقی کریں گے تو ہزاری ہو جائیں گے راجہ مان سنگھ سے اونچے نہیں ہو سکتے جو کہ پنجہزاری یا ہفت ہزاری منصب رکھتا تھا ــــ اور بالفرض تم مان سنگھ والے منصب پر بھی پہونچ گئے تو سوچو اور غور کرو تم نے کیا کارنمایاں انجام دیا اور کونسی بزرگی حاصل کر لی ہے ــــ کیا فقیری کی حالت میں روٹی نہیں ملتی تھی؟ ــــ اب (زیادہ سے زیادہ) یہ ہو گیا کہ گھی سے تر کی ہوئی روٹی کھا رہے ہو۔ وہ حالت بھی گذر گئی، یہ حالت بھی گذر جائے گی لیکن تصور تو کرو کہ کیا چیز تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور برابر نکلتی جا رہی ہے اور تم پہلے سے زیادہ مفلس ہو رہے ہو ــــ جو شخص اپنے

نقصان پر راضی ہو وہ شفقت و ہمدردی کا مستحق نہیں ہوتا ہے ــــــ اب جبکہ تم اس حالت میں مبتلا ہو ہی گئے ہو تو اس امر کی کوشش کرو کہ طریق استقامت اور التزام شریعت کا دامن تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور شغل باطن میں بھی کوئی خلل نہ واقع ہو ــــــ ہر چند دنیا کے ساتھ اس بات کا جمع کرنا مشکل ہے اسلئے کہ یہ توضدّین کا جمع کرنا ہے ــــــ بس اتنا ہے کہ یہ وضع اور حالت جو تم نے اختیار کرلی ہے اور یہ کار خدمت جس کی جانب تم اب متوجہ ہو اگر اس میں صحیح نیت کرلی جائے گی تو داخل جہاد ہو کر عمل نیک بن جائے گا ــــــ لیکن صحیح نیت ہے مشکل کام ــــــ آج تو تمہارے سپرد یہ خدمت ہے جو فی الجملہ اچھی ہے کل کو شاید کوئی اور ڈیوٹی لگادی جائے جو عین وبال ہو ــــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مشکل کام ہے ہشیار رہیں ــ خبر کرنا شرط ہے ــــ والسّلام ــــ

مکتوب (۵۶) حضرت خواجہ عبداللہؒ خلف حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور خواجہ جمال الدین حسینؒ خلف خواجہ حسام الدین احمدؒ کے نام ــــــ

الحمد للہ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ ــــــ میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میرے کانوں کی مسرت! یعنی خواجہ عبداللہ اور خواجہ جمال الدین حسین دونوں ــ اطمینان صوری و معنوی سے ہم آغوش اور آراستہ رہیں ـ تم دونوں نے عجیب تغافل اور نامہربانی کا معاملہ اختیار کر رکھا ہے کہ باوجود پڑوس میں رہنے کے سرہند نہیں پہونچے اور اس غریب کا حال دریافت نہیں کیا نیز حقوق آشنائی بجا نہ لائے ــــــ خواجہ محمد افضل کا کیا گلہ کروں وہ تو تم دونوں سے زیادہ دوستی کے معاملے میں دور ہیں بلکہ (یوں کہا جائے کہ) وہ ہماری دوستی سے ہراساں ہیں ـــ میر منصور بیگ کے متعلق کیا کہوں کہ وہ ہمیشہ آرزوئے ملاقات کرتے رہتے ہیں اور وہ آرزو قوت سے فعل میں نہیں آتی ــــــ فقہائے عظام کا قول ہے کہ "جو شخص خود اپنے ضرر پر راضی ہو وہ شفقت و ترحم کا مستحق نہیں ہوتا" ــــــ لشکر شاہی ہر چند ایک دریائے ظلمات ہے مگر آب حیات بھی اسی کے اندر ہے ــــ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے۔

گو بطریقِ ندرت ہی سہی مگر وہ گوہر (مضمون) ہاتھ آتا ہے کہ دوسری جگہوں میں اگر اس گوہر کی صورت ہی میسر آجائے تو غنیمت ہے ــــ جس سپاہی نے بھی اپنی قیمت پیدا کی ہے غلبۂ اعداء کے وقت میں کی ہے ــ ہر چند کہ گوشے میں سلامتی ہے، لیکن دولتِ غزا و شہادت تو میدان میں ہے گنج و زاویہ عورتوں اور ضعیفوں کے لئے مناسب ہے ــــ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "مومن قوی، مومن ضعیف سے بہتر ہے ــ قوی اور طاقتور مردوں کا کام جنگ اور معرکۂ کبریٰ ہے ــــ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ؕ ــــ

کہہ دیجئے کہ ہر شخص اپنے اپنے طریقے پر کام کرتا ہے پس تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اس شخص کو جو زیادہ راہ یاب ہے) رخصت کی مدت ختم ہوجانے کے بعد جب میں لشکر شاہی کی طرف متوجہ ہوا تو فرزندی محمد سعید کو بضرورت، مکان پر چھوڑ گیا ــــ جب میں نے ان فیوض و برکات اور علوم و معارف کو دیکھا جو محمد سعید کی مفارقت کے بعد ظہور میں آئے تو میں ان کو ساتھ نہ رکھنے پر پچھتایا اور فرصت کو غنیمت سمجھ کر ان کو اپنے پاس بلا لیا......

سید سلیمان ندوی
شخصیت و ماحول

سید ذوالفقار حسین بخاری ایم۔ اے (اسلامیہ کالج لاہور)

سید صاحبؒ (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۳ء) کی شخصیت کا تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے علمی، مذہبی، سیاسی اور ادبی ماحول کا سرسری جائزہ لیا جائے، جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے اثرات ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے۔

سید صاحب دیسنہ ضلع پٹنہ (صوبہ بہار) کے رہنے والے ہیں۔ صوبہ بہار کا یہی خطہ جس میں صادق پور اور عظیم آباد واقع ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے جاں نثار دل اور راہ خدا کے جانبازوں کا مرکز تھا۔ جنگ آزادی اوّل ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد ان بستیوں کے مکینوں پر انگریزوں نے جس طرح کی سختیاں کیں، ان پر بغاوت کے سنگین مقدمات چلائے، انھیں ملک بدر کیا اور ان کے لئے سزائے موت اور حبس دوام کے احکام صادر کئے ان سب کی روداد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطہ کے مسلمان دینی و سیاسی شعور اور راہ حق میں قربانی کے جذبہ کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے۔ اسی ماحول میں سید صاحب کا خاندان پرورش پاتا ہے مگر جب سید صاحب آنکھیں کھولتے ہیں اس وقت ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آچکی ہوتی ہے۔ بقول علامہ عبداللہ یوسف علی۔

> "۱۸۸۵ء سے ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں ایک خاص دور کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اِس سال انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی گئی اور اُس وقت سے ہندوستانی دماغ میں اپنی سیاسی حیثیت کا احساس پیدا ہو گیا۔"[1]

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

سیاست کے بارے میں مسلمان اس دور میں زبردست ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو علمائے کرام میں بعض اہم شخصیتیں کانگریس کی حمایت میں تھیں۔ اور انہی کے ساتھ ساتھ بعض معزز، باثر مسلمان مثلاً بدرالدین طیب جی[2] اور صوبہ بمبئی اور مدراس کے مسلمان اس کی موافقت کر رہے تھے۔ دوسری طرف بنگال میں سید امیر علی کانگریس کی مانند محمڈن نیشنل کانفرنس[3] قائم کرنا چاہتے تھے اور پنجاب میں مسلمان ایک علیحدہ انجمن بنانے کی تیاری کر رہے تھے[4]۔ ادھر سرسید جیسی بارسوخ اور متحرک و فعال شخصیت مذکورہ تمام جماعتوں کی مخالفت کر رہی تھی۔ ایسے میں سرسید کے ایک رفیق خاص مولانا شبلی نعمانی سرسید کے برعکس کانگریس کے حامی ہو جاتے ہیں، بقول شبلی نعمانی :۔

"رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا، اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں[5]"

سید صاحب کے خاندان نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ علم و ادب، مذہب و حکمت اور تصوف کی طرف مائل رہے۔ سید صاحب جب ندوۃ العلماء میں تعلیم کی خاطر آئے تو وہاں علامہ شبلی بھی کچھ عرصہ کے بعد تشریف لے آئے۔ سید صاحب کا سیاسی ذوق شبلی ہی کا مرہون منت ہے۔ فرماتے ہیں :۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ"، گیارہواں باب صفحہ ۳۲۳ تا ۳۵۴

[2] علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے لکھا ہے۔ طیب جی نے ۱۸۸۷ء میں مدراس کانگریس میں اور مسٹر رحمت اللہ محمد نے ۱۸۹۶ء میں کلکتہ کانگریس میں اس موضوع پر فصیح اور بلیغ تقریریں کیں (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ صفحہ ۳۳۱)

[3] عبداللہ یوسف علی صاحب نے اس کا نام "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" بتایا ہے جو اس وقت مسٹر امیر علی کے زیر ہدایت مسلمانوں کی نمائندہ تھی (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ) صفحہ ۳۲۷

[4] تفصیل کے ملاحظہ ہو "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مولفہ سید طفیل احمد منگلوری، باب ہشتم یعنی ۱۸۸۵ء تا ۱۹۱۰ء کی سیاست صفحہ ۲۷۵ تا صفحہ ۳۷۰۔ [5] حیات شبلی صفحہ ۲۹۷

"میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے۔ وہ اٹھارہ برس سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب سنہ ۱۹۱۱ء میں اپنا اخبار "الہلال" نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا۔[۱]

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :۔

"سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصہ لیا۔ اور جنگِ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اونچ میں شریک رہے کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلہ سے کبھی کسی منصب پر پہنچنے کے درپے نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کرلی تھی۔ اسی پر آخری دم تک قائم رہے۔ یہ سید صاحب کا بہلا بڑا کارنامہ ہو۔[۲]

اصل بات یہ ہے کہ سید صاحب کی فطرت اور ان کا مزاج اصلاً سیاسی نہیں بلکہ دینی، علمی، اور تصنیفی تھا، اور سیاسی خیالات یا سیاسی تحریکوں سے تعلق وقت کے شدید تقاضوں کا نتیجہ تھا ورنہ اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ اس میدان کے آدمی نہیں تھے، وہ خود فرماتے ہیں :۔

"پولیٹکس بڑی گندی چیز ہے، میں نے کبھی اس خرقہ سے آلود کو از خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی نے پہنا دیا، کبھی شوکت علی نے، اور جب کبھی کسی نے پہنا یا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا۔

حافظ زخود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را[۳]

---

[۱] "جن سے میں متاثر ہوا" معارف جولائی سنہ ۱۹۵۰ء ص ۹

[۲] ہم نفسانِ رفتہ ص ۳۹ و ص ۴۰ [۳] تذکرہ سلیمان ص ۲۳۶

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے انکے مزاج کی صحیح تشخیص فرمائی اور ٹھیک لکھا ہے کہ :۔

" سید صاحب فطرۃً مطالعہ و تصنیف اور ذہنی اور تعمیری کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور اسی قسم کا مزاج اور طبیعت لے کر آئے تھے وہ میدانی اور ہنگامہ خیز زندگی اور سیاسی تحریکات کے لئے بالکل موزوں نہ تھے "[۱]

وہ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے جب یورپ گئے تو وہاں بھی انھوں نے اپنی اس حیثیت کو بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ خود ہی بیان کر دیا انھوں نے لندن سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا :۔

میں نے مسئلہ خلافت اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت ظاہر کرنے کی خاطر ان سے کہا کہ میں کوئی پولیٹکل آدمی نہیں، مذہبی اور علمی آدمی ہوں، اور علماء کی جماعت کا قائم مقام ہوں، میرا اس وفد میں شریک ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہم جن مطالبات کو پیش کرتے ہیں وہ سراسر مذہبی ہیں[۲]

پھر سید صاحب نے جس حد تک بھی سیاست میں حصہ لیا اعتدال اور توازن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کبھی غلو میں مبتلا نہیں ہوئے جس سے بچنا اس راہ کے راہیوں کے لئے حقیقتہً بہت ہی مشکل ہے۔

دراصل سید صاحب مسلمانوں کے اندر بلکہ انسانوں کے اندر محبت پیدا کرنے کے حامی تھے۔ ان کا کہنا ہے :۔

" محبت، اعتماد اور رواداری ہمارا دستور العمل ہے چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے جس دن یہ بات نہیں رہے گی میں نہیں رہوں گا "[۳]

---

[۱] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ ۔ ۳ر نومبر ۱۹۵۳ء [۲] مکتوبات سلیمانی حصہ اول ص ۱۳۸
[۳] مکاتیب سلیمانی ص ۱۱۳ سید صاحب گویا جگر کے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں :۔

ان کا جو فرض ہے ارباب سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

سید صاحب کے اس اصول اور معتدل روش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے زمانے کی مختلف سیاسی ادبی، علمی اور مذہبی مسلک و مذہب کی حامل معروف ترین شخصیات سے ان کے کسی نہ کسی درجہ کے تعلقات تھے، بلکہ بعض کے ساتھ تو نہایت گہرے مراسم تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ملکر دینی سیاسی یا قومی تحریکات اور سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ مثلاً مولانا سید انور شاہ کشمیری مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حکیم سید عبدالحی، نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبداللہ غازی پوری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سلیمان اشرف، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، مولانا ظفر علی خاں، گاندھی جی موتی لال، جواہر لال نہرو، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد بدایونی، سر فضل الحق، سید کرامت حسین اکبر آبادی، نواب سر مزمل اللہ، سر راس مسعود، قاضی سلیمان منصور پوری مولانا ثناء اللہ امرتسری، خان بہادر ظفر حسین خاں (پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ) حسرت موہانی جگر مرادآبادی، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ۔

دین کے معاملے میں بھی اُن کا مسلک اعتدال اور حق پرستی پر مبنی تھا اور مولانا اشرف علی تھانویؒ ایسے اعتدال پسند اور حق پرست بزرگ کے ساتھ تعلق ہونے کے بعد یہ وصف اور بھی ترقی کر گیا، اس کا بین ثبوت وہ بیان ہے جو جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں "رجوع و اعتراف" کے نام سے شائع کیا اس میں تسلیم کیا کہ وہ بعض دینی مسائل میں جمہور سے الگ تھے۔ اب اس سے رجوع کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کو جو نصیحت کی ہے اس سے سید صاحب کے مزاج دینی پر پوری پوری روشنی پڑتی ہے۔ مولانا نگرامی لکھتے ہیں:-

"اس موقع پر حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی ایک،

نصیحت بار بار یاد پڑتی ہے۔ دار المصنفین کے زمانۂ قیام میں ایک دن مجھ سے
ارشاد فرمایا کہ میں اپنے پچاس سالہ تصنیفی تجربہ کے بعد آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ
کسی مسئلہ میں جمہور امت سے الگ نہیں ہونا چاہیئے۔ اور سلف صالحین کا دامن
ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے اہل علم کے کچھ تفردات ہوتے ہیں مگر ان تفردات
میں اور مفاسد سے قطع نظر ایک بڑا مفسدہ یہ ہے کہ نظم ملت میں خلل پڑتا ہے۔
یہ تفردات امت میں حسن قبول تو پاتے نہیں البتہ تفرقہ ضرور پیدا کرتے ہیں[۱] یہ

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی استاد و شاگرد (شبلی اور سید سلیمان) کی شخصیت
کا تقابل کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:-

"اس میں شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی۔ انھوں
نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے، اور عملی بھی۔ انھوں نے نثر کے میدان میں بھی
گوہر لٹائے اور نظم کے سبزہ زار میں حسن تخیل، لطافت بیان اور جذبات واثر
کے پھول کھلائے .... بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی
بنا پر جن میں سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتاد مزاج سے تھا۔
مولانا شبلی کو نہ قدیم علماء کا پورا اعتماد حاصل ہو سکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ
طبقہ کا .... رہا تعلیم جدید کا گروہ! تو چونکہ یہ گروہ سرسید کے زیر اثر تھا
اور مولانا شبلی سرسید کی سیاسی بلکہ ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے۔
اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ مولانا کو اس
طبقہ کا پورا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا تھا .... ان حالات اور اس
ماحول میں مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان
ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا، جو وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق،

---

[۱] مجلہ الفرقان لکھنؤ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی مضمون کچھ امام ابن تیمیہ کے متعلق جمادی الاولیٰ
۱۳۷۱ھ حاشیہ صفحہ ۳۵-۳۶

دقیقہ رسی اور علم وفضل میں استاد کا صحیح جانشین تھا اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا جو اسی کا اپنا حصہ تھے۔ اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رَو اور سُبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط واعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا، اس کی طبیعت میں متانت وسنجیدگی اور حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اسکے خامۂ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ وغضب کے تیور ظاہر نہیں ہوئے تھے ...... پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسکے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں سکنت تھی۔ فکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی، اور ان خداداد اوصاف وکمالات کے باعث وہ جس محفل میں بیٹھا صدرِ بزم ہو کر رہا۔ جس انجمن میں شرکت کی شمع انجمن کہلایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف وکمالات تھے جن کے باعث جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد اُن کو حاصل ہوا، وہ اُن کے استاد کو حاصل نہ ہو سکا۔"[۱]

سید صاحب کی کامیابی کا یہ ثبوت ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند اور جمعیۃ العلمائے اسلام، مسلم یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی، ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور، آل انڈیا ہسٹری کانگرس اور آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس اپنے اپنے اجلاسوں میں انھیں بلایا کرتی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند[۲] اور جامعہ ملیہ کے ساتھ ان کے روابط تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد عمومی تھے۔ مسلم یونیورسٹی کا انھیں ڈاکٹری کی ڈگری پیش کرنا، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر اور سر راس مسعود وغیرہم، انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا سید صاحب کے ساتھ عقیدت و مودّت رکھنا ان کی مقبولیتِ عامہ کو ظاہر کرتا ہے۔

---

[۲] حضرت سید صاحب دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ (ایگزیکٹیو) کے رکن بھی تھے جو دارالعلوم کا سب بڑا با اختیار اور ذمہ دار ادارہ ہے۔ (الفرقان)

[۱] معارف سلیمان نمبر ۱۶۱

اُن کے دل میں اپنے استاد علامہ شبلی کی والہانہ محبت تھی۔ اس کا عملی اظہار انھوں نے اس طرح کیا کہ ان کی ایک ایک تحریر شائع کی۔ ان کی سیرت النبی کی آرزو پوری کی۔ اُن کے بنائے ہوئے خاکے پر ایک اکیڈمی کو بنایا۔ اور ترقی دی۔ آخر میں ان کی سوانح حیات لکھ کر حقِ شاگردی کی تکمیل کر دی۔ مولانا سید مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں :۔

" مکاتیب میں حضرت استاذ نے بارہا استاذ الاستاذ مولانا شبلی سے اپنی وفاداری وفا شعاری کا تذکرہ فرمایا ہے اور واقعی یہ سید صاحب قبلہ کا ایسا وصف ہے جس میں سید رضا مصری (ف۔ ۱۳۵۴ھ) کے سوا کوئی ان کا مثیل نہیں۔ سید رضا اور حضرت الاستاذ دونوں علم و فضل میں اپنے اساتذہ شیخ محمد عبدہ (ف۔ ۱۳۲۳ھ) اور مولانا شبلی (ف ۱۳۳۲ھ) سے کہیں بڑھے ہوئے تھے مگر دونوں نے ان شخصیتوں میں اپنے فضل و کرم کو جس طرح گم کرنے کی کوشش کی وفا شعاری کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے "[1]

استاد کا اتنا احترام تھا کہ بقول سید صاحب :۔

" نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرت کا مسودہ مصنّف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ میں آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ ہونی چاہیئے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اگر کبھی بضرورت گستاخی کرنی پڑتی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا "[2]

اس عقیدت و الفت کے باوصف سید صاحب استاد کے مقلّد محض ہو کر نہیں رہ گئے۔ ڈاکٹر محمد زبیر صاحب رقم طراز ہیں :۔

سید صاحب کا طریقِ تحقیق عموماً وہی تھا جو اُن کے استاذ مولانا شبلی کا تھا، لیکن ایک حد تک وہ آزادانہ اپنے خیال کا اظہار فرماتے تھے۔ چنانچہ بعض مسائل میں انھوں نے مولانا شبلی سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب

---

[1] تقریب مکاتیب مولانا سید سلیمانؒ صـ۱۳ [2] دیباچہ سیرت النبی جلد اوّل طبع چہارم۔

قید فکر کے اس جنجال سے جو گزشتہ دو تین صدیوں سے مسلمانوں میں پھیل گیا تھا، بہت باہر نکل آئے تھے"[۵]

سید صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ محض علمی و تصنیفی کاموں ہی کے لئے مخصوص ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ خالص علمی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی، قومی، تعلیمی اور سیاسی تحریکات میں بھی شریک رہے۔

ان کی شخصیت کا ایک عجیب پہلو یہ رہا ہے کہ شروع شروع میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا[۶] انھوں نے طلب علم کے زمانے میں اساتذہ کو یہ تاثر دیا کہ وہ زندگی میں کوئی بڑا کام سرانجام نہیں دے سکتے، بلکہ بعض کو تو شبلی کے انتقال کے

بقیہ حاشیہ صہ ۳۴

۴ شیخ محمد اکرام صاحب نے موج کوثر میں سید صاحب کے اس وصف کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "بالخصوص ایک وصف ایسا ہے جو ان کے استاد میں نہ تھا۔ یہ وصف وفاداری ہے۔ صہ ۲۷۴

۵ معارف سلیمان نمبر صہ ۳۴۱

۶ علامہ شبلیؒ پہلے شخص ہیں جنھیں سید صاحب کی ذات میں ایک ایسی شخصیت کی جھلک نظر آرہی تھی جو مستقبل کی ایک درخشندہ ہستی بن کر نمودار ہونے والی تھی۔ شبلی کے بعد معدودے چند لوگ ایسے تھے جنھیں ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکا۔ انہی میں مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں جنھوں نے ان کے ایام طلب علم میں ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی دن بڑی شخصیت کے روپ میں ظاہر ہوں گے۔ مقالات ماجد جلد اوّل مضمون بہار کی بہار صہ ۱۹۴، صہ ۱۹۵۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کو سید صاحب کی اصل اور بہترین صلاحیتوں کا اندازہ اس وقت ہوگیا تھا جب سید صاحب مئی ۱۹۱۳ء میں الہلال کے اسٹاف میں شامل ہوئے اور چھ ماہ تک مولانا آزاد کے ساتھ رہے۔

سید صاحب کا یہ وہ دَور ہے کہ ابھی ان کی تمام صلاحیتیں بروئے کار نہیں آئی تھیں اس لئے مولانا ابوالکلام کی فراست اور بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے تھوڑے ہی (باقی حاشیہ صہ ۳۶ پر)

وقت تک اس بات میں شبہ تھا کہ سید صاحب ان کے کام کو احسن طریقے سے پورا کرسکیں گے۔

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس زمانے میں ان کی استعداد رہنمائی پر شبہ ظاہر کرنے والے کئی تھے کہ وہ اپنے استاد کی بہت سی خوبیوں سے محروم ہیں۔ لیکن جس کامیابی سے انھوں نے دارالمصنفین کو چلایا ہے اس کی توقع اُن کے سیماب طبع استاد سے نہ ہوسکتی تھی۔ ان کی رہنمائی میں اعظم گڑھ قوم کا سب سے بڑا تصنیفی مرکز اور معارف سب سے باثر علمی رسالہ ہوگیا ہے۔ سیرت النبی کا معیار اس قدر بلند نہیں جس کا دعویٰ شبلی نے مقدمہ میں کیا تھا لیکن بہرکیف کام جاری ہے۔ بلکہ اصل کام تو مدت ہوئی ختم ہوگیا۔ شبلی کی تمام تصنیفات بلکہ ان کے منتشر مضامین کو صفائی اور خوبی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اور اگرچہ شبلی کی وفات کو آج تیس سال ہوئے لیکن ان کی آواز برابر قائم ہے۔ حالانکہ علی گڑھ میں علمی اور تصنیفی لحاظ سے ایک سناٹا چھایا پڑا ہے۔"[1]

(باقی)

---

[1] موجِ کوثر صـ۲۷۴ و ۲۷۵۔ مولانا سعید احمد انصاری صاحب (دفتر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے ایک گفتگو میں راقم الحروف سے فرمایا کہ "سید صاحب نہ ہوتے تو دارالمصنفین کو شبلی کا کوئی اور شاگرد اس طرح نہ چلا سکتا۔" نومبر سنہ ۱۹۶۱ء۔ یہاں یہ بات مدنظر رہے کہ شیخ محمد اکرام اور مولانا سعید انصاری سید صاحب کے معترفین میں سے نہیں بلکہ معترضین میں سے ہیں انکی زبانی سید صاحب کی یہ تعریف!

بقیہ حاشیہ صـ۳۵

عرصے میں گوہر نایاب کا سراغ لگا لیا۔ چنانچہ سید صاحب جب "الہلال" کے ادارے کو ترک کرکے چلے جاتے ہیں تو ابوالکلام انھیں بار بار اپنے پاس بلاتے ہیں۔ لکھتے ہیں "آپنے پونا میں پروفیسری قبول کرلی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری سنئے اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجئے...... کیا حاصل اس سے کہ آپنے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہو کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھا سکتے ہیں۔" مکتوبات سلیمانی صـ۱۸

خدمتِ دین کی مشکلات

ایک تقریر

وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

برادرانِ اسلام! ——

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ بستی کے باہر ایک باغ میں مسلمانوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا، اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے بالکل قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پہیہ پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پہیہ اوپر کھڑا تھا اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اسی کے ساتھ جوئے میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آنے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے۔ ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آ رہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یادداشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے، اس کو میں نے قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سنانے میں آپ کا وقت ضائع کروں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیونکہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، یہ ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور پھنسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جا سکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسہ پر بالکل حسبتہ للہ ایک نیک کام کے لئے دوڑ پڑے تو اسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی۔ اور اس نے آن کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کمزور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! اسی طرح سے ایک اور گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات میں پھنس گئی ہے۔ پاسبانوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اسکے پہیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑ پڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو لگا دیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین مصرف، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر کوئی

ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے دین کی گاڑی کو اٹھانے میں لگے ہوئے ہوں۔ اس زمین پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا مظلوم ہونا ہمارے لئے سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لیے انتہائی سخت حالت ہے، مگر انھیں سخت حالات میں ہمارے لئے اُس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی اس دنیا میں کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہوا ہو۔ ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہوسکتی ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو وہ تنہا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اسکے ساتھ ہو جاتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے جب بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر کر رہا ہو، جب خدا کے فرشتے اسکے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آگیا ہو — آپ جانتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اگر کلکٹر کی ہمدردیاں اور اسکی معیت حاصل ہوجائے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ پھر خدا کی معیت اور اسکی مدد، اللہ اکبر! اسکی عظمت کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا ہے۔ خدا کی طرف سے آپ کو ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسول کی امت میں شامل کیا جانا گویا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ کا ایمان، اس کام پر آپ کے تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کی ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف سے خط ملے کہ تم کو فلاں جنگلی علاقے میں فارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس وقت وہ سرکاری ملازمتوں کے متعلق حکومت کے شائع شدہ قواعد و ضوابط سے رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ

وہاں اسکے سارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔ "گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہوگی؟" جواب یہ کہ تم کو پوری مسافت کے لئے معقول سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ "میں وہاں جا کر کس جگہ رہوں گا؟" اس کا جواب یہ ہوگا کہ وہاں تمھارے رہنے کے لئے سرکاری بنگلہ موجود ہے۔ "جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کروں گا؟" حفاظتی دستہ تمھارے ساتھ موجود رہے گا۔ "گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہوگا؟" تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی؟ اسی طرح ملازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہوگا۔ ہر تقرر لازماً یہ چاہتا ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اسکی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرائع و وسائل کا سارا خزانہ اس کی مٹھی میں ہے۔ ناممکن تھا کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر انکی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت رحیمیت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شان اقتدار کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمان دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جانیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمت دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہوسکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور واقعی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپکے ہر معقول مطالبے کا قطعی

اور یقینی جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ کسی بھی ایسی حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملے میں ہرگز آپ کتاب الٰہی کو خاموش نہ پائیں گے۔

اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا مل جانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں۔ (یوسف — ۱۱) خدا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پالینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئیے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

۱۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک داعی کے سامنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائیگی کا احساس اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے پست ہمتی —— یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کوہ طور پر بلا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپتا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی قبطی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ محکوم فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو ملک کی حکمراں قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس تقرر کو سن کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

رب انی اخاف ان یکذبون — خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔

ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی

شعراء ۱۲ ـ ۱۳

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم ڈرو مت۔ تمھاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دیدی گئیں۔

قد اوتیت سؤلک یا موسیٰ (طہ ـ ۳۶)

یہ مانگنے اور دیئے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کئے گئے ہیں اور جن کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری امت کے اہل علم اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں) ان کے لئے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولوگے اور ہم تمھاری ڈھارس بندھائیں گے جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکوگے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندۂ خدا کے اندر حقیقۃً داعی بننے کا جذبہ ابھر آئے اور وہ بیتابانہ اپنے رب کو پکار اٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللھم یضیق صدری ولا ینطلق لسانی خدایا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں۔

تو یقیناً کلام الٰہی اس کو دوبارہ آواز دے کر کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دیدی جس کی تمھیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس نے ہزاروں برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گونگے کو ناطق بنا دے اور بولتے ہوئے شخص کو گونگا کر دے۔ کمزوروں کو ہمت دیدے اور ہمت والے کو پست کر کے بٹھا دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے۔

آدمی جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسکی اپنی ضروریات توختم نہیں ہوجاتیں۔ اس کے جسمانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف جھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور ذاتی ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے، جو ہر داعی کے سامنے لازماً پیش آتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں اس معاملے میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی سترھویں سورہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا	جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ
ویرزقہ من حیث لا یحتسب	اس کے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور
	اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے
طلاق — ۲	گا جہاں اس کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

یہ ایک بہت بڑی یقین دہانی ہے، یہ ایک عظیم انشورنس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا کھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت وہ ذریعے ہیں جو کسی کو رزق دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم سرچشمے کی سرے سے خبر ہی نہیں اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے، یہاں ایک اور دینے والا ہے جو تمام دینے والوں سے زیادہ دے سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ خدا کے خزانے کو چھوڑ کر بناوٹی خزانوں کے سامنے دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ چھوٹے ذریعہ کو پاکر خوش ہیں، حالانکہ وہ اس سے بڑا ذریعہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ موجودہ انسان کی مثال اس بے صبرے نوجوان کی سی ہے جس کو گھر پر باپ کی وراثت میں معقول زمین ملی ہو۔ مگر دیہات کے خشک ماحول سے گھبرا کر وہ بمبئی بھاگ جائے اور وہاں واشنگ فیکٹری میں کلرکی حاصل کر کے سمجھے کہ میں نے اپنے رزق کا ذریعہ حاصل کر لیا۔ حالاں کہ بمبئی کی اس ملازمانہ زندگی میں وہ جو کچھ حاصل کر رہا ہے، اس سے بہت زیادہ خود اپنے گھر پر اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے آزادانہ طور پر حاصل کر سکتا تھا۔

۳- اب تیسری ضرورت کا تصور کیجئے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی مشکلات میں پھنس گیا ہو، جب حالات سے اس کا ٹکراؤ شروع ہوگیا ہو، جب باطل طاقتیں اس کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ یہ ہمارے احتیاج کا نازک ترین وقت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب داعی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا احساس لے کر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار نازک اوقات میں اہل ایمان کی مدد کی ہے۔ بلکہ ایسے وقت میں مدد کے لئے پہنچنا، اس نے اپنے اوپر اہل ایمان کا حق قرار دیا ہے۔

کان حقا علینا نصر المومنین — اہل ایمان کی مدد کرنا ہمارے اوپر اہل ایمان کا حق ہے۔ روم — ۴۷

بندے کے لئے احتیاج کا انتہائی وقت، آقا کے لئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کا انتہائی وقت ہوتا ہے، حتیٰ کہ نازک اوقات میں وہ یہاں تک کرتا ہے کہ اپنی مخصوص فوج کو اہل ایمان کی کمک کے لئے روانہ کر دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:۔

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین۔ (انفال — ۹) — جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میں ہزار فرشتے بھیج کر تمھاری مدد کروں گا۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے خادم، حقیقی خادم پر خدا کے دشمن حملہ آور ہوں، انھوں نے اس کا نرغہ کر لیا ہو، اور خدا بس دور سے اس کا تماشا دیکھتا رہے، یہ بالکل ناقابل تصور ہے۔ ایسے واقع پر تو خدا کی غیرت وحمیت دوسرے مواقع کے مقابلے میں اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر مدد کا یہ معاملہ صرف ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حقیقی خادم اور سچے وفادار ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب نیفا پر چینی حملے کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا، حکومت ہند کا ایک اعلیٰ افسر وہاں سے ڈر کر قبل از وقت بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اس کے برعکس اگر وہ جرأت اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقام پر ڈٹا رہتا، تو ہو سکتا تھا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں حکومت کا خاص ہوائی جہاز

بھیجا جاتا کہ وہاں جا کر افسر اور اس کے خاندان کو شہر سے نکال لائے۔

یہ چند مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح خدا نے اپنے دین کے خادموں کی تمام ضروریات و مسائل کا ذمہ لیا ہے۔ مگر یاد رکھیئے قرآن میں ہماری ضرورتوں کے بارے میں یہ جو یقین دہانیاں کی گئی ہیں اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ خدا کے فرشتے ہر صبح و شام آسمان سے خوان لے کر اتریں گے اور ہمارے سامنے بچھا دیا کریں گے۔ اگرچہ ایسا بھی ہو سکتا ہو مگر عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے۔ ہماری احتیاجات کی تکمیل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب دراصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنا دے گا کہ ہم بآسانی اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کر کے ہم اپنی کاربرآری کر سکتے ہوں، وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا جس کے بعد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ ایمان کی برکت سے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ کم صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کر سکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دل کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کر کے شکست کو آسان بنا دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کمتر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے اور معمولی ساز و سامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے اور نہ شاعری ہے۔ یہ ایک بڑا حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدائی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا ہے، مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے۔ بعض مذاہب کی طرح

میں اس نظریئے پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل لغویات ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھیئے یہ خدا کی شانِ خدائی کے بالکل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا عجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے، اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پکار رہی ہے ـــــ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللہِ (کون ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار بنے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ ـــ اِنْ تَنْصُرُوا اللہَ یَنْصُرْکُمْ (اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایک ایسے کام کے لئے پکار رہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی معیت کا راستہ ہو اس کی مدد سے ہم کنار ہونے کا راستہ ہے، یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو اور کس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مر گئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اٹھیئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔

انتخاب

ختم نبوت کی ضرورت و مصلحت

(مولانا محمد اسحٰق سندیلوی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نبوت کی برکت کا اقرار کرنے کے بعد ختم نبوت کی برکتوں سے ناواقفیت درحقیقت خود نبوت کی برکتوں سے جہالت کے مرادف ہے۔ نبوت و رسالت منبع برکات و انوار، مگر ختم نبوت اس کا تمام و کمال ہے، اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو اس کے معنیٰ یہ تھے کہ برکات نبوت کبھی کمال کو نہ پہونچتے اور نوعِ انسانی کبھی اس کے اعلیٰ مدارج کو نہ پا سکتی۔

اگر عالم دائمی اور ابدی نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، اگر اس خاکدان کا خاک میں ملنا لابدی ہے، اور قطعاً لابدی ہے، اگر قیامت کا آنا برحق ہے، اور بیشک برحق ہے تو، نبوت کا ختم ہونا بھی یقینی، لابدی اور ناگزیر ہے، کوئی احمق ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ جب حضرت اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم دیا جائے گا اس وقت بھی کوئی نبی مبعوث ہوگا، اس وقت سے پہلے جس نبی کو فرض کر دگے کیا اُسے خاتم النبیین نہ کہو گے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ختم نبوت ایک ناگزیر شئے ہے جس کا ہونا اسی طرح لازم اور ضروری ہے جس طرح آج کے بعد کل کا، منکرین ختم نبوت کو بھی بالآخر ختم نبوت کا قائل ہونا پڑے گا، مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ختم نبوت یعنی نبوت کے اعلیٰ ترین درجہ کے برکات و انوار سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ ہو یا ہوں تو بہت قلیل اشخاص، بخلاف اس کے ہم چاہتے ہیں کہ اس نعمت عظمیٰ اور حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے فائدہ اُٹھانے والے نوعِ انسانی کے کثیر سے کثیر افراد ہوں، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کیا جائے، ارحم الراحمین کی رحمت کا تقاضہ یہی ہے کہ نوعِ انسانی کے کثیر افراد کو ایک طویل مدت تک نبوت و رسالت کے اعلیٰ ترین برکات سے فیضیاب ہونے کا موقع

دیا جائے، اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم نہیں ہو جاتی تو اس کا موقع دُنیا کو کس طرح اور کب ملتا؟ اور نوعِ انسانی کا یہ انتہائی عروج روحانی عملی صورت میں کیسے جلوہ گر ہوتا؟۔

نوعِ انسانی کے ارتقاءِ روحانی کی آخری منزل "نبوت" ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو شرف عطا فرمایا گیا تھا وہ اُن کی ذات کے لیے محدود نہ تھا بلکہ ان کے واسطے سے اور طفیلی کی حیثیت سے پوری نوعِ انسانی بحیثیت مجموعی اس شرف سے مشرف ہوئی، اس شرف وعظمت کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کیجئے کہ کسی قوم میں چند ناموروں کا پیدا ہو جانا پوری قوم کے وقار میں اضافہ کر دیتا ہے اور اسے نامور قوم بنا دیتا ہے، کیا جرمنی کا ہر شخص لبنز اور آئنسٹائن ہوتا ہے؟ لیکن اس قسم کے چند جرمن نژاد اعلیٰ پایہ کے سائنس دانوں نے جرمنی کی سائنسدانی کا شہرہ آفاق میں پھیلا دیا ہے۔ اور پوری جرمن قوم کو نامور اور ممتاز بنا دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء مرسلین کی ذوات قدسیہ ہیں جنھوں نے اپنے وجود سے پوری نسلِ انسانی کے سر پر تاج کرامت رکھا، وہ انسانیت کا جوہر اور نوعِ انسانی کا شرف ہیں۔ اس فیض رسانی اور تقسیم شرف وکرامت میں سب انبیاء شریک وسہیم ہیں۔ ہر نبی انسانیت کا تاج ہے اور اسکی حیاتِ حقیقی کا منبع ہے، لیکن کتابِ الٰہی ناطق ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ — ان رسُولوں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ عظمت وفضیلت کے لحاظ سے ان کامل انسانوں اور عظیم شخصیتوں میں باہم فرقِ مراتب ہے اور اسی فرق کے تناسب سے ان کی فیض رسانی کے مدارج میں بھی فرق کرنا پڑے گا۔

مراتب ومدارج کا یہ فرق اشارہ کر رہا ہے کہ جس طرح نوعِ انسانی کے شرف کی تکمیل مرتبۂ نبوت سے کی گئی ہے اسی طرح کمالِ نبوت کا اعلیٰ ترین مرتبہ ختم نبوت کو بنایا گیا ہے، سلسلے نبی کامل تھے لیکن کمالِ نبوت کے سامنے بھی منازلِ ارتقاء تھے اور اسے ایک فردِ اکمل تک پہونچنا تھا اور یہی فردِ اکمل واعظم خاتم النبیین کے نام سے موسوم ہے۔

ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ختم نبوت ایک ناگزیر اور لابدی شئے ہے، سلسلۂ نبوت ورسالت کو لاانتہا نہیں فرض کیا جا سکتا، کسی نہ کسی کو تو خاتم النبیین تسلیم کرنا پڑیگا خواہ اسکی شخصیت جو بھی فرض کی جائے اور اسکے لیے عمرِ عالم کا جو بھی حصہ تجویز کیا جائے۔

یہ بھی لازم ہو کہ جسے خاتم النبیین کہا جائے اسے کمالاتِ نبوت و رسالت کا اعلیٰ ترین فرد سمجھا جائے اور نوعِ انسانی کیلئے اسکے فیوض و برکات کو بہترین اور اعلیٰ ترین فیوض و برکات تصور کیا جائے، اسکے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس نبی اکمل کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کو بحیثیت نوع جو کمالاتِ روحانیہ حاصل ہونگے انکی نظیر اُمم سابقہ میں مفقود ہوگی پھر کیا یہ ضروری نہیں ہو کہ ان بے نظیر کمالات سے نوعِ انسانی کے انتفاع و استفادے کی مدت طویل ہو تاکہ کثیر سے کثیر افراد ان کمالات سے مستفید ہو کر روحانیت و انسانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس حد تک قربِ الٰہی کے منازلِ ارتقاء طے کر سکیں جس حد تک کوئی اُمتی پہونچ سکتا ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سلسلۂ نبوت قیامت تک جاری رہے گا تو خاتم النبیین کو عمرِ عالم کے آخری حصہ میں فرض کرنا پڑے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ بنی نوعِ انسان کی ایک بہت ہی قلیل تعداد اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہو سکے گی ظاہر ہے کہ یہ شے نوعِ انسانی کی مصلحت کے بالکل خلاف ہے اور ارحم الراحمین کی رحمت سے بعید ہے۔

بے شک عقل یہ بات بتانے سے بالکل قاصر ہے کہ فلاں وقت پر نبی کو مبعوث ہونا چاہیے لیکن نبی کی بعثت کے بعد عقل اس حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے کہ فلاں نبی کی بعثت مناسب ترین وقت پر ہوئی تھی اور اس وقت کے انتخاب میں فلاں مصلحت تھی، اس قاعدے کے تحت ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقلی طور پر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسے وقت پر ہوئی جو ختمِ نبوت کے لیے موزوں ترین وقت تھا، یہ وہ وقت تھا جب انسانیت عقلی اعتبار سے حالتِ بلوغ کو پہونچ چکی تھی بنو اسرائیل کی دینی امامت ختم ہو چکی تھی مگر انبیاء بنی اسرائیل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات نے انسان کی عقلِ معاد[1] میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ وہ دینِ کامل کو سمجھ سکے اور اس پر عمل پیرا ہو سکے اور عقلِ معاش[2] بھی اس درجہ پر پہونچ چکی تھی جس کے بعد اس کی رفتارِ ارتقاء میں برابر تیزی پیدا ہوتی گئی اور جمود و توقف سے حرکت و تکمیل کی طرف مائل ہو رہی تھی اس وقت شدید ضرورت اس بات کی تھی کہ انسان کو دینِ کامل کی تعلیم دی جائے تاکہ عقلِ معاد عقلِ معاش کی رہنمائی کرتی رہے اور اسے حدود سے متجاوز ہونے سے محفوظ رکھے، اگر اس وقت نبوت ختم نہ ہو جاتی تو عقلِ معاد کمال کو نہ پہونچتی اور تیز رفتار عقلِ معاش کا ساتھ نہ

---

[1] عقلِ معاد: یعنی دینی امور اور آخرت کے متعلق مسائل کی فہم اور سمجھ ۱۲ منہ

[2] عقلِ معاش: یعنی دنیاوی امور کی سمجھ بوجھ ۱۲ منہ

دے سکتی، جب عقل معاش کی ترقی کا کوئی نیا دروازہ کھلتا تو عقل معاد ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی اور اس کا ساتھ دینے کے لیے کسی نبی کا انتظار کرتی۔

نئے مسائل کے معادی پہلو بالکل تاریک رہتے، اس تاریکی میں عقلِ معاش اس قدر دور نکل جاتی کہ عقل معاد اس کی رہنمائی کے بجائے اس کی اتباع پر مجبور ہو جاتی، یہ حالت انسانیت کے لیے کس قدر ہلاکت خیز ہوتی اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے، اس کے علاوہ اس وقت ختم نبوت کی وجہ سے کمالات ختم نبوت اور اس کے فیضان کے ظہور کے لیے انسان کے عقلی شباب و پیری کا پورا زمانہ لمبا ہے، ظاہر بات ہے کہ انسانی زندگی میں یہی دو زمانے بہت طویل ہوتے ہیں اور خاتم الرسل کے فیضان کے لیے ایسے طویل ہی زمانہ کی حاجت ہے، ابھی تو شباب بھی ختم نہیں ہوا، اس وقت ختم نبوت کے بارے میں شک کرنا بالکل ہی بے معنی ہے۔

ختم نبوت اور عقل معاش کا ارتقار

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تاریخ عالم میں دینی و مذہبی ابواب تو بکثرت ہیں یہاں تک کہ (جیسا کہ باب اول میں ثابت کیا جا چکا ہے) باطل ادیان و مذاہب کی عقلاً جتنی صورتیں نکل سکتی تھیں وہ سب بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تک ختم ہو چکی تھیں اور عالم کو ایسے حق کا انتظار تھا جس کی روشنی ہر قسم کے باطل کی تاریکی دور کر دے جس کے معنی یہ ہیں کہ عقلِ معاد اپنے انتہائی عروج و کمال کی طالب تھی اور انسانیت کو اس کے کمال کی سخت احتیاج تھی۔

لیکن عقل معاش نے اس وقت تک موجودہ دور کے لحاظ سے بہت کم مدارج ارتقار طے کیے تھے، یہ صحیح ہے کہ انسانیت دنیاوی فہم و فراست کے لحاظ سے بھی سن بلوغ کو پہونچ چکی تھی، لیکن یہ اس کے بلوغ کا بالکل ابتدائی دور تھا، دورِ شباب ابھی دور تھا، غور کیجیے کہ اٹھارویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی تک عقل معاش نے جس قدر ترقی کی ہے اس کا سواں حصہ بھی اس سے پیشتر نہ حاصل کر سکی تھی، ان دو ڈھائی صدیوں کے ارتقار عقل معاش سے اس سے پہلے کی ترقی کی کوئی نسبت بھی ہے؟

نکتہ یہ ہے کہ علوم معاش کی رفتارِ ارتقار اُس وقت تک تیز نہیں ہو سکتی تھی جب

تک علوم معاد اپنے عروج و کمال کو نہ پہونچ جائیں، جس طرح ایک انسانی فرد کی سب طبعی قوتیں متوازی طور پر ایک ساتھ ترقی نہیں کرتی ہیں، مثلاً پہلے انسان کا ذہنی نشو و نما ایک خاص درجۂ کمال کو پہونچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی قوت تولید نسل ترقی کرتی ہے جسے عرف عام میں بلوغ کہتے ہیں، یہ بلوغ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک قوائے ذہنیہ عقلیہ ایک درجہ تک ترقی نہ کر جائیں جس کے بعد وہ صرف معلومات و تجربات کی غذا سے ترقی کرتی ہیں خود ان کا ذاتی نشو و نما رک جاتا ہے جب تک عقل اس درجہ تک پہونچ نہ جائے اس وقت تک اس میں قوت تولید نسل نہیں پیدا کی جاتی، اسی لیے بلوغ کو کمالِ عقل کی علامت سمجھا جاتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا اور بلوغ عقل سے پہلے بلوغ عرفی شروع ہو جاتا تو ایسا شخص عموماً فہم کی خامی اور عقل و خرد کی کوتاہی میں مبتلا ہوتا اور یہ کمزوری عمر بھر رفع نہیں ہوتی، اس قانون فطرت کا دوسرا مظہر خود قوائے عقلیہ ہی کی ترقی کا فطری منہاج ہے، بچپن میں معلومات کی ساری غذا قوت حافظہ کے حصہ میں آتی ہے اور متخیلہ اپنی ترقی کے لیے شباب کا انتظار کرنے پر مجبور ہے، بلوغ کے بعد متخیلہ کا دورِ عروج شروع ہوتا ہے مگر یہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب حافظہ اپنے نقطۂ کمال پر پہونچ چکتا ہے۔
اس قانون کے ماتحت انسان کا نوعی ذہن بھی اس کا محتاج تھا کہ پہلے اس کی عقلِ معاد اپنے عروج و کمال کو پہونچ جائے تاکہ اس کے بعد اس کی دوسری قوت یعنی عقلِ معاش کو ترقی کا موقع ملے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انسان کے ذہن نوعی میں پوری صلاحیت اس چیز کی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اعلیٰ علوم معاد میں کمال حاصل کر سکے اور اس کی عقل معاد درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی، معلّم اعظم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اپنی تعلیم سے اسے درجۂ کمال عطا فرمایا اور ایسے علوم حقہ ربانیہ سے بھر دیا جس کی طلب و صلاحیت اس میں پورے طور پر پیدا ہو چکی تھی۔ ایک نابالغ بچہ ازدواجی تعلقات کے متعلق مسائل کو بالکل سمجھ نہیں سکتا، بلوغ کے بعد ان کے سمجھنے کی صلاحیت کاملہ پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس موضوع کے متعلق طب یا حیاتیات یا نفسیات کے مسائل خود بخود سمجھنے لگتا ہے، بلکہ اس کی صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسے یہ مسائل سمجھائے جائیں تو

آسانی سے سمجھ سکتا ہو۔ اگر نہ سمجھ جائیں تو ان سے ناواقف رہے گا۔

اس مثال سے مندرجہ بالا بیان عیاں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ اقدس میں عقلِ معاد شباب کو پہونچ چکی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں پوری پوری صلاحیت معادی مسائل کو سمجھنے کی پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ خاتم النبیین کے علوم ربانیہ کو خوب سمجھ سکتا تھا اگر انسان کی صلاحیت کامل نہ ہوتی تو وہ علوم ختم نبوت کو سمجھ نہ سکتا اور اس کا حامل نہیں بن سکتا تھا، اور اگر خاتم النبیین نہ تشریف لاتے تو عقلِ معاد کامل نہیں ہوسکتی تھی بلکہ علوم حقیقیہ سے محروم رہنا اس کے لیے لازم ہوتا اور حق یہ ہے کہ اگر انسانیت میں علوم ختم نبوت کی صلاحیتِ کاملہ موجود ہوتی تو خاتم النبیین کی بعثت ہی نہ ہوتی اور عقلِ معاش کی ترقی کا دور بھی شروع نہ ہوتا کیونکہ نوعِ انسانی اپنے نوعی ذہن کی ایک قوت کی تکمیل میں مصروف رہتی اور اس کی تکمیل کے بغیر وہ دوسری قوت یعنی عقلِ معاش کی تکمیل میں نہیں مصروف ہوسکتی تھی۔

اس نظریہ کی مزید وضاحت کے لیے اس تاریخی اور یقینی حقیقت پر غور کیجیے کہ بعثت محمدیہ علیہ الف الف تحیۃ سے پہلے بلکہ آنحضور کے زمانہ تک دُنیا کی صاحبِ فکر ذہین اور ترقی یافتہ قوموں میں سب سے زیادہ جس علم کا رواج اور چرچا ملتا ہے وہ الٰہیات اور اخلاقیات ہے خواہ وہ فلسفہ کی صورت میں ہو یا دینیات کی شکل میں، مابعد الطبعیات کو جو اہمیت دی گئی ہے اُس کی نصف بھی اس کی کسی شاخ کو حاصل نہ ہوئی، مگر باوجود دقیقہ رس عقل وفہم کے ان قوموں میں سائنس کا نام بھی نہیں ملتا، کیا یہ اس کی علامت نہیں ہے کہ نوعِ انسانی کی عقل معاد اپنی بالیدگی پر تھی تو اس کی عقلِ معاش کا نشو ونما رکا ہوا تھا۔ انسان معادی علوم کا پیاسا تھا اور ان سے سیراب ہونا چاہتا تھا لیکن علوم معاش کی پیاس اس میں، اس شدت کے ساتھ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خاتم النبیین نے تشریف لاکر آبِ حیات سے اسے سیراب کیا جس نے پیا اس کی عقلِ معاد کمال کو پہونچی جس نے اس سے روگردانی کی اس کی عقلِ معاد سراب سے دھوکا کھاکر ہلاک ہوئی اور محروم کمال رہی، یہ تقسیم افراد کے اعتبار سے ہے ورنہ انسان بحیثیت نوع کی عقلِ معاد خاتم النبیین کی تعلیمات سے تربیت پاکر بامِ عروج وکمال پر پہونچی، اس کی تکمیل کے بعد نوع کی عقلِ معاش میں بھی نشو ونما اور بلوغ کے آثار پیدا ہوئے تا آنکہ اس کی رفتار ترقی

روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اگر ختم نبوت سے عقل معاد کی تکمیل نہ ہو گئی ہوتی تو عقل معاش ہرگز میدان ترقی میں گامزن نہ ہوتی۔

یہ بھاپ اور برق کی قوتوں کی دریافت، یہ بحر و بر کی تسخیر، یہ دوش ہوا کی سواری، یہ ذرات و توانائی کے حیرت خیز آثار، یہ صوت وصورت کے محیر العقول شاہکار، یہ عجیب و غریب ایجادات و اختراعات عقل معاش کے تعجب خیز ارتقاء کے بدیہی آثار و دلائل ہیں، لیکن یہ سب درحقیقت ختم نبوت کے طفیل میں دنیا نے حاصل کیے ہیں، اگر نبوت ختم نہ ہوتی، اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی و رسول نہ ہوتے جن کی تعلیمات اور جن کے فیوض و برکات نے عقل معاد کی تکمیل فرمائی، علوم معاد کو ان کے انتہائی عروج پر پہونچایا اور نوع انسانی کو اپنی دوسری قوت کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس طرف سے مطمئن و فارغ کر دیا تو ہرگز ہرگز ان ترقیات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا، بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کسی نبی و رسول کی بعثت نہ ہوئی ہے نہ کبھی ہوگی۔

ابتلاء عظیم سے حفاظت

قرآن مجید نے امم سابقہ کے حالات کو عبرت و نصیحت کیلئے بیان فرمایا ہے، عاد و ثمود، اصحاب الایکہ، قوم تبع وغیرہ بہت سی قومیں اور امتیں عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح محو کر دی گئیں، کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ ان کی تباہی کا راز کیا تھا؟ شرک و کفر؟ نہیں! اس کی سزا کا مقام آخرت ہے، اور علیم و حکیم رب العالمین صدیوں تک اس جرم کی دنیا میں سزا نہیں دیتے۔ آج دنیا میں اس جرم کی کتنی کثرت ہے، مگر مجرم قومیں تباہی و بربادی اور مکمل استیصال سے محفوظ ہیں، پھر کیا فسق و فجور؟ یہ بھی نہیں! کیا آج فاسق و فاجر قومیں دنیاوی عیش و عشرت سے بہرہ یاب نہیں ہیں؟ اور صدیوں سے ارتکاب جرائم کرنے کے بعد بھی ابھی تک مٹنے سے محفوظ ہیں، جس شخص کو حق تعالیٰ نے اپنی کتاب کا ذرا بھی ذوق عطا فرمایا ہے وہ بہت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ جن امم سابقہ پر ہلاکت و بربادی نازل ہوئی وہ وہی تھیں جنھوں نے انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو دیکھا مگر ان کی دعوت کو ٹھکرایا ان کی بات کو جھٹلایا، ان کی شان میں بے ادبیاں کیں اور ان کے دل کو توڑا۔

یہ واقعہ قرآن مجید کی عبرت خیز و حکمت آمیز قصص میں قدر مشترک کا درجہ رکھتا ہے اور اسی چیز کو روشن کر رہا ہے کہ بے شک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا تشریف لانا انسانیت کے لیے ہزاروں

رحمتوں اور برکتوں کا سبب ہے لیکن دوسری طرف سخت امتحان، شدید آزمائش اور ابتلائے عظیم بھی ہے۔

باران رحمت، مردہ زمین کی حیات اور روح شجر و نبات ہے، مگر اسی کے ساتھ کمزور بودوں کے لیے باعث ممات بھی ہے، نجوم ہدایت کا طلوع تنویر بصر و بصیرت کا سبب، مگر شپرہ چشموں کی خیرگی اور بیمار دلوں کی موت کا بھی باعث ہے، نبی کا دیدار ایمان والوں کے لیے قرب الٰہی کا قریب ترین راستہ، مگر منکروں کے لیے حجت الٰہی کا تمام ہونا عذاب الیم کا پیام۔

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت ختم نہ ہوگئی ہوتی اور سلسلۂ نبوت جاری رہتا جیسا کہ امم سابقہ میں رہا تو امت محمدیہ علیہ الف الف تحیہ ہر نبی کی بعثت کے وقت سخت امتحان و ابتلا کے دور سے گزرتی، بار بار اس کے سامنے ایمان اور کفر کا سوال پیدا ہوتا، کسی نبی سے انکار کے معنی سب انبیاء کے انکار کے ہیں، اس لیے بہت سے ایسے ہوتے جو ایک لمحہ میں عمر بھر کی اپنی دینی کمائی کھو بیٹھتے اور عبادات و ریاضات کے باوجود عذاب دائمی کے مستحق ٹھہرتے۔

حق تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے رحمۃ للعالمین کی امت کو اس ابتلاء عظیم اور پرخطر امتحانوں سے محفوظ رکھا اور سید المرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو خاتم النبیینؐ کا مرتبہ عطا فرما کر سلسلۂ نبوت کو آنحضور کے بعد بند فرما دیا، حق تعالیٰ کا یہ احسان عظیم اسی امت پر ہے جس کا زیادہ سے زیادہ شکر بھی کم سے کم ہے اور اسی کے شکر واجب کا کروڑواں حصہ ادا کرنا بھی طاقت انسانی سے باہر اور غیر ممکن ہے۔

منکرین ختم نبوت، احسان فراموش، ناقدر شناس اور کافران نعمت ہیں جو اس احسان عظیم کی قدر کرنے کے بجائے سلسلۂ نبوت جاری رکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، گویا اس شدید امتحان و ابتلاء کے طالب ہیں جس سے رب رحیم نے انھیں مستثنیٰ و محفوظ فرما دیا ہے اور جس میں ناکامی کے معنی عذاب دائمی میں مبتلا ہونے کے ہوئے ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

(اقتباس از "مسئلہ ختم نبوت")

الفرقان لکھنؤ
مدیر
عتیق الرحمن سنبھلی
منظور نعمانی
فی پرچہ ساٹھ پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دُنیا اس سے ناآشنا ہے یہاں تک کہ اسکو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۲۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۴۰۴ صفحات، مجلّد مع گرد پوش، قیمت ۴/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے .... -/6
پاکستان سے .... -/8
ششماہی
ہندوستان سے 3/50
پاکستان سے .... -/4

(فی کاپی آٹھ آنے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۴ء | شمارہ ۵

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو اطلاع فرمائیں۔ **چندہ** یا کوئی دوسری اطلاع **۳۰ ر اکتوبر** تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار :- اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری :- براہ کرم خط وکتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان کچہری روڈ ــــ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اس حقیقت کو جس کا جی چاہے آج سمجھ لے اور جس کا جی چاہے کل کے انتظار پر رکھے ہندوستان میں بحیثیت ایک اقلیت کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کی اولین شرط ان کا اتحاد ہے اس لئے کہ کوئی بھی اقلیت اپنے حقوق کا تحفظ اس وقت تک کر نہیں سکتی جب تک کہ اس تحفظ کے معاملہ میں اُسکی ساری طاقتیں ایک مرکز کے تحت جمع نہ ہوں۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ اتحاد اس وقت تک کچھ زیادہ مفید نہیں ہوسکتا جب تک کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے ذہن کی موجودہ گرہیں نہ کھلیں اور شکایت و منافرت کی وہ فضا نہ بدلے جس میں ہندو ذہن جارحیت اور حق ماری کے رجحان کو قبول کرنے میں آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن اسکی بھی کوئی صورت اس سے زیادہ مؤثر اور کارگر کیا ہوسکتی ہے کہ مسلمان ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک متفق ہو کر اٹھیں اور ملک کی ہر ہر آبادی میں ہندوؤں کے دلوں پر دستک دیں کہ ہم اعتماد اور محبت کے طلبگار ہیں ——— اور یہ صورت جبھی بن سکتی ہے جبکہ مسلمان اس ذہن کی کسی ایک قیادت کی رہنمائی پر سرگرم عمل ہو جائیں۔

پس مسلمانانِ ہند کی اولین ضرورت ہے کہ وہ کسی ایسی قیادت کے گرد پورے عزم اور کامل یکجہتی کے ساتھ جمع ہو جائیں جو اُن کے حقوق کے معاملہ میں پوری مضبوطی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر بھی یقین رکھتی ہو۔

مسلمانوں میں کافی پرانی کل ہند جماعتیں اور تنظیمیں موجود ہیں اُن میں سے ہر ایک یا بعض اپنے متعلق سوچ سکتی ہیں کہ وہ اس معیار پر پوری اُترتی ہیں لہٰذا اس ذہن کے لوگوں کو اُن سے تعاون کرنا چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ کل مسلمان فلاں تنظیم کی قیادت کو قبول کرکے اُس کے اشاروں پر حرکت کریں۔

یہ مطالبہ حق بجانب ہوسکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کیا کیا جائے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کسی بھی صحیح یا غلط وجہ سے ان موجودہ تنظیموں میں سے کسی کے ساتھ بھی وابستہ ہونے کو نہ ابتک تیار ہوسکی ہے نہ آئندہ ایسے آثار ہیں۔

ظاہر ہو کہ حقائق سے لڑا نہیں جا سکتا اور واقعات کا دھارا منطقی استدلال سے نہیں موڑا جا سکتا۔ مسلمانوں کی بہتری اگر مقصود ہو تو اس حقیقت کی رعایت کرنا ہوگی اور اپنی اپنی جماعتیں جو مقصد نہیں کام کا ذریعہ ہیں انھیں پر زور دیئے رہنے کے بجائے کوئی ایسی راہ سوچنا ہوگی جس سے مسلمانوں کے انتشار اور لامرکزیت کو اتحاد اور مرکزیت میں بدلا جا سکے ——

ایسی راہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب اب غور و فکر کا محتاج نہیں ہے۔ ان تمام باقاعدہ تنظیموں اور متفرق باا ثر حلقوں کے اہم اشخاص نے لکھنؤ کے "مسلم مشاورتی اجتماع" کے ذریعہ مسلمانان ہند کی عظیم اکثریت کے جذبات و افکار کی نمائندہ جس "مجلس مشاورت" کو وجود بخشا تھا اس کے ایک منتخب وفد کے پہلے ہی دورے نے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے کہ ان تمام حلقوں کی مشترکہ قیادت کا نظام مسلمانوں میں اتحاد اور ولولۂ کار کی روح پھونک دینے کا ایک یقینی ذریعہ ہے۔ اس وفد نے بہار اور اڑیسہ کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ ان ارکان وفد میں سے اکثر کے جماعتی یا غیر جماعتی دورے ان مقامات پر پہلے بھی ہوئے ہوں گے۔ مسلمانوں کے انھیں قومی مسائل کے سلسلہ میں بھی ہوئے ہوں گے جن کی مصیبتوں نے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا ہے لیکن کہیں نہیں ہوا کہ شہر کا شہر اُن کی بات سننے کے لئے اُمنڈ آیا ہو۔ لیکن یہی سب لوگ جب مشترک قیادت کے عنوان سے جمع ہو کر پہنچے ہیں تو استقبال کے لئے شہر کے شہر اُمنڈ آتے ہیں، مسلمانوں کی افسردگی اور بے تعلقی کی جگہ جوش اور محبت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے اور اُن کی ساری مشغولیتوں پر ان رہنماؤں کی بات سننے کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ یہ اس دورے کے ہر قدم کے وہ یکساں مناظر ہیں جنھیں دیکھ کر شرکاء وفد دنگ رہ گئے کہ —— ع

ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی!

بہرحال خدا کی رحمت نے سترہ سالہ عقدۂ لاینحل کا سرا ہاتھ میں دیدیا ہے۔ اور حجت تمام کر دی ہے کہ مسلمانوں کو اگر افسردگی اور سرافگندگی کے حال سے نکال کر اپنے اجتماعی مسائل کے لئے سرگرم عمل کرنا ہے تو اُس کی راہ ہے مسلمانوں کے تمام رہنما حلقوں کا مشترکہ وفاق۔

"مجلس مشاورت" کا دائرہ کار ابھی واضح نہیں ہے۔ اسکی وضاحت کے لئے جب ارکان مجلس بیٹھیں گے تو ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ اپنے تجربے کے اس پہلو کو سامنے رکھیں گے، اور جماعتی مصالح کی بڑی سے بڑی قربانی بھی گوارا کر کے اُن تمام مسائل کو اپنے اس وفاق کے دائرہ کار میں لانے کی کوشش کریں گے جن کا حل مسلمانوں کی سرگرم اجتماعی جدوجہد کا طالب ہے۔

کتاب الحج

معارف الحدیث

(مسلسل)

طواف زیارت اور طواف وداع :-

حج کے اعمال و مناسک اور ان کی ترتیب سے جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے اس کا اہم مقصد بیت اللہ کی تعظیم و تکریم اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار ہے ــــــ اس لئے جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے مکہ معظمہ میں حاضری کے بعد حج کا سب سے پہلا عمل طواف ہی کرنا ہوتا ہے، یہاں تک کہ مسجد حرام میں داخل ہو کر پہلے تحیۃ المسجد بھی نہیں پڑھی جاتی بلکہ طواف پہلے کیا جاتا ہے اور اور دوگانہ طواف اس کے بعد پڑھا جاتا ہے ــــــ حاجی کے اس پہلے طواف کا معروف اصطلاحی نام ہی "طوافِ قدوم" ہے (یعنی حاضری کا طواف) اس کے متعلق احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔

اس کے بعد ۱۰ر ذی الحجہ کو قربانی اور حلق سے فارغ ہونے کے بعد ایک طواف کا حکم ہے۔ اس کا معروف اصطلاحی نام "طواف زیارۃ" ہے۔ یہ وقوف عرفات کے بعد حج کا سب سے اہم رکن ہے ــــــ پھر حج سے فارغ ہونے کے بعد جب حاجی مکہ معظمہ سے اپنے وطن واپس ہونے لگے تو حکم ہے کہ وہ آخری وداعی طواف کر کے واپس ہو اور اس کے سفر حج کا آخری عمل بھی طواف ہی ہو، اس کا معروف اصطلاحی نام طوافِ وداع اور طوافِ رخصت ہے ــــــ اِن دونوں طوافوں سے متعلق چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے!

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَرْمُلْ فِی السَّبْعِ الَّذِیْ اَفَاضَ فِیْہِ ــــــ رواہ ابو داؤد و ابن ماجۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف زیارت کے سات چکروں میں رمل نہیں کیا۔ (یعنی پورا طواف عادی رفتار سے کیا)

(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) پہلے گزر چکا ہے کہ حاجی جب مکہ معظمہ حاضر ہو کر پہلا طواف کرے (جس کے بعد اس کو صفا مروہ کے درمیان سعی بھی کرنی ہو گی) تو اس طواف کے پہلے تین چکروں میں وہ رمل کرے گا، حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام صحابہ نے ایسا ہی کیا تھا، اس کے بعد ۱۰ ذی الحجہ کو آپ نے منیٰ سے مکہ معظمہ آ کر طواف زیارت کیا اس میں آپ نے رمل نہیں کیا جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں تصریح ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَّرَ طَوَافَ الزِّيَارَةِ يَوْمَ النَّحْرِ اِلَى اللَّيْلِ ــــــــ

ــــــــ رواہ الترمذی وابو داؤد وابن ماجہ

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف زیارت کو مؤخر کیا (یعنی اس کی تاخیر کی اجازت دیدی) دسویں ذی الحجہ کی رات تک۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ طواف زیارت کے لئے افضل دن یوم النحر (عید الضحیٰ) کا دن) ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے کہ اس دن کے ختم ہونے کے بعد رات میں بھی وہ کیا جا سکتا ہے اور اس رات کا طواف بھی افضلیت کے لحاظ سے ۱۰ ذی الحجہ ہی کا طواف شمار ہو گا ــــــ عام عربی قاعدہ کے مطابق رات کی تاریخ اگلے دن والی تاریخ ہوتی ہے اور ہر رات اگلے دن کے ساتھ لگتی ہے، لیکن حج کے مناسک اور احکام میں بندوں کی سہولت کے لئے اس کے برعکس قاعدہ مقرر کیا گیا ہے اور ہر دن کے بعد والی رات کو اس دن کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اسی بنا پر جو طواف ۱۰ ذی الحجہ کا دن گزرنے کے بعد رات میں کیا جائے گا وہ ۱۰ ذی الحجہ ہی میں شمار ہو گا اگرچہ عام قاعدہ کے لحاظ سے وہ ۱۱ ذی الحجہ کی رات ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَنْصَرِفُوْنَ فِي كُلِّ وَجْهٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْفِرَنَّ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِالْبَيْتِ اِلَّا اَنَّهٗ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ ——— رواه البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ (حج کرنے کے بعد) اپنے اپنے وطنوں کے رخ پر چلدیتے تھے (طواف وداع کا اہتمام نہیں کرتے تھے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک وطن کی طرف کوچ نہ کرے جب تک کہ اسکی آخری حاضری بیت اللہ پر نہ ہو (یعنی جب تک کہ طواف وداع نہ کرلے) البتہ جو عورت خاص ایام کے عذر کی وجہ سے طواف سے معذور ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے (یعنی اس کو طواف وداع معاف ہے)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ اس حدیث میں صراحۃً مذکور ہے پہلے لوگ طواف وداع کا اہتمام اور پابندی نہیں کرتے تھے۔ ۱۲ر یا ۱۳ر ذی الحجہ تک منیٰ میں قیام کرکے اور رمی جمرات وغیرہ وہاں کے مناسک ادا کرکے اپنے اپنے وطنوں کو چلدیتے تھے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس کے وجوب اور اہمیت کا اعلان فرمایا، چنانچہ فقہا نے طواف وداع کو واجب قرار دیا ہے البتہ حدیث کی تصریح کے مطابق وہ مستورات جو اپنے خاص ایام کی وجہ سے طواف سے معذور ہوں وہ اگر طوافِ زیارت کرچکی ہیں تو بغیر طواف وداع کئے مکہ معظمہ سے وطن رخصت ہوسکتی ہیں ——— ان کے علاوہ ہر بیرونی حاجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملک کی طرف روانہ ہونے سے پہلے وداع اور رخصت ہی کی نیت سے آخری طواف کرے اور یہی حج کے سلسلہ کا اس کا آخری عمل ہو۔

عَنِ الْحَارِثِ الثَّقَفِيِّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلْيَكُنْ اٰخِرُ عَهْدِهِ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ ——— رواه احمد

حارث ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص حج یا عمرہ کرے تو چاہیئے کہ اس کی آخری حاضری بیت اللہ پر ہو اور آخری عمل طواف ہو ——— (مسند احمد)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا قَالَتْ اَحْرَمْتُ مِنَ التَّنْعِیْمِ بِعُمْرَةٍ فَدَخَلْتُ فَقَضَیْتُ عُمْرَتِیْ وَانْتَظَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْاَبْطَحِ حَتّٰی فَرَغْتُ وَاَمَرَ النَّاسَ بِالرَّحِیْلِ قَالَتْ وَاَتٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْبَیْتَ فَطَافَ بِہٖ ثُمَّ خَرَجَ ———

——— رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (حجۃ الوداع کے سفر میں قیام مکہ کی اُس آخری رات میں جس میں مدینہ کی طرف واپسی ہونے والی تھی) میں نے مقام تنعیم جاکر عمرہ کا احرام باندھا اور عمرہ کے ارکان (طواف، سعی وغیرہ) ادا کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (منی اور مکہ کے درمیان) مقام ابطح میں میرا انتظار فرمایا جب میں عمرہ سے فارغ ہو چکی تو آپ نے لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم دیا اور آپ طواف وداع کے لئے بیت اللہ کے پاس آئے اور طواف کیا اور اسی وقت مکہ سے مدینہ کی طرف چل دیئے۔

(**تشریح**) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب حجۃ الوداع کے سفر میں مدینہ سے روانہ ہوئی تھیں تو آپ نے تمتع کا ارادہ کیا تھا اور اس وجہ سے عمرہ کا احرام باندھا تھا لیکن جب مکہ معظمہ کے قریب پہنچیں تو (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) خاص ایام شروع ہوگئے جس کی وجہ سے وہ عمرہ کا طواف وغیرہ کچھ بھی نہ کر سکیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق آپ نے عمرہ ترک کر کے ۸ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ لیا اور آپ کے ساتھ پورا حج کیا۔ ۱۳ ذی الحجہ کو جمرات کی رمی کر کے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منی سے واپس ہوئے تو آپ نے ابطح میں قیام فرمایا اور رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا، اسی رات میں آپ نے حضرت صدیقہ

کو اُن کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ بھیجا کہ حدودِ حرم سے باہر تنعیم جاکر وہاں سے عمرہ کا احرام باندھیں اور عمرہ سے فارغ ہو کر آجائیں، اس حدیث میں اسی واقعہ کا ذکر ہے حضرت عائشہؓ جب عمرہ سے فارغ ہو کے آئیں تو آپ نے قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا، قافلہ ابطح سے مسجد حرام آیا آپ نے اور آپ کے اصحاب کرامؓ نے سحر میں طواف وداع کیا اور اسی وقت مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے ——— حضرت صدیقہ کا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا تھا جو احرام باندھنے کے باوجود نہ کر سکی تھیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ افضل یہی ہے کہ طواف وداع اس وقت کیا جائے جبکہ مکہ معظمہ سے روانگی ہو، اگر طواف وداع کر لینے کے بعد کسی وجہ سے ایک دو دن ٹھہرنا پڑ جائے تو چاہئیے کہ روانگی کے قریب پھر بیت اللہ پر حاضر ہو اور طواف کرے۔

تجلیاتِ مجدّدِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ :- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۵۷) مولانا حمید کے نام [حدوثِ عالم اور ردّ عقل فعّال کے بیان میں]

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسّلام علیٰ سید المرسلین۔ اللہ تعالیٰ، "بذات اقدس خود" موجود ہے اور اس کی ہستی، "بخودیٔ خود" ہے ـــــ اللہ تعالیٰ جیسا ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ عدم سابق اور عدم لاحق کا اُسکی جناب میں کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ "وجوبِ وجود" اس کی درگاہِ مقدس کا ادنیٰ خادم ہے، اور "سلبِ عدم" اُسکی بارگاہِ محترم کا معمولی خاکروب ہے ـــــ اللہ تعالیٰ کے ماسوا ـــــ جس کو عالم کہتے ہیں ـــــ چاہے وہ عناصر ہوں یا افلاک اور خواہ وہ عقول ہوں یا نفوس، بسائط ہوں یا مرکّبات، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے وجود بخشنے سے موجود ہوئے ہیں اور عدم سے وجود میں آئے ہیں ـــــ قدامت ذاتی وزمانی صرف اُسکے ہی لئے ثابت ہے اور حدوثِ ذاتی وزمانی اُس کے غیر کے واسطے ہے۔ چنانچہ زمین کو دو۲ روز میں اُس نے ہی پیدا کیا ـــــ زمین کو پیدا کرنے کے بعد، آسمانوں اور ستاروں کو دو۲ روز میں عدم سے وجود میں وہی لایا ہے ـــــ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (زمین کو اُس نے دو۲ دن میں پیدا کیا)

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ ——— (اللہ نے سات آسمان دو روز میں بنائے) ——— کوئی بیوقوف ہوگا بلکہ نصِ قرآنی کا منکر ہوگا کہ ماسوائے حق تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں قدامت کا قائل ہو (مثلاً) آسمانوں اور ستاروں کو قدیم کہے یا بسائطِ عناصر کو قدیم جانے یا عقول و نفوس کو ازلی و قدیم تصوّر کرے ———
اجماعِ اہلِ ملت اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ ماسوائے حق تعالیٰ، سب کے سب حادث ہیں۔ اور سب نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ ماسوائے حق جتنی اشیاء ہیں سب عدم کے بعد وجود میں آئی ہیں ——— چنانچہ امام حجۃ الاسلام (غزالیؒ) نے اپنے رسالے "المُنْقِذُ عَنِ الضَّلَال" میں اس عقیدے کی تصریح اور جو جماعت بعض اجزائے عالم کی قدامت کا اعتقاد رکھتی ہے ——— اسی بنا پر ——— اس کی تکفیر کی ہے ——— پس اشیاءِ ممکنہ میں سے کسی شے کی قدامت کا حکم لگانا ملت سے خروج ہے اور دائرہ فلسفہ میں داخل ہوتا ہے ——— جس طرح ماسوائے حق کے لئے عدمِ سابق ثابت ہے، اسی طرح عدمِ لاحق بھی ماسوا کو دامنگیر ہے ———
(قیامت میں) ستارے آسمانوں سے بکھر جائیں گے، آسمان پارہ پارہ ہو جائیں گے، زمین اور پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور عدم سے مل جائیں گے ——— چنانچہ نصِ قرآنی اس پر ناطق ہے اور تمام اسلامی فرقے اس حقیقت پر اجماع کئے ہوئے ہیں حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کلام مجید میں فرماتے ہیں ——— فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاهِیَةٌ (پس جب ایک صور پھونکا جائے گا اور جب زمین اور پہاڑوں کو اٹھا لیا جائے گا پھر یکبارگی ان کو توڑ پھوڑ دیا جائے گا پس اُس دن واقع ہوگی قیامت اور آسمان پھٹ جائے گا پس آسمان اس دن بودا اور سست ہوگا) نیز حق تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جس وقت ستارے تیرہ و تاریک ہو جائیں گے اور جب کہ پہاڑ چلائے جائیں گے) نیز فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (جب کہ آسمان پھٹ جائے گا

اور جس وقت ستارے بکھر جائیں گے) نیز ارشاد فرمایا اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (جب کہ آسمان پھٹ جائے گا) نیز ارشاد ربانی ہے ـــــ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ـــــ (سوائے ذاتِ خداوندی کے ہر چیز فانی ہے اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤگے) ـــــ اور بھی اس مضمون کی بہت سی آیات، قرآن مجید میں آئی ہیں ـــــ کوئی جاہل ہی ہوگا جو ان اشیاء کی فناء کا انکار کرے گا یا وہ سرے سے ایمان ہی قرآن پر نہ رکھتا ہوگا بلکہ وہ فلسفیوں کی ملمع کاری پر فریفتہ ہوگا ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ ممکنات میں' عدم سابق کی طرح عدم لاحق کا اثبات بھی ضروریاتِ دین کئے ہے اور اس حقیقت پر ایمان رکھنا لازم ہے ـــــ اور بعض علماء نے جو یہ فرمایا ہے کہ سات چیزیں یعنی عرش و کرسی، لوح و قلم بہشت و دوزخ اور روح ـــــ فنا نہ ہوں گی اور باقی رہیں گی" ـــــ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیزیں فنا قبول نہیں کرتی ہیں اور قابلیت زوال نہیں رکھتی ہیں حاشا و کلا ـــــ بلکہ قادرِ مختار جل شانہٗ اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر جس کو چاہتا ہے بعد از وجود، فنا کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے ـــــ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس امر کا ارادہ کرتا ہے اُس کا حکم دیتا ہے) ـــــ اس بیان سے ظاہر ہوا کہ عالم اپنے جمیع اجزاء کے ساتھ واجب تعالیٰ سے احتیاجی نسبت رکھتا ہے اور اپنے وجود و بقا میں اسی کا محتاج ہے ـــــ اس لئے کہ بقاء وجود کے برقرار رہنے کا نام ہے جس زمانے تک بھی اللہ تعالیٰ برقرار رکھنا چاہے ـــــ اس وجود پر کسی امر زائد کا نام بقا نہیں ہے ـــــ پس نفس وجود اور استقرارِ وجود دونوں کے دونوں ارادۂ خداوندی ہی کے سپرد ہوں گے ـــــ عقل فعّال کون ہوتی ہے؟ کہ اشیاء کا انتظام کرے اور حوادث اس کی طرف منسوب ہوں ـــــ عقل فعّال کے تو نفس وجود اور اسکے ثبوت میں بھی ہزاروں کلام ہیں ـــــ اس لئے کہ اس عقل فعّال کا تحقق دُصول فلسفیوں کے ان غلط اور فریب دہندہ مقدمات سے ہے جو اصولِ حقہ اسلامیہ کی رو سے ناتمام اور نافرجام ہیں ـــــ کوئی بیوقوف ہوگا جو اشیاء کو قادرِ مختار جل شانہٗ سے الگ

رکھ کر عقل فعال جیسے امر موہوم کی طرف منسوب کرنے بلکہ خود اشیاء کو بہت زیادہ ننگ و عار ہے اس بات سے کہ فلسفی کی گھڑی ہوئی عقل فعال سے وہ منسوب ہوں بلکہ اشیاء اپنے عدم پر راضی و خورسند ہوں گی اور ہرگز وجود کی رغبت نہ کریں گی اس بات کے مقابلے میں کہ ان کے وجود کی نسبت فلسفی کی من گڑھت چیز کی طرف کی جائے اور وہ قدرت قادر مختار جل سلطانہٗ کی طرف انتساب کی سعادت سے محروم کردی جائیں ۔۔۔۔۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔ (سخت ہے وہ بات جو اُن کے مُنھ سے نکل رہی ہے، وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں کہہ رہے)

مکتوب (۵۹) خواجہ شرف الدین حسین کے نام ۔۔۔۔۔

[تمام حوادث کو ارادۂ خداوندی سے متعلق سمجھ کر اُن سے لذت یاب ہونا چاہیئے]

اے فرزند عزیز با تمیز! حوادث یومیہ چونکہ بارادۂ واجب الوجود ہوتے ہیں اور اُسی کے فعل سے برقرار ہیں اس لئے اپنے ارادے کو تابع ارادۂ خداوندی کرکے حوادث کو اپنی مُرادات قرار دینا چاہیئے اور ان سے لذت یاب ہونا چاہیئے ۔۔۔۔۔ اگر بندگی کا جذبہ ہے تو یہ نسبت پیدا کرنا چاہیئے ورنہ پاؤں دائرہ بندگی سے باہر نکالنا اور اپنے آقائے حقیقی کا مقابلہ کرنا ہے ۔۔۔۔۔ حدیث قدسی میں آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جو شخص راضی نہیں ہوا میرے فیصلے پر اور جس نے صبر نہیں کیا میری بھیجی ہوئی مصیبت و آزمائش پر اس کو چاہیئے کہ وہ میرے علاوہ اپنا کوئی اور رب ڈھونڈھ لے اور میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے" ۔۔۔۔۔ مردم فقراء و مساکین اور کمزور اشخاص تمھاری رعایت و حمایت میں آسودہ حال رہے ہیں ۔۔۔۔۔ چونکہ وہ بھی اپنا ایک آقائے حقیقی رکھتے ہیں (اس لئے تمھاری حمایت کی چنداں ضرورت تو نہیں البتہ اس بہانے سے) تمھاری نیکنامی باقی رہی ۔۔۔۔۔ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ تم کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے ۔۔۔۔۔ والسّلام ۔۔۔

مکتوب (۶۰) پیرزادۂ گرامی قدر حضرت خواجہ محمد عبداللہ معروف بخواجہ کلاںؒ کے نام ۔۔۔۔۔ [درمیان کا کچھ حصہ]

۔۔۔۔۔۔ حقیقتِ انسان اور اس کی ذات عدم ہے جو کہ حقیقتِ نفسِ ناطقہ ہے ابتداء میں اس نفس کو نفسِ امّارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہر انسان لفظاً انا (میں) بول کر اسی نفسِ امارہ کی طرف اشارہ کرتا ہے پس ذاتِ انسان، نفسِ امّارہ ہے اور تمام لطائفِ انسان، نفسِ امارہ کے قویٰ وجوارح کی مانند ہوئے ـــــــ چونکہ عدم اپنی ذات کے لحاظ سے شرِ محض ہوتا ہے بوئے خیریت اس میں نہیں ہوتی اس لئے نفسِ امارہ بھی شرِ محض ہو اور اپنے اندر بوئے خیریت نہیں رکھتا ـــــــ یہ نفسِ امّارہ کی شرارت وجہالت ہی تو ہو کہ وہ کمالاتِ منعکسہ جو اس کے اندر بطورِ ظلّیت، ظاہر ہوگئے ہیں ان کو وہ اپنی طرف سے سمجھتا ہے اور اُن کمالات کو جو اپنی اصل کے ساتھ قائم و ثابت ہیں یہ اپنی جانب منسوب کرکے خود کو ان کمالات کی بنا پر کامل وخیر جانتا ہے اور اسی وجہ سے اپنی سرداری کا دعویٰ کرتا ہے نیز اپنے آپ کو کمالات کے اندر خداوند کریم کا شریک بناتا ہے، حول و قوّت کو اپنی جانب سے تصور کرتا ہے، خود کو متصرّف سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب اس کے تابع رہیں اور وہ کسی کا تابع نہ ہو وہ اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ دوست اور عزیز رکھتا ہے اور دوسروں کو اپنی ذاتی غرض سے دوست رکھتا ہے نہ کہ دوسروں کی مصلحت کے پیشِ نظر۔ انھیں تخیلاتِ فاسدہ کی وجہ سے وہ اپنے مولا جل سلطانہ سے عداوتِ ذاتی پیدا کرتا ہے اور اس کے نازل کئے ہوئے احکام کی طرف مائل نہیں ہوتا (بلکہ) اپنی خواہشات کی پیروی اور پرستش کرتا ہے۔

حدیث قدسی میں آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــــــ "تو اپنے نفس کو دشمن رکھ اسلئے کہ وہ میری مخالفت و دشمنی پر کمر باندھے ہوئے کھڑا ہے"۔

حضرت حق مجدہ نے اپنی کمال مہربانی و رحمت سے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جو رحمتِ عالم ہیں ـــــــ تاکہ وہ مخلوق کو حق تعالےٰ کی طرف دعوت دیں اور اس دشمن (نفس امّارہ) کا کارخانہ تباہ کریں نیز انسان کو اپنے خالق و مولا کی جانب راستہ دکھائیں اور جہالت وخباثت سے باہر لائیں اور اسکے نقص و شرارت سے مطلع کریں جو سعادتِ ازلی رکھتا تھا اس نے ان بزرگوں (انبیاء) کی دعوت کو قبول کرلیا اور اپنی

جہالت وخباثت سے باز آگیا اور نازل شدہ احکام کا تابع ومطیع بن گیا.........

مکتوب (۶۶) محمد مقیم قصوری کے نام

[المجاز قنطرۃ الحقیقہ (مجاز، حقیقت کا پل ہے) کے بیان میں]

برادرم محمد مقیم نے دریافت کیا تھا کہ صوفیا نے المجاز قنطرۃ الحقیقہ، کس معنی میں استعمال کیا ہے؟ جاننا چاہیئے کہ مجاز، ظلِ حقیقت ہے کہ اس نے ظل سے اصل کی طرف شاہراہ کھولی ہے شاید اسی بناپر بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا"۔ بات یہ ہے کہ معرفتِ ظلِ معرفتِ اصل کو مستلزم ہے اس لئے کہ ظل اپنی اصل کی صورت میں موجود ہے پس ظل، انکشافِ اصل کا سبب ہوتا ہے کیونکہ صورت شئے وہی ہے جس سے اصل شئے ظاہر ہو۔ لیکن یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ المجاز قنطرۃ الحقیقہ اس صورت میں ہے جب کہ مجاز میں گرفتار نہ ہو جائے بلکہ ایک نظر کے بعد دوسری نظر کی نوبت نہ آنے پائے (پس) نظر اول قنطرۃ الحقیقہ ہے۔ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے "النظرۃ الاولیٰ لک" فرمایا ہے۔ (یعنی پہلی نظر تیرے لئے ہے) گویا کہ لفظ لک سے اشارہ دولت حقیقت کے حصول کی طرف ہے اور اگر نعوذ باللہ مجاز میں گرفتار ہو گیا اور نظرۂ ثانیہ کی نوبت آئی تو وہ مجاز، راہِ وصولِ حقیقت کا مانع ہے قنطرہ (پل) کہاں سے ہوگا؟ بلکہ وہ تو ایک بُت ہے جو کہ اپنی پرستش کی دعوت دیتا ہے۔ ایک دیو ہے جو حقیقت سے روگرداں کر رہا ہے — اسی لئے مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے نظرۂ ثانیہ کو مُضر جان کر "النظرۃ الثانیۃ علیک" (دوسری نظر تیرے لئے مُضر ہے) فرمایا — اس چیز سے زیادہ کونسی چیز مضر ہوگی جو حق سے باز رکھے اور باطل میں گرفتار کر دے۔ جاننا چاہیئے کہ پہلی نظر بھی اس وقت نافع ہے کہ اپنے اختیار سے نہ ہو اپنے اختیار سے ہوگی تو وہ بھی دوسری نظر کا حکم رکھتی ہے — قرآن مجید کی یہ آیت اس مطلب کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے — قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ (آپ مومنین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظروں کو پست رکھا کریں) — بیوقوف صوفیائے خام نے المجاز قنطرۃ الحقیقہ کے معنیٰ نہ سمجھ کر غلطی کی وہ حسین شکلوں میں گرفتار ہو کر اُن کے عشوہ وناز پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اس طمع میں کہ اس گرفتاری و فریفتگی کو

حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ اور حصولِ مطلوب کا زینہ بنالیں مگر یہ بات ہرگز درست نہیں ۔
یہ تو خود راہِ مطلوب میں رکاوٹ ڈالنے والی چیز ہے اور مقصود سے روکنے کے لئے زبردست آڑ ہے ـــــ ایک باطل ہے جو اُن کی نظر میں مزین ہو گیا ہے اور دھوکے میں آکر وہ اس کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں ـــــ اِن صوفیائے خام کی ایک جماعت ہے جو اِن صورتوں کے حسن وجمال کو حسنِ حق تعالیٰ سمجھ کر ان کے عشق میں مبتلا ہونے کو گرفتاری بحق جانتی ہے اور اِن صورتوں کے مشاہدے کو مشاہدۂ حق سمجھتی ہے ان میں سے بعض نے کہا ہے ۔

امروز چوں جمالِ تو بے پردہ ظاہر است[۱]
در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

اللہ تعالیٰ اُن کے اِن اقوال سے دراداالوراء ہے ـــــ اللہ تعالیٰ کو یہ کوتاہ نظر لوگ (نہ معلوم) کیا گمان کئے ہوئے ہیں اور اس کے حسن وجمال کا نہ جانے کیا تصور کئے ہوئے ہیں ....

حق تعالیٰ کی ایک تجلّی سے کوہِ طور کا پارہ پارہ ہو جانا اور حضرت کلیم اللہ علیہ السّلام کا باوجود قرب ومنزلت کے اس تجلّی سے بیہوش ہو کر گر پڑنا یہ تو نصِّ قرآنی سے ثابت ہے اور یہ لوگ اپنی اس بیوقوفی کے باوجود ہمہ وقت بے پردہ حق تعالیٰ کو دیکھنے والے ہیں اور وعدۂ رویتِ اُخروی پر حیرت وتعجب کا اظہار کرتے ہیں ـــــ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ـــــ (انھوں نے اپنے گمان میں اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور بڑی سرکشی کی) ـــــ علماءِ اہلِ سنت وجماعت نے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو قبول فرمائے ـــــ اپنی جانیں کھپائی ہیں اور براہینِ نقلی سے مخالفینِ اہلِ سنت کے مقابلے میں اثباتِ رویتِ اُخروی کیا ہے کیونکہ اہلِ سنت کے علاوہ جتنے مخالف فرقے ہیں ان میں سے کوئی بھی ـــــ چاہے وہ کوئی ملت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو ـــــ رویتِ حق تعالیٰ کا قائل نہیں ہے ـــــ بلکہ اُس کو محالِ عقلی سمجھتا ہو

---

[۱] جبکہ آج تیرا حسن وجمال بے پردہ ظاہر ہے تو مجھے حیرت ہے کہ پھر قیامت میں دیدار کا وعدہ کس لئے ہے ؟

اور خود اہل سنت بھی رویت باری تعالیٰ کو بلا کیف ہی مانتے اور کہتے ہیں نیز آخرت کے ساتھ مخصوص رکھتے ہیں اور یہ بوالہوس (صوفیائے خام) ہیں کہ اسی دنیائے فانی میں اس دولت قاہرہ کے حصول کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اپنے خیال میں مگن ہیں۔ رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ۝ (ہمارے رب ہم کو اپنی جانب سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں بہتری پیدا کر دے) والسلام علی من اتبع الہدیٰ والتزم متابعۃ المصطفے صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۶۹) قاضی موسیٰ کے نام ——— (نصیحت)

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ——— اس طرف کے فقرا کے احوال مستوجب حمد ہیں۔ جو مکتوب تم نے رحم علی درویش کے ہاتھ ارسال کیا تھا پہونچ گیا۔ خوشوقت کیا ——— خداوند کریم سلامت و با استقامت رکھے ——— مکتوب میں نصائح کو طلب کیا تھا مخدوما! بس ایک نصیحت تو دین کے متعلق ہے (کہ دین پر پورے پورے عامل رہنا) دوسری نصیحت متابعت سید المرسلین کی کرتا ہوں........ متابعت کی کئی اقسام ہیں اُن میں سے ایک قسم یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی ادائیگی کیجائے۔ باقی اقسام کا فقیر نے ایک مکتوب میں مفصل ذکر کر دیا ہے جس کو ایک دوست[۵۱] کے نام لکھا ہے ——— اُن سے کہوں گا کہ اُسکی نقل تم کو بھیج دیں ——— بالجملہ اس طریقے میں افادہ و استفادہ کا دارومدار صحبت پر ہے۔ کہنا اور لکھنا کافی نہیں ہے۔ حضرت خواجہ نقشبندؒ نے فرمایا ہے کہ "ہمارا طریقہ صحبت ہے" ——— اور اصحاب کرامؓ صحبت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت تمام اولیائے امت سے افضل ہیں کوئی ولی مرتبۂ صحابی تک نہیں پہونچ سکتا اگرچہ اویس قرنیؒ کیوں نہ ہوں (جو کہ خیر التابعین ہیں) ——— دوستوں سے دعائے سلامتیٔ ایمان کی درخواست ہے ——— "اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام کو بہتر و درست فرمائے"۔ رحم علی نے اپنے ورق زندگی کو پلٹ دیا ہے (محاسبۂ اعمال میں لگے ہوئے ہیں) اور اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہیں ——— اللہ تعالیٰ استقامت بخشے ——— والسلام

---

[۵۱] مکتوب (۵۴) بنام سید شاہ محمد ——— در دفتر دوم

قسط نمبر ۲

سید سلیمان ندویؒ
شخصیت و ماحول

سید ذوالفقار حسین بخاری ایم۔ اے (اسلامیہ کالج لائلپور)

سید صاحب نے جس دینی اور علمی فضا میں پرورش پائی اُس نے اُن کی شخصیت کے بنانے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ گھریلو ماحول، انداز تربیت اور اس کے اثرات کی ایک مثال خود سید صاحب کی زبانی سنیئے:۔

"قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی۔ میں ان بیبیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویۃ الایمان کی ایک ایک بات پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کے ایک ایک مسئلہ کی تشریح و تفسیر فرماتے اور جو وہ فرماتے وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُن میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علمِ کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے

نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ قائم رہی۔[۱]

جس زمانے میں ہوش و شعور کی آنکھ کھولی وہ بھی کچھ کم مردم ساز نہیں تھا۔ بڑی بڑی مؤثر تحریکیں اٹھ رہی تھیں اور طاقتور شخصیتیں قوم کی علمی و دینی تعمیر نو کے میدان میں اتری ہوئی تھیں۔ سید صاحب اپنے اس دور کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی تو میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھل رہی تھیں، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا تھا۔ کانوں میں دو قسم کی تحریکوں کی آوازیں دم بدم آ رہی تھیں۔ ایک سر سید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش اور دوسری علماء کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کرکے پرانی عربی تعلیم کی از سر نو تنظیم کی تحریک جن کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے اور یہ عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڑھ کی ایک عربی درسگاہ تھی جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔ اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا۔ جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے، کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں مگر میرا خاندانی ماحول اس دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اس دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی۔ اور بڑھتی گئی اور پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جزو بن گئی۔

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علمائے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی .... اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا نیا مدرسہ کھولا میرے والد مرحوم نے مدرسہ احمدیہ میں بھیجنے کا ارادہ کیا مگر

---

[۱] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص۱۰۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون "سید الملت کی مکتبی زندگی" میں دسنہ کے مشاہیر علماء اور صلحاء کا تفصیلی تذکرہ کیا ہو اس ضمن میں سید صاحب کے خاندان کے اہل علم و اہل دل کا مختصر حال بھی لکھا ہو۔ اس سے سید صاحب کے خاندانی ماحول کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا۔ اس لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی مگر ابھی اس کے داخلہ میں کچھ تاخیر تھی تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری میں مجھے رکھا گیا یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا خاصا چرچا تھا اور ہے۔ میں نے بھی اس فضا میں سانس لی اور سب سے پہلے میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہن دیکھا اس کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔[۱]

اس کے بعد سید صاحب دربھنگہ میں رہے اور آخر میں کئی برس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہے اور یہیں سے دستارِ فضیلت لے کر نکلے۔

ندوہ میں ان کو مولانا شبلی جیسی شخصیت میسر آئی جس نے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا، اور وہ بھی پھر اس کے دامن اس طرح وابستہ ہوگئے، جسے لوگوں نے استاد کی شخصیت میں اپنے آپ کو گم کر دینے سے تعبیر کیا۔

شبلی نے ان کے ادبی اور تصنیفی ذوق کو چمکایا، علم اور تحقیق کی پر پیچ راہوں سے گزرنا سکھایا، اپنے سیاسی ذہن کا ورثہ بھی انھیں دیا۔ غرض شبلی کے پاس جو کچھ تھا وہ سید صاحب کی جھولی میں ڈال دیا، لیکن خود سید صاحب کے احساس کے مطابق شبلی کا ان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سیرت پاک علیہ الصلوٰت والتسلیمات کی خدمت میں سید صاحب کو اپنا شریک بنایا اور دنیا سے جاتے وقت اس کارِ سعادت کی تکمیل بھی انھیں پر چھوڑ گئے سید صاحب راقم ہیں :-

" انھوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی تکمیل وصیت اس سرکار کائنات فخر موجودات، رحمت عالم، سید اولاد آدم محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر میں پہنچے تھے۔ سب سے اول پہنچایا، یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع، تنقید او ر تالیف و تحقیق کی خدمت ابتدا ہی میں سپرد فرمائی جو الحمد للہ یہاں اس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے اور ان شاء اللہ

[۱] جن سے میں متاثر ہوا ص۶

وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار کج رویوں کے باوجود حجاز کی بجائے ترکستان جانے کی غلطی اس سے سرزد نہیں ہوئی اور ساری علمی و عملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اس سایۂ رحمت کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا اور اس طرح سرکار مدینہؐ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہ قبول کے قابل ٹھہرا اور تلافی مافات کی توفیق سے بہرہ ور ہوا۔"[1]

سید صاحب کی شخصیت نے بلندی کی جو منزلیں اپنے استاد کی حیات ہی میں طے کر لی تھیں پھر استاد کی جانشینی، سیرت النبی جیسے عظیم کام کی بطریق احسن تکمیل اور دار المصنفین کی شہرۂ آفاق علمی کارگزاریوں نے ان کو جس رتبۂ بلند پر پہنچا دیا تھا اُس کے بعد بھی اپنے اندر کسی کمی کا احساس، تکمیل مزید کی جستجو اور اس کے لئے نئے آستانے کی نیازمندی بظاہر بعید سی بات تھی لیکن سید صاحب کی گھٹی میں جو روحانی تشنگی پڑی ہوئی تھی اور جسے سیرت نگاری نے دو آتشہ کر دیا تھا اس نے سید صاحب کی شخصیت کو ایک آخری موڑ اور دیا ہے۔ یہ موڑ تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت، جس نے شخصیت کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور یہ رنگ اضافۂ عمر کے ساتھ ساتھ گہرا ہی ہوتا چلا گیا، اسکی تفصیل[2] کا تو یہاں موقع نہیں، لیکن ایک شعر میں شاید اس کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، ترے فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

دل کی اس نئی مشغولیت اور نئی لذت کا اثر آپ کے علمی اور تصنیفی کاموں پر پڑنا ناگزیر تھا لیکن یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے کہ تصوف نے سید صاحب کو علمی اور تصنیفی

---

[1] حیات شبلی صد ۱۱-۱۲

[2] ہم "سوانح حیات" میں اس کی طرف تھوڑا سا اشارہ کر آئے ہیں۔ زیادہ تفصیل کے لئے تذکرہ سلیمان، مرتبہ غلام محمد صاحب ملاحظہ فرمائیں۔

کام کا نہ رکھا۔ حقیقت میں وہ کچھ خاص حالات تھے اور پھر تقاضائے عمر جس نے سید صاحب کو رفتہ رفتہ ان مشاغل سے یکسو کر دیا، ورنہ حیات شبلی تو بیعت کے بعد ہی منصۂ شہود پر آئی ہے رسالہ معارف میں بھی کچھ عرصہ تک آپ کا قلم حسب سابق گوہر لٹاتا رہا، علاوہ ازیں اگر تصوف کا یہی اثر ہوا کرتا تو حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کارنامے کیوں کر وجود میں آجاتے اور خود مرشد تھانوی کیونکر اس قدر تصانیف یادگار چھوڑتے؟

بیعت سے پہلے سید صاحب اپنے کو سلفی کہلانا پسند کرتے تھے، اصولی طور پر فقہ میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن القیم کے مسلک کی طرف رجحان تھا۔ عملی طور پر تقریباً حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم مسلک تھے۔ لیکن بیعت کے بعد پوری طرح حنفیت کی طرف میلان ہو گیا اور اپنے مرشد کے اتباع میں اپنے آپ کو ایک عامی مقلد کے درجہ پر رکھنے لگے۔[1]

اب چند معاصرین کے بیانات میں علامہ سید سلیمان کی شخصیت کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:۔

"کسی فن میں کامل یا نامور ہونا اور بات ہے اور اس کا حقیقی ذوق اور اس میں شغف اور انہماک دوسری بات ہے۔ اپنی اس مختصر علمی زندگی میں اکثر یہ دیکھا کہ اکثر لوگ خاص ماحول، خاص اوقات میں صاحب علم اور صاحب ذوق نظر آتے ہیں باقی اوقات میں ان میں کوئی علمی دلچسپی، شوق مطالعہ، جستجو اور کتابی ذوق نظر نہیں آتا، درحقیقت ان میں طالب علمانہ روح نہیں ہوتی۔ اس بارہ میں میں نے دو شخصیتوں کو مستثنیٰ پایا۔ ایک مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی اوّل الذکر کو کم دیکھا .... لیکن سید صاحب کو خوب دیکھا سفر و حضر میں رفاقت رہی اور کئی کئی دن مسلسل ساتھ رہنا۔ ان کا علمی ذوق ہر جگہ اور تقریباً ہر وقت قائم رہتا، مطالعہ، غور و فکر، علماء اہل فن سے تبادلۂ خیال اور بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہتا، وہ فطرتاً طالب علم تھے اور ان کا لازمۂ زندگی

---

[1] مکاتیب سلیمانی ج۱ ص۵۲ ایضاً ص۱۵

تھا۔ بیماری میں بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا، دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے لیکن قدیم
و جدید حلقوں میں اب جو علمی بے تعلقی و بے ذوقی بڑھتی جارہی ہے اس کے پیش نظر
کسی زمانہ میں یادگار بات ہوگی۔[۵۱]

سیّد صاحب کی ایک دوسری صفت کا اظہار بھی مولانائے موصوف نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان اور بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ
سے قریبی واقفیت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسا جامع اوصاف
اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذہن نہیں دیکھا۔"[۵۲]

علمی انہماک کے باوجود ان کی طبیعت کی شگفتگی قائم تھی۔ عبدالمجید صاحب سالک لکھتے ہیں :-

"جن لوگوں کو مولانا سے ملنے کا کم اتفاق ہوا ہے وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا بالکل
خشک مُلّا ہوں گے اور اُن کے چہرے پر کبھی تبسم کی چھاپ نظر نہ آتی ہوگی۔ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ مولانا نہایت شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ اُن کی ظرافت میں حسن و لطافت کا
رنگ تھا۔"[۵۳]

مولانا محمد اویس صاحب ندوی فرماتے ہیں :-

"سید صاحب لطف و مزاح کی باتیں بھی خوب کرتے تھے۔"[۵۴]

سیّد صاحب میں اخلاق بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ سالک صاحب لکھتے ہیں :-

"ہرزہ گوئی سے اپنی زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں پر
بے حد شفیق تھے جہاں تک امکان عمر بھر کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ اختلاف کی صورت
میں خلق محمدی سے کام لیتے اور سخت سے سخت بات نرم سے نرم الفاظ میں کہتے۔"[۵۵]

---

۵۱ قومی آواز لکھنؤ ۳۰ نومبر ۱۹۵۳ء ۵۲ ایضاً ۵۳ "ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۰ سالک صاحب
نے آگے سید صاحب کے لطیف مزاح کی مثالیں بھی دی ہیں۔ ۵۴ ریاض سید سلیمان ندوی نمبر صفحہ ۵۵ اویس صاحب
نے بھی ... ... سید صاحب کی لطف و مزاح کے واقعات نقل کئے ہیں۔
۵۵ "ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۰

سیّد صاحب کے اخلاق و مروت، شرافت و وسیع القلبی اور عفو و درگذر کے بیسیوں واقعات ہیں۔ ہم یہاں چند واقعات نقل کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی صاحب نے سید صاحب کے محبوب استاد علامہ شبلی پر جس انداز سے تنقید کی اور سید صاحب کے ساتھ ان کی جس طرح علمی چشمک رہی اس کا اہل علم حضرات کو بخوبی علم ہے مگر سید صاحب کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا اس کا ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب راوی ہیں:۔

"ایک مرتبہ شیرانی صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے .... سید صاحب نے آپ کی اپنے خاص انداز میں پرتکلف دعوت بھی کی۔ جب لاہور واپس آئے شیرانی صاحب نے بسبیل تذکرہ اس دعوت کا حال سنایا۔ اس کے بعد اکثر میں نے شیرانی صاحب کو شعرالعجم کی تنقید جاری رکھنے پر اکسایا مگر وہ یہی کہہ کر ٹال دیتے کہ یہ پٹھان (شیرانی) سیّد کی روٹیاں کھا آیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اعلیٰ اخلاق کی تعریف بھی ہمیشہ کرتے"[۵۱]

شیرانی صاحب کی وفات پر اُن کے اوصاف کا سید صاحب نے ان الفاظ میں ذکر کیا:۔

"مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے۔ ان کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا......... مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا...... حافظِ قرآن تھے یہ خود ایک بڑی نعمت ہے اور وسیلہ مغفرت"[۵۲]

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:۔

"سید الطائفہ کی دوسری بڑی خوبی ان کی علمی شرافت، وسیع القلبی ہے۔ ان کی علمیت کے خلاف سب سے مؤثر نشتر مہدی حسن کے خطوط میں ملیں گے لیکن آپ مکاتیبِ مہدی اٹھا کر دیکھیے ان خطوط کے شروع میں تعریفی دیباچہ سید سلیمان کا اپنا ہے۔ اسی طرح شبلی کے اندازِ طبیعت پر پہلی بلیغ اور نکتہ پرور ضرب "شبلی اور حالی کی معاصرانہ

---

۵۱ اردو ادب علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۶-۵ مرتبہ آل احمد سرور۔

۵۲ معارف سلیمان نمبر صفحہ ۲۳

چشمک" والے مضمون میں لگائی گئی لیکن یہ مضمون سب سے پہلے سید سلیمان نے معارف میں شائع کیا۔ سید صاحب کی سیرت میں ایک پاکیزگی اور درویشی ہے۔ شبلی کے کیریکٹر کا خم و پیچ نہیں۔"[1]

سید صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود خط کا جواب دینا اپنا اخلاقی فرض جانتے تھے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا مسعود عالم ندوی سے خط و کتابت شروع ہوئی تو آخر تک قائم رہی۔[2] یہی حال دوسرے علما و ادبا سے تعلقات کا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:۔

"آپ ہمیشہ خط کا جواب نہایت پابندی سے دیتے خواہ کبھی حالات کے اعتبار سے دیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔"[3]

سید صاحب کی شخصیت جن مختلف النوع عوامل سے پروان چڑھی ان میں ایک بڑا عنصر ان کے انسانی پہلو کا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی لکھتے ہیں:۔

"شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابل احترام تھی۔ ان کو دیکھ اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رسوا نہ کریں گے۔ اور جب تک ساتھ رہیں گے زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی۔"[4]

سید صاحب کی شخصیت کے ایک اور رخ کی طرف بھی رشید صاحب نے بڑا لطیف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے فرائض غصب کر کے اپنی ضیافت و حکم برداری میں نہیں لیتے تھے جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرنا اور اصرار کرتا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو وجہ بتائے تو یہ

---

[1] موج کوثر ص۲۶۔ [2] مولانا دریابادی سے مسلسل چالیس سال اور مولانا ندوی سے اٹھائیس سال تک مستقل خط و کتابت رہی۔ [3] اردو ادب ص۹۔ [4] ہم نفسان رفتہ ص۱۰۴۔

تعزیت کی ریزولیوشن پاس کریں یا کوئی چورن تجویز کریں .... میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے .... میں نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے اور دونوں اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اترے ہیں سید صاحب کی جو بڑائی میرے دل میں ہے اس میں سید صاحب کی اس خوبی کا خاصہ اونچا درجہ ہے" [۵۱]

ایک اور خوبی کی طرف یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ :-

"لباس، بستر، سازوسامان صاف ستھرا اور سجل رکھتے تھے" [۵۲]

سید صاحب نے اپنے استاد سے جس اخلاص اور وفاداری کا معاملہ کیا تھا قدرتی طور سے اسی کی توقع وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بھی کرتے تھے، چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی کو لکھتے ہیں :-

"آپ کو معلوم ہے کہ میں نے استاد مرحوم کے ساتھ جس طرح ظاہری و معنوی وفا کی اور ان کی رائے کے آگے اپنی رائے کو فنا کر دیا تھا ایسی ہی توقع مجھے اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے بھی ہو تو تعجب نہیں" [۵۳]

شاہ معین الدین احمد ندوی کو تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ سے ایک فرمائش کو جی چاہتا ہے جس طرح میں نے اور مولوی عبدالسلام صاحب نے حضرت الاستاذ کی ایک ایک تحریر کو زندہ کیا آپ صاحبان میرے مضامین و مقالات کو بہ ترتیب جمع کرتے کہ اب میری زندگی ان ہی اوراق سے عبارت ہے۔ ۲۳ صفر کو میری عمر قمری حساب سے انہتر سال کی ہوگی۔ رہے نام اللہ کا" [۵۴]

انہی شاہ صاحب کو ایک دوسرے گرامی نامے میں لکھتے ہیں :-

---

۵۱ ہم نفسان رفتہ ص ۴۶-۲۴۷ ۵۲ ایضاً ص ۲۴۴ ۵۳ مکاتیب سید سلیمان ندوی ص ۱۴۰
۵۴ مکتوب نمبر ۳ معارف فروری ۱۹۵۸ء

"حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو رہے ہوں خلف رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے اور اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی کہ بعد کے کام کے لئے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا۔"[1]

دیکھئے سید صاحب کے اخلاف واحباب ان کی یہ عزیز خواہش کب پوری کرتے ہیں؟

(تمام شد)

[1] مکتوب نمبر ۲ معارف فروری ۱۹۵۷ء

جب خدا کا کنبہ قحط سے دوچار ہو؟

اسلامی تاریخ اور اسلام کی تعلیم!

محمد منظور نعمانی

[آج ملک میں غذائی گرانی کا تقریباً وہی حال نظر آرہا ہے جو دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ میں رونما ہوا تھا۔ ذیل کا مضمون اسی زمانہ کی یادگار ہے جس کی اس وقت مکرر اشاعت مناسب معلوم ہوئی ——— نعمانی]

اب سے تقریباً چار ہزار برس پہلے جبکہ بظاہر ایک عجیب وغریب "اتفاق" ہی کے طور پر اور فی الحقیقت خداوند قادر وقدوس کی بیچون وچگوں قدرت، اور شانِ "فعال لما یرید" کی جلوہ فرمائی کے نتیجہ میں حکومت مصر کی باگ سیدنا یوسف صدیق علیہ وعلیٰ آبائہ الصلوٰت والتسلیمات کے ہاتھ میں آگئی تھی اور مصری حکومت جبکہ انہی کے تحت اقتدار تھی، تو سنا ہوگا کہ اس زمانہ میں مصر میں ایک شدید قحط پڑا تھا جو سات سال تک مسلسل رہا تھا، ان سات سالوں میں سرزمین مصر بارش اور پیداوار سے بالکل محروم رہی اور خشکی کا اثر یہاں تک پڑا کہ دودھ دینے والے جانوروں کے تھن بھی خشک ہوگئے، رسل ورسائل کے جو ذرائع اور حمل ونقل کے جو وسائل آج انسان کے ہاتھ میں ہیں جن کے ذریعہ ہر قسم کی ضروریات زندگی اور سامان معیشت کی درآمد برآمد ایک ملک سے دوسرے ملک کو بہ آسانی ہوسکتی ہو۔ اس وقت انسان ان سے بھی تہی دست تھا، ایسی حالت میں جس ملک پر سات سال تک اتنا سخت قحط مسلط رہے وہاں کے آدمیوں پر جو کچھ بھی نہ گزر جائے اور جتنے بھی ان میں سے بھوکوں نہ مرجائیں بعید از قیاس نہ ہوگا ——— لیکن سیدنا یوسف صدیق کی خدا ترسی مخلوق خدا کی سچی ہمدردی اور رعیت کی راحت رسانی کے متعلق اپنی حاکمانہ ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ ان کی خداداد خوش تدبیری اور مآل اندیشی نے مل جل کر ایسا نظم قائم کیا کہ نہ صرف قلمرو مصر کے رہنے والوں کو، بلکہ آس پاس کے دوسرے قحط زدہ ملکوں کے باشندوں کو بھی بلا امتیاز ملک ونسل اور بلا لحاظ

مذہب وملت خوش حالی اور تمت کے سالوں کی طرح ہی غلہ ملتا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت صدیقی کے دور میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا جس نے بہت سے بندگان خدا کو فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ حضرت عثمان ذوالنورین اس وقت مدینہ کے درجہ اوّل کے تاجروں میں تھے اور آج کل کی اصطلاح میں سمجھئے کہ اس وقت کی چھوٹی سی اسلامی حکومت کے گویا وزیر مال بھی تھے، غلہ سے لدے پھندے آپ کے ایک ہزار اونٹ شام سے آئے، مدینہ کے غلہ فروشوں کو جیسے ہی اس مال کی آمد کی خبر ہوئی وہ خریداری کے لئے حضرت عثمان کی خدمت میں پہونچے بھاؤ تاؤ شروع ہوا، سب نے اپنی اپنی بولی بولی لیکن حضرت عثمان برابر یہی کہتے رہے کہ مجھے اس سے زیادہ ملتا ہے، آخر میں مدینہ کے ان سوداگروں نے کہا کہ مدینہ کے دوکاندار تو سب یہاں موجود ہیں اور سب اپنی اپنی بولی بول چکے اور اپنے اپنے اندازہ کے مطابق سب ہی قیمت لگا چکے، آخر اس سے زیادہ دام کون لگا رہا ہے؟

حضرت عثمان نے کہا کہ وہ اللہ ہے جس کا وعدہ ایک کے بدلے دس یا اس سے بھی زیادہ دینے کا ہے، تم سب گواہ رہو کہ میں نے یہ سارا غلہ اس کے لئے اور اسی کے حساب میں ناداروں، غریبوں اور حاجتمندوں کو دیدیا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان کے ان ایک ہزار اونٹوں نے مدینہ کے غربا و فقرا کی ساری پریشانی اس وقت کی دور کردی۔

سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی ایک سال عرب بھر میں سخت قحط پڑا تھا جس کا نام ہی تاریخ میں "عام الرمادہ" ہے۔ حضرت عمر نے خلق خدا کو اس قحط کی مصیبت سے بچانے کے لئے ایک طرف تو شام اور مصر سے غلہ منگوانے کا انتظام کیا، (چنانچہ حضرت ابو عبیدہ نے جو اس وقت شام کے حاکم اعلیٰ تھے چار ہزار اونٹ غلہ سے لدوا کر بھیجے اور مصر کے حاکم اعلیٰ عمرو بن عاص نے غلہ کی تیس کشتیاں بحری راستہ سے روانہ کیں) دوسری طرف آپ نے یہ کیا کہ بیت المال (سرکاری خزانہ) میں اس وقت جتنا کچھ روپیہ جمع تھا آپ نے وہ سب مدینہ کے ناداروں اور غریبوں میں تقسیم کرا دیا اور بیت المال کو بالکل خالی کر دیا جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ خلق خدا فاقوں مرنے کی مصیبت سے بچ گئی اور اللہ کے بندے قحط کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے۔

یہ سب کچھ تو آپ نے عام پبلک اور عام رعایا کے لئے کیا، لیکن دُنیا حیرت میں رہ جائے گی جب اس کو یہ معلوم ہوگا کہ خود فاروق اعظم نے اس قحط کے زمانہ میں گھی، گوشت اور گیہوں تک کا استعمال قطعی ترک کردیا تھا، کیونکہ اس وقت پبلک کے غریب طبقہ کو یہ چیزیں عام طور سے میسّر نہ تھیں، اس زمانہ میں آپ کی اپنی غذا جَو کی روٹی ہوتی تھی جس کے ساتھ بجائے گھی کے کبھی کبھی زیتون کا تیل استعمال کیا جاتا تھا، طبیعت اس غذا کو آسانی سے قبول نہ کرتی تھی جس کی وجہ سے گاہ گاہ معدہ میں تکلیف بھی ہوجاتی تھی۔ ایک دن آپ نے اپنے نفس سے خطاب کرکے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اپنے عام بندوں سے اس قحط کو دور نہ فرمادے گا تجھ کو اس غذا کے سوا کچھ نہ مل سکے گا۔

ناقلین آثار کا بیان ہے کہ اس قحط میں فاقوں کی کثرت اور ناموافق غذا کے استعمال ہی سے آپ کا رنگ بھی سیاہ پڑ گیا تھا۔

بہرحال اپنے اوپر آپ نے ہر قسم کی مصیبت جھیلی اور اپنے معیارِ زندگی اور اپنی خوراک کو آپ نے ادنیٰ درجہ کے غریبوں اور فقیروں کے درجہ پر اُتار لیا لیکن عام رعایا بالخصوص اس کے ناداروں اور غریبوں کو قحط کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے سب کچھ کیا یہاں تک کہ سارا سرکاری خزانہ ہی ان پر تقسیم فرمادیا۔ ورنہ عرب جیسے غیر زرعی اور دنیا سے کٹے ہوئے خطہ کا ایسے سخت قحط میں جو حال ہوتا اور وہاں کے باشندوں پر جو کچھ گزرتی اس کا اندازہ ہر ایک کرسکتا ہے۔

یہ تین مثالیں ہیں اللہ کے صالح بندوں کے طرز حکومت اور ان کے طریقہ جہانبانی کی۔ اور عوام کے غذائی مسئلہ کے بارہ میں ان کے احساس ذمہ داری کی۔

موجودہ صورت حال

خدا کے فضل سے ہمارے ملک میں اس وقت قحط نہیں ہے، پیداوار جیسی ہمیشہ ہوتی تھی بحمداللہ ویسی ہی یا اُس سے کم و بیش گزشتہ چند سالوں میں بھی ہوتی رہی ہے۔ اسکے علاوہ لاکھوں ٹن غلہ

دوسرے ملکوں سے آتا رہا ہے اور آرہا ہے لیکن غلہ کی تجارت کے اجارہ داروں کی ہوسِ زر نظامِ حکومت کے ڈھیلے پن نے باہم ملکر صورت حال ہزار قحطوں سے بدتر کردی ہے۔ اللہ کی پناہ مہینوں سے گیہوں بازار میں قریباً ایک سیر مل رہا ہے قریب قریب یہی حال چاول کا ہے۔

ذرا سوچئے! ہم میں کتنے گھر ایسے ہیں جن میں میاں بیوی اور اللہ کے دئیے دو دو چار چار بچے بھی ہیں، اور آمدنی بس پچاس ساٹھ روپے ماہوار[1] یا اس سے بھی کم! ظاہر ہے کہ بحالت موجودہ ایسے گھرانوں میں دن رات کے آٹھ پہروں میں ایک وقت کے لئے بھی پورا کھانا نہیں جڑ سکتا ہوگا۔ اللہ ہی جانتا ہے اور وہی جان سکتا ہے کہ ہمارے ہزاروں لاکھوں ایسے غریب بھائیوں کے دن رات آج کل کس طرح کٹتے ہوں گے، بھوک سے نڈھال بیوی کی اُداس صورت دیکھکر غیرتمند شوہروں پر کیا گزرتی ہوگی، پھر دن رات میں کئی کئی دفعہ معصوم بچوں کا بلکنا دیکھ دیکھ کر ماں باپ کے دلوں کا کیا حال ہوتا ہوگا، پھر ان المناک حالات سے کسی ایک کی ڈبڈبائی آنکھیں دوسرے کے دل پر کیا قیامت ڈھاتی ہوں گی؟

یقیناً ہمارے ناظرین میں سے اکثر کو اندازہ ہوگا کہ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ وہ حقیقی حالات ہیں جن سے لاکھوں بندگانِ خدا آج دوچار ہو رہے ہیں، العظمۃ للہ! کیا سخت وقت ہے اُن بیچارے شریف اور باغیرت غریبوں کے لئے جو اپنی فطری غیرت اور عزتِ نفس کے باعث کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہو سکتے، بلکہ کسی سے اپنی یہ حالتِ زار کہہ بھی نہیں سکتے۔

ان مصائب کا صحیح مداوا تو جب ہی ہو سکتا تھا کہ حکومت کا نظام کسی "یوسف"، کسی "ابوبکر" کسی "عمر" یا کسی "عثمان" کے ہاتھ میں ہوتا لیکن اپنے اور دنیا کے موجودہ حالات میں تو اس کی آرزو کی بھی گنجائش نہیں ہے ــــــــ اس لئے اب جو کچھ ذمہ داری ہے وہ ہم ہی جیسے لوگوں کی ہے جو اللہ کی عنایت سے خود زیادہ حاجتمند نہیں ہیں اور اپنے غریب تر بھائیوں کی کچھ تھوڑی بہت مدد کسی نہ کسی طرح سے کر سکتے ہیں۔

اس گئی گزری حالت میں بھی ہم میں بہت زیادہ نہ سہی، پھر بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ابھی موجود ہے جن کے ذرائع آمدنی ان کی عام ضروریات سے زیادہ ہیں اور اسلئے اپنی

---

[1] یاد رہے کہ یہ تیس برس پہلے کا زمانہ ہے۔

بھی خاصی بسر اوقات کے علاوہ ان کے پاس کم یا بیش کچھ فاضل سرمایہ بھی رہتا ہے ——— ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ہم میں بحمد اللہ ابھی ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اگرچہ اصطلاحی سرمایہ دار یا دولتمند تو نہیں ہیں لیکن خوش حالی کے ساتھ گزارا کرتے ہیں اور ان کے حالات میں اتنی گنجائش ہے کہ اپنے مصارف میں کچھ تخفیف کر کے اپنے گزارہ سے کچھ بچا بھی سکتے ہیں۔

اس نازک وقت میں حسب حیثیت ان دونوں طبقوں کا خصوصی فرض ہے کہ ان کے عزیزوں قریبوں، ان کے پڑوسیوں، اور ان کی بستی کے رہنے والوں میں جو بھی حاجتمند ان کے علم میں ہوں اور جن لوگوں کے متعلق بھی وہ یہ جانتے ہوں کہ ان کی آمدنی ان کے گزارہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، جس طرح اور جتنی بن پڑے وہ ان کی مدد کریں اور ان کا کچھ بار اپنے ذمہ لیں۔

یوں تو ہر وقت اور ہر زمانہ کے صدقہ میں اللہ پاک کے یہاں بڑا اجر ہے لیکن بالخصوص ایسے سخت وقت میں تو اس کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ سے معلوم ہوتا ہے۔

اس ناچیز کو تو یقین ہے کہ اس وقت اللہ پاک کی رضا حاصل کرنے، اس کے قہر و غضب سے بچنے، آتشِ دوزخ سے رہائی اور داخلۂ جنت کا استحقاق پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ اللہ کے حاجتمند اور نادار بندوں کی ہمدردی و غمخواری اور ان کی امداد و اعانت ہو۔ اس کارِ خیر کے لئے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے ذخیرہ میں جو ہزارہا ترغیبات وارد ہوئی ہیں، اپنے ناظرین کی ترغیب کے لئے ان میں سے چند یہاں بھی درج کی جاتی ہیں۔ اللہ کرے کہ قارئین کرام کے دل ان آیات و احادیث سے متاثر ہوں اور اس باب میں اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق ہم سب کو ملے۔

راہِ خدا میں دینے کی تاکید و ترغیب قرآن میں

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے ایمان والو! ہمارے دیئے ہوئے دھن دولت میں
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ	سے نیکی کی راہوں میں خرچ کرو اس یوم الفصل
لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ	اور یوم الجزا کے آنے سے پہلے جبکہ نہ کسی قسم کی
(بقرہ ۳۴)	

خرید و فروخت ممکن ہوگی اور نہ دوستی اور سعی سفارش سے ہی کام چل سکے گا۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاۗءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (منافقون ع ۲)

اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے (نیکی کی راہوں میں) خرچ کر لو اس سے پہلے کہ آدبائے تم میں سے کسی کو موت پھر اس وقت وہ حسرت وافسوس سے کہنے لگے کہ خداوندا کیوں تونے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں کچھ صدقہ وخیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا اور فیصلہ ہو چکا ہے کہ) اللہ ہرگز کسی کو (ایک لمحہ کی بھی) مہلت نہ دیگا جب اس کا وقت آجائے گا اور اللہ پاک خوب باخبر ہے تمہارے عملوں سے۔

وعدہ و بشارت!

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَـنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ ع ۳۶)

جو لوگ راہ خدا میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان (کے اس عمل) کی مثال ایک ایسے دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں پیدا ہوئی ہوں اور ہر بال میں سَو سَو دانے ہوں اور اللہ بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے وہ گنجائش وکشایش رکھنے والا ہے اور علیم کل ہے (تو اپنے کمال علمی سے وہ جانتا ہے کہ کون میری راہ میں صرف میرے ہی لئے اور اخلاص سے خرچ کرتا ہے ——— اور اس کی بے پناہ وسعت وگنجائش کی وجہ سے ایک دانہ کے بدلہ میں سات سو دانے دے دینا یا اس پر بھی اضافہ کر دینا اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (لیل ع ۱)

اور دوزخ کی آگ سے وہ پاکباز اور پرہیزگار بچایا جائیگا جو پاکیزگی کیلئے (راہِ خدا میں) اپنا مال دیتا ہو۔

صدقہ و خیرات کرنے والے گویا خدا کو قرض دیتے ہیں

راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے صدقات کو گویا اپنے اوپر قرض قرار دیا ہے اور خود کو ان کا مقروض بنا کر ان کا درجہ بلند کیا ہے یقیناً انسان کے لیے اس سے زیادہ کسی بلند مقام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (حدید ع)

اللہ کے جو بندے اور بندیاں صدقہ کرتے ہیں اور اللہ کو قرض دیتے ہیں اُن کیلئے بہت کچھ بڑھایا جائیگا اور انکو عزت والا صلہ ملیگا۔

کہیں حکم کی صورت میں ارشاد ہے:۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (مزمل ع)

اور اے اللہ کے بندو! اللہ کو قرض حسن دو۔

کہیں خود "سوالی" بن کر ترغیبی انداز میں صدا دی جاتی ہے:۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (بقرہ ع ۳۲)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو اللہ اسکو بہت گنا کرکے دے گا۔

راہ خدا میں خرچ نہ کرنیوالوں کو نہایت دردناک لرزہ خیز عذاب کی وعید

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (توبہ ع ۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی (مال و دولت) کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور راہ خدا میں اس کو خرچ نہیں کرتے ہیں۔ اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دی جائے جبکہ ان کی اس مایہ کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں ان کی کروٹیں ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور

کہا جائے گا) یہ ہے تمہارا وہ مال جسکو تم نے
اپنے ہی لیے سینت سینت کے رکھا تھا، لو
اب اپنے اس اندوختہ کا مزہ چکھو۔

چند احادیث نبویہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْفِقْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَيْكَ۔ (بخاری مسلم مشکوٰۃ)

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے کہ آدم کے فرزندو! تم میری راہ میں خرچ کرو میں تمکو وسعت سے عطا کیے جاؤنگا

حضرت انس سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ (ترمذی مشکوٰۃ)

صدقہ اللہ کے غضب اور اسکے قہر وجلال کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت کو دور کرتا ہے۔ (یعنی صدقہ وخیرات کرنیوالا بندہ بری موت نہیں مرتا بلکہ موت کے وقت اس پر رحمت ومقبولیت کے آثار ہوتے ہیں، اور یہ اس عاجز کا مشاہدہ بھی ہے)

مرثد بن عبداللہ بعض صحابۂ کرام سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا:۔

اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ صَدَقَتُهٗ۔ (مسند احمد مشکوٰۃ)

قیامت کے دن مومن کے سر پر اس کے صدقہ کا سایہ ہوگا۔

ایک اور حدیث میں عقبہ بن عامر سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ عَنْ اَهْلِهَا حَرَّ الْقُبُوْرِ وَاِنَّمَا يَسْتَظِلُّ الْمُؤْمِنُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْ ظِلِّ صَدَقَتِهٖ

صدقہ قبر کی گرمی کو ٹھنڈا کردے گا اور مومنین قیامت کے دن اپنے صدقہ ہی کے سایہ میں ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ايما مسلم كسا مسلماً ثوباً على عرىٍ

جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو کپڑا پہنائے گا

کساہ اللہ من خضر الجنۃ وایما	تن ڈھانکے گا اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں
مسلم اطعم مسلماً علیٰ جوع اطعمہ	جنت کا سبز خلعت پہنائے گا، اور جو مسلمان
اللہ من ثمار الجنۃ وایما مسلم	اپنے بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے
سقی مسلماً علیٰ ظمأ سقاہ اللہ	گا اللہ اس کو جنت کے میوے اور پھل عطا
من الرحیق المختوم ۔	فرمائے گا، اور جو مسلمان کسی پیاسے مسلمان کو
(رواہ ابوداؤد ۔ مشکوٰۃ)	پانی پلائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی مہربند
	شراب طہور سے سیراب فرمائے گا ۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

من کان فی حاجۃ اخیہ کان	جو شخص اپنے کسی بھائی کی کوئی حاجت پوری
اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن مسلم	کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اسکی ضروریات
کربۃً فرج اللہ عنہ کربۃً من	کی کفالت فرماتا رہیگا اور جو شخص اپنے بھائی
کربات یوم القیٰمۃ ۔	کی کوئی مصیبت دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت
(بخاری و مسلم ۔ مشکوٰۃ)	کی کوئی سخت ترین مصیبت اس سے دور فرما دیگا ۔

ایک اور حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے وارد ہوا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا	دوسروں پر جو ترس کھانے والے اور رحم
من فی الارض یرحمکم من فی السماء	کرنے والے ہیں اللہ ان پر رحم کریگا۔ لوگو! تم
(ابوداؤد ۔ ترمذی ۔ مشکوٰۃ)	زمین والوں پر رحم کرو تم پر رب السماء
	رحم فرمائے گا ۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے :۔

من لا یرحم لا یرحم	جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا ۔

اللہ کے بندو !

اگر چاہتے ہو کہ رب العرش تم پر رحمت فرمائے، تم اسکے غضب اور عذاب سے محفوظ رکھے جاؤ اور

اسکے دار رحمت (جنت) میں تم جگہ پاسکو تو بالخصوص اس سخت وقت میں کمزوروں، غریبوں اور آفت رسیدوں پر رحم کھاؤ، ان کی امکانی مدد کرو، یقیناً انشاء اللہ خدا کی رحمت سے نوازے جاؤ گے۔
میرا اندازہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص بھی آج تجسس کی نگاہ ڈالے گا تو اسکو معلوم ہوگا کہ ہمارے عزیزوں قریبوں اور دائیں بائیں رہنے والے پڑوسیوں میں اسوقت کتنے ہی ایسے ہیں جو ازراہ عفت وعزت نفس ہمارے سامنے دست سوال دراز نہیں کر سکتے ہیں، بلکہ اپنی مصیبت اور بپتا ہم سے چھپاتے ہیں اسلئے ہم انکی قابل رحم حالت سے واقف بھی نہیں ہو سکتے حالانکہ ان کے بچوں پر مسلسل فاقے گزر جاتے ہیں ـــــ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لیس المومن بالذی یشبع وجارہ	وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود اطمینان سے پیٹ
جائع الی جنبہ (شعب الایمان بمشکوٰۃ)	بھر کے کھائے درانحالیکہ اس کا پڑوسی بھوکا
	ہو اور اس کے گھر میں فاقہ ہو۔

ہم میں سے جو صاحب اولاد ہوں وہ ذرا سوچیں کہ اگر خدانخواستہ ہماری اولاد پر ایسا برا وقت آپڑے اور کوئی اللہ کا بندہ ان پر رحم کھا کے ان کی خبر لے اور ان کو فاقوں کی مصیبت سے بچا لے تو ہمارے دل میں اسکے لیے کتنی جگہ ہوگی ـــــ بلاشبہ جو لوگ اللہ کے غریب حاجت مند بندوں فقراء ومساکین کی ایسے وقت میں خبر لیں، ان پر رحم کھائیں اور انکی مدد کریں یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی قدر کرے گا اور ان کے اس حسن عمل کا اچھا بدلہ دے گا۔
حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق	ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے تو جو شخص
الی اللہ من احسن الی عیالہ۔	اسکے کنبہ (یعنی اسکی مخلوق) کے ساتھ زیادہ
(شعب الایمان بمشکوٰۃ)	اچھا سلوک کرے وہی اس کو زیادہ پیارا ہے۔

اللہ کے غریب بندوں کو آج کل سب سے بڑی مصیبت بھوک کی ہے اور افضل ترین صدقہ بالخصوص ان ایام میں بھوک کے مصیبت زدوں کو غلہ یا روٹی مہیا کر دینا ہے، حدیث میں وارد ہوا ہے:۔

افضل الصدقۃ ان تشبع کبدا	صدقات میں سب سے افضل یہ ہے کہ تم کسی بھوکے
جائعاً۔ (شعب الایمان بمشکوٰۃ)	کا پیٹ بھروا دو۔

ایک ضروری ہدایت

اللہ پاک اپنے جن بندوں کو اس کارِ خیر کی توفیق دے ان کو یہ بات ضرور ملحوظ رہنی چاہیے کہ ان کی مدد اور ان کی خبرگیری کے سب سے زیادہ مستحق وہ شرم وحیا والے لوگ ہیں جو اپنی مصیبت اور فقروفاقہ کو عام طور سے لوگوں پر ظاہر نہیں کر سکتے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے جو "فقیر" کہلانے والے گداگری کرتے ہیں اور مانگنا جن کا پیشہ ہو ان کے متعلق تجربہ یہ یقین دلا چکا ہو کہ دراصل وہ حاجتمند نہیں ہوتے ہیں اور ان کو کبھی فاقہ کی نوبت نہیں آتی ہو۔ ایک حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

لیس المسکین الذی تردہ اللقمۃ	اصلی مسکین وہ نہیں ہو جو در در سے ایک لقمہ
واللقمتان والتمرۃ والتمرتان ولکن	دو لقمے یا کھجور کا ایک دانہ دو دانے لے کر
المسکین الذی لایجد غنی یغنیہ	چلا جاتا ہے بلکہ حقیقی مسکین وہ ہیں جن کے
ولا یُفطن بہ فیتصدق علیہ ولا	پاس ان کی ضروریات پوری کرنے کے بقدر
یقوم فیسأل الناس۔	پیسے بھی نہیں، اور نہ ان کی ظاہری حالت
(بخاری مسلم)	ایسی ہو کہ آسانی سے کسی کو ان کی حاجتمندی

معلوم ہو جائے اور ان کی مدد کر دی جائے۔ اور نہ وہ جیسے پھر کر لوگوں سے مانگ ہی سکتے ہیں (تو حقیقی مسکین ایسے ہی لوگ ہیں اور یہی ہماری امداد و اعانت کے اصلی مستحق ہیں)

اس لیے اپنی مدد و خبرگیری کے لیے ایسے ہی اللہ کے بندوں کی تلاش و جستجو کیجئے جو پیشہ ور سائل نہیں ہیں اور جو اپنی حاجات بھی ہر ایک سے نہیں کہہ سکتے۔

قرآن مجید میں ایسے باغیرت باعفت اصحاب حاجت کا ذکر بڑے پیار سے کیا گیا ہو، ارشاد ہے:۔

یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ	ان کے سوال نہ کرنے اور عفت کی زندگی
التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا	گزارنے کی وجہ سے ناواقف ان کو ضرورتمند
يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔	نہیں سمجھتا بلکہ انکو خوشحال گمان کرتا ہو مگر

تم ان کے چہروں میں افلاس و فاقہ زدگی کے آثار دیکھ کر ان کو پہچان سکتے ہو، وہ خود کسی کے

آگے ہاتھ پھیلا کر اور اپنا حال زار بیان کر کے سوال نہیں کرتے ہیں۔

بہرحال مدد اور خبرگیری کے سب سے زیادہ مستحق اللہ کے ایسے ہی بندے ہیں اور آج کل اُجلے پوش شریفوں میں ایسے غریب حاجتمند بکثرت موجود ہیں، ہمارا فرض ہو کہ ہم انکی خبر لیں، اور اگر بالفرض ہم خود اس قابل نہیں ہیں تو کم از کم دوسروں سے اُن کی امداد کرانے میں سعی کریں، حدیث پاک میں ہے:۔

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ (بخاری مسلم مشکوٰۃ)	بیوہ عورتوں اور حاجتمندوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ثواب میں راہ خدا میں جہاد کرنے والے کے ہم رتبہ ہے۔

امید ہے بلکہ اللہ و رسول کے ارشاد ہی کی بنیاد پر یقین ہو کہ اس وقت اس سلسلہ میں جو فرض ہم آپ پر عائد ہوتا ہے اگر ہم سب نے اس کو ادا کیا اور اللہ کے کمزور و غریب بندوں کی مدد کی تو اللہ پاک ہماری آپ کی مدد کرے گا، آپ کے مصائب کو دور کرے گا، آپ پر دنیا و آخرت میں اپنی رحمت کے دروازے کھول دے گا۔ پھر پڑھیے اس آیت کو اور سنیے اللہ پاک کی اس اپیل کو:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔	اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو دولت دی ہو اس میں سے ہماری راہ میں کچھ خرچ کر لو قبل اس کے کہ وہ یوم الحساب آجائے جبکہ نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سعی سفارش سے ہی کام چل سکے گا اور خوب سمجھ لو کہ نہ ماننے والے ہی ظالم ہیں، جو خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں جس کا برا نتیجہ وہ بھگتیں گے۔

آخر میں اس سلسلہ کی ایک حدیث قدسی اور پڑھ لیجئے:۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیٰمۃ یا ابن اٰدم مرضتُ فلم تعدنی قال یا ربِّ کیف اعودک وَ اَنْتَ رَبُّ العٰلمین قال اما	اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بعض آدمیوں سے فرمائیں گے "اے ابن آدم! میں مریض ہوا تھا تو نے میری خبر نہیں لی" وہ عرض کریگا آپ تو رب العلمین ہیں آپ کی کیسی بیماری

عَلِمتَ ان عبدی فلانا مرض
فلم تعده اما عَلِمت انك لوعُدتَّه
لوجدتنی عنده یا ابن آدم
استطعمتك فلم تُطعِمنی قال
یارب کیف اُطعِمك وانت ربّ
العٰلمین قال اَما عَلِمتَ انّه
استَطعَمَكَ عبدی فلان فلم تطعمه
اَمَا عَلِمتَ انك لَو اطعمته لوجدتَ
ذلك عندی یا ابن اٰدم استسقیتك
فلم تسقنی قال یاربّ کیف اسقیك
وانت رب العٰلمین قال استسقاك
عبدی فلان فلم تسقه اما انك
لَو سقیته وجدت ذلك عندی
(رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

اور کیسی میری عیادت وخبر گیری؟ ارشاد ہوگا
کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا
تھا تو نے اس کی خبر نہ لی، اگر تو اسکی عیادت
دیکھ بھال کرتا، خبر لیتا تو یقیناً مجھے اسکے
پاس پاتا، اور" اے ابن آدم! میں نے تجھ
سے کھانے کا سوال کیا تھا تو نے مجھے کھانا
نہیں کھلایا"۔ وہ عرض کرے گا آپ تو رب العٰلمین
ہیں آپ کو کھانا کھانے کی ضرورت کیا؟ اور
میں بھلا آپ کو کس طرح کھلا سکتا ہوں ارشاد
ہوگا "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے
نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے اس کو
کھانا نہیں دیا، تجھے خبر نہیں کہ اگر تو اس کو
کھانا کھلاتا تو اپنے اس کھلانے کو میرے
پاس پاتا اور میں تجھے اس کا بدلہ دیتا، پھر
ارشاد ہوگا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا"۔ بندہ عرض کریگا
خداوندا! آپ رب العٰلمین ہیں آپ کو پانی پینے کی کیا ضرورت) اور میں کس طرح آپ کو پلا سکتا
ہوں' ارشاد ہوگا "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا تو نے اسکو نہیں پلایا اگر
تو اس کو پلا دیتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔"

مبارک اور خوش نصیب ہیں اللہ کے وہی بندے جو بیچارے بیماروں، آفت رسیدوں، اور کھانے پینے کے حاجت مندوں کو دیکھ کر یہ حدیث پاک یاد کر لیا کریں اور اس کے مطالبہ کو پورا کر کے اپنے اللہ کی رضا حاصل کریں!

وَبَشِّرْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ
وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

شمع نبوت کا ایک پروانہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ترجمہ ــــــــــــ امۃ الرحمٰن کوثر

[حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا اتنا بڑا ذخیرہ اُمت کو بہم پہونچایا ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے یہ اُمت کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن علم نبوت کے اس ذخیرہ کو جمع کرنے کی راہ میں حضرت ابو ہریرہؓ نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں اس کا کچھ اندازہ ذیل کے مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو مصری عالم عجاج الخطیب کی کتاب "ابو ہریرہ ـ راویۃ الاسلام" سے ترجمہ کیا گیا ہے ــــــــــ مترجم]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے اُن صحابہ میں سے تھے جن کی زندگی میں فقر و مسکنت کا پہلو بہت نمایاں تھا لیکن فقر و عسرت کے سخت ترین لمحات میں بھی صبر کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔ بعض اوقات بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ دن دن بھر اور رات رات بھر اس طرح بھوکے گزر جاتے کہ ایک دانہ بھی منھ میں نہ جاتا ــــــ اپنا حال بیان کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں:۔

"میرا حال یہ تھا کہ جہاں کچھ میرے پیٹ میں پڑ جاتا حضور کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا (تاکہ آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں) یہی وجہ تھی کہ نہ میں خمیری روٹی کھا سکتا تھا، نہ عمدہ کپڑے پہن سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی غلام یا باندی مجھے خدمت کے لیے میسّر تھی (کیونکہ یہ باتیں کچھ کمانے کو چاہتی تھیں)۔

جب بھوک ستاتی تو اکثر یہ طریقہ اختیار کرتا کہ کسی صاحب سے قرآن کی کوئی آیت پڑھنے کی فرمائش کرتا، دراںحالیکہ وہ آیت مجھے خود یاد ہوتی، مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس طرح وہ صاحب مجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں اور پھر شاید میری بھوک کا حال محسوس کرکے مجھ سے کھانے کو بھی کہیں (یعنی صاف صاف میں اپنی حاجت کسی کے سامنے نہیں رکھتا تھا)"

مزید فرماتے ہیں:-

"میں ان ستّر اہل صفہ میں سے تھا جن میں سے کسی کے پاس باقاعدہ ایک چادر تک نہ ہوتی تھی۔ کوئی کملی یا ایک کپڑا جس کو وہ اپنی گردن میں باندھ لیتے تھے ان کا پورا لباس ہوتا، بھوک سے بھی پریشان رہتے تھے۔ نماز کے وقت کے علاوہ ان میں سے کوئی گھر سے نکل کر مسجد نبوی کا رُخ کرتا تو اس کا واحد سبب بھوک ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہاں اسی حال میں مبتلا کچھ اور لوگ مل جاتے تھے۔ ایک دن میں اسی حال میں نکل کر مسجد پہونچا تو کچھ لوگ ملے اور پوچھا ابوہریرہؓ! تم کو اس وقت کس چیز نے نکالا؟ میں نے کہا بس بھوک نے، کہنے لگے اللہ کی قسم ہم کو بھی بھوک ہی نے نکلنے پر مجبور کیا ہے (چنانچہ طے ہوا کہ چلو حضور کی خدمت میں چلیں) پس ہم سب اُٹھ کر چلے اور حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے دریافت کیا، اس وقت کیسے آئے ہو؟ عرض کیا یارسول اللہ بھوک لائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کا ایک طباق منگوایا، اور ہم میں سے ہر شخص کو دو دو کھجوریں دیں اور فرمایا:- یہ دو کھجوریں کھاؤ اور اس کے بعد پانی پیو یہی دو کھجوریں تمھیں آج کے لیے کافی ہوں گی ———— (حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں) میں نے ایک کھجور کھالی اور دوسری اپنے دامن میں اٹھا کر رکھ لی حضورؐ نے دریافت فرمایا، ابوہریرہ! تم نے یہ کھجور کس کیلئے اُٹھا کر رکھ لی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے یہ اپنی والدہ کے لیے رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تم اس کو کھالو، ہم ان کے لیے بھی تم کو دو کھجوریں دیں گے۔ چنانچہ میں نے وہ کھجور بھی کھالی اور

حضورؐ نے مجھے والدہ کے لیے مزید دو کھجوریں عنایت فرمائیں"۔

اولاد بیشک ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ سبحان اللہ، حضرت ابوہریرہ! آپ بحیثیت ایک بیٹے کے بھی کتنے اچھے تھے ——— آپ کو اکثر اتنی شدید بھوک کی تکلیف ہو جاتی تھی کہ منبر شریف اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے درمیان بیہوش ہو کر گر پڑتے تھے اور کوئی گزرنے والا آپ کو جنون زدہ سمجھ کر سینہ پر بیٹھ جاتا تھا حضرت ابوہریرہ اس وقت سر اٹھا کر اس سے کہتے :۔

"بھائی تم کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ بھوک کی تکلیف ہے۔"

بعض وقت سیدھا بیٹھا نہ جاتا تو کہنی سے زمین پر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتے اور پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ :۔

ایک دفعہ ایسے ہی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابوبکر گزرے تو میں نے ان سے قرآن کی ایک آیت کے متعلق کچھ معلوم کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس بہلانے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلا دیں گے۔ لیکن وہ یوں ہی گزر گئے، مجھے ساتھ نہیں لیا۔ ان کے بعد عمر گزرے انھوں نے بھی ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا، آپ نے میرے چہرے سے بھوک کا اندازہ فرما لیا، ارشاد ہوا ابوہریرہ! میں نے عرض کیا حضور حاضر ہوا۔ میں آپؐ کے ساتھ خانۂ اقدس میں پہونچا، آپ نے وہاں ایک پیالے میں دودھ رکھا ہوا پایا، اہلِ خانہ سے دریافت فرمایا۔ یہ کہاں سے آیا ہے؟ جواب ملا کہ فلاں شخص نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ مجھ سے فرمایا ابوہریرہ! اہلِ صفّہ کے پاس چلے جاؤ اور سب کو بلا لاؤ ——— اہلِ صفّہ اسلام ہی کے مہمان تھے۔ نہ ان کا گھر تھا اور نہ ان کے پاس مال تھا ——— جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی صدقہ آتا تو آپ اس کو ان کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ استعمال نہ فرماتے، اور جب آپ کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو استعمال فرماتے اور اہلِ صفّہ کو بھی شریک فرماتے ——— (حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں) اس وقت مجھے آپؐ کا ان لوگوں کو بلانے کے لیے بھیجنا کچھ گراں ہوا۔ میں نے سوچا میں تو اس

امید میں تھا کہ یہ دودھ مجھ ہی کو ملے گا، اور اسے پی کر کچھ جان آئے گی۔ یہ اتنا سا دودھ تمام اہلِ صفہ میں بھلا کیا کرے گا ____ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تو ضروری تھی، میں اہلِ صفہ کے پاس آیا (اور رسول اللہ کا پیغام پہونچایا) تمام اہلِ صفہ آ گئے۔ جب وہ سب بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا ابوہریرہ! اس کو لو اور ان سب کو دو، میں ہر شخص کو دینے لگا، ان میں سے ہر شخص نے خوب سیر ہو کر پیا۔ حتیٰ کہ میں نے سب کو فارغ کر دیا، اور بقیہ رسول اللہ کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ نے میری طرف سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے فرمایا، اب ہم اور تم باقی رہے، میں نے عرض کیا جی ہاں حضرت! آپ نے فرمایا لو پیو، میں نے پیا۔ پھر فرمایا پیو، میں نے پھر پیا، آپ برابر فرماتے رہے کہ پیو اور میں پیتا رہا۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اب مزید گنجائش نہیں ہے۔ پس وہ باقی دودھ آپ نے لے لیا اور خود نوش فرمایا۔"

اس فقر و عسرت کے ساتھ ذرا حضرت ابوہریرہ کی خودداری بھی دیکھئے ____ ایک مرتبہ کا واقعہ بیان فرماتے ہیں:۔

"میں عمر بن خطاب کے پاس پہونچا۔ وہ نماز کے بعد کچھ تسبیحات پڑھ رہے تھے، میں ان کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو میں قریب گیا اور کہا مجھے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھا دیجئے (فرماتے ہیں) اس وقت میری اصل نیت کھانے کی تھی۔ انھوں نے مجھے آلِ عمران کی چند آیتیں پڑھا دیں۔ جب آپ گھر پہونچے تو مجھ کو دروازہ پر ہی چھوڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ میں نے سوچا آپ شاید کپڑے بدلیں گے اور پھر میرے لیے کھانے کو کہیں گے۔ لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور میں نے کچھ نہ پایا، تو واپس چل پڑا۔ سامنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے مجھ سے کچھ گفتگو فرمائی اور پھر فرمایا ابوہریرہ! یہ تمھارے منھ سے سخت بو کیسی ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ میں بغیر افطار کے مسلسل روزہ سے ہوں، اور کوئی

ایسی چیز میرے پاس نہیں ہے کہ میں اس سے افطار کر لوں۔ آپؐ نے فرمایا اچھا چلو۔ میں گھر تک ساتھ چلا گیا۔ آپؐ نے اپنی ایک حبشن باندی کو پکارا، پھر ارشاد فرمایا۔ ذرا یہ پیالہ اٹھاؤ وہ پیالہ لے آئی۔ اس میں کچھ تھوڑا سا بچا ہوا کھانا تھا، شاید جو تھے جس میں سے آپؐ نے تناول فرمایا تھا اور کناروں میں کچھ تھوڑا سا لگا ہوا رہ گیا تھا۔ میں نے بسم اللہ کی اور سمیٹ سمیٹ کے کھانے لگا۔ یہاں تک کہ اسی سے شکم سیر ہو گیا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اکثر فرماتے تھے:۔

"میں نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی اور بحالت مسکینی ہجرت کی۔ میں بسرہ بنت غزوان کے یہاں مزدوری کرتا تھا۔ میری اُجرت کھانا اور سواری تھی۔ جب میرے مالک کہیں ٹھہرتے تو میں ان کی خدمت کرتا اور جب سوار ہوتے تو حُدی خوانی کرتا ــــــ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ یہی بسرہ بنت غزوان میرے حبالۂ عقد میں آگئیں۔"

امام التابعین سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳ــ ۹۴ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ کا یہ حال دیکھا کہ آپ بازار کا چکر لگاتے، پھر گھر واپس آتے اور فرماتے:۔ "کیا تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے"، اگر گھر والے کہتے کہ کچھ نہیں ہے تو فرماتے بس میں روزہ سے ہوں۔"

ان تنگ حالیوں کے باوجود آپ کا نفس کھانے کا حریص کبھی نہیں ہوا، اور کبھی آپ کے نفس پر پیٹ کی طمع نے غلبہ نہیں پایا۔ ہمیشہ اتنے ہی پر اکتفا کرتے تھے جتنا کہ کم سے کم آپ کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اگر آپ کے پاس پندرہ ۱۵ کھجوریں ایک ساتھ ہو جاتیں تو پانچ کھجوروں سے افطار کرتے اور پانچ سحر میں کھاتے اور بقیہ پانچ کو افطار کے لیے رکھ لیتے۔ آپ پر فقر کی آزمائشوں کا طویل زمانہ گزرا۔ یہاں تک کہ اللہ کی رحمت سے خوشحالی اور فارغ البالی کا دروازہ آپ پر کھلا۔ اس وقت آپ پر شکر غالب ہوا، ہمیشہ اپنے ایام فقر کو یاد کرتے تھے۔ لوگوں کو اللہ کی نعمتیں یاد دلاتے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

ایک دفعہ ایک جماعت کے پاس سے آپ کا گزر ہوا جن کے سامنے بھنی ہوئی بکری رکھی تھی۔ انھوں نے آپ کو کھانے کی دعوت دی تو آپ نے انکار فرما دیا اور کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے کہ جَو کی روٹی بھی کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھائی تھی۔"

مضارب بن حزن کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رات کو سفر کر رہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص تکبیر کہہ رہا ہے، جب میرا اونٹ اس کے قریب پہونچ گیا تو میں نے کہا یہ کون ہے؟

جواب ملا۔ ابوہریرہ۔
میں نے کہا یہ تکبیر کیسی؟۔
کہا شکر کی۔
میں نے کہا کس چیز پر؟
کہا۔ "میں بسرہ بنت غزوان کا خادم تھا پھر ایسا زمانہ آیا کہ اللہ نے ان کے ساتھ میری شادی کرا دی۔ اب وہ میری بیوی ہیں۔"

اس دور میں آپ کے یہاں جب کبھی مہمان آتے تو آپ اپنی والدۂ ماجدہ کے پاس آدمی بھیجتے کہ آپ کا بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ کچھ کھانے کے لیے بھیجیے۔ آپ کی والدہ طشت میں تین ٹکیاں رکھ کر اور تھوڑا سا روغن زیتون اور نمک ساتھ رکھ کر بھیجتیں جب آدمی ان مہمانوں کے سامنے اس کو رکھتا تو حضرت ابوہریرہ کے منھ سے تکبیر بلند ہوتی اور فرماتے:۔

"تعریف ہے اس اللہ کے لیے جس نے یہ غذا بخشی۔ ایک وقت وہ تھا جب ہمارا کھانا صرف کھجور اور پانی ہوتا تھا۔"

اپنی خوشحالی کے زمانہ میں جب کبھی بڑھیا قسم کا لباس پہن لیتے تو اپنے آپ کو اٹھلاتا ہوا محسوس کرتے اور فوراً کہہ اٹھتے:۔ "واہ واہ! آج ابوہریرہ کتانی لباس میں اکڑ رہے ہیں حالانکہ میں نے اسے اس حال میں بھی دیکھا ہے کہ وہ منبر شریف اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے درمیان گر پڑتا اور کوئی آنے والا اسے دیکھ کر جنون زدہ سمجھتا ــــ حالانکہ یہ صرف بھوک ہوتی تھی۔"

جزیرۂ قبرص میں اسلام کی سرگزشت

محمد خالد مسعود

قبرص کی سرزمین پر تاریخ اسلام کا سب سے پہلا قافلہ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اُترا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت فاروقؓ کے زمانے میں بازنطینی سلطنت کو جب پے در پے شکستیں ہوئیں اور بحیرۂ روم کا جنوبی حصہ اس کے قبضے سے جاتا رہا۔ تو اسے مشرقی حصے کی حفاظت کیلئے بحیرۂ روم کے شمالی علاقے کو زیادہ مستحکم کرنا پڑا۔ چنانچہ قسطنطنیہ پر اس کی پوری توجہ مرکوز ہوگئی۔ امیر معاویہؓ اس علاقے کے گورنر ہوئے تو انھیں بازنطینی حکومت کی اس جنگی پالیسی پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ بحیرۂ روم کی طرف سے ہونے والے حملوں کا سدّباب کیا جائے۔ قبرص کا جزیرہ بازنطینی سلطنت کا بہت اہم مورچہ تھا۔ امیر معاویہ نے حضرت عمرؓ سے قبرص پر حملے کی اجازت چاہی۔ لیکن آپ نے اجازت نہ دی۔ آخر کار حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ۲۷ھ میں ایک طاقتور بحری بیڑہ لے کر حملہ آور ہوئے۔

اس حملے میں حضرت امیر معاویہ کے ساتھ جہاں بہت سے جلیل القدر صحابہ ابو الدرداءؓ ابوذر غفاریؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور مقدادؓ شامل تھے وہاں عورتیں بھی کافی تعداد میں شرکت کر رہی تھیں۔ جن میں حضرت عبادہ بن الصامت کی اہلیہ حضرت ام حرام بنت ملحان، حضرت معاویہ کی اہلیہ فاختہ بنت قرظہ اور ان کی بہن کنوہ بنت قرظہ کے نام معروف ہیں۔ حضرت ام حرامؓ اس وقت تک ضعیف العمری کو پہونچ چکی تھیں، لیکن بحری جہاد میں شرکت اور شہادت کی جو پیشگوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی اسے پورا کرنے کا جذبہ پیرانہ سالی کے باوجود کشاں کشاں لے گیا۔ جب جہاز کنارے پر لگا تو حضرت ام حرام کے لیے خچر لایا گیا لیکن خچر

بدک گیا اور آپ گرتے ہی شہید ہو گئیں۔ اسی جگہ آپ کو دفن کر دیا گیا۔ آپ کا مزار لارنا کا کی خوبصورت نمکین جھیل کے کنارے موجود ہے جسے لوگ "حالا سلطان تکے" (سلطان کی خالہ کا تکیہ) کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حسین مسجد ہے جو سمندر میں دور سے ہی نظر آنے لگتی ہے۔ آج بھی بحیرۂ روم میں جہاز جب قبرص کے نزدیک پہونچتے ہیں تو مسلمان ملاح جھنڈے جھکا دیتے ہیں اور خود بھی فرط عقیدت سے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ حضرت کتوہ بنت قرظہ بھی اسی حملے میں شہید ہوئیں۔

جنگی مہموں میں عورتوں کی شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب جہازرانوں کے لیے سمندر "بازی گاہ" تھے۔ بحری سفر کے شدائد ان کے شوق کو تیز کرتے تھے، موجوں سے آویزش اور طوفان سے کھیلنا ان کا معمول تھا۔ حبشہ کی طرف ہجرت کا سفر ہو یا قبرص کی جنگی مہم، عورتیں ان کی بحری مہمات میں برابر شریک ہوتی تھیں۔

قبرص فتح ہوا اور خراج کی شرط پر صلح ہوئی، معاہدہ طے پایا کہ قبرص بازنطینی اور اسلامی سلطنت کے درمیان غیر جانبدار رہے گا۔ لیکن ۳۲ھ میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بازنطینیوں کی مدد کی۔ حضرت معاویہ اگلے سال پانچ سو جہازوں کا بیڑہ لے کر حملہ آور ہوئے قبرص نے صلح کی درخواست کی جسے حضرت معاویہ نے منظور کر لیا۔ مسلمانوں کی خاصی تعداد تقریباً (۱۲۰۰۰) شام سے یہاں آکر آباد ہو گئی۔ اور حضرت معاویہؓ نے فوج کا ایک دستہ بھی متعین کر دیا۔

حضرت معاویہ کی وفات کے بعد قبرص نے مطالبہ کیا کہ مسلمان فوج کو واپس بلا لیا جائے یزید بن معاویہ نے فوج کو واپس بلا لیا۔ فوج کے جاتے ہی قبرصی باشندوں نے مسلمان آبادی پر حملہ کر دیا۔ اس قتل و غارت گری میں مسلمانوں کی اکثریت شہید ہوئی۔ کچھ لوگ شام واپس آگئے اکثر مسجدیں گرا دی گئیں۔

عبدالملک خلیفہ ہوئے تو قبرص ابھی تک مسلمانوں کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ خلیفہ نے قبرص سے معاہدہ کی تجدید کا مطالبہ کیا۔ بازنطینی سلطنت قبرص کو غیر جانبدار رکھنے کے حق میں نہیں تھی چنانچہ بازنطینیوں نے پوری کوشش کی کہ قبرص کو مسلمانوں سے الگ کرا دیا جائے۔ لیکن یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور قبرص نے خراج میں اضافہ منظور کرتے ہوئے صلح کر لی۔ ولید ثانی کے دور میں ۱۲۵ھ میں قبرص کا مستقل طور پر شام سے الحاق کر دیا گیا۔

اس زمانہ میں اُموی حکومت کا آفتاب روبہ زوال تھا. خانہ جنگیوں کی وجہ سے باہر کی طرف توجہ ختم ہوگئی. اُموی حکومت کے کھنڈرات پر عباسی سلطنت قائم ہوئی. لیکن جب تک اس کو استحکام حاصل ہوتا بازنطینی سلطنت اپنا قبضہ بحال کرچکی تھی. قسطنطنیہ اس کی قوت کا مرکز تھا. صقلیہ اور اور قبرص کو شطرنج کے مہروں کے طور پر استعمال کر رہی تھی. اس کی وجہ سے اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدیں ہمیشہ خطرے میں رہتی تھیں.

ہارون الرشید کے عہد میں حمید بن معیوف ہمدانی کو شام اور جزیرۂ روم کے علاقے کے فوجی اختیارات ملے تو اس نے حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیا. اس کی نظریں بھی قبرص پر جاکر رک گئیں دارالخلافت سے اجازت پاکر اس نے ۱۹۰ھ میں قبرص پر حملہ کیا. قلیل محاصرے کے بعد قبرص فتح ہوگیا. ان دنوں قبرص میں کلیسا کو کافی اقتدار حاصل ہوچکا تھا. اسقف گورنر کے فرائض انجام دیتا تھا. اسقف نے صلح کے معاہدے کی پیش کش کی جسے ہارون الرشید نے منظور کرلیا.

قبرص سارے عباسی دور میں غیر جانبدارانہ پالیسی پر قائم رہا اور کوئی بحران پیدا نہیں ہوا. عباسی سلطنت کے اواخر میں جب خلافت کمزور ہونے لگی تو بازنطینی اثر درسوخ بحال ہوگیا اور اس جزیرے کی طرف اسلامی سلطنت کی توجہ بہت کم ہوگئی. مجموعی طور پر قرونِ وسطیٰ کی قبرصی تاریخ صلح و معاہدہ کی تاریخ ہے.

(۲)

گیارھویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک، قبرص کا واسطہ زیادہ تر مملوک سلاطین سے رہا. رچرڈ اول شاہ انگلستان جب صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں صلیبی جنگوں میں شرکت کے لیے آیا تو راستے میں بازنطینی حکمراں سے جھڑپ ہوگئی. رچرڈ نے حملہ کرکے قبرص فتح کرلیا اور ۱۱۹۲ء میں اسے فرینک خاندان کے ہاتھ فروخت کردیا. اس طرح قبرص سے بازنطینی اقتدار کا خاتمہ ہوا. لیوسیناں (فرینک) دورِ حکومت میں پطرس اول کا زمانہ قابل ذکر ہے. اس نے اسلامی اثر درسوخ ختم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوگیا. اسی حوصلے پر پطرس اول کے جانشین شاہ جانوس نے مصر کے مملوک سلاطین کو مکمل طور پر ختم کرنے کی تیاریاں شروع کردیں. چند ایک بحری جھڑپوں کے بعد ۱۴۲۶ء میں بارس بی مملوک سلطان نے

۱۰۰ جہازوں کا بیڑہ لے کر قبرص پر حملہ کر دیا۔ لارناکا کے ضلع میں لڑائی ہوئی جس میں جانوس کو شکست فاش ہوئی۔ یہ تاریخ قبرص کی سب سے تباہ کن شکست تھی۔ جانوس گرفتار ہوا اور آٹھ ماہ مملوک سلطان کی قید میں رہا، آخر خراج کا وعدہ کر کے رہا ہوا۔ اس کے بعد مملوک کو قبرص کی طرف سے مکمل اطمینان رہا اور لیوسینان دور کے آخر تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ترک ابھر رہے تھے اور یورپ کی ساحلی سلطنتوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ اس خطرے کو سب سے پہلے وینس کے حکمراں مینوری نے محسوس کیا۔ ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے اس کی نظر بھی قبرص پر پڑی۔ قبرص کی کمزور حکومت کسی بھی وقت ترکوں کے ہاتھ میں جا سکتی تھی۔ مینوری نے مسلسل کوششوں سے قبرص پر تسلط حاصل کر لیا اور اس طرح وینس کے باشندوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ صرف فوجی حکومت تھی جو یورپ کے ساحلی علاقے کو ترکوں کی ترکتاز سے محفوظ رکھنے کے لیے عمل میں آئی تھی۔ لیکن یہ بند ترکوں کے آگے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔

(۳)

ترکیہ میں عثمانیہ سلطنت کے استحکام کے بعد قریبی جزیروں کی طرف توجہ دی گئی۔ سلطان سلیم ثانی کے عہد میں لالہ مصطفیٰ، جولائی سنہ ۱۵۷۰ء میں پچاس ہزار ترک لشکر کے ساتھ لارناکا میں اترے۔ اسی جگہ جہاں تقریباً ایک ہزار سال پہلے امیر معاویہ کا لشکر اترا تھا۔ ترک آگے بڑھتے گئے۔ دارالخلافہ نکوسیا کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تقریباً دو ماہ کے محاصرے کے بعد نکوسیا فتح ہو گیا! اس کے ایک ہفتہ کے اندر سارا قبرص اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔

قبرص تین سو سال تک سلطنت عثمانیہ کا جزو رہا۔ ترکوں کی بہت بڑی تعداد نے اسے وطن بنایا۔ عثمانیہ دور قبرص کی تاریخ کا شاندار عہد تھا جس میں قبرص کو صحیح معنوں میں ارتقاء حاصل ہوا۔ ترکوں نے یہاں بہت سی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ جاگیرداری نظام ختم کر دیا گیا۔ عیسائی کلیسا کو پوری آزادی دی گئی۔ عیسائی رعایا کو برابر کے حقوق حاصل تھے۔ ولیم ٹرنر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ:-

"قبرص پر اگرچہ [illegible] ہے" حکمراں ہے، لیکن درحقیقت یہاں

یونانی اسقف اور اس کے ماتحت پادریوں کی حکومت ہے۔"

۱۸۳۹ء میں ترکوں نے آئینی اصلاحات رائج کیں اور ایک قائم مقام مقرر کیا جس کی مدد کے لیے قبرص کے باشندوں کی ایک کونسل کا انتخاب ہوتا تھا۔ اس طرح قبرص کو اندرونی معاملات میں خود مختاری حاصل تھی۔

انیسویں صدی میں عالمی سیاست میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ نہر سوئز کی وجہ سے یورپ کے لیے بحیرۂ روم کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس علاقے کی طرف روس اور برطانیہ دونوں کی نظریں اٹھ رہی تھیں۔ روس درۂ دانیال اور بحیرۂ باسفورس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اسے سلطنت عثمانیہ سے ٹکر لینا پڑتی تھی۔ اس نے قبرص کے جزیرے کو فوجی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہا، برطانیہ نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے دخل اندازی کی۔ اس نے ترکی کی مدافعت کا وعدہ کیا، چنانچہ جون ۱۸۷۸ء میں سلطان ترکی نے عارضی طور پر قبرص انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد برطانیہ نے قبرص کو پوری طرح اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ سلطنت برطانیہ کی طرف سے یہاں ہائی کمشنر متعین ہونے لگا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد قبرص میں انگریزوں کے خلاف بغاوتوں کا آغاز ہوا۔ یونان نے اس میں درپردہ مدد کی اور جنرل گریفاس مسلح جہاز لے کر یہاں کے قبرصی رہنما اسقف میکاریوس کی مدد کو پہونچ گیا۔ ترک اور یونان دونوں آزادی کے لیے لڑ رہے تھے لیکن یونانی انتہاپسندوں کے سامنے مقصد کچھ اور تھا انھوں نے برطانوی سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ترکوں پر بھی حملے شروع کر دیئے ترک اقلیت کو اب اس تحریک آزادی کی حقیقت کا علم ہوا۔ قبرص کو کلیتاً یونان سے ملحق کرنے کے لیے ترکوں کو سرے سے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں سے ترک اقلیت کے اختلافات کا آغاز ہوا

(۴)

ترکوں اور یونانیوں کے ان اختلافات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس تاریخی پس منظر کا جائزہ لینا ہوگا جس میں اس کشیدگی نے جنم لیا۔

قبرص ابتدائے تہذیب سے ہی اپنی معدنیات[۱] اور جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے خاص

---

[۱] یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کاپر (تانبہ) یہاں کافی مقدار میں ملتا تھا اور یورپین زبانوں میں اس جزیرہ کا نسبت سے اس کا نام کاپر پڑا۔

اہمیت کا حامل رہا ہے۔ زمانہ قبل مسیح میں یونانی قسمت آزما یہاں پہونچتے رہے۔ یونانی اساطیر میں قبرص کا ذکر بارہا آتا ہے۔ یونانی محبت کی دیوی افروڈائٹ (APHRODITE) قبرص ہی میں پیدا ہوئی اس لیے اسے محبت کا جزیرہ کہا جاتا ہے۔ (چنانچہ اسی نسبت کی وجہ سے انطونی نے قلوپطرہ کو یہ جزیرہ محبت کے تحفے کے طور پر دیا تھا۔)

قبرص کے یونان سے الحاق کے حامیوں کے دلائل میں سب سے بڑی دلیل قبرص کا یونان سے یہی قدیم دیومالائی رشتہ ہے۔ لیکن محقق مورخین کو اس میں کلام ہے جارج ہل کے نزدیک قبرص کو یونان سے وابستہ کرنے کے لیے ایلیڈ (ILIAD) کی کہانیوں میں تبدیلیاں کی گئی ہیں تاکہ اس کی فینیقی ثقافت سے وابستگی ختم کی جا سکے۔

الحاق کے حامیوں کی دوسری دلیل زبان کا رشتہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یونان سے مسلسل ربط و ضبط کی وجہ سے یونانی زبان قبرص میں آئی اور آج بھی اکثریت کی زبان ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ بازنطینی سلطنت کے قیام کے بعد کی بات ہے۔

سلطنت روما کے مشرقی حصوں کے نظم و نسق کے لیے قسطنطین نے ایشیائے کوچک کے علاقے کی طرف توجہ کی۔ یہاں بازنطیم نامی ایک قدیم شہر جسے بازاس نے ۶۵۸ ق م میں بسایا تھا، کے کھنڈرات پر ۳۳۰ء میں شہر بسایا گیا جس کا نام قسطنطنیہ (قسطنطین کا شہر) پڑ گیا۔ قدیم نام کی رعایت سے اس سلطنت کو بازنطینی سلطنت کہا گیا۔ یونانی دارالحکومت کی وجہ سے اب سلطنت روما میں لاطینی کے بجائے یونانی زبان کو عروج ہوا اور اس کے ماتحت علاقوں میں بھی اس کو قبول عام حاصل ہوا۔

پولس نے عیسائیت کو یونانی ذہن کے لیے قابل قبول بنا دیا تھا۔ بازنطینی حکومت کا عیسائیت سے تعلق ہوا تو قبرصی عیسائیوں کے ذہن میں عیسائیت یونانیت اور بازنطینیت کی تثلیث پیوست ہو گئی جس نے اینوسس ENOSIS کا نام پایا۔

اینوسس کے لفظی معنی "الحاق" ہیں۔ یہ درحقیقت بازنطینی سلطنت کے احیاء کی تحریک ہے۔ قبرصی خواہ یونان سے اس کا کوئی خونی اور نسلی رشتہ نہ ہو، لیکن اگر وہ کیتھولک مسیحی ہے تو وہ اپنے کو یونانی شمار کرتا ہے۔" (جارج ہل)

یہ تحریک انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ اس کا مطالبہ تھا یونان سے الحاق، اور قدیم بازنطینی سلطنت کا احیاء، اس تحریک کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یونانی زبان اکثریت کی زبان ہے "قبرص یونان کا حصہ رہا ہے" اور اکثریت کا مطالبہ یونان سے الحاق ہے۔"

لیکن جارج ہل جیسے محقق تاریخ داں کو ان دلائل میں منطقی اور تاریخی ربط کے وجود سے انکار ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسی فیصد آبادی اینوسس کے خلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قبرص کبھی یونان کا حصہ نہیں رہا۔ بازنطینی سلطنت میں یونان بھی اسی طرح اس سلطنت کے ماتحت تھا جیسے قبرص۔

اینوسس کی یہ تحریک بعد میں تشدد پسندی میں تبدیل ہوگئی اور ایک دہشت پسند تنظیم ایوکا EOKA کی تشکیل کی۔ اس وقت بیس ہزار افراد کو اس میں باقاعدہ رکنیت حاصل ہے۔ ایوکا کی دہشت پسند سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۵۵ء سے ہو گیا تھا۔ یونان کی پشت پناہی جنرل گریفاس کی شرکت کی صورت میں حاصل رہی۔ اس کے علاوہ بہت سی تبلیغی مسیحی تنظیمیں اس بربریت پسند تنظیم کا ساتھ دے رہی تھیں، مسیحی مبلغ ہوں یا اسکول کے اساتذہ اور طلبہ، تمام کیتھولک اینوسس کے لیے حلف اٹھاتے تھے۔

قبرص کے موجودہ صدر میکاریوس جب اسقف بنے تو انھوں نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں نکوسیا میں حلف اٹھایا۔

"میں مقدس حلف اٹھاتا ہوں کہ میں قومی آزادی کے لیے زندگی وقف کر دوں گا اور تا حیات پوری استقامت سے کوشش کروں گا کہ قبرص کا الحاق مادرِ وطن یونان سے ہو جائے۔"

میکاریوس اس حلف پر شدت سے قائم رہے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء میں ترک اقلیت پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ ترکوں کے نمائندہ لیڈر ڈاکٹر فاضل کوچک نے اس کے خلاف آواز اٹھائی چنانچہ ۱۹۵۹ء میں لندن میں تین طاقتیں مصالحت کے لیے جمع ہوئیں۔ برطانیہ (حکمراں طاقت) یونان (قبرصی یونانیوں کی اکثریت کے حقوق کی محافظت کی دعویدار سلطنت) اور ترکی (ترک اقلیت کی حفاظت کی دعویدار سلطنت) برطانیہ قبرص سے اپنا تعلق منقطع کرنے کے لیے

تیار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قبرص اپنے قدیم حکمران ترکی کے زیر اثر آجائے جس سے برطانیہ نے یہ علاقہ عارضی طور پر لیا تھا۔ طویل مذاکرات کے بعد تینوں طاقتوں کے مابین معاہدہ ہوا جس کی مدد سے قبرص کے آئین کا یہ ڈھانچہ طے پایا کہ صدر قبرصی یونانیوں میں سے اور نائب صدر قبرصی ترکوں میں سے ہوگا اور کابینہ میں دونوں قوموں کو مساوی حقوق دیئے جائیں گے اس کے باوجود اگر کوئی تنازعہ ہو تو برطانیہ، یونان اور ترکی تینوں کے درمیان گفت وشنید سے طے کیا جائے گا۔

۱۹۶۰ء میں قبرص آزاد ہوا اور میکاریوس پہلے صدر ہوئے۔ انھیں یہ آئین منظور نہیں تھا اس لیے کہ اس میں قبرصی ترکوں کو قبرصی یونانیوں کے مساوی حقوق دیئے گئے تھے، چنانچہ انھوں نے ترک نمائندوں کو مجبور کیا کہ وہ آئین میں آبادی کے تناسب سے حقوق کی تقسیم کے لحاظ سے ترمیم وتبدیلی کو منظور کریں۔

ڈاکٹر فاضل کوچک نائب صدر تھے انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسئلہ اکثریت واقلیت کا نہیں بلکہ دو قوموں کا ہے، یونانی ایک قوم ہیں ترک دوسری قوم۔ دونوں قوموں کو مساوی آئینی حقوق ملنے چاہئیں۔ قبرص میں درحقیقت اکثر لحاظ سے وہی سیاسی صورت حال ہے جو تقسیم سے پہلے برصغیر ہندو پاکستان میں مسلمانوں کو پیش تھی۔ جب میکاریوس کو گفت وشنید میں کامیابی نہ ہوئی تو ایوکا کی دہشت پسند سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۳ء میں قبرص میں ترکوں کے قتل عام کا آغاز ہوا۔ ایوکا کا خیال تھا کہ اس طرح دہشت پسندی پھیلانے سے یا تو ترک آئین میں تبدیلیوں کو منظور کرلیں گے، ورنہ انھیں صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردیا جائے گا۔

نکوسیا میں پانچ دن تک اخباری نامہ نگاروں کو داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ ۲۶ دسمبر کو جب نامہ نگار ترک بستیوں میں پہونچے تو انھوں نے وہ خونیں مناظر دیکھے جو ایوکا کے دہشت پسندوں نے اپنے ترک ہم وطنوں کو کرسمس کی رات تحفے کے طور پر پیش کیے تھے۔

اس بربریت پر ساری دنیا نے افسوس کیا۔ معاہدہ لندن ۱۹۵۹ء کی رو سے ترکی پر قبرصی ترکوں کی حفاظت کی ذمہ داری پڑتی تھی۔ ترکی نے میکاریوس کی حکومت کو تنبیہ کی اور اقوام متحدہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ اور ترکی کی مصالحانہ کوششوں کو ایوکا کے دہشت پسند کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں ان کی سفاکی جاری ہے۔

ترکی نے مظلومین قبرص کی حفاظت کے لیے گفت و شنید پر اکتفا نہیں کی۔ حال ہی میں اس نے قبرص کے خلاف تادیبی کارروائی کر کے اس امید کو تقویت دی ہے کہ شہیدوں کا خون رنگ لائے گا اور قبرص کے ترک جو اکثریت کے مظالم کا نشانہ رہے ہیں امن و آزادی کا سانس لے سکیں گے۔

مآخذ

۱۔ بلاذری۔ "فتوح البلدان"۔ بریل (۱۸۶۶ء)

۲۔ صحیح بخاری، جزو الرابع، مطبع امیریہ (۱۳۱۲ھ)

۳۔ طبقات ابن سعد، بیروت (۱۹۵۸ء)

۴۔ تاریخ طبری، مطبع حسینیہ (ت۔ ن)

5- Harry Luke, Cyprus, London (1957)

6. Background to Enosis, Royal Institute of International Affairs London, (1967)

7. Mangonten, Island of Cyprus, Nicosia, (1947)

8. Cyprus, Central Office of Information London (n.d).

9. Encyclopaedia of Islam "Cyprus."

10. Dr Fazil Khuchuk, The Cyprus Question.

11. Cyprus : Past, Present and Future Ankara (1964)

12. George Hill, The History of Cyprus.

(بشکریہ "فکر و نظر" کراچی)

مطبوعات کتبخانہ الفرقان ایک نظر میں
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے مجلد -/-/۴
اسلام کیا ہے؟ مجلد -/-/۲
آپ حج کیسے کریں؟ مجلد -/-/۲
آسان حج -/۸/-
مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ مجلد -/-/۴
ہندوستان سے سب سے پہلا سفرنامۂ حجاز -/۱۲/۱
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور اہل بدعت کے الزامات -/۱۲/-
معارف الحدیث (اول) غیر مجلد -/-/۴ مجلد -/-/۵
معارف الحدیث (دوم) غیر مجلد -/۸/۴ مجلد -/۸/۵
دین و شریعت مجلد -/-/۳
کلمۂ طیبہ کی حقیقت -/۶/-
ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ -/۸/۱
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ مجلد -/-/۴
برکات رمضان -/۱۲/-
نماز کی حقیقت -/-/۱
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ
لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنیؒ کے چند مخصوص مجربات
سفوف ذیابطیس اس دوا کے استعمال سے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے۔ چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوٹنے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ 3/50 NP پانچ تولہ 2/=
شربت جذام جذام میں یہ دوا بیحد مفید ہے۔ پانچ چھ پاؤنڈ استعمال کر لینے سے یہ مرض دفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ 5/=
شربت کبد پتہ کی پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے۔ قیمت ایک پونڈ 5/=
شربت درد گردہ پیشاب میں بھوری ریت آنا اور چبھن پیدا ہو جانا یا رک رک کر پیشاب آنا، یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے۔ جنکی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں، انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ 5/=
مرہم سرخ پھوڑوں، خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم بیحد مفید ہے، اس مرہم کے استعمال سے درد اور جلن کافور ہو جاتی ہے اور پورا حصہ صاف ہو کر صحت ہو جاتی ہے۔
آٹھ اونس 3/50

سنہ آغاز ۱۹۳۳ء

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان ۱۳۵۷ھ کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزارے (از ۱۰۰۱ھ تا ۲۰۰۰ھ) کا مجدد امت نے مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں عالم اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور انکے دینی تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے "الف ثانی" کے مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعہ سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانیؒ کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات ۲۷۲، سائز متوسط، قیمت: ۴/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۶/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

الفرقان
لکھنؤ
ماہنامہ
فی کاپی .... ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
سادہ ڈاک .... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک .... ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابت ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۴ھ مطابق نومبر ۱۹۶۴ء | شمارہ ۶

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

منیجر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان سے شائع کیا۔

خریداران الفرقان سے

ایک معذرت

الفرقان جیسے دینی اور مقصدی رسالوں کے خریدار عام دنیا کے خریدار نہیں ہوتے وہ دراصل معاونین کار ہوتے ہیں، اسی لئے ادارہ کی طرف سے بھی اُن کے ساتھ تجارتی انداز کی معاملت نہیں برتی جاتی۔ کوئی اپنی استطاعت کی بنا پر رعایت کا طلبگار ہوتا ہے تو انکار نہیں کیا جاتا۔ کوئی چندہ کی ادائیگی میں مہلت مانگتا ہے تو بے تامل دیجاتی ہے کوئی کسی نئے خریدار کے نام وعدہ پر پرچہ جاری کرنے کی فرمائش کرتا ہے تو یہ فرمائش پوری کر دیجاتی ہے اور پھر خریدار ہی اگر بروقت ادائیگی کی فکر نہ کرے تو دفتر عموماً سال بھر کے بعد بھی نہیں کی جاتی۔ ان دوران میں بہت سوں پر کئی کئی سال کا چندہ بھی چڑھ جاتا ہے یا کسی سال کا چندہ کسی کسی بار تک [illegible] ہدایت کر دیتے ہیں کہ ان کو کبھی وی پی نہ کیا جائے، تو نیا سال شروع ہونے پر چندہ کی وصولی کا انتظار ہے، ان کا پرچہ تو بند نہیں کیا جاتا بلکہ متعارف ہونے کی صورت میں اگر کسی کسی سال بھی اس طرح گزر جاتا ہے تو اس کو بھی برداشت کیا جاتا ہے ——

لیکن یہ تمام رعایتیں بہرحال ایک حد کے اندر ہی نباہی جا سکتی ہیں۔ یکسر ڈھیل چھوڑ دی جائے تو چند سال میں الفرقان کا کام ہی تمام ہو جائے۔

گزشتہ دو ڈھائی سال اتفاق سے ایسے ہی گزر گئے کہ بقایا چندوں کی وصولیابی کی کوئی فکر ہی نہیں کی جا سکی۔ اسکی خاص وجہ یہ تھی کہ اس عرصہ میں میں خود دفتر کے کام پر تفصیلی نظر بالکل نہیں رکھ سکا اور جن صاحب کے سپرد سارا کام ہو گیا تھا وہ پورے بوجھ کو سنبھال نہیں سکے۔ اور نہ صرف یہ کہ بقایا جات بڑھتے رہے بلکہ جو چندے ان دنوں میں روزمرہ وصول ہوئے اُن میں سے بہت سوں کے اندراجات بھی مکمل نہیں ہوئے۔ اور اسی صورت حال میں وہ صاحب یکایک مستعفی ہو کر چلے بھی گئے۔ ان کے بعد جو ایک نئے کارکن نے دفتر سنبھالا تو یہ وہ وقت تھا کہ میں اس شدید بیماری کے حملوں کا شکار ہو چکا تھا جس سے ابتک سنبھل نہیں پایا ہوں (گو کہ صفر مطابق جولائی کے الفرقان میں میرے ہی قلم سے میری صحتیابی کی خبر پڑھنے والے اس طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اسی وقت چند دن کے کام سے شکایت پھر عود کر آئی اور پھر ابتک بھی اس کے ازالے کی شکل نہیں پیدا ہوئی ہے) بہرحال ان نئے کارکن

باقی صفحہ ۱۵ پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

از ——— جناب وحید الدین خاں صاحب

کسی شخص نے کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ سورج کی گرمی سے کاغذ جل گیا۔ حالانکہ سورج کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ کاغذ تو کیا پورا کا پورا پہاڑ بلکہ سارا کرۂ ارض اس طرح جل سکتا ہے جیسے کسی بھڑکتے ہوئے تنور میں ایک تنکا۔ مگر یہی سورج جس کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے جنگلوں اور پہاڑوں کو بھک سے اڑا دے وہ ایک تنکے کو بھی جلانے پر قادر نہیں ہے، ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں لاکھوں کروڑوں میل کے دائرے میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے کسی ایک چیز پر بیک وقت اس کی شعاعیں اتنی مقدار میں نہیں پڑتیں کہ وہاں وہ اتنی گرمی پیدا کر سکیں جو کسی چیز کو جلانے کے لیے ضروری ہے۔ حالانکہ یہی بکھری ہوئی شعاعیں اگر سمیٹ دی جائیں تو وہ خوفناک الاؤ کی شکل میں بھڑک سکتی ہیں۔

آفتابی چولھا سورج کی شعاعوں کے اسی قسم کے ارتکاز کا نام ہے۔ بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک خاص دائرے میں سمیٹ دینے کی وجہ سے اس جگہ اتنی گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ کھانا پکنے لگتا ہے۔ آفتابی چولھا تو ابھی بہت کم رائج ہو سکا ہے مگر آتشی شیشہ (BURNING GLASS) ایک ایسی چیز ہے جو اکثر اشخاص نے کبھی نہ کبھی دیکھا ہے۔ آتشی شیشہ کیا ہے۔ یہ ایک محدب یا کروی عدسہ (CONVEX LENS) ہے جس سے کاغذ یا دوسری آتش پذیر چیزوں میں آگ لگائی جا سکتی ہے۔ عام حالات میں کاغذ پر سورج کی جو شعاعیں پڑتی ہیں وہ اتنی زیادہ گرمی نہیں پیدا کر سکتیں کہ اس میں آگ لگ جائے۔ مگر انھیں شعاعوں کو جب مجتمع کر دیا جاتا ہے تو وہ شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتی ہیں۔ کوئی بھی شخص تجربہ کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ لنس ان شعاعوں

کو طاقت ور بنانے کے لیے کیا کرتا ہے، جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا۔

اس خاکہ میں درمیان میں آتشیں شیشہ ہے جس سے شعاعیں مڑ کر نیچے ایک نقطہ پر جمع ہو رہی ہیں۔
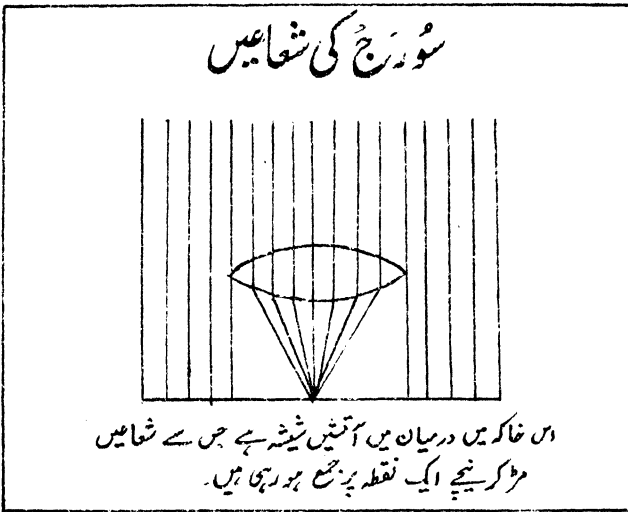
اس نقشہ کے مطابق آتشیں شیشہ کا تمام تر عمل صرف یہ ہے کہ وہ ان شعاعوں کو جمع کرے جو لنس کے پورے دائرے میں پڑ رہی ہیں اور ان کو اس طرح موڑے یا منعطف کردے کہ وہ سب اکٹھا ہو کر ایک محدود رقبہ پر پڑنے لگیں۔ سورج کی شعاعوں کا یہ اجتماع اس محدود رقبہ میں اتنی حرارت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ جلنے لگتا ہے۔

یہ مثال میں نے یہ واضح کرنے کے لیے دی ہے کہ انتشار اور اجتماع میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی چیز اگر منتشر حالت میں ہو تو وہ بے وزن ہے۔ لیکن اگر اسے اکٹھا کر دیا جائے تو اتنی زبردست طاقت بن سکتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت جس کمزوری کی حالت میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں وہ حقیقۃً اتنے کمزور نہیں ہیں، یہ کمزوری دراصل ان کے انتشار کی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے درمیان اجتماعیت کا آتشیں شیشہ فراہم کر لیں اور انفرادی طور پر بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مقام پر مجتمع کر دیں تو یکایک وہ دیکھیں گے کہ جو شعاعیں الگ الگ ہونے کی صورت میں تنکا جلانے کے لیے بھی ناکافی نظر آتی تھیں، انھیں کی گرمی سے شہتیر بھڑک اٹھا ہے۔ ہماری موجودہ تعداد اور موجودہ

ذرائع و وسائل جو منفرد طور پر بالکل بے قیمت نظر آتے ہیں، یہی تعداد اور یہی ذرائع کروڑوں گنا زیادہ اہمیت اختیار کر لیں گے۔ آج ہر مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اس وقت ہر شخص اپنے کو ایک پوری قوم کی مانند سمجھنے لگے گا۔ اور جب ایسا ہو گا تو دوسرے بھی ہم کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ فی الواقع ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے یہ پانچ کروڑ افراد گویا پانچ کروڑ دھاگے ہیں، اگر وہ الگ الگ ہوں تو کوئی شخص بھی انھیں باری باری توڑ سکتا ہے۔ لیکن یہی پانچ کروڑ دھاگے اگر مل جائیں تو وہ اتنا مضبوط رسّا بن جائیں گے جنھیں ایک ہاتھ تو کیا سیکڑوں ہاتھ بھی توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ جو چیز الگ سے دیکھنے میں محض ایک دھاگا ہے وہ اتحاد کی برکت سے موٹے رسے کا مقام حاصل کر لے گی۔ قطرہ سمندر میں ہو تو وہ سمندر ہے اور باہر ہو تو قطرہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لیے کسی بھی اسکیم کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ اصلاحِ حال کی ہر تجویز سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر مجتمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لیے مہیا ہو سکیں زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو مؤثر بنایا جا سکے۔ جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو وہ زیادہ سے زیادہ وقیع اور باوزن معلوم ہو۔

اجتماعیت سے ہماری مراد کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام فرقے اور جماعتیں ختم ہو جائیں اور سارے ملک میں ایک تنہا جماعت قائم ہو جائے۔ ایسی اجتماعیت نہ ضروری ہے اور نہ ممکن۔ اس وقت ہم جس اجتماعیت کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انفرادی اور گروہی سطح پر اپنے مخصوص امتیازات کو باقی رکھتے ہوئے قومی اور ملی سطح پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ جائیں، بالکل ویسے ہی جیسے آزادی سے پہلے ملک کے مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی گروہ اپنے علیحدہ وجود کو باقی رکھتے ہوئے ایک مشترک قومی مقصد کی خاطر کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔

اس وقت حالات نے مسلمانوں کے لیے چند ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایک فرد یا فرقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر پوری امت کا مسئلہ ہے۔ مثلاً مخصوص اسباب نے

اس ملک کے مسلمانوں کے لیے معاشیات کے دروازے تنگ کر دیے ہیں اور اب ہمیں سوچنا ہے کہ اس قوم بیمار کی معیشت کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں، تعصب کی آندھی نے فسادات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کا شکار فرقہ اور گروہ کے امتیاز کے بغیر ہر مسلمان ہو رہا ہے۔ ملک کا پریس ہمارے ساتھ نہ صرف بائی کاٹ کر رہا ہے بلکہ مخالف خبریں نشر کرتا ہے، اس کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں ایک طاقت ور پریس کی ضرورت ہے۔ انتخابات میں مسلم ووٹروں کے بٹ جانے اور مسلم قائدین کے منتشر ہو جانے کی وجہ سے ہم ان سیاسی امکانات میں سے اپنا حصہ بہت کم وصول کر پاتے ہیں جو ملک کے سیاسی ڈھانچے کے تحت ہمارے لیے ممکن ہیں۔ ضرورت ہے کہ سیاسی محاذ پر ہم اپنی پوری طاقت کو صحیح طور پر لگائیں تاکہ قوم کو اس کا پورا سیاسی حق مل سکے۔ اسی طرح اور بہت سے کام ہیں جو قومی اور ملی سطح پر درکار ہیں اور باہمی ٹکراؤ کے بغیر ساری اُمت جس میں شترک طور پر حصہ لے سکتی ہو اور یکساں فوائد حاصل کر سکتی ہے۔

یہ اجتماعیت کیسے ظہور میں آئے؟

۱۔ پہلی بات یہ کہ کوئی بھی اجتماعیت، خواہ وہ کتنے ہی ہلکے درجہ کی ہو، بہر حال قربانی چاہتی ہے ـــــ وقت کی قربانی، رائے کی قربانی، حیثیت کی قربانی، ذاتی مفادات کی قربانی۔ کبھی ایسا ہوگا کہ ذاتی دائرہ میں آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے، مگر قوم کو اس کی ضرورت ہوگی، کبھی اپنی رائے کو محض اس لیے چھوڑنا ہوگا کہ دوسروں کو آپ اس کا قائل نہیں کر سکے اور اشتراک کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ آپ اپنی رائے سے عملی طور پر دست بردار ہو جائیں۔ کبھی آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی ڈھانچہ میں آپ کی حیثیت گھٹ رہی ہے مگر اس کے باوجود ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کے لیے آپ اپنی حیثیت کو نظر انداز کر دیں گے۔ کبھی اجتماعی تقاضے آپ کے ذاتی مفادات کو متاثر کرنے لگیں گے۔ ضرورت پکارے گی کہ اس وقت اپنا سرمایہ ذاتی خواہش میں نہیں بلکہ قوم کے کام میں لگاؤ اور آپ اس پکار کو لبیک کہیں گے، کبھی ذاتی اور خاندانی مصالح پر قوم کی مصالح کو ترجیح دینا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک ایسے معاشرے میں یہ اجتماعیت قائم نہیں ہو سکتی جہاں صدارت اور نظامت حاصل کرنے کے لیے رسہ کشی ہوتی ہو، جہاں قوم کے پڑھے لکھے لوگ محض بیرونی ملکوں کی سیاحت کی

قیمت پر اس کے لیے راضی ہو جائیں کہ وہ باہر جا کر قوم کی غلط نمائندگی کریں۔ جس کے افراد کو محض ایک اچھا عہدہ دے کر خریدا جا سکتا ہو، جہاں ایک مسلم گروہ دوسرے مسلم گروہ کو شکست دینے کے لیے قوم کے دشمنوں سے مل جاتا ہو، جہاں یہ حال ہو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خفا ہو تو پولیس کے دفتر میں اس کے خلاف مخبری کرنے پہونچ جائے۔ جہاں نظر آئے کہ کچھ لوگ ایک ملی کام کے لیے اٹھیں تو بقیہ لوگ اس کا تعاون کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگیں کہ کہیں یہ میدان پر قابض نہ ہو جائیں۔ اور فوراً اسی کام کے لیے ایک اور علیحدہ تنظیم قائم کر کے لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کر دیں۔ جہاں ملت کی ضروریات خدمت کرنے کا میدان نہ ہوں بلکہ لیڈری حاصل کرنے کا سستا ذریعہ بن جائیں، جہاں لوگ اجتماعی احساس سے اس قدر نا آشنا ہوں کہ اختلافات پر گالی گلوج ہونے لگے اور ترک کلام کی نوبت آ جائے۔ جہاں لوگوں کی سطحیت کا عالم یہ ہو کہ اتحاد کے بجائے اختلاف کے اجزا ڈھونڈھتے ہوں، جہاں گروہ بندی اس شدت کو پہونچی ہوئی ہو کہ اپنے دائرہ سے باہر نہ کسی حق کو تسلیم کریں اور نہ اپنے سوا کسی کو کام کرنے کا اہل سمجھتے ہوں —— جہاں پستی کا یہ عالم ہو اور جہاں اجتماعی اوصاف کی اس درجہ کمی ہو وہاں تمام لوگ آخر ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کس طرح ہوں گے —— حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ قوم کو اخلاقی پستی سے نکالا جائے اور اس کے اندر اجتماعی احساس پیدا کیا جائے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہمارے اندر کوئی اجتماعیت برپا ہو سکے۔

۲۔ اسی کے ساتھ اس بات کو ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ موجودہ گروہوں اور فرقوں کے کھنڈر ہی پر قومی اجتماعیت قائم ہو سکتی ہے، اس طرح کی کلی اجتماعیت، اس سے قطع نظر کہ وہ ضروری ہے یا نہیں، یہ قطعی ہے کہ وہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے۔ اس وقت جو کچھ ممکن ہو وہ صرف ایک قسم کی داخلی کنفیڈریشن ہے جس میں مختلف گروہ اپنی مخصوص انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے ایک مشترک سطح پر باہم مل گئے ہوں۔ بعض مرتبہ کسی مشکل کا حل صورت واقعہ کی تصحیح میں نہیں ہوتا بلکہ صورت واقعہ کو قبول کر لینے میں ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں ہم کو یہی طریق کار اختیار کرنا ہے، ۱۸۶۱ء میں جب لنکن امریکا کا صدر منتخب ہوا تو بعض مسائل پر امریکا میں شدید قسم کے اندرونی اختلافات پیدا ہو گئے اور بہت سی ریاستوں نے یونین گورنمنٹ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

اسکے بعد ۴ فروری ۱۸۶۱ء کو مانٹ گومری (الباما) میں سات باغی ریاستوں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا جس میں طے پایا کہ امریکا میں کنفڈریشن طرز کا نظام حکومت قائم ہوگا جسمیں ریاستوں کو اندرونی خود مختاری حاصل رہے گی ـــــ یہ ایک سیاسی حیثیت کی مثال ہے۔ اس کو ہم اپنی غیر سیاسی نوعیت کی تنظیم میں اپنے حالات و مسائل کے اعتبار سے اختیار کر سکتے ہیں۔

جہانتک میں سمجھتا ہوں اس نتیجے تک پہونچنے میں اصلاً جو چیز حائل ہے وہ صرف یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اختلافی گروہ اپنے اختلافات کو مقامی دائرہ میں محدود رکھنے کے بجائے پوری قوم اور سارے مسائل تک اسکو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کا ایک فقہی مسلک ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ سارے مسائل کا حل بس اسی مخصوص فقہی مسلک کو اختیار کرنے میں ہے۔ کسی کا کوئی طریق کار ہے تو اس کا خیال ہے کہ بس یہی طریق کار سارے مرضوں کی دوا ہے۔ کسی کا ایک ڈھانچہ بن گیا ہے تو وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ بقیہ تمام ڈھانچے عبث ہیں اور سب کو میرے ڈھانچہ میں ضم ہو جانا چاہیے۔ کسی کے کچھ مخصوص عقائد ہیں تو اسکو اصرار ہے کہ بس یہی عقیدہ دنیا و آخرت کا اصل مسئلہ ہے اور اسکو مانے بغیر سرے سے کسی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ہمارے ان فرقوں اور جماعتوں کی مثال قوالی یا بھجن کی ان شبانہ مجالس کی سی ہو گئی ہے جو صرف اپنے کمرے میں اپنے ہم ذوق افراد کے درمیان قوالی اور بھجن کر کے مطمئن نہیں ہوتیں بلکہ تیز قسم کا لاؤڈ اسپیکر لگا کر پوری آبادی کو رات بھر اپنی آواز سنانا بھی ضروری سمجھتی ہیں خواہ بقیہ آبادی کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسکو وہ دوسروں کی نیند خراب کرنے کا ایک مجنونانہ فعل ہی سمجھیں مجھے اس سے بحث نہیں کہ کسی کا جو مخصوص فکر ہے وہ حقیقتہً کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔ بالفرض وہ اتنا ہی اہم ہو جتنا اسکے ماننے والے سمجھتے ہیں، جب بھی حالات کی سنگینی تقاضا کر رہی ہے کہ مشترک اجتماعی دائرے میں اسکو منوانے پر اصرار نہ کیا جائے ـــــ معیار پسندی بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر معیار حاصل نہ ہو رہا ہو تو حقیقت واقعہ کا اعتراف بہترین عقلمندی ہے اور میں مسلم فرقوں اور جماعتوں کو یہی مشورہ دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اجتماعی جدوجہد کے بغیر ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور اجتماعیت ایک ایسی چیز ہے جو عین ہمارے دائرۂ امکان میں ہے کسی بھی پہلو سے وہ ہمارے لیے ناممکن نہیں، اب اگر ایک ایسے امکان کو بھی ہم حاصل نہیں کرتے تو یاد رکھئے تاریخ ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مستقبل کا مورخ یقیناً ہم کو مجرم ٹھہرائے گا۔ خواہ اپنے دل میں ہم دوسروں کو اپنی مصیبت کا ذمے دار سمجھتے ہوں۔

کتابُ الحجّ

معارفُ الحدیث

(مُسلسل)

حرمِ مکہ کی عظمت

خانۂ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مقدس بیت (گھر) قرار دیا ہے اور اسی نسبت سے شہر مکہ کو جس میں بیت اللہ واقع ہے بلد اللہ الحرام قرار دیا گیا ہو، گویا جس طرح دُنیا بھر کے گھروں میں کعبۂ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ سے خاص نسبت ہے اسی طرح دُنیا بھر کے شہروں میں مکۂ معظمہ کو اللہ تعالیٰ کی نسبت کا خاص شرف حاصل ہے۔ پھر اسی نسبت سے اسکی ہر سمت میں کئی کئی میل کے علاقہ کو حرم یعنی واجب الاحترام قرار دیا گیا ہے اور اس کے خاص آداب و احکام مقرر کیے گئے ہیں اور ادب و احترام ہی کی بنیاد پر بہت سی ان باتوں کی بھی وہاں ممانعت ہے جن کی باقی ساری دُنیا میں اجازت ہے، مثلاً ان حدود میں کسی کو شکار کی اجازت نہیں، جنگ اور قتال کی اجازت نہیں، درخت کاٹنے اور درختوں کے پتے جھاڑنے کی اجازت نہیں۔ اس محترم علاقہ میں ان سب چیزوں کو ادب و احترام کے خلاف گنہگارانہ جسارت قرار دیا گیا ہے۔

اس علاقۂ حرم کی حدود پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے معین کی تھیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں انہی کی تجدید فرمائی اور اب وہ حدود معلوم و معروف ہیں۔ گویا یہ پورا علاقہ بلد اللہ الحرام کا صحن ہے اور اس کا وہی ادب و احترام واجب ہے جو اللہ کے

مقدس شہر مکہ معظمہ کا ـــــ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث ذیل میں پڑھیے!

عَنْ عَیَّاشِ بْنِ اَبِیْ رَبِیْعَةَ الْمَخْزُوْمِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَزَالُ ھٰذِہِ الْاُمَّةُ بِخَیْرٍ مَا عَظَّمُوْا ھٰذِہِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِیْمِھَا فَاِذَا ضَیَّعُوْا ذَالِكَ ھَلَکُوْا۔

ـــــــــــ رواہ ابن ماجۃ

عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت جب تک اس حرم مقدس کا پورا احترام کرتی رہے گی اور اس کی حرمت و تعظیم کا حق ادا کرے گی خیریت سے رہے گی اور جب اس میں یہ بات باقی نہ رہے گی برباد ہو جائے گی۔ (سنن ابن ماجہ)

تشریح) گویا بیت اللہ اور بلد اللہ الحرام (مکہ معظمہ) اور پورے علاقہ حرم کی تعظیم و حرمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے صحیح تعلق اور سچی وفاداری کی علامت اور نشانی ہے جب تک یہ چیز اجتماعی حیثیت سے اُمت میں باقی رہے گی اللہ تعالیٰ اس امت کی نگہبانی فرمائے گا اور وہ دنیا میں سلامتی اور عزت کے ساتھ رہے گی۔ اور جب اُمت کا رویہ بحیثیت مجموعی اس بارہ میں بدل جائے گا اور خانہ کعبہ اور حرم مقدس کی حرمت و تعظیم کے بارہ میں اس میں تقصیر آجائے گی تو پھر یہ امت اللہ تعالیٰ کی حمایت و نگہبانی کا استحقاق کھودے گی۔ اور اس کے نتیجہ میں تباہیاں اور بربادیاں اُس پر مسلط ہوں گی۔

ہمارے اس زمانہ میں سفر کی سہولتوں کی وجہ سے اور بعض دوسری وجوہ سے بھی اگرچہ حج کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے لیکن وہاں ساری دنیا سے جو مسلمان آتے ہیں اُن کا طرز عمل بتاتا ہے کہ بیت اللہ اور حرم مقدس کے ادب و احترام کے لحاظ سے اُمت میں بحیثیت مجموعی بہت بڑی تقصیر آگئی ہے اور بلاشبہ یہ بھی ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ جن کی وجہ سے اُمت مشرق و مغرب میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور نگہبانی سے محروم کردی گئی ہے۔

اَللّٰھُمَّ عَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَامِلْنَا بِمَا اَنْتَ اَھْلُہٗ وَلَا تُعَامِلْنَا بِمَا نَحْنُ اَھْلُہٗ۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ لَا ھِجْرَۃَ وَلٰکِنْ جِھَادٌ وَّنِیَّۃٌ فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا وَ قَالَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ اِنَّ ھٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَہُ اللّٰہُ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فَھُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَاِنَّہٗ لَمْ یَحِلَّ الْقِتَالُ فِیْہِ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ وَلَمْ یَحِلَّ لِیْ اِلَّا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ فَھُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا یُعْضَدُ شَوْکُہٗ وَلَا یُنَفَّرُ صَیْدُہٗ وَلَا یَلْتَقِطُ لُقَطَتَہٗ اِلَّا مَنْ عَرَّفَھَا وَلَا یُخْتَلٰی خَلَاھَا قَالَ الْعَبَّاسُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِلَّا الْاِذْخَرَ فَاِنَّہٗ لِقَیْنِھِمْ وَلِبُیُوْتِھِمْ فَقَالَ اِلَّا الْاِذْخَرَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب ہجرت کا حکم نہیں رہا لیکن جہاد ہے اور نیت! تو جب تم سے راہ خدا میں کوچ کرنے کو کہا جائے تو چل دو ——— اور اسی فتح مکہ کے دن آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ یہ شہر مکہ اللہ نے اس کو اسی دن سے محترم قرار دیا ہے جس دن کہ زمین و آسمان کی تخلیق ہوئی (یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اسی وقت زمین کے اس قطعہ کو جس پر مکہ معظمہ آباد ہے اور اس کے آس پاس کے علاقہ حرم کو واجب الاحترام قرار دیا، لہذا اللہ کے اس حکم سے قیامت تک کے لیے اس کا ادب و احترام واجب ہے۔ اور مجھ سے پہلے اللہ نے اپنے کسی بندہ کو یہاں قتال فی سبیل اللہ کی بھی اجازت نہیں دی! اور مجھے بھی دن کے تھوڑے سے وقت کے لیے اس کی عارضی اور وقتی اجازت دی گئی تھی اور وہ وقت ختم ہو جانے کے بعد اب قیامت تک کے لیے یہاں قتال اور ہر وہ اقدام اور عمل جو اس مقدس جگہ کے ادب و احترام کے خلاف ہو حرام ہے، اس علاقہ کے خاردار جھاڑ بھی نہ کاٹے چھانٹے جائیں۔ یہاں کے کسی قابل شکار جانور کو پریشان بھی نہ کیا جائے، اگر کوئی گری پڑی چیز نظر پڑے

تو اس کو وہی اٹھائے جو قاعدہ کے مطابق اس کا اعلان اور تشہیر کرتا رہے، اور یہاں کی سبز گھاس بھی نہ کاٹی اکھاڑی جائے ـــــ (اس پر آپ کے چچا) حضرت عباس نے عرض کیا "اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرما دیا جائے، کیونکہ یہاں کے لوہار اس کو استعمال کرتے ہیں اور گھروں کی چھتوں کے لیے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے" ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس کے اس عرض کرنے پر اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرما دیا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اعلانوں کا ذکر ہے، جو آپ نے فتح مکہ کے دن خاص طور سے فرمائے تھے ـــــ پہلا اعلان یہ تھا کہ "اب ہجرت کا حکم نہیں رہا" ـــــ اس کا مطلب سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب مکہ پر ان اہل کفر و شرک کا اقتدار تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ اور مکہ میں رہ کر کسی مسلمان کے لیے اسلامی زندگی گزارنا گویا ناممکن تھا تو حکم یہ تھا کہ مکہ میں اللہ کا جو بندہ اسلام قبول کرے اس کے لیے اگر ممکن ہو تو وہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر جائے جو اس وقت اسلامی مرکز اور روئے زمین پر اسلامی زندگی کی واحد تعلیم گاہ اور تربیت گاہ تھی، بہرحال ان خاص حالات میں یہ ہجرت فرض تھی اور اس کی بڑی فضیلت اور اہمیت تھی ـــــ لیکن جب ۸ھ میں اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ پر بھی اسلامی اقتدار قائم کرا دیا تو پھر ہجرت کی ضرورت ختم ہو گئی، اس لیے آپ نے فتح مکہ ہی کے دن اعلان فرمایا کہ اب ہجرت کا وہ حکم اٹھا لیا گیا ـــــ اس سے قدرتی طور پر ان لوگوں کو بڑی حسرت اور مایوسی ہوئی ہو گی جن کو اب اسلام کی توفیق ملی تھی اور ہجرت کی عظیم فضیلت کا دروازہ بند ہو جانے کی وجہ سے وہ اس سعادت سے محروم رہ گئے تھے ـــــ ان کی اس حسرت کا مداوا فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت کی فضیلت و سعادت کا دروازہ اگرچہ بند ہو گیا ہے لیکن جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ اور اللہ تعالیٰ کے سارے اوامر کی اطاعت کی نیت اور بالخصوص اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں ہر قربانی کے لیے دلی عزم و

آمادگی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور بڑی سے بڑی سعادت اور فضیلت ان راہوں سے اللہ کا ہر بندہ حاصل کر سکتا ہے۔

دوسرا اعلان فتح مکہ کے دن آپ نے یہ فرمایا کہ یہ شہر مکہ جس کی عظمت و حرمت دورِ قدیم سے مسلّم چلی آ رہی ہے یہ محض رسم و رواج یا کسی فرد یا پنچایت کی تجویز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ازلی حکم سے ہے اور قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کا خاص ادب و احترام کیا جائے۔ یہاں تک کہ اللہ کے لیے جہاد و قتال جو ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت اور بڑے درجہ کی سعادت ہے یہاں اس کی بھی اجازت نہیں ہے، مجھ سے پہلے کسی بندہ کو اس کی اجازت وقتی طور سے بھی نہیں دی گئی، مجھے بھی بہت تھوڑے سے وقت کے لیے اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور وہ بھی وقت ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو گئی، اب قیامت تک کے لیے کسی بندہ کو یہاں قتال کی اجازت نہیں ہے ـــــ جس طرح مخصوص سرکاری علاقوں کے خاص قوانین ہوتے ہیں اسی طرح یہاں کے خاص آداب اور قوانین ہیں اور وہ وہی ہیں جن کا آپ نے اس موقع پر اعلان فرمایا۔

قریب قریب اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يَحْمِلَ بِمَكَّةَ السِّلَاحَ ـــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار اُٹھائے (صحیح مسلم)

تشریح) جمہور علماء اُمت کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مکہ اور حدود حرم میں کسی مسلمان کو دوسرے کے خلاف ہتھیار اُٹھانا اور اس کا استعمال کرنا جائز نہیں، یہ اس مقامِ مقدس کے ادب و احترام کے خلاف ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کو ہتھیار ہاتھ میں لینے کی اجازت ہی نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ الْعَدَوِيِّ أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِيْدٍ وَهُوَ

يَبْعَثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ ائْذَنْ لِي أَيُّهَا الْأَمِيرُ أُحَدِّثْكَ قَوْلًا
قَامَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ
أُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِي وَأَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ حِينَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمِدَ اللّٰهَ
وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ
فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا
وَلَا يَعْضِدَ بِهَا شَجَرَةً فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا فَقُولُوا لَهُ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ
يَأْذَنْ لَكُمْ وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ وَقَدْ عَادَتْ
حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِيلَ
لِأَبِي شُرَيْحٍ مَا قَالَ لَكَ عَمْرٌو؟ قَالَ قَالَ أَنَا أَعْلَمُ بِذَلِكَ
مِنْكَ يَا أَبَا شُرَيْحٍ إِنَّ الْحَرَمَ لَا يُعِيذُ عَاصِيًا وَلَا فَارًّا بِدَمٍ
وَلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ ——— رواه البخاری ومسلم

ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عمرو بن سعید سے کہا جبکہ وہ (یزید کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا اور اس کے حکم سے عبداللہ بن الزبیرؓ کے خلاف) مکہ پر چڑھائی کرنے کے لیے لشکر تیار کر کے روانہ کر رہا تھا کہ اے امیر مجھے اجازت دیجیے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بیان کروں جو آپ نے فتح مکہ کے اگلے دن (مکہ میں) ارشاد فرمایا تھا میں نے اپنے کانوں سے آپ کا وہ فرمان خود سنا تھا اور میرے ذہن نے اس کو یاد کر لیا تھا اور جس وقت آپ کی زبان مبارک سے وہ فرمان صادر ہو رہا تھا اس وقت میری آنکھیں آپ کو دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اس کے بعد فرمایا تھا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے اس کی حرمت کا فیصلہ انسانوں نے نہیں کیا ہے اس لیے جو آدمی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے حرام ہے کہ وہ یہاں خوں ریزی کرے، بلکہ یہاں کے درختوں کا کاٹنا بھی منع ہو۔

(آپ نے فرمایا) اور اگر کوئی شخص میرے قتال کو سند بنا کر اپنے لیے اس کا جواز نکالے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دی تھی اور تجھے اجازت نہیں دی ہے اور مجھے بھی اللہ نے ایک دن کے تھوڑے سے وقت کے لیے عارضی اور وقتی طور پر اجازت دی تھی اور اس وقت کے ختم ہونے کے بعد وہ حرمت لوٹ آئی اور اب قیامت تک کسی کے لیے اس کا جواز نہیں ہے ——— (اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ) جو لوگ یہاں موجود ہیں اور جنھوں نے میری یہ بات سنی ہے وہ دوسرے لوگوں کو یہ بات پہونچا دیں (اس لیے اے امیر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں آپ کا یہ فرمان تم کو پہونچایا ہے)۔

ابو شریح سے کسی نے پوچھا کہ پھر عمرو بن سعید نے کیا جواب دیا، انھوں نے بتلایا کہ اس نے کہا کہ ابو شریح! میں یہ باتیں تم سے زیادہ جانتا ہوں، حرم کسی نافرمان کو یا ایسے آدمی کو جو کسی کا ناحق خون کر کے یا کوئی نقصان کر کے بھاگ گیا ہو پناہ نہیں دیتا (یعنی ایسے لوگوں کے خلاف حرم میں بھی کارروائی کی جائے گی)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) اسلام کی پہلی ہی صدی میں سیاسی اقتدار کی ہوس رکھنے والوں نے اسلام کے ساتھ جو معاملہ کیا اور اس کے احکام کو اپنی اغراض کے لیے جس طرح توڑا مروڑا وہ تاریخ اسلام کا نہایت تکلیف دہ باب ہے۔ ابو شریح عدوی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے انھوں نے اموی حاکم عمرو بن سعید کے سامنے بر وقت کلمۂ حق کہہ کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا کے اپنا فرض ادا کر دیا ——— صحیحین کی اس روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ عمرو بن سعید نے جو بات کہی ابو شریح نے اس کے جواب میں کچھ کہا یا نہیں ——— لیکن مسند احمد کی روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا۔

قَدْ كُنْتُ شَاهِداً وَكُنْتَ غَائِباً وَقَدْ اَمَرَنَا اَنْ يُّبَلِّغَ شَاهِدُنَا غَائِبَنَا وَقَدْ	فتح مکہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تھی میں اس وقت وہاں حاضر اور موجود تھا اور تم

بَلَّغْتُكَ [۱] وہاں نہیں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ جو یہاں موجود ہیں وہ میری یہ بات ان لوگوں کو پہونچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہیں ــــــ میں نے اس حکم نبوی کی تعمیل کر دی اور تم کو یہ بات پہونچا دی۔

ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ کے اس جواب میں یہ بھی مضمر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقصد و منشا سمجھنے کے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جن کے سامنے آپ نے یہ بات فرمائی، اور جنھوں نے موقع پر حضور سے یہ بات سنی۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ حَمْرَاءَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاقِفًا عَلَى الْحَزْوَرَةِ فَقَالَ وَاللّٰهِ اِنَّكِ لَخَيْرُ اَرْضِ اللّٰهِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللّٰهِ اِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا اَنِّيْ اُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ۔ ــــــ رواہ الترمذی و ابن ماجۃ

عبداللہ بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ مکہ میں حَزْوَرہ (ایک ٹیلے) پر کھڑے تھے اور مکہ سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے خدا کی قسم تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر جگہ ہے اور اللہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور اگر مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا تو میں ہرگز تجھے چھوڑ کے نہ جاتا۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ مکہ معظمہ تمام روئے زمین میں سب سے افضل اور باعظمت اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین جگہ ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ اس میں کعبۃ اللہ ہے جو حق تعالیٰ کی خاص الخاص تجلّی گاہ اور قیامت تک کیلئے اہل ایمان کا قبلہ ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی طواف کرتے تھے اور اسی کی

---

[۱] فتح الباری کتاب المناسک، باب لا یعضد شجر الحرم الخ

طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے ــــــ اسی مضمون کی حدیث قریب قریب انہی الفاظ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِمَکَّۃَ مَا اَطْیَبَکِ مِنْ بَلَدٍ وَ اَحَبَّکِ اِلَیَّ وَلَوْلَا اَنَّ قَوْمِیْ اَخْرَجُوْنِیْ مِنْکِ مَا سَکَنْتُ غَیْرَکِ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تو کس قدر پاکیزہ اور دلپسند شہر ہے اور تو مجھے کتنا محبوب ہے اور اگر میری قوم نے مجھے نکالا نہ ہوتا تو میں تجھے چھوڑ کے کسی اور جگہ نہ بستا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) ان دونوں حدیثوں میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ یہ بات آپ نے کس موقع پر فرمائی، شارحین نے حضرت عبداللہ بن عباس والی اس حدیث کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے یہ بات فتح مکہ کے سفر میں مکہ سے واپس ہونے کے وقت فرمائی تھی۔ واللہ اعلم۔

مدینۂ طیبہ کی عظمت اور محبوبیت

اکثر محدثین کا دستور ہے کہ وہ اپنی مؤلفات میں حج و عمرہ سے متعلق حدیثوں کے ساتھ "باب فضل مکۃ" کے تحت مکۂ معظمہ کی عظمت و فضیلت کی حدیثیں اور انہی کے ساتھ "باب فضل المدینہ" کے تحت مدینۂ طیبہ کی عظمت کی حدیثیں بھی درج کرتے ہیں۔ اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے یہاں بھی پہلے مکۂ معظمہ سے متعلق احادیث درج کی گئی ہیں اور اب مدینۂ طیبہ سے متعلق درج کی جارہی ہیں۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ سَمَّی الْمَدِیْنَۃَ طَابَۃَ۔

ــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) طابہ، طیبہ اور طیّبہ ان تینوں کے معنی پاکیزہ اور خوشگوار کے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ نام رکھا اور اس کو ایسا ہی کر دیا، اس میں روحوں کے لیے جو خوشگواری جو سکون و اطمینان اور جو پاکیزگی ہے وہ بس اسی کا حصہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اِبْرَاہِیْمَ حَرَّمَ مَکَّۃَ فَجَعَلَہَا حَرَاماً وَاِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَۃَ حَرَاماً مَابَیْنَ مَازِمَیْہَا اَنْ لَا یُہْرَاقَ فِیْہَا دَمٌ وَّلَا یُحْمَلُ فِیْہَا سِلَاحٌ وَلَا تُخْبَطُ فِیْہَا شَجَرَۃٌ اِلَّا لِعَلَفٍ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم نے مکہ کے "حرم" ہونے کا اعلان کیا تھا (اور اس کے خاص آداب و احکام بتلائے تھے) اور میں مدینہ کے "حرم" قرار دیئے جانے کا اعلان کرتا ہوں اس کے دونوں طرف کے دروں کے درمیان کا پورا رقبہ واجب الاحترام ہے، اس میں خونریزی نہ کی جائے کسی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھایا جائے (یعنی اسلحہ کا استعمال نہ کیا جائے) اور جانوروں کے چارے کی ضرورت کے سوا درختوں کے پتّے بھی نہ جھاڑے جائیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا، مدینہ طیّبہ بھی سرکاری علاقہ کی طرح واجب الاحترام ہے اور وہاں ہر وہ عمل اور اقدام منع ہے جو اس کی عظمت و حرمت کے خلاف ہو۔ لیکن اس کے احکام بالکل وہ نہیں ہیں جو حرم مکہ کے ہیں۔ خود اسی حدیث میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ اس میں جانوروں کے چارہ کے لیے وہاں کے درختوں کے پتے توڑنے اور جھاڑنے کی اجازت دی گئی ہے جب کہ حرم مکہ میں اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔

عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اُحَرِّمُ مَا بَیْنَ لَابَتَیِ الْمَدِیْنَۃِ اَنْ یُّقْطَعَ عِضَاھُھَا اَوْ یُقْتَلَ صَیْدُھَا وَقَالَ الْمَدِیْنَۃُ خَیْرٌ لَّھُمْ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ لَا یَدَعُھَا اَحَدٌ رَغْبَۃً عَنْھَا اِلَّا اَبْدَلَ اللّٰہُ فِیْھَا مَنْ ھُوَ خَیْرٌ مِّنْہُ وَلَا یَثْبُتُ اَحَدٌ عَلٰی لَاْوَائِھَا وَجَھْدِھَا اِلَّا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا اَوْ شَھِیْدًا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

رواہ مسلم

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حرم قرار دیتا ہوں مدینہ کے دونوں طرف کے سنگستانی کناروں کے درمیان کے علاقوں کو (یعنی اس کے واجب الاحترام ہونے کا اعلان کرتا ہوں، اور حکم دیتا ہوں کہ) اس کے خاردار درخت کاٹے نہ جائیں اور اس میں رہنے والے جانوروں کو شکار نہ کیا جائے ـــــ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ (بعض اشیاء کی کمی اور بعض تکلیفوں کے باوجود) مدینہ لوگوں کے لیے بہتر ہے، اگر وہ اس کی خیر و برکت کو جانتے (تو کسی تنگی اور پریشانی کی وجہ سے اور کسی لالچ میں اس کو نہ چھوڑتے) جو کوئی اپنی پسند اور خواہش سے اس کو چھوڑ کے جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اپنے کسی ایسے بندہ کو بھیج دے گا جو اس سے بہتر اور افضل ہو گا۔ (یعنی کسی کے اس طرح چلے جانے سے مدینہ میں کوئی کمی نہیں آئے گی بلکہ وہ جانے والا ہی اس کی برکات سے محروم ہو کر جائے گا) اور جو بندہ مدینہ کی تکلیفوں، تنگیوں اور مشقتوں پر صبر کر کے وہاں پڑا رہے گا میں قیامت کے دن اس کی سفارش کروں گا یا اس کے حق میں شہادت دوں گا۔ (صحیح مسلم)

تشریح) سفارش اس کی کہ اس کے قصور اور اس کی خطائیں معاف کر دی جائیں۔ اور اس کو بخشدیا جائے، اور شہادت اس کے ایمان اور اعمال صالحہ کی اور اس بات کی کہ یہ بندہ تنگیوں تکلیفوں پر صبر کیے ہوئے مدینہ ہی میں پڑا رہا۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ

لَا یَصْبِرُ عَلٰی لَاوَاءِ الْمَدِیْنَۃِ وَشِدَّتِہَا اَحَدٌ مِّنْ اُمَّتِیْ اِلَّا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا جو امتی مدینہ کی تکلیفوں اور سختیوں پہ صبر کرکے وہاں رہے گا، میں قیامت کے دن اس کی شفاعت اور سفارش کروں گا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ کَانَ النَّاسُ اِذَا رَأَوْا اَوَّلَ الثَّمَرَۃِ جَاؤُا بِہٖ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِذَا اَخَذَہٗ قَالَ اَللّٰہُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ مَدِیْنَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ مُدِّنَا اَللّٰہُمَّ اِنَّ اِبْرَاہِیْمَ عَبْدُكَ وَخَلِیْلُكَ وَنَبِیُّكَ وَاِنِّیْ عَبْدُكَ وَنَبِیُّكَ وَاِنَّہٗ دَعَاكَ لِمَکَّۃَ وَاَنَا اَدْعُوْكَ لِلْمَدِیْنَۃِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَکَّۃَ وَمِثْلِہٖ مَعَہٗ ثُمَّ قَالَ یَدْعُوْا اَصْغَرَ وَلِیْدٍ لَہٗ فَیُعْطِیْہِ ذٰلِكَ الثَّمَرَ ــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں کا دستور تھا کہ جب وہ درخت پر نیا پھل دیکھتے تو اس کو لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے، آپ اس کو قبول فرماکر اس طرح دعا فرماتے ــــــ "اے اللہ ہمارے پھلوں میں اور پیداوار میں برکت دے اور ہمارے شہر مدینہ میں برکت دے اور ہمارے صاع اور ہمارے مُد میں برکت دے! الٰہی ابراہیم تیرے خاص بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں انھوں نے مکہ کے لیے تجھ سے دعا کی تھی اور میں مدینہ کے لیے تجھ سے ویسی ہی دعا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ اتنی ہی مزید ــــــ پھر آپ کسی چھوٹے بچے کو بلاتے اور وہ نیا پھل اس کو دے دیتے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) پھلوں اور پیداوار میں برکت کا مطلب تو ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو اور فصل بھرپور ہو۔ اور شہر مدینہ میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ خوب آباد ہو اور اس کے

رہنے والوں پر اللہ کا فضل ہو ـــــ اور صاع اور مُد دو پیمانے ہیں، اُس زمانہ میں غلہ وغیرہ کی خرید و فروخت ان پیمانوں ہی سے ہوتی تھی، ان میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاع یا ایک مُد جتنے آدمیوں کے لیے یا جتنے دنوں کے لیے کافی ہوتا ہے اُس سے زیادہ کے لیے کافی ہو۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی اس دُعا کا ذکر ہے جو آپ نے اپنے بیوی بچہ کو مکہ کی غیر آباد اور بے آب و گیاہ وادی میں بسا کر اللہ سے اُن کے لیے کی تھی کہ اے اللہ تو اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت و مودّت ڈال دے اور ان کو ان کی ضرورت کا رزق اور پھل وغیرہ پہونچا اور یہاں کے لیے امن اور سلامتی مقدر فرما!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور نظیر اس ابراہیمی دُعا کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے مدینہ کے لیے وہی دُعا بلکہ مزید اضافے کے ساتھ کرتے تھے ـــــ اس دُعا کا یہ ثمرہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا بھر کے جن ایمان والے بندوں کو مکہ سے محبت ہے اُن سب کو مدینۂ طیبہ سے بھی محبت ہے اور اس محبوبیت میں تو اس کا حصہ مکہ سے یقیناً زیادہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دُعا میں حضرت ابراہیم کو اللہ کا بندہ، اس کا نبی اور اس کا خلیل کہا اور اپنے کو صرف بندہ اور نبی کہا، حبیب ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ تواضع اور کسر نفسی آپ کا مستقل مزاج تھا۔

بالکل نیا اور درخت کا پہلا پھل چھوٹے بچہ کو بلا کر دینے میں یہ سبق ہے کہ ایسے موقعوں پر چھوٹے معصوم بچوں کو مقدم رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ نئے پھل اور کم سن بچے کی مناسبت بھی ظاہر ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَنْفِیَ الْمَدِیْنَةُ شِرَارَهَا كَمَا یَنْفِی الْكِیْرُ خَبَثَ الْحَدِیْدِ ـــــ رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اُس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مدینہ اپنے فاسد اور خراب عناصر کو اس طرح باہر نہ پھینک دے گا جس طرح لوہار کی بھٹی لوہے کے میل کو

دور کر دیتی ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) یعنی قیامت آنے سے پہلے مدینہ کی آبادی کو ایسے خراب عناصر سے پاک صاف کر دیا جائے گا جو عقائد و افکار اور اعمال و اخلاق کے لحاظ سے گندے ہوں گے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَنْقَابِ الْمَدِيْنَةِ مَلَائِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُوْنُ وَلَا الدَّجَّالُ۔

—— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مدینہ کے راستوں پر فرشتے مقرر ہیں اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہو سکتا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) صحیحین ہی کی بعض دوسری حدیثوں میں مدینہ طیبہ کے ساتھ مکہ معظمہ کی بھی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ دجال اس میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہ غالباً ان دعاؤں کی برکات میں سے ہے جو اللہ کے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اللہ کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مقدس و مبارک شہروں کے لیے کی تھیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَاِنِّیْ اَشْفَعُ لِمَنْ يَّمُوْتُ بِهَا —— رواہ احمد والترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اس کی کوشش کر سکے کہ مدینہ میں اس کی موت ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ (اس کی کوشش کرے اور) مدینہ میں مرے۔ میں ان لوگوں کی ضرور شفاعت کروں گا جو مدینہ میں مریں گے (اور وہاں دفن ہوں گے)

(مسند احمد، جامع ترمذی)

(تشریح) ظاہر ہے کہ یہ بات کہ موت فلاں جگہ آئے، کسی کے اختیار میں نہیں ہے، تاہم بندہ اس کی آرزو اور دعا کر سکتا ہے اور کسی درجہ میں اس کی کوشش بھی کر سکتا ہے مثلاً

یہ کہ جس جگہ مرنا چاہے وہیں جا کے پڑ جائے، اگر قضا و قدر کا فیصلہ خلاف نہیں ہے تو موت وہیں آئے گی ــــــ بہر حال حدیث کا مدعا یہی ہے کہ جو شخص یہ سعادت حاصل کرنا چاہے وہ اس کے لیے اپنے امکان کی حد تک کوشش کرے اخلاص کے ساتھ کوشش کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ جَالِسًا وَقَبْرٌ يُحْفَرُ بِالْمَدِيْنَةِ فَاطَّلَعَ رَجُلٌ فِي الْقَبْرِ فَقَالَ بِئْسَ مَضْجَعُ الْمُؤْمِنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِئْسَ مَا قُلْتَ قَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ لَمْ اُرِدْ هٰذَا اِنَّمَا اَرَدْتُ الْقَتْلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا مِثْلَ الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا عَلَى الْاَرْضِ بُقْعَةٌ اَحَبُّ اِلَيَّ اَنْ يَكُوْنَ قَبْرِيْ فِيْهَا مِنْهَا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ــــــ رواہ مالک مرسلاً

یحییٰ بن سعید انصاری تابعی سے بطریق ارسال روایت ہے (یعنی وہ صحابی کا واسطہ ذکر کیے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ کے قبرستان میں) تشریف فرما تھے اور (کسی میت کی) قبر کھودی جا رہی تھی۔ ایک صاحب نے قبر میں جھانک کر دیکھا اور ان کی زبان سے نکلا کہ مسلمان کے لیے یہ اچھی آرام گاہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہاری زبان سے بہت بری بات نکلی، (ایک مسلمان کو مدینہ میں موت اور قبر نصیب ہوئی اور تم کہتے ہو کہ مسلمان کے لیے یہ آرام گاہ اچھی نہیں) اُن صاحب نے (بطور معذرت) عرض کیا حضور میرا مطلب یہ نہیں تھا (کہ مدینہ میں موت اور قبر اچھی نہیں) بلکہ میرا مقصد راہ خدا میں شہادت سے تھا (یعنی میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ مرنے والے بھائی اگر بستر پر مرنے اور اس قبر میں دفن ہونے کے بجائے جہاد کے کسی میدان میں شہید ہوتے اور ان کی لاش وہاں خاک و خون میں تڑپتی تو اس قبر میں دفن ہونے سے یہ زیادہ اچھا ہوتا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راہ خدا میں

شہید ہونے کے برابر تو نہیں (یعنی شہادت کا مقام تو بیشک بلند ہے، لیکن مدینہ میں مرنا اور اس کی خاک میں دفن ہونا بھی بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہے) روئے زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اپنی قبر کا ہونا مجھے مدینہ سے زیادہ محبوب ہو —— یہ بات آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائی۔ (موطا امام مالک)

(**تشریح**) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ شہادت فی سبیل اللہ کی فضیلت وعظمت بیشک مسلم ہے اور بستر پر مرنا اور میدانِ جہاد میں اللہ کے لیے سر کٹانا برابر نہیں لیکن مدینہ میں مرنا اور یہاں دفن ہونا بھی بڑی خوش بختی ہے جس کی خود مجھے بھی چاہت اور آرزو ہے۔

امام بخاری نے اپنی جامع صحیح بخاری میں کتاب الحج کے بالکل آخر میں مدینۂ طیبہ کے فضائل کے سلسلہ کی حدیثیں ذکر کرنے کے بعد اس بیان کا خاتمہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی اس مشہور دعا پر کیا ہے کہ

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ"

اے اللہ مجھے اپنی راہ میں شہادت بھی دے اور اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک شہر (مدینہ) میں مرنا اور دفن ہونا بھی نصیب فرما!

اس دعا کا واقعہ ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت کیا ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ خواب حضرت عمر سے بیان کیا۔ حضرت عمر نے بڑی حسرت سے کہا۔

اَنّٰى لِي بِالشَّهَادَةِ وَاَنَا بَيْنَ ظَهْرَانَيْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ لَسْتُ اَغْزُو وَالنَّاسُ حَوْلِي۔	مجھے شہادت فی سبیل اللہ کیسے نصیب ہو سکتی ہے جبکہ میں جزیرۃ العرب کے درمیان مقیم ہوں (اور وہ سب دار الاسلام بن چکا ہے) اور میں خود جہاد نہیں کرتا اور اللہ کے بندے ہر وقت میرے آس پاس رہتے ہیں۔

پھر خود ہی کہا۔

"یکلی یاتی بھا اللہ یاتشاء" (فتح الباری بحوالہ ابن سعد)

مجھے شہادت کیوں نہیں نصیب ہو سکتی، اگر اللہ چاہے گا تو انہی حالات میں مجھے شہادت سے نوازے گا۔

اس کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے وہ دعا کی جو اوپر درج کی گئی ہے۔ آپ کی زبان سے یہ دعا سُن کر آپ کی صاحبزادی اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ راہِ خدا میں شہید بھی ہوں اور موت مدینہ میں بھی ہو؟ آپ نے فرمایا اللہ چاہے گا تو یہ دونوں باتیں ہو جائیں گی۔

اس سلسلہ کی روایات میں یہ بھی ہے کہ لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس عجیب و غریب اور بظاہر ناممکن سی دُعا سے تعجب ہوتا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ جب ابولؤلؤ نے مسجد نبوی کی محراب میں آپ کو زخمی کیا تب سب نے سمجھا کہ دُعا کی قبولیت اس طرح مقدر تھی۔[۱]

بیشک جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس چیز کو واقع کر کے دکھا دیتا ہے جس کے امکان میں بھی انسانی عقلیں شبہ کریں۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

---

[۱] فتح الباری جزء سابع آخر کتاب الحج ۱۲

تجلیاتِ مجدّدِ الفِ ثانی

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ ــــ از ــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۷۰) مولانا محمد اسحٰق ولد قاضی موسیٰ کے نام ـــــــ

[در ترغیبِ صحبتِ صاحبدلان]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــــ رحم علی درویش کے ہاتھ جو مکتوب بھیجا تھا مل گیا۔ چونکہ وہ ذوق وشوق کی اطلاع دے رہا تھا اس لیے اس نے مسرت بخشی۔ ایک علیٰحدہ کاغذ پر اپنا خواب بھی لکھا تھا اُس کے مطالعے سے فرحت پر فرحت ہوئی۔ اس قسم کے واقعات (خواب) مُبَشِّرات ہیں۔ سعی کرنا چاہیئے کہ قوت سے فعل میں اور گوش سے آغوش میں آجائیں۔ آج جب کہ کوتاہیوں کا تدارک ممکن ہے فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے اور (اس کارِ خیر میں) یہ کہہ کر کہ "عنقریب اس کو انجام دے لوں گا" تاخیر اور ٹال مٹول نہیں کرنی چاہیئے ـــــــ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ ہم درویشوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ اس مجلس میں جمعہ کی اس ساعت کا ذکر چھڑا جس میں قبولیتِ دعا کی قوی اُمید ہوتی ہے ـــــــ دورانِ گفتگو میں یہ بات بھی آئی کہ جمعہ کی وہ ساعتِ مقبولہ کسی کو میسر آجائے تو حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے کیا طلب کرنا چاہیئے؟ ہر ایک نے اپنی اپنی مطلوب چیز کو بتایا جب میرے بتانے کی نوبت آئی تو میں نے کہا کہ "(اس ساعت میں) صحبتِ اربابِ جمعیّت کو طلب کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس کے ضمن میں تمام سعادتیں میسر آجاتی ہیں" ـــــــ بعض مکاتیب کو نقل کرا کے قاصد کے ہاتھ

بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے بہرہ ور فرمائے ـــــ برادر شیخ کریم الدین کچھ عرصے سے یہاں آئے ہوئے ہیں وہ اپنے حالات شاید خود ہی تم کو لکھ کر بھیجیں ـــــ دوستوں سے دعا کی توقع ہے ـــــ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اے ہمارے رب ہمارے نور کو مکمل کردے اور ہمیں بخش دے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے) والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ

مکتوب (۲۷) خواجہ حسام الدین احمدؒ کے نام ـــــ

[قیامِ لشکر کے کچھ حالات اور ایک استفسار کا جواب]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ مکتوب گرامی جو ازروئے کرم و شفقت آپ نے اس فقیر کو بھیجا تھا اُس کے مطالعے سے مشرف ہوا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ آپ صحت و عافیت سے ہیں اور اپنے دور افتادہ دوستوں کی پرسش احوال سے فارغ و بے فکر نہیں ہیں ـــــ اس طرف کے فقراء کے احوال و اوضاع، لائق حمد ہیں۔ عین بلا میں عافیت ہے اور ایسی جگہ جہاں تفرقۂ قلب کا اندیشہ تھا ـــــ جمعیت قلب حاصل ہے ـــــ میرے فرزند اور احباب جو ہمراہ ہیں ان کے اوقات، اطمینان کے ساتھ گزر رہے ہیں ـــــ نیز اُن کے احوال، ترقی پر ہیں ـــــ اُن کے حق میں لشکر نے ایک خاص خانقاہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ لشکریوں کے رنگ برنگ حالات کی موجودگی میں ساتھیوں کو تمکین نصیب ہے اور مختلف و متفرق پھندوں کے اندر رہ کر جو کہ لشکر کے لوازم میں سے ہیں۔ ہمارے آدمی بس ایک ہی مطلب و مقصد میں گرفتار ہیں ـــــ نہ کسی لشکری کو ان سے سروکار نہ ان کو کسی سے ناگواری ـــــ ان سب باتوں کے باوجود (اختیار کچھ بھی نہیں رکھتے بلکہ) ہم مسلوب الاختیار ہیں اور (یک گونہ) حبس و قید کی حالت میں ہیں ـــــ یہ عجیب حبس ہے کہ اس سے رہائی کو ایک جَو کے عوض بھی نہ خریدیں اور عجیب قید ہے کہ اس سے آزادی کو ایک کوڑی کے بدلے بھی قبول نہ کریں ـــــ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اس نعمت پر بھی اور اسکی تمام بڑی بڑی نعمتوں پر ـــــ

مخدوما! قرۃ العینین (ہر دو صاحبزادگان حضرت مرشد خواجہ باقی باللہؒ) کو جو مکتوب بھیجا گیا تھا اُس سے مقصود، صرف اظہارِ حسرت تھا بعض اُن نعمتوں کے فوت ہوجانے پر کہ دہلی کے پڑوس (سرہند) میں (ہماری قید و بند سے قبل) اُن نعمتوں کا حصول (صاحبزادوں کے لئے) متوقع تھا ـــــــ اب اُن کا لشکر میں آنا اور یہاں پر ہماری صحبت اختیار کرنا یہ آپ کی صوابدید پر موقوف ہے کیونکہ آپ "لشکر و لشکریاں" کے طور طریقوں کو خوب جانتے ہیں اور اس جگہ کے نفع و ضرر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ـــــ آپ نے لکھا تھا کہ "اگر تم لکھو کہ صاحبزادگان (لشکر میں آکر) آفات سے محفوظ رہیں گے تو وہ (بغرض کسبِ فیضِ صحبت) لشکر میں آجائیں" ـــــــ غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے ـــ لیکن اللہ کا شکر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ باوجود فوجیوں سے کثرتِ اختلاط کے ہمراہیوں میں سے کسی شخص کو اس وقت تک کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی جس کو آفتِ تفرقہ کہہ سکیں ـــ (لشکر نے) میرے ہمراہیوں کو اُن کے مطلبِ حقیقی سے نہیں روکا ـــــــ دوسری بات مولود خوانی کے بارے میں آپ نے لکھی تھی کہ ـــ اُس کے اندر اچھی آواز سے قرآن پڑھنے اور قصائدِ نعت و منقبت پڑھنے میں کیا مضائقہ ہے؟ ممنوع تو یہ ہے کہ قرآن اس طرح پڑھیں کہ حروفِ قرآن میں تحریف و تغیر واقع ہو جائے اور موسیقی کی رعایت کرتے ہوئے آواز کو .... گھمایا جائے اور اس طرح تو شعر پڑھنا بھی غیر مباح ہے چہ جائیکہ قرآن مجید ـــ البتہ اگر قرآن مجید کو اس طرح پڑھا جائے کہ کسی قسم کا کوئی تغیر، کلماتِ قرآنی میں واقع نہ ہونے پائے تو کیا حرج ہے؟ اسی طرح قصائد نعت و منقبت کو اس طرح پڑھیں کہ اس میں مقاماتِ نغمہ کی رعایت نہ ہو اور تالی بجانا بھی نہ ہو اور نیت بھی صحیح ہو تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟"

مخدوما! خاطرِ فقیر میں یہ بات آتی ہے کہ جب تک مطلقاً یہ دروازہ بند نہ کیا جائے گا بوالہوس لوگ باز نہیں آئیں گے اگر تھوڑی سی اجازت دیدی گئی تو بات بہت دور تک پہونچ جائے گی ـــ قلیلہ یُفضی الیٰ کثیرہٖ (تھوڑا بہت تک پہنچاتا ہے) ـــــ والسّلام

مکتوب (۸۷) صاحبزادگان گرامی قدر (خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ) کے نام۔

[اظہار اشتیاق و تذکرہ ثمرات و نتائج لشکر]

الحمد للہ والصلوٰۃ علی رسول اللہ ــــــ فرزندانِ گرامی اگرچہ ہماری صحبت میں ہمیشہ رہنے کے مشتاق و خواہاں ہیں اور ہم بھی اُن کو اپنے پاس حاضر رکھنے اور اُن کی ملاقات کے آرزومند ہیں لیکن کیا کیا جائے تمام آرزوئیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔

ع ــــ تَجْرِی الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِی السُّفُنُ [۱]

میں تو لشکر کے طور و طریق کے ماتحت، بے اختیار اور بے خواہش و رغبت رہنا بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں اور اس مقام کی ایک ساعت کو دوسرے مقامات کی بہت سی ساعتوں سے بہتر تصور کرتا ہوں۔ اس جگہ (لشکر میں) وہ (بات) حقیقی طور پر میسر ہے جس کی ظاہری شکل بھی مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے مقامات پر میسر ہو سکتی ہے ــــ اس مقام کے علوم و معارف بھی جدا ہیں، اس مجمع کے احوال و مقامات بھی علیحدہ ہیں جو (رکاوٹ اور نظر بندی) سلطانِ جہانگیر کی طرف سے ہے اس کو میں تو مولائے حقیقی کی انتہائی رافت و رضامندی کا دروازہ جانتا ہوں اور اس محبوسی کے اندر اپنی سعادت سمجھتا ہوں ــــ علی الخصوص اِن ایامِ اختلاف میں اور اِن "اوقاتِ پرتفرقہ" میں عجیب و غریب معاملہ اور چشم و ابروئے محبوبِ حقیقی کے اشارات نیز اس کے ناز و ادا کے کرشمے (ظاہر ہو رہے) ہیں ــــ لیکن جو دولتِ تازہ و عجیب روز بروز (قلب پر) وارد ہو رہی ہے ــــ (اس کی وجہ سے) فرزندوں کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے اور اُن کی دوری اور نارسائی سے جگر، اضطراب میں رہتا ہے ــــ میں سمجھتا ہوں کہ میرا اشتیاق تمھارے اشتیاق سے بڑھا ہوا ہے اور یہ بات مُسلّم ہے کہ باپ جتنا بیٹے کو چاہتا ہے۔ بیٹا اتنا باپ کو نہیں چاہتا۔ اگرچہ

---

[۱] بعض اوقات ہوائیں کشتیوں کی آرزوؤں کے برخلاف چلا کرتی ہیں یعنی کبھی ہوائیں کشتیوں کی سمتِ رفتار کے مخالف چلتی ہیں۔

اصالت و فرعیت کا معاملہ اس کے برعکس کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ اصل کو احتیاج نہیں ہوتی اور فرع سراسر محتاجِ اصل ہے ــــ لیکن ازل سے کچھ ایسا ہی طے ہوا ہے ا ہ اصل (بابا) کا شوق و اشتیاق، قوی تر ثابت ہوگیا ہے ــــ ہاں ٹھیک ہے ع

در خانہ بگدر خدائے ماند ہمہ چیز

(گھر میں صاحبِ خانہ کے دم سے سب چیزیں برقرار رہتی ہیں) ــــ اگر (بسلسلۂ قیام لشکر) دہلی میں ہوں تو تمہارا ہمسایہ ہوں اور آگرہ میں ہوں تب بھی بفضلِ خداوندی تم سے قریب ہوں۔ والسّلام۔

مکتوب (۷۹) خواجہ محمد معصومؒ کے نام ــــ

[ایک طویل مکتوب کے آخر کی چند سطریں]

.... شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ وہ ہیں جنھوں نے سخنِ معرفت و عرفان کی بنیاد رکھی ہے اور اس کو شرح و بسط کا جامہ پہنایا ہے، وہی ہیں جنھوں نے توحید و اتحاد کے متعلق تفصیل سے بات کہی ہے اور تعدد و تکثر کے منشا کو بیان فرمایا ہے۔ وہی ہیں کہ تنزلاتِ خمسہ کو وجود کے لئے ثابت کیا ہے اور ہر مقام کے جدا جدا احکام پیش کئے ہیں۔ انھوں نے عالم کو عینِ حق جانا اور ہمہ اوست کہا ہے اس کے باوجود مرتبۂ تنزیہ حق سبحانہٗ کو وراء الورا پایا ہے اور سب کی دید و دانش سے اللہ تعالیٰ کو منزّہ و مبرّا سمجھا ہے۔ ان سے پہلے جو مشائخ ہوئے ہیں انھوں نے اس توحید کے بارے میں اگر کوئی بات کہی ہو تو اشارات و رموز میں کہی ہے شرح و تفصیل میں مشغول نہیں ہوئے ہیں۔ جو مشائخ، شیخ اکبرؒ کے بعد ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر نے تقلیدِ شیخ اختیار کی ہے اور ان کی اصطلاح کے موافق گفتگو کی ہے۔ ہم پسماندگان نے بھی شیخ اکبرؒ کی برکات سے بہت کچھ استفاضہ کیا ہے اور اُن کے علوم و معارف سے بہت کچھ حصّہ لیا ہے اللہ تعالیٰ اُن کو ہماری جانب سے بہترین جزا دے ــــ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بحکمِ بشریت خطا و صواب کے مقام چونکہ آپس میں مختلف ہوجایا کرتے ہیں اور انسان سے کبھی (کسی مسئلے میں) بے قصد خطا ہو جاتی ہے اور کبھی وہ صحت و صواب کی منزل پر گامزن ہوتا ہے ایسی صورت میں

ضروری ہوا کہ احکام سوادِ اعظم اہل حق کی موافقت کو معیارِ صحت و ثواب بتایا جائے اور اہل حق کے سوادِ اعظم کی مخالفت کو دلیل خطا سمجھا جائے ـــــ قائل کوئی بھی ہو اور مقولہ کچھ بھی ہو ـــــ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "تم اہل اسلام کے سواد اعظم کا اتباع کرو" ـــــ اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ فکرہائے مختلف کے مل جانے اور اختلافِ نظریات کے ذریعے تکمیل صناعت وجود میں آتی ہے ـــــ (دیکھو) سیبویہ کے متعلق ہرچند یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ بانیٔ احکام نحو ہے لیکن جس نحو نے متاخرین کے افکار کے باہم جمع ہوجانے اور ان کے نظریات کے اختلاف سے کمال و تنقیح کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور ایک نئی زیب و زینت پائی ہے اُس نحو کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ نوع دیگر ہوگئی ہے اور اُس نے علیحدہ احکام پالئے ہیں ـــــ

رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ـــــ والسلام۔

مکتوب (۸۲) صاحبزادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام۔

[اظہارِ آلامِ فراق]

الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ فرزندانِ گرامی جمعیتِ صوری و معنوی کے ساتھ متصف رہیں ـــــ میں ان (لشکری) سفروں اور مشقتوں میں کوئی درد بھی تم دونوں عزیز فرزندوں کی مفارقت کے برابر نہیں محسوس کرتا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تمہاری یاد سے فارغ ہوں ـــــ جس قدر منعم حقیقی جلّ شانہٗ کی نعمتوں کا حصول زیادہ ہے اسی قدر دور افتادہ عزیزوں کی یاد بڑھ رہی ہے ـــــ احوالِ جدیدہ روزانہ مسودہ سے بیاض میں پہونچتے ہیں لیکن اُن کو سمجھنے والا اور ان سے حصہ حاصل کرنے والا یہاں پر کون ہے؟ خواجہ محمد ہاشم (کشمی) بھی غنیمت ہیں جو ذوقِ فہم سخن رکھتے ہیں اور فی الجملہ لذت یاب ہوتے ہیں لیکن وہ اس سفر اجمیر میں شدّتِ مشقت کی وجہ سے اُن متخلفین میں سے ہوگئے ہیں جن کا عذر صحیح ہے۔ شاید وہ کچھ دنوں اور ہماری رفاقت میں رہیں ـــــ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ (بس اللہ ہم کو کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے) رفقاء بھی کم ہیں اور زادِ راہ بھی قلیل ہے ـــــ

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ــــ (کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے)
کیوں نہیں وہ بیشک کافی ہے ــــ دوسری بات یہ لکھنی ہے کہ تمھاری مفارقت سے
مغموم ہو کر ایک رات بعد از نمازِ تہجد خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم دونوں بھائی ہمارے دوستوں
میں سے ایک دوست کے ساتھ ایک بادشاہ کے وکیل کے پاس گئے ہو تاکہ بادشاہ کے
یہاں ملازم ہو جاؤ اور (بادشاہ کی طرف سے) ملازمت کی تجویز اُس وکیل کے سپرد کر دی
گئی ہے کہ وہ جس کسی کو نوکری کے قابل جانے اُس کو نوکر رکھ لے اور جس کسی کو نوکر تجویز
کرے ایک ورق پر اُس کا حلیہ لکھے اور اُس ورق کے کنارے پر لکھے کہ (اِس کو) نوکر
رکھ لیں" ــــ ان تینوں اشخاص میں سے تم دونوں کا چہرہ وکیل نے لکھا ہے اور نوکری
تجویز کر دی ہے اُس تیسرے شخص کا نہ حلیہ لکھا نہ اُس کو نوکر رکھا ــــ میں نے تم دونوں سے
دریافت کیا ہے کہ (وکیل نے) اس تیسرے کا حلیہ کیوں نہ لکھا؟ تم نے کہا کہ حلیہ لکھتے
وقت وکیل نے اپنے منھ کو اُس تیسرے کے مُنھ کے قریب کیا اور بہت غور سے اُس کو
دیکھا اور کہا کہ یہ چہرہ سیاہی رکھتا ہے ــــ یا اِسی کے مُرادف کوئی لفظ کہا اور یہ کہہ کر
چہرہ نہیں لکھا ــــ الحمد للہ کہ میرا دل تم دونوں کی جانب سے مطمئن ہو گیا کہ تم کو قبول کر لیا
گیا ــــ لیکن اُس تیسرے دوست کی طرف سے دل میں تشویش رہی کہ وہ نوکری کے لئے
تجویز نہیں ہوا ــــ کاش اُس کو نوکرانِ بادشاہ کسی نوکری میں قبول فرما لیں ــــ
العَاقِبَۃُ بِالخَیر (انجام بخیر ہو) ــــ

مکتوب (۸۳) صاحبزادگانِ کبار کے نام ــــ

[برکاتِ عسکر]

فرزندانِ گرامی، جمعیتِ قلب کے ساتھ رہیں ــــ ہمارے آدمی ہماری
مشقتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس تنگی (نظر بندی) سے ہماری رہائی چاہتے ہیں وہ یہ نہیں
جانتے کہ نامرادی و بے اختیاری اور ناکامی کے اندر کس قدر حُسن و خوبی ہے ــــ بھلا
کونسی نعمت اس نعمت کے مساوی ہے کہ کسی شخص کو بے اختیار اُس کے اختیار سے نکال
لیں اور خود اپنے ہی اختیار سے اُس کو زندگانی دیں نیز اُسکے اُمورِ اختیاری کو بھی تابع

بے اختیاری کرکے اُس کو دائرۂ اختیار سے باہر کردیں اور مردہ بدست زندہ کی مانند بنا دیں۔ قیدِ گوالیار کے زمانے میں بھی جب کبھی اپنی ناکامی و بے اختیاری کا مطالعہ کرتا تھا تو عجیب لطف اور طُرفہ ذوق محسوس کرتا تھا ـــــــ ہاں بات یہ ہے کہ راحت و آرام والے ذوقِ اربابِ بلا کو کیا جانیں اور جمالِ بلا کا کیا ادراک کریں؟ بچّوں کو تو بس شیرینی ہی میں لذت محسوس ہوتی ہے اور جس نے تلخی سے حصّہ لیا ہو وہ تو شیرینی کو ایک جَو کے عوض میں بھی نہیں خریدے گا ـــــ ع

مُرغِ آتشخوارہ کے لذّت شناسد دانہ را

(آگ کھانے والا پرندہ دانے کی لذّت کیا جانے اُس کی خوراک تو آگ ہی ہے)

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ـــــــ

مکتوب (۵۴) حافظ عبدالغفور کے نام ـــــ

[آدابِ طریقہ]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــــ اِس راہ کے طالب کو چاہیے کہ اہلِ حق کی صحیح رائے کے موافق تصحیحِ عقائد کرنے کے بعد اپنے تمام اوقات کو ذکرِ الٰہی میں مشغول رکھے بشرطیکہ اس ذکر کو کسی کاملِ و مکمل سے اخذ کیا ہو ـــــ اس لئے کہ ناقص کے ذریعے کوئی کامل نہیں بنتا ـــــ اور اپنے اوقات کو ذکر سے اِس طرح معمور رکھے کہ سوائے ادائے فرائض و سنن موکدہ کے کسی چیز میں مشغول نہ ہو حتیٰ کہ (ذکر میں پختگی پیدا ہونے تک) تلاوتِ قرآن مجید اور عباداتِ نافلہ کو بھی (کچھ عرصے) موقوف رکھے ـــ باوضو اور بے وضو ذکر کرے اور کھڑے، بیٹھے، لیٹے اسی میں مشغول رہے۔ نیز چلتے پھرتے اور کھاتے اور سونے کے وقت بھی ذکر سے خالی نہ ہو۔

ذکر گو ذکر تا ترا جان است
پاکیٔ دل ز ذکرِ رحمٰن است

ؔ۵ جب تک تیری جان میں جان ہے ذکر کرتا رہ ـ دل کی پاکی ذکرِ رحمٰن کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے

یہاں تک کہ ماسوی، بطریق وسوسہ بھی اُس کے دل میں نہ گذرنے پائے ـــــ اور غیر کا وسولہ تکلف کے ساتھ بھی دل میں لانا چاہے تو نہ لاسکے۔ بوجہ اُس نسیان کے جو دل کو غیر اللہ کی طرف سے ہوگیا ہو ـــــ اور یہ نسیان جو کہ دل کو تمام ماسوائے مطلوب سے حاصل ہوگیا ہے، حصولِ مطلوب کا صرف ایک مقدمہ و ذریعہ اور مطلوب کے وصول کا بشارت دہندہ ہے ـــــ رہا نفسِ حصولِ مطلوب اور وصولِ حقیقی بمقصود ـــــ اُس کے متعلق کیا لکھوں وہ تو وراء الورا ہے ـــــ

کیف الوصول الی سعاد ودونها
قلل الجبال ودونهن حتوف[۱]

برادرِ عزیز پہلے اس سبق کو جب بعنایت اللہ، انجام کو پہنچا لیں تب اس کے بعد دوسرا سبق حاصل کریں ـــ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے ـــــ والسلام علی من اتبع الہدیٰ ـــــ

مکتوب (۵۸) صاحبزادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام۔

[حفظِ اوقات کی نصیحت]

اس طرف کے احوال و اوضاع، لائقِ حمد ہیں ـــــ میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری سلامتی اور استقامت کا خواستگار رہوں ـــ اگر جمعیت پہونچا ہوا اور شدائد راہ کی گھاٹیوں اور سخت گرمی سے نجات میسر ہوئی تو میں تم کو لکھوں گا اور اپنے پاس بلاؤں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ـــــ مطمئن رہیں اور اپنی تمام تر ہمت مرضی مولیٰ تعالیٰ میں مصروف رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ بے فکری اور حفظِ نفس میں پڑ جاؤ اور اہل و عیال کے ساتھ بہت زیادہ اُنس و محبت پیدا کر کے کارخانہ اہم میں فتور و خلل ڈالو ـــــ ایسا کیا تو سوائے محرومی و ندامت کے کوئی چیز نقدِ وقت نہ ہوگی اور کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس صحبتِ ذکر اور اس

---

[۱] سعاد، محبوبہ تک رسائی کیونکر ہو در آنحالیکہ اُس سے ورے پہاڑ کی چوٹیاں ہیں اور چوٹیوں سے پہلے بہت سی پہاڑی بلندیاں و پستیاں ہیں ـــ

دولتِ باطنی کو غنیمت جانیں اور اہم امور میں [illegible] کریں ـــــ خیر شرط ہے ـــ
ہم نے اپنے معارف جدیدہ جو تم کو لکھے ہیں وہ تمہارے لئے ایک سبق کے بعد دوسرے سبق
کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ سرسری طور پر اُن سے نہ گزریں۔ اہتمام اور جد و جہد کے ساتھ
ان کے مطالعے میں کوشاں ہوں ـــ ممکن ہے کہ اُن معارف کے اندر سے کوئی دریچہ کھل کر
سرمایۂ سعادت بن جائے ـــ تم دونوں کے بارے میں میں نے جو بشارت پائی ہے اُس
کو ایک مکتوب میں لکھ کر خواجہ محمد ہاشم کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ تم تک پہونچا دیں ـــــ
اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے کرم سے، تم کو ضائع نہ کرے گا اور قبول فرمائے گا ـــ لیکن
ترسان و لرزاں رہیں اور لہو و لعب میں زندگی نہ گزاریں ـــ ایسا نہ ہو کہ ہماری صحبت
کی دوری تمہارے اندر کچھ اثر کر جائے ـــــ حضرت حق سبحانہٗ سے التجا و تضرع و زاری
کرتے رہیں اور اہلِ حقوق سے بقدرِ ضرورت اختلاط رکھیں اور ان کی دلجوئی کریں ـــ
گھر کی عورتوں کو رفقاء تصیحت کرتے ہوئے زندگی بسر کریں اور ان کے حق میں امر معروف
اور نہی منکر سے باز نہ رہیں۔ تمام اہلِ خانہ کو نماز کی اور صلاح و تقویٰ کی نیز تمام احکام
شرعی کی ادائیگی کی ترغیب دیتے رہیں ـــ اس لئے کہ تم سے (از روئے حدیث) ان سب
کے بارے میں اللہ تعالےٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا ـــ اللہ تعالےٰ نے تم کو علم دیا ہے
اس علم کے مطابق عمل بھی عطا فرمائے اور اس پر استقامت بخشے۔ (آمین)

---

*

معجزہ کی حقیقت

از افادات مولانا فراہی

ترجمہ ــــــــــــــ خالد مسعود صاحب

معجزہ سے مراد وہ کام ہے جو انسان کی قوت اور اس کی تدابیر کی حدود سے باہر ہو۔ اس اعتبار سے نشانیاں معجزہ بھی ہوتی ہیں اور امر رب پر دلیل بھی۔ معجزہ کا یہ مفہوم اس آیت سے واضح ہوتا ہے جس میں قرآن مجید نے انزال مائدہ کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا قول نقل کیا ہے :-

قَالُوا نُرِيدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (مائدہ - ۱۱۳)

انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس مائدہ میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم جان جائیں کہ آپ نے ہمیں سچی بات کہی اور ہم اس پر گواہ بنیں۔

یعنی اگر خدا ہماری اس درخواست پر آسمانی خوان اتار دے گا تو ہم اس بات کا یقین کر لیں گے کہ اسی نے آپ کو رسول بنایا اور آپ جو پیغام خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں وہ واقعی اسی کا ہے۔ یہ معجزہ دیکھ کر ہم آپ کی حقانیت کی گواہی ان لوگوں کے سامنے دیں گے جو یہاں موجود نہیں۔

معجزہ اور شعبدہ میں فرق شعبدہ اور معجزہ میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر محض لہو کے لیے اور ثانی الذکر نعمت و نقمت کے لیے ہوتا ہے۔

شعبدہ کا اثر انسان کے سفلی جذبات پر پڑتا ہے۔ اس کی نشو و نما تقویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی شعبدہ باز نے نہ تو اپنی قوم کی قیادت کی اور نہ اس کو سربلند کیا ہے یہ لوگ ہمیشہ ذلیل و خوار رہے ہیں۔ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى — اور جادوگر جہاں جائے فلاح نہیں پائے گا۔ (طٰہٰ ۶۹)

اس کے برعکس معجزہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس سے نبی اپنے مشن کو ترقی دیتا اور اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتا ہے۔

معجزہ کی ضرورت

زمرۂ انبیاء کا کوئی فرد جھوٹ سے متہم نہیں ہوتا کہ اس کی صداقت کے اثبات کے لیے معجزات آتارنے کی ضرورت ہو۔ بلکہ نبی جب اپنی قوم کو توحید اور آخرت کی حقیقت سمجھاتا ہے تو وہ اس کے صحیح ہونے میں شک کرتی ہے! اس مرحلہ میں نبی کی صداقت کا نہیں بلکہ توحید و معاد کا اثبات ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے ابتدا میں تو وحی کے ذریعے سے نبی کو صرف دلائل عطا ہوتے ہیں تاکہ مخاطبین کی عقل کی گرہیں کھلیں۔ معجزہ ظاہر کرنے سے اس وقت اجتناب کیا جاتا ہے لیکن معاملہ جب اتمام حجت کا ہو، اس وقت نبی کو معجزہ عطا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد قوم کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان کی عقل کسی مثال کو دیکھ کر ایک حقیقت کو مانتی اور اس پر غور کرتی ہے۔ اس لیے معجزہ نبوت کی ایک دلیل بھی ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ معجزہ بطور دلیل بھی آتا ہے۔ فرمایا:-

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ	ہم نے موسیٰ کو کھلی نشانیاں عطا کیں،
بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	بنی اسرائیل سے پوچھو کہ جب وہ ان کے
اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ	پاس آیا تو اس سے فرعون نے کہا، موسیٰ
اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا	میں تو تمھیں سحر زدہ خیال کرتا ہوں۔ موسیٰ
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ	نے جواب دیا تمھیں معلوم ہے کہ ان کو نہیں
اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اُتارا مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے

بَصَآئِرَ ۚ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۰۱-۱۰۲)	نشانیاں بنا کر اور فرعون، میں سمجھتا ہوں کہ تم ہلاکت میں پڑنے والے ہو۔

معجزہ خدا کا فعل ہے یہ دعویٰ کہ معجزہ نبی کا فعل ہوتا ہے شریعت کی رو سے بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معجزہ ظاہر کرنے والا خدا ہے وہ یا تو نبی کے ہاتھ سے معجزہ دکھاتا ہے یا اس کی نبوت کی شہادت کے طور پر خود اتارتا ہے۔ اس حقیقت کی تصریح قرآن کے علاوہ پہلے صحیفوں میں بھی ملتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ (رعد ۳۸)	کسی رسول کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائے۔

دوسری جگہ فرمایا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (ابراہیم ۱۰، ۱۱)	ان کے پیغمبروں نے کہا کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے! وہ تمہیں اس لیے بلاتا ہے کہ تمہارے گناہ بخشے اور تمہیں ایک مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے۔ انھوں نے کہا تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو اور چاہتے ہو کہ ہمیں ان چیزوں سے روکو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے۔ اچھا لاؤ کوئی واضح نشانی۔ رسولوں نے ان سے کہا، ہم تو تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کرتا ہے۔ اور ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائیں۔ اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

یہاں سلطان مبین سے مراد اس عذاب کی نشانیاں ہیں جس سے انبیاء کرام اپنی قوم کو متنبہ کرتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ جس کا مقصود نبی کی رسالت کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر معجزہ نبی کا فعل ہوتا تو یہ اس کی رسالت کی نہیں بلکہ الوہیت کی دلیل ہوتا۔ اسی لیے نبی پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ وہ واضح طور پر یہ کہہ دے کہ معجزہ دکھانا اس کی قوت سے باہر ہے۔

فیصلہ کن معجزہ کا وقت معین ہوتا ہے

نبی کو جو معجزہ قوم پر اتمام حجت کے لیے دیا جاتا ہے اور جس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے، اس کا وقت خدا کے ہاں معین ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب کسی امت کی مہلت میں اضافہ کر دیتا ہے تاکہ وہ معجزہ دیکھے بغیر ہی ایمان لائے۔ اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ ہدایت اس فہم و بصیرت سے نشو ونما پاتی ہے جس کی تربیت نبی کے ہاتھوں ہوتی ہے، اس کے برعکس جو ایمان معجزہ دیکھ کر لایا جائے وہ محض مقلدانہ ایمان ہوتا ہے جس کے بعد نبی کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں کوئی بصیرت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس میں دوسری حکمت یہ ہے کہ فیصلہ کن معجزات کے ظہور کے بعد صرف عذاب باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کو فیصلہ کن معجزات اسی وقت دیے جاتے ہیں جب قوم کے اندر فکر و فہم کے ذریعہ سے ایمان لانے والا کوئی نہیں رہ جاتا، اور جو لوگ معجزہ دیکھنے سے پہلے ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھنے کے بعد بھی کم ہی ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا :-

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ○	پھر ہم نے اس کے بعد رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لائے مگر لوگ جن باتوں کو پہلے جھٹلا چکے تھے ان پر ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم حد سے بڑھ جانے والوں کے دلوں پر اسی طرح

(یونس ۷۴) مہر لگا دیا کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:-

وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ○ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ○	معجزات اور تنبیہات ان لوگوں کے کسی کام نہیں آتیں جو ایمان لانے والے نہیں ہوتے یہ لوگ بھی اسی طرح کے عذاب کے منتظر ہیں جس طرح کے عذاب پہلے لوگوں پر گذر چکے۔ کہو کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔
(یونس ۱۰۱، ۱۰۲)	

پس معجزہ چونکہ قیامت کی مانند فصل و فرقان ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کے ظہور کے وقت کو غیب میں رکھتا ہے اور نبی اس کا منتظر رہتا ہے۔ کبھی کبھی نبی کا دل لوگوں کے باطل پر اکیلا کر لینے سے تنگ ہوتا ہے تو وہ فیصلہ طلب کرنے میں جلدی کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ نبی معجزہ کے بعد آنے والے عذاب کے اندیشے سے ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے جو معجزہ طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام نے فریسیوں سے یہی سلوک کیا۔

"پھر فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لیے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشانی دکھا۔ اس نے جواب میں ان سے کہا شام کو تم کہتے ہو کہ کھلا رہے گا کیونکہ آسمان لال اور دھندلا ہے، تم آسمان کی حرارت میں تمیز کرنا جانتے ہو مگر زمانے کی علامتوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس زمانہ کے برے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ اور وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا"[۱]

متی ۱۶، ۱—۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین عذاب کی جو نشانیاں مانگتے تھے قرآن نے اس کا

---

[۱] مصنف علیہ الرحمہ نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ بائبل کا یہ اقتباس ہم نے خود دیا ہے۔ مصنفؒ کا اشارہ بھی اسی اقتباس یا اس جیسی کسی اور عبارت کی طرف ہوگا ۱۔ خ۔ م

جواب بڑی وضاحت سے دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ نشانیاں خدا کے پاس محفوظ ہیں اور نبی خود ان کے منتظر ہیں۔ فرمایا:-

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۚ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِينَ ○ (یونس ۲۰)	وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہو غیب کا مالک اللہ ہے تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

یعنی عذاب کی جن نشانیوں کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ آئیں گی تو ضرور مگر خدا کے ہاں ان کے آنے کا وقت مقرر ہے، جس کا علم صرف خدا کو ہے۔ میں خود اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

اسی طرح کی آیت یہ بھی ہے:-

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۚ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ○ قُلْ لَّوْ أَنَّ عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ○ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ (انعام ۵۷-۵۹)	کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ چیز نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو، فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ سچی امر بیان کرتا ہے اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے، کہو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان معاملہ طے ہو چکا ہوتا، اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

یہی مضمون آیت ذیل میں بھی بیان ہوا ہے:-

قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ○ لِّكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ	کہو کہ میں تمہارے اوپر داروغہ نہیں ہوں ہر خبر کا وقت معین ہے اور عنقریب تم

تَعْلَمُوْنَ ۝ (انعام ۶۶-۶۷) جان لوگے۔

معجزات کی اقسام انبیاء کے مخاطبین جن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اُن کی دو قسمیں ہیں:-

معجزات کی ایک قسم وہ ہے جن کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کے حال سے بلند ہوتے ہیں، مثلاً خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ، یا یہ مطالبہ کہ ان پر آسمان سے ایک کھلی کتاب اتاری جائے، دوسرے وہ جن کا تقاضا نبی کی قوت کے بارے میں غلط گمان کی بنا پر کیا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ نبی ان کے پاس وہ چیزیں لائے جو ان کو محبوب ہیں، اس کا ایک خزانہ ہو یا اس کے ہمراہ فرشتے نازل ہوں۔

دوسری قسم کے معجزات وہ ہوتے ہیں جن کے جواب میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس تاخیر میں دو مصلحتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ فہم و تقویٰ رکھنے والے لوگ بصیرت کے ساتھ ایمان لائیں، دوسری یہ کہ ایمان نہ لانے والوں پر حجت تمام ہو جائے اور اس مرحلہ سے پہلے ان پر عذاب نہ نازل ہو۔

یہ چار اسباب ہیں جن کی وجہ سے نبی معجزہ دکھانے کا مطالبہ مسترد کر دیتا ہے۔ ہم نے یہاں ان اسباب کا ذکر مجمل طریقہ سے کیا ہے۔ قرآن میں یہ حقائق تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن کی جن آیات میں معجزات کے مطالبہ کو رد کیا گیا ہے اُن سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ عطا نہیں ہوا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں انھوں نے ان آیات کے موقع و محل کو نہیں سمجھا۔ ورنہ قرآن تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں معجزات کے وقوع پر شاہد ہے۔ مثلاً فرمایا:-

وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ	اور جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو
وَقَالُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ	مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو
(صافات ۱۴)	کھلا ہوا جادو ہے۔

قرآن کا معجزہ ہم مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ قرآن اس شخص کیلئے

معجزہ ہے جو اس جیسی کتاب تصنیف کرنے کا دعویٰ کرے۔ لیکن علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ قرآن کے اعجاز کا کیا پہلو ہے۔ میرے نزدیک اور بیشتر علماء کے نزدیک، قرآن کی فصاحت و بلاغت اس کا اعجاز ہے۔ جو لوگ اس پہلو کا انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک قرآن کی ہدایت اس کا معجزہ ہے۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ	کہو کہ لاؤ کوئی کتاب اللہ کی طرف سے
هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ	جو ان دونوں (یعنی تورات و قرآن سے)
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن	زیادہ ہدایت دینے والی ہو، اگر تم سچے ہو۔
لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ	پس اگر یہ تمھیں کوئی جواب نہ دے سکیں تو
أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ	جان لو کہ یہ اپنی خواہشات کے پیچھے
(قصص ۴۹، ۵۰)	لگے ہوئے ہیں۔

ان علماء کی تقریر ہمارے نقطۂ نظر کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہدایت اسی وقت اھدیٰ اور دلنشین کہلاتی ہے جب وہ ایک ایسے کلام میں پیش کی جائے جو فصاحت و بلاغت کی آخری حد پر ہو۔ پس قرآن کا معجزہ کی حد تک بلیغ ہونا اس کے اھدیٰ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

(بشکریہ میثاق۔ لاہور)

پاکستان کی صدارت کی خاتون امیدوار

اور دو فتوے

(از عتیق الرحمٰن سنبھلی)

پاکستان کے صدارتی الیکشن میں بانیٔ پاکستان مسٹر محمد علی جناح کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کی امیدواری نے جہاں اور پہلوؤں سے اس الیکشن کو بیحد ہنگامہ خیز بنا دیا ہے وہاں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ "کیا ازروئے شرع ایک عورت کو مملکت کی سربراہی کے لیے ووٹ دینا جائز ہے؟" —— ہمارے لیے اس الیکشن کو موضوعِ بحث بنانے کا باعث بس یہی مسئلہ ہے!

ہم جہاں تک سمجھتے ہیں پاکستان کے انتخابی معرکہ میں یہ سوال بالکل بے معنی سا ہے۔ کیونکہ اسلام کو اگر معیار ٹھہرایا جائے گا تو اسی قسم کا سوال دوسرے امیدوار صدر ایوب خاں صاحب کے بارے میں بھی پیدا ہو جائے گا۔ وہ کب اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو اسلام نے سربراہ مملکت کے لیے ملحوظ رکھا ہے؟ یہ معیار خالی مرد ہونا تو نہیں ہے، کچھ اور اوصاف بھی تو اس کے ساتھ لازم ہیں! کیا وہ اوصاف صدر ایوب خاں صاحب میں پائے جاتے ہیں؟ پھر ان کے بارے میں کیوں اسلامی معیار کا سوال نہیں اٹھایا گیا؟ اور ایک صدر ایوب خاں کیا، پاکستان کے روزِ اول سے کتنے کرسیٔ اقتدار پر آئے اور کتنے چلے گئے کسی کے بارے میں بھی کب یہ سوال اٹھا کہ وہ امارت کے اسلامی شرائط کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں؟ وجہ صاف ہے کہ جب حکومت کا نظام اسلامی نہیں، شریعت کے مقرر کردہ مقاصد و فرائض حکومت کو انجام دینے نہیں تو حکمرانوں کو اسلام کے معیار پر جانچنے سے کیا حاصل؟۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مس فاطمہ جناح کے بارے میں یہ سوال اس لیے کھڑا ہو گیا کہ قیادت کے اور تمام غیر اسلامی نمونوں کے تو لوگ عرصہ سے عادی ہو چکے تھے لیکن یہ تجربہ اُن کے لیے بالکل نیا ہے کہ ایک عورت باقاعدہ رائے عامہ کے ذریعہ ایک مسلمان ملک کی سربراہی کیلئے منتخب ہونا چاہ رہی ہے، جس کی کوئی نظیر اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی، بظاہر یہی وجہ ہے کہ یہ نئی غیر اسلامیت بہت سے علماء کو ہضم نہیں ہو سکی اور انھوں نے صدر ایوب خاں کی حمایت کرتے ہوئے فتویٰ دے دیا کہ "عورت مسلمانوں کی سربراہ نہیں ہو سکتی" ـــــ لیکن ان علماء نے ایک بات نہیں سوچی کہ یہ نیا غیر اسلامی تجربہ جس کی وہ تاب نہیں لا سکے خود صدر ایوب خاں صاحب ہی کے عطا کیے ہوئے دستور ہی کی تو برکت ہے۔ اس دستور ہی کی رو سے پاکستانی عورتوں کو مردوں کے مساوی یہ حق ملا ہے کہ وہ ملک کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکیں، ورنہ مس فاطمہ جناح اس صدارتی مقابلہ میں شامل کیسے ہو سکتی تھیں؟ پس اگر مس فاطمہ ایک غلطی کر رہی ہیں تو اسکی ذمہ داری سب سے پہلے صدر ایوب خاں پر ہے اور وہ اگر عورتوں کو پاکستان کی صدارت کے لیے منتخب ہونے اور منتخب کیے جانے کا حق دے کر صدارت کے لیے اہل رہ سکتے ہیں تو بیچاری مس فاطمہ جناح نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ عورت ہونے کی بنا پر صدارت کے لیے نااہل قرار دے دی جائیں۔

افسوس ہمارے ان علماء نے کیسا بہترین موقع ضائع کر دیا، وقت آیا تھا کہ پاکستان میں عورت کی مساوات کے فتنے کو خود فتنہ گروں اور ان کے سرپرستوں کے ہاتھوں ایک کاری ضرب لگ جاتی اور ع "جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا" کے ماتحت کم از کم یہ فتویٰ تو تجدد پسند حکمرانوں اور اُن کے حامی فلسفیانِ تجدد کی زبانوں پر جاری ہو ہی جاتا کہ اسلام میں عورت کی سربراہی جائز نہیں ہے۔ اور پھر اس سے اُن کے فلسفۂ مساوات کی جو گت بنتی وہ ظاہر ہے۔ لیکن ہائے یہ ہمارے نیک دل علماء! کہ انھوں نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے کر اس طبقہ کو اس مشکل سے صاف نکل جانے کا موقع دے دیا۔ چنانچہ ایک چودھری خلیق الزماں نے تو باآواز بلند پہلے پہل یہ فتویٰ سنایا تھا، لیکن اس کے بعد جونہی یہ خدمت علماء کی ایک جماعت نے اپنا فرض سمجھ کر سنبھال لی تو ہوشیار مدعی اب اس موضوع سے گویا غیر متعلق ہیں کہ جب کام دوسروں کے ذریعہ نکل رہا ہے تو کیوں اس کو اوڑھ کر اپنے نظریات کے لیے مصیبت پیدا

کریں ـــــ ع

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا!

لیکن اس سحر کا اس سے بھی زیادہ دردناک منظر یہ ہے کہ پاکستان میں جو جماعت تجدد پسندوں کی اصل حریف بنی ہوئی تھی۔ اُس نے ایوب خاں صاحب کی ڈکٹیٹر شپ کے مقابلہ میں ایک خاتون کی سربراہی کو ترجیح دے کر مکمل شرعی زبان میں فتویٰ دے دیا ہے کہ پاکستان میں اس وقت جیسے حالات ہیں اُن میں مس فاطمہ جناح کو مملکت کی سربراہی کے لیے منتخب کرنا مسلمانوں کے لیے نہ صرف شرعاً جائز ہی ہے بلکہ تن من دھن سے ان کی حمایت کی جانی چاہیئے ـــــ یہ فتویٰ پاکستان کی جماعت اسلامی کا ہے!

ایوب خاں ہاریں تو بلا سے ہاریں، لیکن تجدد پسندی کو پاکستان میں اپنی جیت کے لیے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ ابھی تو برسوں نہیں، مدتوں بھی تجدد پسندی اور ترقی پسندی اپنی اس معراج کا خواب تک پاکستان میں نہیں دیکھ سکتی تھی کہ صنف نازک کی ایک فرد مملکت کی سربراہی کے لیے امیدواری کا حوصلہ کرے اور اس طرح مردوں کی مساوات سے بھی بڑھ کر اس کا قدم ایک ہی جست میں بالاتری کی سطح پر نظر آئے۔ اور کس شان سے! کہ ایک طرف اسکے جلو میں سُرخ سویرے کے پرستار مولانا بھاشانی ہوں تو دوسری طرف اسلام کے علمبردار مولانا مودودی بھی!! ـــــ

ع۔ آسماں کی نظر نہ لگ جائے

جماعتِ اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اس معاملہ میں اپنے موقف کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اُن میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی ممانعت اُن

حرمتوں میں نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں ہی میں اسکا
شمار ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں ان حالات کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے جن میں
یہ مسئلہ ہمارے سامنے آیا ہے۔"

(اس کے بعد حالات کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر ان الفاظ پر مجلس شوریٰ کی یہ قرارداد
ختم ہوئی ہے کہ)

"مذکورۂ بالا وضاحت کی روشنی میں اس مجلس نے صدارتی انتخاب کے لیے موجودہ
صدر کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید اور حمایت کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ
مجلس عوام سے اپیل کرتی ہے اور جماعت کے کارکنوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ
جبر و استبداد سے نجات پانے کے اس آخری موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں
اور اس مہم کو تن من دھن سے کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

جہاں تک جماعت اسلامی کا سوال ہے اس کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ جماعت اسلامی
کو بھی اس مسئلہ میں شریعت کا معیار زیر بحث نہیں لانا چاہیے تھا کیونکہ وہ تو سیاست میں حصہ ہی محض
اس بنیاد پر لیتی ہے کہ اس میدان میں بھی دین کے اصول و احکام غالب ہوں اور ملک کا اجتماعی نظام
بھی تمام تر شریعت کے معیار پر قائم ہو۔ ایسے میں اگر وہ بھی شریعت کا معیار سامنے نہ رکھے تو اپنے عقیدے
کی رو سے اسی لمحے شرک اور کفر کی مرتکب ہو جائے گی۔ بس یہ بات تو جماعت نے عین اپنے اصول
کے مطابق کی کہ امارت کے شرعی معیار کو فراموش نہیں کیا۔ لیکن یہ جو فیصلہ ہمارے سامنے آیا ہے،
اگر اجازت ہو تو، اسے دیکھ کر ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ سیاست میں جماعت کی سعی اقامت
دین کا حاصل آخر اس کے سوا بھی آج تک کچھ نکلا کہ جو غیر اسلامی باتیں لوگ اس میدان میں اسلام کا
نام لیے بغیر یا کبھی کبھی اسلام سے منھ دیکھی ہی سہی معذرت کے ساتھ کر رہے تھے، اب انھیں باتوں کو
نہایت شرعی طریقہ سے کرنے کا گُر سیکھ جائیں؟ ہماری گنہگار آنکھیں تو اس اقامت دین کی جد و جہد
میں بس ابھی تک یہی دیکھ رہی ہیں کہ کل ایک اسلامی حرمت کو ضرورت "شرعی" کی چھری سے ذبح کیا
گیا تو آج دوسری کا نمبر لگا ہوا ہے۔ میدان جہاد میں جماعت قدم بعد میں رکھتی ہے پہلے کم از کم اپنا
ایک عدد اسلامی اصول، اس کے ہاتھوں قربان ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں یہ اقامت دین کی کون سی

شکل ہے! اور ہدم دین کے اس عمل سے قیام دین کا نتیجہ کس اصول پر برآمد ہوگا!!

غالباً ۱۹۵۲ء میں پہلے پہل پاکستان میں کچھ محدود انتخابات ہوئے تھے اس میں جماعت اپنے تمام نظریات کی پابندی کا عزم لے کر میدان میں اتری لیکن نتیجہ میں انتہائی ناکامی رہی، حالانکہ اندر کے بعض لوگوں کی روایت کے مطابق کچھ بے اصولیاں بھی اس سے سرزد ہو کر رہیں۔ اس تجربہ سے کچھ لوگ تو اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ اس راہ سے اقامت دین کا خیال محض فریب نفس ہے۔ ع

کیں راہ کہ می روی بترکستان است

یہاں اگر دینی جامہ سنبھالتے ہیں تو حریفوں پر فتح ممکن نہیں اور فتح دیکھتے ہیں تو اپنے ہی ہاتھوں دین کی خیر نہیں۔ لیکن غالب گروہ نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور نتیجۃً اول الذکر گروہ نے جماعت کو خیرباد کہہ دیا۔

اندرونی اختلافات کی یہ صورت حال اس وقت سامنے آئی جب پاکستان میں ایک نئے انتخابی معرکے کے آثار پیدا ہونے لگے۔ یہ پاکستان میں ہونے والے وہ عام انتخابات تھے جنھیں ۱۹۵۸ء کا مارشل لا بہالے گیا۔ بہرحال اختلافی نقطۂ نظر والا گروہ الگ ہو گیا تو جماعت نے اس نئے انتخابی معرکے میں اترنے سے پہلے اس مشکل پر غور کیا جو پچھلے انتخابی تجربہ میں اس کے سامنے آئی تھی یعنی یا اصول چھوڑو یا جیت کا خیال دل سے نکال دو۔ اس مشکل کا حل قائد جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "دین میں حکمت عملی" کے فلسفے سے نکالا کہ ضرورت داعی ہو تو ایک اہم تر مقصد کی خاطر نسبتاً کم اہم اصول کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اور اس فلسفہ سے اولین مشکل یہ حل کی گئی کہ اسلام میں امیدوار اور خواہشمند کو چونکہ کوئی منصب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے اب تک تو جماعت اسلامی نہ صرف یہ کہ امیدواری سسٹم سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کی قائل نہ تھی بلکہ کسی بہتر سے بہتر جماعت یا فرد سے بھی انتخابی حمایت کا کوئی معاہدہ اس شرعی عیب کی صورت میں نہیں کر سکتی تھی کہ وہ جماعت امیدواری سسٹم سے اپنے نمائندے کھڑے کرے یا وہ فرد از خود آزادانہ امیدوار ہو، لیکن چونکہ یہ دیکھا جا چکا تھا کہ تن تنہا اپنے بل بوتے پر جماعت ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور جماعت کی کامیابی کے بغیر اقامت دین کا کوئی سوال نہیں۔ لہٰذا اب یہ طے کر دیا گیا کہ جماعت

اپنی حد تک امیدواری سسٹم نہیں اپنائے گی لیکن دوسری بہتر جماعتوں یا اچھے افراد سے اس شرعی عیب کی بنا پر اب مجتنب بھی نہیں رہے گی۔

خیر اس وقت تو یہ "حکمت عملی" عمل میں آئے بغیر صرف علمی بحث کا موضوع بن کر رہ گئی[ع] کیونکہ انتخابات کی بساط ہی نہ بچھ سکی۔ لیکن اب پھر ایک نئے انتخاب کا وقت آیا تو پہلے ہی قدم پر ایک نئی اور بڑی مشکل سامنے آگئی یعنی متحدہ محاذ جس میں جماعت اسلامی جیسی شرعی جماعت کے ساتھ نہایت غیر شرعی جماعتیں بھی جمہوریت کی بحالی کے نام پر یکجا ہو گئی تھیں۔ اس میں سے جماعت اسلامی کے ماسوا سب نے مس فاطمہ جناح کو موجودہ صدر پاکستان جناب محمد ایوب خاں صاحب کے مقابلہ میں صدارتی امیدوار چن لیا۔ لیکن جماعت کے نمائندوں نے اس میں شرعی قباحت کے خیال سے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا اور بعد میں پوری مجلس شوریٰ کے غور و فکر کے بعد وہ فیصلہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر ہے۔

ہم نے اس فیصلہ کا پورا متن طوالت کی وجہ سے نقل نہیں کیا، اس کے لیے کئی صفحے چاہیے تھے۔ لیکن اب اس کا تمہیدی ٹکڑا اور پڑھ لیجیے۔

"جماعت اسلامی ابتدا سے اس ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی کے لیے متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں برابر شریک رہی ہے اور آئندہ انتخابات کے لیے حزب اختلاف کو ایک متفقہ پروگرام پر جمع کرنے میں اس سے تعلق رکھنے والوں نے پورا پورا حصہ لیا ہے۔ لیکن جب صدارت کے لیے حزب اختلاف کی طرف سے ایک متفق علیہ امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لیے مشکل تھا جن کی رو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر ہم نے صدارت کے مسئلہ میں حزب اختلاف کے ساتھ اتفاق یا ان سے علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا تاکہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لینے اور اہل علم سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔"

ع اس حکمت عملی کے فلسفہ پر نہایت مفصل بحث الفرقان جلد ۲۵۔ شمارہ ۱۲ اور جلد ۲۶ شمارہ ۱، ۲، ۳ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ع

ہمارے خیال میں اگر جماعت اسلامی اپنے اس فیصلہ کی توجیہ اسی حکمت عملی کے اصول سے کرتی تو اس تمہید کے بعد وہ مسئلہ یوں بیان کرتی کہ

متحدہ محاذ کے اس فیصلے کے بعد جماعت اسلامی کے سامنے دو راستے تھے کہ یا تو وہ اس فیصلہ کی تصدیق کرے اور یا خود کو محاذ سے الگ کرلے۔ ظاہر ہو کہ دوسرا راستہ اختیار کرنے کے بعد متحدہ محاذ کے اس متوقع اقتدار میں جسکے لیے زمین ہموار کرنے میں جماعت اسلامی نے بڑا حصہ لیا تھا جماعت کا کوئی حصہ نہ رہتا اور پھر وہ اس اقتدار کو پاکستان میں اقامت دین کا ذریعہ بنانے کے قابل نہ رہ جاتی جو کہ بہت بڑا دینی نقصان تھا، لہذا مجبوراً اس نے فیصلہ کیا کہ ایک بہت بڑے دینی نقصان سے بچنے کے لیے نسبتاً ایک چھوٹے دینی اصول کی قربانی گوارا کرلی جائے۔ چنانچہ اب وہ متحدہ محاذ کے متفق علیہ امیدوار کی پوری حمایت کرے گی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ادھر گزشتہ چند برسوں میں وہ فلسفۂ حکمت عملی کی سطح سے بھی ترقی کرکے بہت آگے جا چکی ہو۔ اب وہ صرف اپنے ہی اعلیٰ مقاصد کیلئے بدرجۂ مجبوری حرام کو حلال نہیں کرتی بلکہ کسی مجبوری یا شرعی قباحت کا خیال دل میں لائے بغیر بھی جو لوگ کسی حرام راستہ پر چلیں اُن کے فعل کو بھی سندِ جواز عطا کرنے میں بخل نہیں کرتی۔ جماعت کے جو نمائندے مس فاطمہ کو منتخب کرنے والی میٹنگ میں شریک تھے اُن پر خدا نے بڑا فضل کیا تھا کہ وہ اس فیصلہ کی ذمہ داری سے جماعت کو بچالے گئے اور اسکے بعد جماعت کو تائید ہی کرنا تھی تو وہ غلط یا صحیح ایک عذر کے ساتھ کرسکتی تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ اب جماعت یہ سب تکلفات بھی برطرف کر چکی ہو۔ اب اس نے وہ فتویٰ دیا جس سے صرف اس کی ہی مشکل نہ حل ہو بلکہ اور سب کا بھی بھلا ہو۔ اور کوئی نہ کہہ سکے کہ متحدہ محاذ کی باقی چار جماعتوں نے مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لیے انتخاب کرکے ذرا بھی شریعت کے خلاف کیا تھا۔ —— واقعی حقِ رفاقت ادا کیا جائے تو ایسا ہی کیا جائے۔ ورنہ فاطمہ جناح کو بھی شکایت ہوتی کہ مجھے مجبوراً گوارا کیا جارہا ہے اور دوسری جماعتیں بھی منہ بُرا کرتیں کہ اپنے لیے تو حلال کرلیا اور ہم پر حرام کا الزام چھوڑ دیا!۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: معذرت

نے کام سنبھالا تو سب سے پہلے اُن کی نظر چندوں کے بقایاجات کی قابل فکر صورت حال ہی پر گئی، اور ایک مستعد آدمی کی طرح انھوں نے دوسرے کاموں کو چستی سے کرنے کے ساتھ ساتھ اسکے تدارک کے لئے بھی سوچا اور مجھ سے اجازت چاہی کہ اس ڈھیل کو آئندہ کے لئے کسی ضابطہ کا پابند کیا جائے اور اب تک کے چندے وصول کئے جائیں۔ میں نے اس بنا پر کہ گزشتہ سالوں کے اندراجات بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوں گے انہیں بہت سی احتیاطوں کی تاکید کے ساتھ اسکی اجازت دی۔

لیکن افسوس ہے

کہ وہ اس سلسلہ کی تمام ضروری احتیاطوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکے نتیجہ میں متعدد ایسے حضرات کو بھی مطالبہ کے خطوط چلے گئے جن کی طرف کوئی بقایا نہیں تھا بلکہ رجسٹروں میں اندراجات کی کوتاہی سے انکی طرف بقایا معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر جن حضرات نے اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر خطوط کا جواب نہیں دیا انھیں خطوط کے نوٹس کے مطابق وی پی روانہ کردیئے گئے۔ اور میں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اپنی علالت کی بنا پر اس صورت حال سے بالکل بے خبر رہا۔

مجھے اس صورت حال کا علم ابھی چند دن پیشتر ہوا جبکہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے سے تھوڑا سا باقاعدہ وقت دفتر میں دینا شروع کیا۔ تو ایک شکایت سامنے آئی۔ اور اسکے بعد احتیاطاً تھوڑی سی مزید دیکھ بھال کی۔ اس قسم کے وی پی جہاں بہت سے واپس گئے ہوں وہاں بعض خریداروں نے ازراہ مروت وصول بھی کرلئے شکایت دونوں ہی طرح کے حضرات کو ہوگی۔ میں ان سب ہی حضرات سے دفتر کی اس غلطی پر نہایت افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو اس غلطی پر دانستہ بدمعاملگی کا گمان نہیں گزرے گا۔ اور غلطی کے اسباب کی اس وضاحت کے بعد وہ اس معذرت کے قبول کرنے میں بھی کوئی تأمل نہیں کریں گے۔

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ غلطی صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوئی جنھوں نے دفتر کے نوٹس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر وہ دو لفظ جواب میں لکھ دیتے تو نہ اُن کو شکایت کا موقع ہوتا اور نہ دفتر کو ندامت کا۔ بہرحال دفتر کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان وی پیوں کی واپسی کے نتیجہ میں جن لوگوں کے پرچے بند ہوگئے ہیں وہ از سرِ نو جاری کردئے جائیں الا کہ وہ از خود ہی انکار کریں۔ اسی طرح جن لوگوں سے وی پی کے ذریعہ مکرر چندہ وصول ہوگیا ہو۔ اُس کو واپس کردیا جائے لیکن اس دوسرے کام کے سلسلہ میں چھان بین کیلئے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ جو امید ہے کہ ایک مہینے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ ایک مہینے کے اندر ہی یہ پوری کارروائی ہوجائیگی۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب اپنے مکرر چندہ کو آئندہ کیلئے جمع کرا دینا چاہیں تو وہ فوراً ہی دفتر کو لکھ دیں۔ از خود دفتر کی طرف سے ان میں سے کسی کا چندہ آئندہ کیلئے جمع نہیں کیا جائیگا ——— والسلام

معذرت خواہ ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے لئے چندہ سالانہ پانچ روپیہ ہے، رقم اس پتہ پر جمع کر کے رسید یہاں بھیجدیں
عثمانیہ اسٹیشنری مارٹ ۳۲ پرانی انارکلی، لاہور

اُس نے جو بھی نقش کھینچا جاوداں بنتا گیا

بحضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

از ــــــ محشر رسول نگری

اُس نے چھیڑی تھی حدیثِ عشق تنہا ہی مگر
رفتہ رفتہ اک زمانہ ہم زباں بنتا گیا

راہرو ملتے گئے ہر گام پر بہ تبسم اُسے
اسکی شخصیت کے گرد اک کارواں بنتا گیا

خلق تھا اس قافلہ سالار کا خلقِ عظیم
جو ملا جس موڑ پر وہ ہم عناں بنتا گیا

پھونک دی سوزِ نفس سے اُس نے اک اک دل میں آگ
قافلہ کا قافلہ آتش بجاں بنتا گیا

کر گیا ذوقِ یقیں سے طے وہ اک اک مرحلہ
جو چلا اس کے جلو میں راہ داں بنتا گیا

لے لیا آغوش میں طوفان کو ہر موج نے
ایک دریا تھا کہ بحرِ بیکراں بنتا گیا

کفر کے سب قصر و ایواں بہ گئے خس کی طرح
جوششِ پنہاں سے وہ سیلِ رواں بنتا گیا

اہلِ باطل اپنے خرمن کو بچاتے ہی رہے
اک شرارا تھا کہ برقِ بے اماں بنتا گیا

دے سکا اسکو نہ جنبش کوئی سیلِ تند موج
عزمِ مستحکم سے وہ کوہِ گراں بنتا گیا

اُس نے دُنیا کو دیا انسانیت کا وہ پیام
جس کا اک اک حرفِ حق کا ترجماں بنتا گیا

اُس نے قوموں کو دیا عدل و اخوت کا سبق
اس کا دیں گہوارۂ امن و اماں بنتا گیا

عالم نو، دورِ نو، آئینِ نو، انسانِ نو
اُس نے جو بھی نقش کھینچا جاوداں بنتا گیا

اُس کا فیضانِ نظر کیا انقلاب انگیز تھا
مردِ حق تقدیرِ حق کا رازداں بنتا گیا

بچ سکا اُس کے نہ تیرِ دلبری سے کوئی صید
ہر کوئی محکوم بے تیغ و سناں بنتا گیا

اُسکے در پر جھک گئیں دنیا کی ساری رفعتیں
اُس کا کوچہ کعبۂ صاحب دلاں بنتا گیا

قلب و جاں کا ہر خرابہ اُسکے فیضِ عشق سے
علم اور عرفان کا گنجِ نہاں بنتا گیا

اُسکی عفت نے لیا تقدیسِ حق سے بھی خراج
اُس کا دامن سجدہ گاہِ قدسیاں بنتا گیا

اہلِ دیں نے روند ڈالے قیصر و کسریٰ کے تاج
ہر غلام اُس شاہ کا صاحبقراں بنتا گیا

پڑ گیا جس پر بھی اُس کا پرتوِ حسنِ خرام
گلشنِ وحدت کا وہ سروِ رواں بنتا گیا

اُسکے آدابِ سحر خیزی کا اک اعجاز تھا
ہر گرانِ خواب آپ مرغِ صبح خواں بنتا گیا

رزمِ حق میں اہلِ ایماں کا گلوئے خشک بھی
از پئے تیغِ رضا سنگِ فساں بنتا گیا

ڈھل گیا اخلاقِ حق میں مردِ مومن سر بسر
رحمتِ باری کا خود ہی ارمغاں بنتا گیا

اُسکے فیضِ تربیت نے آئینوں کو دی جلا
ہر دلِ تاریک مہرِ ضو فشاں بنتا گیا

اک چراغِ عشق سے جلتے گئے کتنے چراغ
خاک کا ہر ذرہ ماہ و کہکشاں بنتا گیا

اُس نے اونچا کر دیا اور آدمیت کا مقام
جذبِ حق سے آدمی عرش آستاں بنتا گیا

اُسکی طاعت نے دیا سب کو شعورِ بندگی
خود بخود انسان حق کا پاسباں بنتا گیا

توڑ ڈالا اُس نے رنگ و نسل کا اک اک بُت
عالمِ انسانیت اک خانداں بنتا گیا

اک عمارت عدل کی بنیاد پر اُٹھتی گئی
اک نگیں برتر از وہم و گماں بنتا گیا

آندھیوں کے رُخ پہ بھی جلتی گئی شمعِ حیات
بجلیوں کی زد پہ بھی اک آشیاں بنتا گیا

اس سے پہلے حق کا ایسا انقلاب آیا نہ تھا
یوں جہاں میں پرچمِ توحید لہرایا نہ تھا

ستمبر نمبر ۱۹۳۳ء
۶

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

سالانہ چندہ
ہندستان سے .... -/۶
پاکستان سے .... -/۷
ششماہی
ہندستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے .... -/۴

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ رجب ۱۳۸۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۴ء | شمارہ ۶

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یہ اداریہ ماہ گزشتہ کی اشاعت کے لیے لکھا گیا تھا۔ لیکن اس موضوع پر وحید الدین خاں صاحب کا مضمون آنے کی وجہ سے اس کو روک لیا گیا تھا۔ ع۔

گزشتہ اشاعت کے ان صفحات میں اس رائے کا اظہار کیا گیا تھا کہ بحیثیت ایک اقلیت کے ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کی اولین شرط یہ ہے کہ ان مسائل کے میدان میں وہ سب ایک جماعت بن کر سامنے آئیں۔ اور یہ ملّی اجتماعیت موجودہ حالات میں اگر آسانی ممکن ہے تو صرف اس طرح کہ اس میدان میں کام کرنے والی تمام باقاعدہ جماعتیں اور ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والے تمام مؤثر حلقے ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو کر قیادت کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ترتیب دیں کیونکہ کسی ایک جماعت کی دعوت پر مسلمانوں میں اجتماعی جذبہ اور عملی ولولہ پیدا ہونے کے آثار دور دور تک نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے اشارہ کیا تھا کہ ابھی ابھی تشکیل ہونے والی "مسلم مجلس مشاورت" کے تجربہ نے یہ حقیقت گویا آنکھوں سے دکھا دی ہے کہ یہ طرزِ عمل مسلمانوں میں اجتماعی حرکت پیدا کرنے کا ایک یقینی ذریعہ ہے اور پھر اسی بنیاد پر یہ درخواست کی گئی تھی کہ اسی مجلس مشاورت کو واضح طور پر ان تمام مسائل کے لیے جدوجہد کا واحد پلیٹ فارم بنا دینا چاہیے جن کا حل مسلمانوں کی سرگرم اجتماعی جدوجہد کا طالب ہے ــــــــ لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ یہ بات جتنی ضروری ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے، آج ہم اس کی مشکلات ہی کے پہلو پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

مشترک مسائل میں اشتراکِ عمل اور اجتماعی جدوجہد کی آواز آج کوئی نئی نہیں ہے۔

ایک عرصہ سے یہ آوازِ وقت کی پکار بن کر اس ملک میں گونج رہی ہے اور حال یہ ہے کہ جس جماعت اور جس حلقے کے ذمہ داروں سے اس موضوع پر بات کیجیے بجز اتفاق اور تائید کے کوئی دوسرا جواب آپ کو نہیں ملے گا، گویا کہ یہی ہر ایک کے دل کی آواز ہے۔ لیکن اس اتفاق کے باوجود عمل میں اس کا وجود عنقا ہی بنا ہوا ہے۔ یہ کیوں؟ ہم نے گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں جس قدر اس سوال پر سوچا ہے، شاید کسی دوسرے موضوع پر سوچا ہو۔ اس سوچ بچار کے نتیجہ میں جو رائے ہم قائم کر سکے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہ رائے ہمیں بدلنا نہیں پڑے گی۔

ہمارے نزدیک اس عجیب وغریب صورت حال کا (کہ سب اشتراک واتحاد چاہتے بھی ہیں، کوئی عذر بھی کسی کی زبان پر نہیں ہے اور پھر بھی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی) خاص سبب یہ ہے کہ جن مسائل کو آج مشترک مسائل کہا جاتا ہے جن جماعتوں کا اصل دائرہ کار یہی مسائل ہیں اور انہی میں اپنی سرگرمیوں کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو تھوڑا یا بہت اپیل کرتی ہیں، یہ جماعتیں اگر انہی مسائل میں اپنی جداگانہ سرگرمیاں ترک کر کے سارا کام مشترک پلیٹ فارم سے کریں تو اپنے انفرادی وجود کے لیے عام مسلمانوں کی دلچسپیاں آخر کس بنیاد پر حاصل کر سکیں گی؟

یہ ہے وہ نفسیاتی گرہ جو آج تک مشترک پلیٹ فارم کے قیام کا راستہ روکے رہی ہے اور جب تک یہ گرہ نہیں کھلے گی صحیح معنیٰ میں کوئی مشترک پلیٹ فارم وجود میں نہیں آسکے گا۔ یہ پلیٹ فارم جبھی با معنیٰ ہو سکتا ہے جبکہ تمام مشترک مسائل اسی کے سپرد ہوں اور اس سلسلہ میں کوئی متوازی نمائندگی یا جداگانہ عملی جدوجہد شریک جماعتوں کی طرف سے نہ ہو، اور یہ بات ان جماعتوں کی شمولیت کے ساتھ جن کی زندگی کا بیشتر انحصار انہی مسائل پر ہے اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایسی جماعتیں خود کھلے دل سے یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ اگر وہ اپنا انفرادی وجود برقرار رکھنے کے لیے کوئی اور راہ نہ نکال سکیں تو اس راہ میں اس عظیم ایثار کے لیے بھی تیار ہیں! اور ہمیں یقین ہے، ایسا یقین جس پر شک اور شبہ کا کوئی سایہ نہیں، کہ اگر کسی جماعت کو یہ ایثار کرنا پڑا تو مشترک پلیٹ فارم کی ہیرو بھی وہی جماعت بنے گی۔

کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ اس وقت مسلم مجلس مشاورت کا ہے اور اس میں جماعتیں نہیں جماعتوں کے

افراد شریک ہیں اور ایسا اسی لیے کیا گیا ہے تاکہ جماعتیں اپنی اپنی جگہ پر آزاد رہیں لہذا جماعتوں کے مسائل اور معاملات یہاں خارج از بحث ہونے چاہئیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے جو مسائل کسی جماعت کے دائرۂ کار میں داخل ہیں (خواہ اصلاً یا ضمناً) ان مسائل میں جدوجہد کے لیے ایسی جماعتوں کے افراد اپنے جماعتی نظام اور جماعتی پالیسی سے آزاد نہیں ہوسکتے۔ بالخصوص جبکہ وہ ان جماعتوں کے اعلیٰ ترین عہدیدار بھی ہوں۔ پس اگر مجلس مشاورت کو مشترک مسائل میں جدوجہد کا ایک واقعی پلیٹ فارم بنانا طے کیا جائے تو یہ جبھی ہوسکتا ہے جبکہ یہ جماعتیں ان مسائل کو اس مشترک پلیٹ فارم کے سپرد کر دینے کی تجویز پاس کریں یا کم از کم ان کو اپنے دائرۂ کار سے خارج کر دیں۔ جماعتی اشخاص کی بھی اپنی انفرادی حیثیت بیشک ہوتی ہے اور اس حیثیت سے وہ بہت سے معاملات میں اپنی ذاتی رائے اور ذاتی ذمہ داری پر کام کرنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ مگر یہ وہی معاملات ہوسکتے ہیں جن سے جماعت کو سروکار نہ ہو۔ جو امور جماعت کے دائرۂ کار سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں فرد کی آزادیٔ عمل کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی جماعت اس حد تک آزادی کی اجازت دیتی ہے تو وہ جماعت نہیں مذاق ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مشترک پلیٹ فارم کچھ مسائل میں مشترک جدوجہد کے اُصول پر بنے اور پھر اپنے ارکان کو اجازت دے کہ ان مسائل میں وہ اپنی اپنی جماعتوں کی سطح پر بھی جداگانہ جدوجہد جاری رکھ سکتے ہیں تو وہ اپنی تخریب کا خود ہی ذمہ دار ہوگا اور جماعتوں کا جذبۂ مسابقت و رقابت چار دن میں اس اشتراک کے تنکے بکھیر کر رکھ دے گا۔

پاکستان کے صدارتی انتخاب پر جو چند صفحے گزشتہ اشاعت میں لکھے گئے تھے اُن کے ساتھ "باقی آئندہ" کا لفظ بعض ناظرین کو بہت شاق ہوا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس ماہ اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں لکھا جاسکا۔ یہ پورا مہینہ نزلہ زکام کے ایسے تسلسل میں گزر گیا کہ لکھنے کا کوئی کام بھی نہ ہوسکا۔ اب اگر آئندہ اشاعت تک ضرورت کا احساس باقی رہا اور صحت نے بھی ساتھ دیا تو انشاءاللہ اس کی تکمیل کر دی جائے گی ورنہ وہ اپنی جگہ کچھ نامکمل بھی نہیں ہے۔

معارف الحدیث

(بسلسلۂ کتاب الزکوٰۃ)

زکوٰۃ کے علاوہ مالی صدقات :-

[زکوٰۃ سے متعلق حدیثیں اب سے کافی عرصہ پہلے الفرقان کے اسی سلسلہ معارف الحدیث میں شائع ہو چکی ہیں لیکن زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ و انفاق فی سبیل اللہ (یعنی راہ خدا میں اس کے حاجت مند بندوں پر خرچ کرنے) کی عمومی ترغیب و تاکید کی حدیثیں (جن کو اکثر محدثین اپنی کتابوں میں "فضل الانفاق فی سبیل اللہ و کراہۃ الامساک" کے زیر عنوان درج کرتے ہیں) اُس وقت اس کے ساتھ شامل نہیں کی گئی تھیں، ارادہ تھا کہ کتابی اشاعت میں ان کو شامل کر دیا جائے گا لیکن اس وقت ہمارے ملک میں غلہ کی کمیابی اور عام ضروریات زندگی کی انتہائی گرانی نے ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ اللہ کے کروڑوں بندے سخت تکلیف و محتاجی اور فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ کی تعلیمات و ہدایات کی اشاعت وقتی ضرورت معلوم ہوئی ـــــ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو توفیق دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی تعمیل کر کے اور اس وقت کے خاص حالات میں آخری امکانی حد تک اللہ کے ضرورت مند بندوں کی خدمت اور مدد کر کے دارین میں اس کے فضل و رحمت کے مستحق بنیں۔]

عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِى الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ ثُمَّ تَلَا لَيْسَ الْبِرَّ

اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الْاٰيَةَ۔

رواہ الترمذی و ابن ماجہ والدارمی

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (اللہ کا) حق ہے"۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ...... الاٰية

اصل نیکی اور بھلائی (کا معیار) یہ نہیں ہے کہ (عبادت میں) تم مشرق کی طرف اپنا رُخ کر دیا مغرب کی طرف، بلکہ اصل نیکی کی راہ بس ان لوگوں کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور ملائکہ پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر اور جنھوں نے مال کی محبت کے باوجود اسکو خرچ کیا قرابت داروں پر اور یتیموں مسکینوں پر اور مسافروں اور سائلوں پر اور غلاموں کو آزادی دلانے میں اور اچھی طرح قائم کی انھوں نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ ..... الخ

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

تشریح) حدیث کا مقصد و منشاء یہ ہے کہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ مقررہ زکوٰۃ (یعنی فاضل سرمایہ کا چالیسواں حصہ) ادا کر دینے کے بعد آدمی پر اللہ کا کوئی مالی حق اور مطالبہ باقی نہیں رہتا اور وہ اس سلسلہ کی ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش ہو جاتا ہے، ایسا نہیں ہے، بلکہ خاص حالات میں زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی اللہ کے ضرورت مند بندوں کی مدد کی ذمہ داری دولتمندوں پر باقی رہتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب ثروت آدمی حساب سے پوری زکوٰۃ ادا کر چکا ہو اس کے بعد اسے معلوم ہو کہ اس کے پڑوس میں فاقہ ہے یا اس کا فلاں قریبی رشتہ دار سخت محتاجی کی حالت میں ہے یا کوئی شریف مصیبت زدہ یا مسافر ایسی حالت میں اُس کے

پاس پہونچے جس کو فوری امداد کی ضرورت ہو تو ایسی صورتوں میں ان ضرورتمندوں محتاجوں کی امداد اس پر واجب ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بیان فرمائی اور بطور استشہاد سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ اس آیت میں اعمالِ بِرّ (نیکی کے کاموں) کے ذیل میں ایمان کے بعد یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں وغیرہ حاجتمند طبقوں کی مالی مدد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان کمزور اور ضرورت مند طبقوں کی مالی مدد کا جو ذکر یہاں کیا گیا ہے وہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے کیونکہ زکوٰۃ کا مستقلاً ذکر اس آیت میں آگے موجود ہے۔

امیر غریب ہر مسلمان کے لیے صدقہ لازم ہے :-

عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَۃٌ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ قَالَ فَلْیَعْمَلْ بِیَدَیْہِ فَیَنْفَعُ نَفْسَہٗ وَیَتَصَدَّقُ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ قَالَ فَیُعِیْنُ ذَا الْحَاجَۃِ الْمَلْھُوْفَ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَفْعَلْہُ قَالَ فَیَاْمُرُ بِالْخَیْرِ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَفْعَلْ قَالَ فَیُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ فَاِنَّہٗ لَہٗ صَدَقَۃٌ۔

——————— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر کسی آدمی کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے دست وبازو سے محنت کرے اور کمائے پھر اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور صدقہ بھی کرے، عرض کیا گیا کہ اگر وہ یہ نہ کرسکتا ہو تو کیا کرے، آپ نے فرمایا کسی پریشاں حال محتاج کا کوئی کام کرکے اُس کی مدد ہی کردے (یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہے) عرض کیا گیا کہ اگر وہ یہ بھی نہ کرسکے تو کیا کرے، آپ نے فرمایا تو اپنی زبان ہی سے لوگوں کو بھلائی اور نیکی

کے لیے کہے، لوگوں نے عرض کیا اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے تو کیا کرے، آپ نے فرمایا کہ (کم از کم) شر سے اپنے کو روکے (یعنی اس کا اہتمام کرے کہ اس سے کسی کو تکلیف اور ایذا نہ پہونچے) یہ بھی اس کے لیے ایک طرح کا صدقہ ہے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں پر دولت اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی ان کو بھی صدقہ کرنا چاہیے، اگر روپیہ پیسہ سے ہاتھ بالکل خالی ہو تو محنت مزدوری کر کے اور اپنا پیٹ کاٹ کے صدقہ کی سعادت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر اپنے خاص حالات کی وجہ سے کوئی اس سے بھی مجبور ہو تو کسی پریشان حال کی خدمت ہی کر دے، اور ہاتھ پاؤں سے کسی کا کام نہ کر سکے تو زبان ہی سے خدمت کرے ۔۔۔۔ حدیث کی روح اور اس کا خاص پیغام یہی ہے کہ ہر مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب، طاقتور اور توانا ہو یا ضعیف اس کے لیے لازم ہے کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے جس طرح اور جس قسم کی بھی مدد اللہ کے حاجتمند بندوں کی کر سکے ضرور کرے اور اس سے دریغ نہ کرے۔

صدقہ کی ترغیب اور اس کی برکات :۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْكَ۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بندہ کو اللہ کا پیغام ہے کہ اے آدم کے فرزند تو (میرے ضرورت مند بندوں پر) اپنی کمائی خرچ کر، میں اپنے خزانہ سے تجھ کو دیتا رہوں گا۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہے کہ جو بندہ اس کے ضرورت مند بندوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتا رہے گا اس کو اللہ تعالیٰ کے خزانۂ غیب سے ملتا رہے گا ۔۔۔۔

______ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو یقین کی دولت سے نوازا ہے ہم نے دیکھا کہ ان کا یہی معمول ہے اور اُن کے ساتھ ان کے رب کریم کا یہی معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اس یقین کا کوئی حصہ نصیب فرمائے

(**فائدہ**) پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے کوئی بات بیان فرمائیں اور وہ قرآن مجید کی آیت نہ ہو، اس حدیث کو "حدیث قدسی" کہا جاتا ہے۔ یہ حدیث بھی اسی قسم کی ہے۔

عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْفِقِيْ وَلَا تُحْصِيْ فَيُحْصِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ اِرْضَخِيْ مَا اسْتَطَعْتِ ______ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تم اللہ کے بھروسہ پر اس کی راہ میں کشادہ دستی سے خرچ کرتی رہو اور گنو مت، (یعنی اس فکر میں نہ پڑو کہ میرے پاس کتنا ہے اور اس میں سے کتنا راہ خدا میں دوں) اگر تم اس کی راہ میں اس طرح حساب کر کر کے دوگی تو وہ بھی نعمتیں حساب ہی سے دے گا (اور اگر بے حساب دوگی تو وہ بھی اپنی نعمتیں تم پر بے حساب انڈیلے گا) اور دولت جوڑ جوڑ کے اور بند کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ کرے گا (کہ رحمت اور برکت کے دروازے تم پر خدا نخواستہ بند ہو جائیں گے) لہذا تھوڑا بہت جو کچھ ہو سکے اور جس کی توفیق ملے راہ خدا میں کشادہ دستی سے دیتی رہو۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا ابْنَ اٰدَمَ اَنْ تَبْذُلَ الْخَيْرَ خَيْرٌ لَكَ وَاَنْ تُمْسِكَهُ شَرٌّ لَكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ وَابْدَءْ بِمَنْ تَعُوْلُ ______ (رواہ مسلم)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے آدم کے فرزند! اللہ کی دی ہوئی دولت جو اپنی ضرورت سے فاضل ہو

اُس کا راہِ خدا میں صرف کر دینا تمھارے لیے بہتر ہے اور اس کا روکنا تمھارے لیے بُرا ہے اور ہاں گزارے کے بقدر رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔ اور سب سے پہلے ان پر خرچ کرو جن کی تم پر ذمہ داری ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ آدمی کے لیے بہتر یہ ہے کہ جو دولت وہ کمائے یا کسی ذریعہ سے اس کے پاس آئے اس میں سے اپنی زندگی کی ضرورت کے بقدر تو اپنے پاس رکھے باقی راہِ خدا میں اس کے بندوں پر خرچ کرتا رہے اور اس میں پہلا حق اُن لوگوں کا ہے جن کا اللہ نے اس کو ذمہ دار بنایا ہے اور جن کی کفالت اس کے ذمہ ہے، مثلاً اس کے اہل و عیال اور حاجتمند قریبی اعزہ۔

جو راہِ خدا میں خرچ کر دیا جائے وہی باقی اور کام آنے والا ہے:-

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهُمْ ذَبَحُوْا شَاةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَقِيَ مِنْهَا؟ قَالَتْ مَا بَقِيَ مِنْهَا اِلَّا كَتِفُهَا قَالَ بَقِيَ مِنْهَا غَيْرُ كَتِفِهَا۔ (رواہ الترمذی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک بکری ذبح کی گئی (اور اس کا گوشت للہ تقسیم کر دیا گیا)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے دریافت فرمایا کہ بکری میں سے کیا باقی رہا؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ صرف ایک دست اس کی باقی رہی ہے (باقی سب ختم ہو گیا) آپ نے فرمایا کہ اس دست کے علاوہ جو للہ تقسیم کر دیا گیا در اصل وہی سب باقی ہے اور کام آنے والا ہے (یعنی آخرت میں انشاء اللہ اس کا اجر ملے گا) (جامع ترمذی)

انفاق کے بارہ میں اصحاب یقین و توکل کی راہ:-

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ لِيْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِيْ اَنْ لَا يَمُرَّ عَلَيَّ ثَلٰثُ لَيَالٍ

وَعِنْدِیْ مِنْهُ شَیْئٌ اِلَّاشَیْئٌ اَرْصُدُہٗ لِدَیْنٍ ـــــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات یہ ہوگی کہ تین راتیں گزرنے سے پہلے اس کو راہِ خدا میں خرچ کر دوں اور میرے پاس اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے سوائے اس کے کہ میں قرض ادا کرنے کے لیے اس میں سے کچھ بچالوں۔ (صحیح بخاری)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی بِلَالٍ وَعِنْدَہٗ صُبْرَةٌ مِنْ تَمْرٍ فَقَالَ مَا هٰذَا یَا بِلَالُ؟ قَالَ شَیْئٌ اِدَّخَرْتُهٗ لِغَدٍ فَقَالَ اَمَا تَخْشٰی اَنْ تَرٰی لَهٗ بُخَارًا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَنْفِقْ یَا بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا ـــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت بلال کی قیام گاہ پر پہونچے اور دیکھا کہ ان کے پاس چھواروں کا ایک ڈھیر ہے۔ آپ نے فرمایا بلال یہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اس کو آئندہ کے لیے ذخیرہ بنایا ہے (تاکہ مستقبل میں روزی کی طرف سے ایک گونہ اطمینان رہے) آپ نے فرمایا بلال کیا تمھیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ کل قیامت کے دن آتشِ دوزخ میں تم اس کی تپش اور سوزش دیکھو۔ اے بلال جو ہاتھ پاس آئے اس کو اپنے پر اور دوسروں پر خرچ کرتے رہو اور عرش عظیم کے مالک سے قلت کا خوف نہ کرو (یعنی یقین رکھو کہ جس طرح اس نے یہ دیا ہے آئندہ بھی اسی طرح عطا فرماتا رہے گا اس کے خزانہ میں کیا کمی ہے، اس لیے کل کے لیے ذخیرہ رکھنے کی فکر نہ کرو) (شعب الایمان للبیہقی)

تشریح) حضرت بلال رضی اللہ عنہ اصحاب صفہ میں سے تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی متوکلانہ زندگی کا طریقہ اپنایا تھا اُن کے لیے مستقبل کے واسطے غذا

کا ذخیرہ کرنا بھی مناسب نہ تھا......... اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ ہدایت فرمائی، اگرچہ عام لوگوں کے لیے یہ بات بالکل جائز ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کو بھی اس سے روکا تھا کہ وہ اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کردیں اور گھر والوں کے لیے کچھ نہ رکھیں ۔ لیکن صحابہ میں سے جن حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب صفہ والی خالص توکل کی راہ اپنائی تھی اُن کے لیے اس طرز عمل کی گنجائش نہ تھی۔ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

حدیث کے آخری فقرہ میں اشارہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ خیر کی راہوں میں ہمت کے ساتھ صرف کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی عطا میں کبھی کمی نہ پائے گا۔

جو دولتمند کشادہ دستی سے راہ خدا میں صرف نہ کریں بڑے خسارہ میں ہیں:۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اِنْتَهَیْتُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ جَالِسٌ فِیْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ فَلَمَّا رَاٰنِیْ قَالَ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَقُلْتُ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ مَنْ هُمْ قَالَ هُمُ الْاَكْثَرُوْنَ اَمْوَالًا اِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَعَنْ یَمِیْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اس وقت کعبہ کے سائے میں اور اس کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا "رب کعبہ کی قسم وہ لوگ بڑے خسارہ میں ہیں" میں نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپ پر قربان کون لوگ ہیں جو بڑے خسارہ میں ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو بڑے دولتمند اور سرمایہ دار ہیں، اُن میں سے وہی لوگ خسارے سے محفوظ ہیں جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں (ہر طرف خیر کے مصارف میں) اپنی دولت کشادہ دستی

کے ساتھ صرف کرتے ہیں ۔ مگر دولتمندوں اور سرمایہ داروں میں ایسے بندے بہت کم ہیں ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فقر کی زندگی اختیار کر رکھی تھی اور اُن کے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے یہی ان کے لیے بہتر تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب وہ حاضر ہوئے تو آپ نے اُن کے اطمینان خاطر کے لیے بیان فرمایا کہ دولت مندی اور سرمایہ داری جو بظاہر بڑی نعمت ہے دراصل کڑی آزمائش بھی ہے اور صرف وہی بندے اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو اس سے دل نہ لگائیں اور پوری کشادہ دستی کے ساتھ دولت کو خیر کے مصارف میں خرچ کریں ۔ جو ایسا نہ کریں گے وہ انجام کار بڑے خسارہ میں رہیں گے

صدقہ کے خواص اور برکات :-

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ ۔

رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت کو دفع کرتا ہے ۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) جس طرح دنیا کی مادی چیزوں جڑی بوٹیوں تک کے خواص اور اثرات ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں کے اچھے بُرے اعمال اور اخلاق کے بھی خواص اور اثرات ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ہی معلوم ہوتے ہیں، اس حدیث میں صدقہ کی دو خاصیتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اگر بندہ کی کسی بُری لغزش اور معصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اس کی طرف متوجہ ہو تو صدقہ اس غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے بندہ بجائے اللہ کے غضب اور ناراضی کے اس کی رضا اور رحمت کا مستحق بن جاتا ہے ۔ اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ بُری موت سے آدمی کو بچاتا ہو یعنی صدقہ کی برکت سے اس کا خاتمہ اچھا ہوتا ہے ۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح کی

موت سے بچاتا ہے جس کو دنیا میں بری موت سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ مُرْثَدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ صَدَقَتُهٗ ——— رواہ احمد

مرثد بن عبد اللہ تابعی بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب کرام نے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے کہ قیامت کے دن مومن پر اس کے صدقہ کا سایہ ہوگا۔ (مسند احمد)

تشریح) حدیثوں میں بہت سے اعمال صالحہ کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن یہ اعمال سایہ کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس حدیث میں صدقہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں اس کی ایک برکت یہ ظاہر ہوگی کہ صدقہ کرنے والے کے لیے اس کا صدقہ سائبان بن جائے گا جو اس دن کی تپش اور تمازت سے اس کو بچائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان حقیقتوں کا یقین اور اس کے مطابق عمل نصیب فرمائے۔

صدقہ کرنے سے مال میں کمی نہیں آتی بلکہ برکت ہوتی ہے:-

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللّٰهُ بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی (بلکہ اضافہ ہوتا ہے) اور قصور معاف کر دینے سے آدمی نیچا نہیں ہوتا بلکہ اللہ اس کو سربلند کر دیتا ہے اور اس کی عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جو بندہ اللہ کے لیے فروتنی اور خاکساری کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بالاتری بخشے گا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْ ذَرٍّ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ الصَّدَقَةَ

مَا هِيَ قَالَ اَضْعَافٌ مُضَاعَفَةٌ وَعِنْدَ اللّٰهِ الْمَزِيْدُ ـــــــ رواہ احمد

حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوذر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! بتلایئے کہ صدقہ کیا ہے؟ (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا کیا اجر ملنے والا ہے) آپ نے فرمایا کہ چند در چند (یعنی جتنا کوئی اللہ کی راہ میں صدقہ کرے اس کا کئی گنا اس کو ملے گا) اور اللہ کے ہاں بہت ہے۔

(مسند احمد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جتنا صدقہ کرے گا اس کو اس کا کئی گنا اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ دوسری بعض احادیث میں دس گنے سے سات سو گنے تک کا ذکر ہے اور یہ بھی آخری حد نہیں ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائے گا "وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ" ـــــــ اس کا خزانہ لا انتہا ہے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ صدقہ کے عوض میں کئی گنا تو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں عطا فرماتا ہے اور اس کا صلہ جو آخرت میں عطا فرمایا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ ہوگا اللہ کے بندوں کا یہ عام تجربہ ہے کہ اللہ پر یقین اور اعتماد کرتے ہوئے وہ اخلاص کے ساتھ جتنا اس کی راہ میں اس کے بندوں پر صرف کرتے ہیں اس کا کئی گنا اللہ تعالیٰ ان کو اس دنیا ہی میں عطا فرما دیتا ہے۔ ہاں اخلاص اور یقین شرط ہے۔

ضرورتمندوں کو کھلانے پلانے اور پہنانے کا اجر و ثواب :-

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰى عُرْيٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوْعٍ اَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَاٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

ـــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا جس مسلم نے کسی دوسرے مسلم بھائی کو جس کے پاس کپڑا نہیں تھا، پہننے کو کپڑا دیا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا سبز لباس پہنائے گا اور جس مسلم بھائی نے دوسرے مسلم بھائی کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے پھل اور میوے کھلائے گا اور جس مسلم نے پیاس کی حالت میں دوسرے مسلم بھائی کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی سربمہر شراب طہور پلائے گا۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ مَا مِنْ مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا اِلَّا كَانَ فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ مَا دَامَ عَلَيْهِ مِنْهُ خِرْقَةٌ ـــــــــ رواہ احمد والترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے جس بندہ نے کسی مسلم کو کپڑا پہنایا وہ یقیناً اس وقت تک اللہ کے حفظ و امان میں رہے گا جب تک کہ اس کے جسم پر اس کپڑے میں سے کچھ بھی رہے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ جِئْتُ فَلَمَّا تَبَيَّنْتُ وَجْهَهٗ عَرَفْتُ اَنَّ وَجْهَهٗ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ فَكَانَ اَوَّلُ مَا قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔

ـــــــــ رواہ الترمذی وابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے تو میں (آپ کو دیکھنے سمجھنے کے لیے) آپ کے پاس آیا، جب میں نے غور سے آپ کا روئے انور دیکھا تو پہچان لیا (اور بلا کسی شک و شبہ کے جان لیا) کہ یہ ہرگز کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے، پھر آپ نے سب سے پہلی جو بات فرمائی وہ یہ تھی کہ ــ "اے لوگو آپس میں

سلام کی خوب اشاعت کرو اور رواج دو (یعنی ہر ایک دوسرے کو سلام کیا کرے اس سے دل کی گرہیں کھلتی ہیں اور تعلق بڑھتا ہے) اور (اللہ کے بندوں کو خاص کر ان کو جو ضرورتمند ہوں) کھانا کھلاؤ، اور آپس میں صلۂ رحمی کرو (یعنی قرابت کے حقوق ادا کرو) اور رات کو جس وقت لوگ پڑے سوتے ہیں اللہ کے حضور میں نماز پڑھو ایسا کروگے تو سلامتی کے ساتھ جنت میں جاؤگے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

بھوکے پیاسے جانوروں کو کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِامْرَأَةٍ مُّوْمِسَةٍ مَرَّتْ بِکَلْبٍ عَلٰی رَأْسِ رَکِیٍّ یَلْهَثُ کَادَ یَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَاَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهُ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ کُلِّ ذَاتِ کَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدچلن عورت اس عمل پر بخشدی گئی کہ وہ ایک کنوئیں کے پاس سے گزری اور اُس نے دیکھا کہ ایک کتا زبان نکالے ہوئے ہے۔ (اور اس کی حالت ایسی ہے کہ) گویا وہ پیاس سے مرہی جائے گا، (اس عورت کے دل میں ترس آیا وہاں پانی نکالنے کے لیے رسی ڈول کچھ موجود نہیں تھا) اُس نے اپنا چمڑے کا موزہ پاؤں سے نکالا اور (کسی طرح اس کو) اپنی اوڑھنی سے باندھا اور (محنت مشقت کرکے) اسی کے ذریعہ کنوئیں سے پانی نکال کے اس کو پلایا، وہ عورت اپنے اسی عمل کی وجہ سے بخشدی گئی ـــــــ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے کھلانے پلانے میں بھی ثواب ہے؟ آپ نے فرمایا! ہاں ہر جاندار جانور (جس کو بھوک پیاس کی تکلیف ہوتی ہو) اس کو کھلانے پلانے میں اجر و ثواب ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَاْكُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ اَوْ طَيْرٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ صَدَقَةٌ ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان بندہ کوئی درخت لگائے یا کھیتی کرے تو اس درخت یا اس کھیتی سے جو پھل اور جو دانہ کوئی انسان یا کوئی پرندہ یا کوئی چوپایہ کھائے گا وہ اس بندہ کے لیے صدقہ اور اجر و ثواب کا ذریعہ ہوگا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اللہ کے بندوں کو زحمت سے بچانے کا صلہ جنت :-

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِيْقٍ فَقَالَ لَاُنَحِّيَنَّ هٰذَا عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ لَا يُؤْذِيْهِمْ فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ۔

ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ کا کوئی بندہ کسی راستہ پر چلا جا رہا تھا جس پر کسی درخت کی ایک شاخ تھی (جس سے گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی) اس بندہ نے اپنے جی میں کہا کہ میں اس شاخ کو یہاں سے الگ کر کے راستہ صاف کردوں گا تاکہ بندگانِ خدا کو تکلیف نہ ہو (پھر اس نے ایسا ہی کیا) تو وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے جنت میں پہنچ دیا گیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) بعض اعمال بظاہر بہت چھوٹے اور معمولی ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ دل کی ایسی کیفیت اور ایسے خدا پرستانہ جذبہ کے ساتھ صادر ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بڑا قیمتی اور بڑا محبوب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ارحم الراحمین کا دریائے رحمت جوش میں آجاتا ہے، پھر اس

بندے کے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور اس کے لیے مغفرت اور داخلۂ جنت کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ والی مندرجہ بالا حدیث میں ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر ایک بدچلن عورت کی مغفرت کی جو خوشخبری دی گئی ہے اور اس حدیث میں راستے سے ایک درخت کی صرف شاخ ہٹا دینے پر ایک آدمی کے داخلۂ جنت کی جو بشارت سنائی گئی ہے اُس کا راز یہی ہے۔ واللہ اعلم

کس وقت کے صدقہ کا ثواب زیادہ ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللهِ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَعْظَمُ اَجْرًا قَالَ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَاْمُلُ الْغِنٰی وَلَا تُمْهِلُ حَتّٰی اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ ———— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کس صدقہ کا ثواب زیادہ ہے، آپ نے فرمایا کہ زیادہ ثواب کی صورت یہ ہے کہ تم ایسی حالت میں صدقہ کرو جبکہ تمہاری تندرستی قائم ہو اور تمہارے اندر دولت کی چاہت اور اس کو اپنے پاس رکھنے کی حرص ہو، اس حالت میں (راہِ خدا میں مال خرچ کرنے سے تمہیں محتاجی کا خطرہ ہو اور دولتمندی کی دل میں آرزو ہو۔ (ایسے وقت میں اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کرنا ہی خدا پرستی اور خدا طلبی کی دلیل ہے اور ایسے صدقہ کا ثواب بہت بڑا ہے) اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم سوچتے رہو اور ٹالتے رہو یہاں تک کہ جب موت کا وقت آجائے اور جان کھنچ کے حلق میں آجائے، تو تم مال کے بارے میں وصیت کرنے لگو کہ اتنا فلاں کو اور اتنا فلاں کو، حالانکہ اب تو مال (تمہاری ملکیت سے نکل کر) فلاں فلاں کا (یعنی وارثوں کا) ہو ہی جائے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) انسانوں کی یہ عام کمزوری ہے کہ جب تک وہ تندرست و توانا ہوتے ہیں اور موت سامنے نہیں کھڑی ہوتی، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں، شیطان ان کے دلوں میں

وسوسہ ڈالتا ہے کہ اگر ہم نے راہِ خدا میں خرچ کیا تو ہمارے پاس کمی ہو جائے گی، ہم خود تنگدست اور محتاج ہو جائیں گے اس لیے ان کا ہاتھ نہیں کھلتا، لیکن جب موت سامنے آجاتی ہے اور زندگی کی امید باقی نہیں رہتی تو انھیں صدقہ یاد آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ طرزِ عمل ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ کی نگاہ میں محبوب اور مقبول صدقہ وہ ہے جو بندہ تندرستی و توانائی کی ایسی حالت میں کرے کہ اس کے سامنے اپنے مسائل اور اپنا مستقبل بھی ہو اس کے باوجود وہ اللہ کی رضاجوئی کے لیے اور آخرت کے ثواب کی امید میں اور ربِ کریم کے وعدوں پر یقین و اعتماد کرتے ہوئے اسی حالت میں ہاتھ کھول کے اللہ کی راہ میں اس کے بندوں پہ خرچ کرے ــــ ایسے بندوں کیلئے قرآن مجید میں فلاح کا وعدہ ہے ــــ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

تجلیاتِ مجدد الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ از ————— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۸۶) - درویش حبیب خادم کے نام — [کثرت و قلت کرامات کے راز کے بیان میں]

(کھانے پینے اور پہننے میں) قدرِ ضرورت سے زیادہ کو اختیار کرنا (اور بقدرِ ضرورت پر اکتفا نہ کرنا) ظہورِ خوارق و کرامات کی قلت کا باعث ہے۔ خصوصاً جب کہ مباحات کا زیادہ استعمال حدِ مشتبہ تک پہونچا دے اور وہاں سے حرام کے آس پاس لے آئے — پناہ بخدا — (ایسی صورت میں) کرامات و خوارق کہاں؟ ——— جس قدر ارتکاب مباح کا دائرہ تنگ تر کر کے بقدرِ ضرورت پر اکتفا کیا جائے گا اسی قدر گنجائش کشف و کرامات زیادہ اور راہ ظہورِ خوارق کشادہ تر ہوگی (یہ بھی واضح رہے کہ) معجزہ کا ظہور شرطِ نبوت ہے اور کرامت کا ظہور شرطِ ولایت نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی کے لیے نبوت کا اظہار واجب ہے بخلاف ولی کے کہ اس کے لیے ولایت کا اظہار واجب نہیں، بلکہ اس کو تو مخفی رکھنا اولیٰ ہے .... کسی ولی سے کرامات کا کثرت کے ساتھ ظاہر ہونا ان دوسرے اولیا پر اس کی افضلیت کی دلیل نہیں ہے جن سے اسقدر خوارق و کرامات ظہور میں نہ آئے ہوں، ——— بلکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ولی جس سے کوئی بھی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ ان اولیا سے افضل ہو جن سے خوارق و کرامات کا بکثرت ظہور ہوا ہو ——— چنانچہ شیخ الشیوخ (حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ) نے اپنی کتاب، عوارف المعارف میں اس حقیقت کو

بیان فرمایا ہے ــــ جبکہ انبیاء علیہم السّلام کے اندر معجزات کا کم یا زیادہ ہونا، فاضلیت و مفضولیت کا باعث نہیں (حالانکہ معجزہ شرط نبوت ہے) تو پھر ولایت میں (جبکہ کرامت شرط ولایت بھی نہیں) کس طرح، خوارق و کرامات ایک، دوسرے پر فضیلت کا باعث ہو جائیں گے؟ ــــ ...... ریاضات و مجاہدات، درجات قرب الٰہی تک پہونچنے کے لیے اُس راہ میں درکار ہیں جو راہِ مُریداں کہلاتی ہے اور راہِ مُراداں، اجتبا (برگزیدگی) ہے ــــ مُرید، مشقت و محنت کے ساتھ اپنے پاؤں سے چلتے ہیں اور "مراد" کو ناز و نعم کے ساتھ کشاں کشاں خود لے جاتے ہیں اور اُن کی ریاضت و محنت کے بغیر درجات قرب تک پہونچاتے ہیں ــــ جاننا چاہیے کہ ریاضات و مجاہدات راہِ انابت و ارادت کے لیے شرط ہیں اور راہ اجتبا میں مجاہدات شرط نہیں ہیں مگر ہاں نافع و سود مند ضرور ہیں ــــ مثلاً ایک شخص ہے کہ اس کو کشاں کشاں لیے جا رہے ہیں اور وہ اس کشش کے باوجود اپنی سعی و مشقت کو بھی اپنے اس سفر کے اندر استعمال کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص بہت جلد منزلِ مقصود تک پہونچ جائے گا، بخلاف اس شخص کے جو اپنی سعی کو کار فرما نہیں کرتا ــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی تنہا کشش جو زیادہ قوت والی ہو زیادہ کارآمد ہو اس کشش سے جو سعی و کوشش سے مرکب ہو ــــ پس سعی و مشقت، راہِ اجتبا میں کمالِ وصول کی بھی شرط نہیں جیسا کہ نفسِ وصول کی شرط نہیں ــــ ہاں سعی و مشقت، احتمال نفع ضرور رکھتی ہے اگرچہ بعض مقامات میں ہی کیوں نہ ہو ــــ

ریاضت و مجاہدات کے ــــ جو کہ بالفاظ دگر، ضروریات پر اکتفا کا نام ہے ــــ فوائد و منافع اجتبا والوں کے لیے ...... بہت سے ہیں مثلاً دوام ہجرانِ نفس اور دنیا کی آلودگیوں سے باطن کی طہارت و نظافت ــــ جس قدر کہ حوائجِ ضروری سے ہو وہ داخلِ دُنیا نہیں ہے اور جو فضول و زائد ہے وہ دُنیا میں داخل ہے ــــ ایک دوسرا نفع ریاضت کرنے اور ضروریات پر اکتفا کرنے کا خفتِ محاسبہ اور قلّتِ مواخذۂ اُخروی بھی ہے نیز ریاضت و مشقت، درجاتِ اُخروی کے بلند ہونے کا بھی سبب ہے اس لیے کہ جس قدر دُنیا میں مشقت ہے اُس سے کئی گنی آخرت میں مسرت ہے ــــ ...... پس واضح ہوا کہ ریاضات اور انحصار بر ضروریاتِ مُباحہ اگرچہ راہِ اجتبا کے اندر شرطِ وصول نہیں مگر فی حد ذاتہا محمود و مستحسن

ضرور ہیں بلکہ فوائد مذکورہ پر نظر کرتے ہوئے ضروری و لازم ہیں ـــــ رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ـــــ والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ـــــ

مکتوب (۸۹) - قاضی اسمٰعیل فریدآبادی کے نام ـــــ [درمیانی حصہ شیخ اکبرؒ سے متعلق]

..... اس مسئلۂ توحید (وجودی) کی متقدمین صوفیہ کے زمانہ میں اچھی طرح تنقیح و توضیح نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے ان متقدمین میں سے جس پر غلبۂ حال ہوجاتا تھا اُس سے کبھی کبھی کوئی ایسا کلمہ صادر ہوجاتا تھا جو "اتحاد نما" ہوتا تھا اور وہ غلبۂ سُکر و حال کی وجہ سے اُس کلمے کے راز تک نہیں پہونچتا تھا اور اس کی ظاہر عبارت میں حلول و اتحاد کا شائبہ رہتا تھا ـــــ جب شیخ بزرگوار محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کا زمانہ آیا تو انھوں نے کمالِ معرفت سے اس دقیق مسئلہ کو شرح کیا اور اس مسئلے کو باب باب اور فصل فصل کر کے واضح اور مرتب طور سے بیان کیا، نیز صرف و نحو کی طرح اس کی تدوین کی ـــ اس کے باوجود ایک جماعت صوفیہ نے ان کی بات نہیں سمجھی اور ان کو مطعون کیا ـــ اس مسئلۂ توحید میں اکثر تحقیقات کے اندر شیخ حق بجانب ہیں اور اُن پر طعن و اعتراض کرنے والے صحت و صواب سے دور ہیں ـــــ اس مسئلے کی تحقیق سے شیخؒ کی عظمت اور اُن کے وفورِ علم کا احساس و ادراک ہونا چاہیئے نہ یہ کہ ان پر ردّ و طعن کیا جائے ـ

یہ مسئلۂ توحید (وجودی) جس قدر آگے کو چلا ہے اُسی قدر افکار متاخرین کے باہم مل جانے کی وجہ سے واضح و منقح اور حلول و اتحاد کے شبہات سے دور تر ہوتا چلا گیا ہے ـــــ

علم نحو جو اس فن کے متاخرین کے تلاحقِ افکار سے بقدر واضح و منقح ہو چکا ہے سیبویہ اور اخفش کے زمانے میں اتنا واضح و منقح نہ تھا ہر فن کی تکمیل تلاحقِ افکار ہی سے ہوتی ہے ـــ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ نے چھ ماہ تک مسئلہ خلق قرآن میں باہم تبادلہ خیال اور بحث و مباحثہ کیا، چھ ماہ کے بعد یہ تحقیق مکمل ہوئی کہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے گا کافر ہو جائے گا ـــــ اس وقت ان دو اماموں کے درمیان یہ طویل تبادلۂ خیال اور بحث مباحثہ اسی وجہ سے ہوا کہ مسئلہ اس وقت تک منقح نہیں ہوا تھا جب اتنے بحث مباحثہ اور غور و فکر کے

بعد مسئلہ منقح ہو گیا تو وہ ایک نتیجہ پر پہونچ سکے۔ اس وقت جب کہ تلاحقِ افکار سے یہ مسئلہ (خلق قرآن) منقح ہو گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر محلِ نزاع حروف و کلمات ہیں جو کہ کلام نفسی پر دلالت کرتے ہیں تو اس میں شک نہیں ہے کہ یہ حروف و کلمات حادث و مخلوق ہیں اور اگر معانی مراد ہیں تو (بلاشبہ) قدیم و غیر مخلوق ہیں ____ یہ تنقیح تلاحقِ افکار ہی کی برکات سے ہے.....

مکتوب (۹۰) - خواجہ محمد ہاشم کشمی کے نام ____ [شرع کا کچھ حصہ دُنیا میں دیدار الٰہی سے متعلق]

تم نے دریافت کیا تھا کہ محققین صوفیا میں سے بعض دنیا میں دیدۂ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے قائل ہیں جیسا کہ شیخ عارف (حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ) اپنی کتاب عوارف المعارف میں فرماتے ہیں، موضع المشاہدۃ بصر القلب الخ (دُنیا میں مشاہدۂ حق تعالیٰ کا مقام دیدۂ قلب ہے) ____ اور شیخ ابو اسحٰق کلاباذی قدس سرہٗ جو کہ قدمائے صوفیا اور اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ کتاب تعرف میں فرماتے ہیں کہ "اجماعِ صوفیا رہے اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہ ابصار سے دیکھا جا سکتا ہے نہ قلوب سے ہاں ایقان کی جہت سے دیکھا جا سکتا ہے" ____ تم نے پوچھا تھا کہ دونوں بزرگوں کی تحقیق میں تطبیق کس طرح ہو؟ اور میری رائے بھی اس کے بارہ میں دریافت کی تھی، نیز تم نے دریافت کیا تھا کہ جب اس مسئلہ میں اختلاف ہے تو پھر اجماع کے کیا معنی ہیں؟ - جاننا چاہیے ____ اللہ تعالیٰ تم کو رشد و ہدایت عطا فرمائے ____ کہ اس فقیر کے نزدیک اس مسئلے میں مختار و پسندیدہ قول، صاحب تعرف کا ہے۔ فقیر کا یقین یہی ہے کہ قلوب کو اس دُنیا میں سوائے ایقان کے حضرت حق جلّ سلطانہٗ سے اور کوئی حصہ نہیں ہے ____ اب اس ایقان کو رویت کہہ لو یا مشاہدہ! (اور یہ بھی واضح رہے کہ جب (دنیا میں) قلب کو بھی رویت حاصل نہیں تو ابصار کو کیا حاصل ہو گی؟ اس لیے کہ ابصار تو اس دنیا کے اندر مشاہدۂ حق کے معاملے میں محض بے کار و معطّل ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لو کہ قلب کو معنیٔ ایقان جو حاصل ہو گیا ہے وہ معنیٔ ایقان عالمِ مثال میں بصورتِ رویت و دیدار ظاہر ہو جاتا ہے اور جس ذاتِ مقدس سے ایقان کا تعلق ہے وہ ذات دیکھی ہوئی شے کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عالمِ مثال میں ہر معنیٰ کے لیے عالمِ شہادت (دنیا) کے مناسب

ایک صورت ہے اور چونکہ عالم شہادت میں کمال یقین، رویت کی صورت میں حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ ایقان بھی عالم مثال میں بصورت رویت ظاہر ہو جاتا ہے، اور جب ایقان بصورت رویت ظاہر ہوا تو اس کا متعلق جو کہ موقن بہ ہے اجبار بصورت مرئی (دیدہ شدہ) اس جگہ ظاہر ہو جاتا ہے ۔ سالک جب اس کو آئینہ مثال میں مشاہدہ کرتا ہے تو آئینہ کے توسط سے غافل ہو کر اور صورت کو حقیقت جان کر سمجھتا ہے کہ اس کو حقیقۃً رویت حاصل ہو گئی ہے اور مرئی نمودار ہو گیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ وہ رویت اس کے صورت ایقان کی رویت ہے اور وہ دیدہ شدہ اس کے موقن بہ (متعلق ایقان) کی صورت ہے ـــــ اور یہ ان امور میں سے ہے جن میں بہت سے صوفیوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور ان کے لیے صورتیں حقائق سے ملتبس ہو جاتی ہیں اور وہ مغالطہ کھا جاتے ہیں ـــــ بھی "دید" جب غالب آتی ہے اور باطن سے ظاہر میں نکلتی ہے تو کبھی کبھی سالک اس توہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ رویت بصری بھی حاصل ہو گئی اور مطلوب گوش سے آغوش میں آ گیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اس معنی کا حصول جب کہ اصل تک میں یعنی بصیرت تک میں مبنی بر توہم و تلبیس ہے تو بصر جو کہ اس عالم میں بصیرت کی فرع ہے اس کی تو حیثیت ہی کیا ہے ؟ بھلا (دنیا میں) بصر کو رویت کیسے حاصل ہو سکتی ہے ؟ ـــــ رویت قلبی میں تو صوفیاء کا جم غفیر توہم میں پڑ گیا ہے اور رویت قلبی کا حکم لگاتا ہے۔ مگر دنیا میں رویت بصری کے متعلق صوفیاء میں شاید کوئی ناقص ہی توہم میں پڑا ہو (کیونکہ دنیا میں ان آنکھوں سے حق تعالیٰ کا دیدار) اہل سنت و جماعت کے اجماع کے خلاف ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور کرے ـــــ .... اور اجماع کے بارے میں جو تم نے دریافت کیا ہے (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہو سکتا ہے اس وقت تک (صاحب تعرف کے وقت تک) وہ اختلاف جو لائق اعتبار ہو ظہور میں نہ آیا ہو یا اپنے زمانے کے مشائخ کا اجماع مراد ہو ـــــ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ ـــــ

اسلام کا پیغام
عظیم جرمن قوم کے نام

(از ــــ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

[ہمارے محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ، امسال دوسری مرتبہ اسلامک سینٹر جنیوا کی دعوت پر یورپ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپ کا جرمنی بھی جانا ہوا۔ ۲۴ر اکتوبر ۶۴ء کو برلن کی انجینیرنگ یونیورسٹی کے ایک جلسے میں جو یونیورسٹی کے عرب طلباء کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا، مولانا نے جرمن قوم کو مخاطب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تقریر کی ــــ تقریر پہلے سے عربی میں لکھ لی گئی تھی، مقرر نے اس کے مندرجات اپنی زبانی تقریر میں بیان کیے۔ عربی تقریر کا جرمن ترجمہ پہلے سے تیار تھا جو ایک نومسلم جرمن نے پڑھ کر سنایا ــــ اس تقریر کا اردو ترجمہ مولوی محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" و "تعمیر حیات" نے کیا ہے جو ان کے شکریے کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

حضرات! مجھے اس عظیم شہر برلن میں پہلی بار عظیم جرمن قوم سے خطاب کرنے اور اسلام کا پیغام پہونچانے کا موقع مل رہا ہے، یہ ایک خوشگوار اور قیمتی موقع ہے اور مجھے اس کی اہمیت اور نزاکت کا پورا احساس ہے۔

جرمن قوم زمانۂ قدیم سے شجاعت و بلند ہمتی، سنجیدگی اور قوت عمل اور انتھک جد و جہد میں ممتاز رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس قوم میں ایسے اولوالعزم اور جوانمرد پیدا ہوئے جنھوں نے مغربی معاشرہ اور مغربی افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ تین اشخاص کا نام لوں گا جن

میں سے ہر ایک کا یورپ کے دل و دماغ پر زبردست اثر ہے اور ان میں سے ہر ایک مستقل مدرسۂ فکر کا بانی اور اپنے رنگ میں منفرد ہے پہلا شخص مارٹن لوتھر Martin Luther ہے جس نے اصلاح کلیا، کتاب مقدس کی طرف رجوع اور پوپ پادریوں کے حد سے بڑھے ہوئے اقتدار کی حد بندی کی دعوت دی، اس نے مسیحی یورپ پر گہرا اثر چھوڑا اور ایک مذہب کا بانی قرار پایا جس کو پراٹسٹنٹ کہتے ہیں۔ دوسرا شخص کانٹ ہے جس نے یورپ کی عقل پرستی کی تردید کی اور اس کے حدود اور میدان متعین کیے، کانٹ عہدِ آخر میں جرمنی کا سب سے بالغ نظر فلسفی سمجھا جاتا ہے، اس کا اور اس کی دو کتابوں "تنقیدِ عقل خالص اور تنقیدِ عقل عملی" کا مغربی فکر و فلسفہ پر گہرا اثر ہے۔

تیسری شخصیت نیٹشے کی ہے جو ایک ایسا سرپھرا مفکر تھا جس نے اخلاقیات، اجتماعیات اور مسیحی نظام کے خلاف ہمہ گیر بغاوت کا علم بلند کیا اور ساری عمر اپنے گرد و پیش کی دنیا اور افکار و مسلمات سے لڑتا رہا۔

یہ تینوں شخصیتیں اور ان کے پیدا کیے ہوئے مدارس فکر، جرأت انقلاب اور جدت میں ممتاز تھے، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر انقلابی نقطۂ نظر کا حامل تھا جس کا اعتراف نہ صرف اس کے ملک جرمنی بلکہ پورے یورپ کو ہے۔

انقلاب، بغاوت اور ذہنی بے چینی جرمن قوم کے خمیر میں ہے، انقلاب پسندی، نفسیاتی خلش اور ذہنی بے چینی ہی تھی جو کارل مارکس کی شخصیت کے روپ میں اپنے پورے عروج کے ساتھ ظاہر ہوئی اور جس نے آخر کار دنیا کے ایک بہت بڑے رقبہ میں بے چینی پیدا کر دی اور موجودہ زمانہ کے قدیم اقتصادی نظاموں کے خلاف سب سے بڑی بغاوت کہلائی۔

یہ تحریکیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا دراصل انقلابات اور بغاوتیں ہی تھیں، کبھی ان کا دائرہ وسیع تھا کبھی تنگ، کبھی ان کا اثر گہرا تھا اور کبھی ہلکا، جرمن قوم ہمت و جرأت، پیش قدمی، دنیا میں بلند مرتبہ حاصل کرنے کا شوق اور خود اعتمادی میں بھی ممتاز ہے، پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء) بھی درحقیقت سیاست و حکومت کی دنیا میں دو بغاوتیں یا دو مہم جوئی کہی جا سکتی ہیں۔ یہ صرف اس کا نتیجہ تھا کہ اس عظیم قوم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا، اس کی صلاحیتیں، قوتیں یکا یک ابھر آئیں اس میں حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی اب بھی شرارِ زندگی

اس کی خاکستر میں پوشیدہ ہے، اب بھی وہ زندگی و نشاط اور تعمیر و ترقی کی زبردست صلاحیت سے بھرپور ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو جرمن قوم اس زبردست صدمہ کو برداشت نہ کر سکتی جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں وہ اس قیامت کو سہار نہ سکتی جو ایک پوری قوم کی صلاحیت کو مفلوج کر دینے اور اس کو زندگی سے مایوس کر دینے کے لیے کافی تھی اور دوسری جنگ میں اس کی تباہ شدہ عمارتوں اور کارخانوں کے ملبہ سے یہ تمدن یہ صنعت اور یہ نشاط اور قوت پیدا اور ظاہر نہ ہوتی اور جرمن قوم تازہ دم ہو کر نئی قوت اور نئے ولولہ کے ساتھ اپنی زندگی کی دوڑ شروع کرنے کے قابل نہ ہو سکتی۔

لیکن اس عظیم قوم کے یہ تجربے اور مہم جوئیاں محدود دفاعوں اور محدود قسم کے انقلابات سے آگے نہ بڑھ سکیں، جس طرح کے انقلابات کا آغاز کلام میں میں نے اشارہ کیا ہے اور جس کی مغربی معاشرہ اور مغربی دائرۂ فکر میں ایک خاص قیمت اور اہم حصہ ہے۔ اور جس نے جرمن قوم کو عظمت و ترقی اور شہرت دوام عطا کی ہے لیکن وہ یورپ کے مذہبی اور فکری نظام کو یکسر تہ و بالا نہیں کر سکیں وہ ایک نیا معاشرہ، اور ایک نئی دنیا پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں جو قدیم دنیا سے ہر چیز میں مختلف ہوتا۔ گزشتہ دونوں بڑی جنگیں اصول اور مقاصد کے لیے نہ تھیں وہ مسیحیت یا بلند اخلاقی، ایثار یا انسانیت کے لیے نہیں لڑی گئی تھیں، ان کا مقصد اور نشانہ یہ نہیں تھا کہ قیادت ظالم اور ریا کار ہاتھ سے نکل کر رحمدل اور عدل نواز ہاتھ میں پہونچ جائے، وہ فسق و فجور، بے حیائی اور حیوانیت کو ختم کرنے کے لیے نہیں چھیڑی گئی تھیں۔ آپ مجھے معاف کریں یہ درحقیقت حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے لیے تھیں اور زیادہ صاف لفظوں میں یہ جنگیں اس لیے کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں سے ہر فریق یہ چاہتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ فساد، ظلم، زور دستی اور لوٹ کھسوٹ ہے وہ سب برقرار رہے، لیکن اس کی تولیت اور ماتحتی میں ہو۔

عظیم جرمن قوم کا مقام و مرتبہ تو یہ تھا کہ وہ ان تمام بغاوتوں اور جنگوں اور انقلابات سے زیادہ دور رس انقلاب دنیا کے سامنے پیش کرتی، ایسا انقلاب جو نہ صرف جرمنی اور یورپ بلکہ نوع انسانی کے لیے مفید ہوتا اور اس کو حقیقی سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا، ایک ایسا انقلاب جو اپنی انفرادیت، انقلاب آفرینی، جدت اور حوصلہ مندی اور اپنی تخلیقی صلاحیت میں ان تمام انقلابات سے کہیں بہتر ہوتا جو جرمنی کے اولوالعزم رہنماؤں نے ماضی قریب یا ماضی بعید میں برپا کیے ہیں۔

آج بھی جرمنی مغربی قافلہ کا پوری طرح ساتھ دے رہا ہے بلکہ صنعت، کاریگری اور کثرت پیداوار میں بعض وقت اس سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ وسائل، ایجادات اور مصنوعات اور زندگی کی سہولتوں میں برابر اضافہ کرتا آرہا ہے۔ لیکن موجودہ تہذیب میں اس کا حصہ صرف صنعت، پیداوار، تجارت اور موقع شناسی کی حد تک ہے، اس معاملہ میں اس قوم کی ذہانت اور عبقریت، اس کا کمال فن اور اس کا ضبط و تحمل اچھی طرح آشکارا ہوگیا ہے اور وہ اس میدان میں اپنی بہت سی پڑوسی قوموں اور ملکوں سے آگے نکل گئی ہے اور دنیا کی قوموں میں اور تجارت کی منڈیوں اور بازاروں میں صف اوّل میں نظر آتی ہے۔

اس انقلاب پسند اور حوصلہ مند قوم سے اور اس ملک سے جو عرصہ سے انقلابوں کا مسکن اور انقلابات کی آماجگاہ رہ چکا ہے اس کی توقع تھی کہ وہ اس تہذیب سے بغاوت کرتی جس نے انسان کو ایک گمراہ سرکش وجود اور ایک طاقتور تباہ کن ہستی بنا دیا ہے، اس نے اس کو ایک ایسی اندھی بہری مشین بنا دیا ہے جو نہ روح رکھتی ہے نہ دل، نہ عقیدہ، نہ ضمیر، اس نے پوری دنیا کو ایک قمار خانہ یا تھیٹر خانہ اور پوری زندگی کو خرید و فروخت اور لین دین کی ایک منڈی بنا دیا ہے۔ اس نے زندگی سے لذت، جدت، تنوع، گہرائی اور حرارت سلب کرلی ہے اس تہذیب کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی جس نے زندگی کو ایک نہ ختم ہونے والی مشکلات بنا دیا ہے ایک ایسی ریس میں تبدیل کر دیا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، ایک ایسی جدوجہد اور تگ و دو جس کا کوئی نتیجہ نہیں اس نے عصر حاضر کے انسان کو کولہو کا بیل بنا دیا ہے جو مسلسل ایک دائرہ میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ اس نے انسان سے اس کی سب سے بیش قیمت متاع چھین لی اس کو سب سے بڑی شرافت سے محروم کر دیا، اور وہ ہے ایمان و یقین، بے لوث اخلاص، پاکیزہ محبت اور درد و سوز کی دولت۔

اس کی توقع تھی کہ یورپ کی قوموں میں سے کوئی ایک قوم ان جھوٹے نظریات اور ان مصنوعی اقدار اور معیاروں سے بغاوت کرتی جس کو خود انسان تراشتا ہے اور پھر ان کی پرستش کرتا ہے۔ یہ جھوٹی اقدار، زندگی کے وہ مطالبات، زندگی کا وہ معیار اور نئے نئے فیشن ہیں اور وہ ساری پابندیاں ہیں جن کو سوسائٹی بلا وجہ انسانوں پر عائد کرتی ہے، وہ ٹیکس ہیں جو انسان کی پرسکون زندگی کو محکوم اور اس کی حقیقی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں خاص طور پر

اس جرمن قوم سے جس کی یورپ نے کوئی قدر نہیں کی اس بات کی امید تھی کہ وہ اس مبارک اور حقیقی انقلاب کی علمبردار ہو کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دُنیا کے حالات کا رُخ تبدیل کر دیتی اور اس کے ایک نئے باب کا آغاز کرتی۔

اس کے برعکس جرمنی جس مغربی خاندان کا ایک وفادار ممبر رہا جس نے اس کے ساتھ کبھی مساویانہ سلوک نہیں کیا اور ہمیشہ اس کو حسد کی نگاہ سے دیکھا وہ اسی رُخ پر چلتا رہا اسی ذہن و دماغ سے سوچتا رہا اور اپنی ذہانت اور مہارت کمال سے اس کو مدد پہونچاتا رہا، اس نے ان حدود سے آگے بڑھنے اور اس دائرے سے باہر قدم نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی جو اس نے متعین کر دیا تھا، اس نے وہ عظیم جست نہیں لگائی جو اس کی تقدیر اور دُنیا کی تقدیر تبدیل کر سکتی اُس کو دنیا کی قیادت اور بقاء، دوام ملتی اور قوموں کی برادری میں اس کے مقام کو بلند اور اپنے پڑوسیوں کی نگاہ میں اس کی عزت دوچند کر سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی جرأت مندانہ جست ہوتی جس کا مقابلہ یورپ کی کوئی اور قوم نہ کر سکتی۔ یہ اس مصنوعی اور تنگ حصار کو توڑ سکتی تھی جس میں یورپ صدیوں سے زندگی گزار رہا ہے۔ یہ جست قدیم و جدید، اور مشرق و مغرب سب کو فراموش کر کے دنیا کو مادیت، حیوانیت درندگی اور اس المناک انجام سے محفوظ کر سکتی تھی جس کو سائنس نے بہت قریب کر دیا ہو۔ یورپ کے مختلف حصّوں میں اقتصادیات، اجتماعیات، اور سیاست کے میدانوں میں انقلابیوں نے جو چھلانگیں لگائی ہیں، وہ اس عظیم جست کے مقابلے میں بچوں کے اچھل کود سے زیادہ کوئی حقیقت نہ رکھتیں۔

یہ ایک عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم تضاد ہے کہ وہ یورپ جو زندگی اور نشاط سے بھرپور رہی اور متمدن دنیا کے سب سے وسیع رقبہ کی قیادت کر رہا ہے جس نے کائنات کے اسرار سے پردہ اُٹھایا اور مادّی طاقتوں کو اپنا غلام بنایا، جو سُستی، جمود، تعطل، اور بے عملی کے الفاظ سے ناواقف ہے، اس کی رہنمائی ایک ایسے مذہب کے ہاتھ میں ہے جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان واسطہ حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ جو انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے اور حضرت مسیح کے نوعِ انسان کی طرف سے کفارہ بن جانے پر عقیدہ رکھتا ہے، وہ کفارہ جو انسان کو دوسرے پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں اور اپنے ارادہ و عمل پر اس کے اعتماد کو ختم کر دیتا ہے اور اس کے عمل کی قیمت اور جدوجہد کی ضرورت و افادیت کو خود اس کی نگاہ سے گراتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ اس مذہب کے

نمائندے یورپ کے متجسس، حوصلہ مند اور سیماب وش انسان اور علم و عقل کے درمیان ایک طویل عرصہ تک دیوار بن کر حائل بھی رہے انھوں نے کتاب مقدس کے مفسرین اور اہل کلیسا کے بتائے ہوئے معلومات و نظریات سے سرتابی ان کے لیے حرام کر رکھی تھی چنانچہ جو شخص اپنے عقل و تجربہ پر بھروسہ کرتا تھا اور اپنے مشاہدہ اور نظریہ کا اعلان کرتا تھا، اس کو وہ سزائیں دی جاتی تھیں کہ مذاہب کی پوری تاریخ میں اس سے ہیبت ناک اور بیدردانہ سزاؤں کی مثال نہیں ملتی۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ یورپ نے کلیسا کے اس بیجا جبر و استبداد اور تنگ نظری و کم عقلی کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کی بیڑیاں اور زنجیریں توڑ ڈالیں اس نے وہ عظیم ترقی کی جس کی مثال عہد یدا انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ علم و تمدن اور طبیعیاتی علوم میں بڑے بڑے مراحل طے کیے لیکن اس زبردست کشمکش نے جس نے اس کو بالکل خستہ اور شکستہ کر دیا اور اس کی ساری طاقتوں اور صلاحیتوں کو نچوڑ لیا (حالانکہ اس دردسری کی اس کو کوئی ضرورت نہ تھی) اس کو اس توازن و اعتدال سے محروم کر دیا جو حقیقی سعادت کا سرچشمہ ہے اور اس پر وہ انتہا پسندی اور مادہ پرستی مسلّط کر دی جو مرور زمانہ کے ساتھ مغربی تہذیب کا مزاج اور اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے آج بھی یہ کلیسا بہت سے مغربی ملکوں کی مغربی سوسائیٹوں پر حاوی ہے، آج بھی ایک یوروپین اپنے مذہب میں وہ رُخ اختیار کرتا ہے جس کا عقل و تدبر سے کچھ تعلق نہیں ہوتا، اور اپنی تہذیب و معاشرت میں وہ طرز اختیار کرتا ہے جس کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، یہ تضاد اس کی ہر ترقی ہر پیشقدمی اور ہر طرز ادا کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔

اس سے بڑھ کر تضاد اور المیہ جس کو تاریخ بھول نہیں سکتی یہ ہے کہ اس کے برعکس یورپ اس توحید خالص اور واضح عقیدہ کے دین (اسلام) سے محروم رہا جو اپنی وضاحت اور عملیت، سعی و عمل اور خود اعتمادی میں ممتاز ہے جس کے نزدیک ایک فرد کے عمل کی بڑی قیمت ہے جو دنیا و آخرت دونوں جگہ اعمال کے نتائج و اثرات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس دُنیا کو آخرت تک پہونچنے کا ایک پُل سمجھتا ہے جو انسان میں مردانگی، اولوالعزمی، عالی ہمتی اور بلند نظری کے اوصاف پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ اس پیغام کے داعی سے بالکل الگ رہا جس کے متعلق قرآن کے معجزانہ اور بلیغ الفاظ یہ ہیں۔

الرّسول النّبی الامیّ الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحلّ لھم الطیّبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔

(پارہ ۹)

(ترجمہ) جو رسول کی پیروی کریں گے جو نبی امّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا۔ برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا۔ گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہونگے۔ ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے یورپ کو متوحش، بدظن اور دور کرنے میں صلیبی جنگوں، اہل کلیسا، مسیحیت کے مبلّغین اور یورپ کے ان مصنفین کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو علمی رجحان یا مذہبی رجحان کے حامل نہ تھے، انھوں نے اس دین اور اس کے عظیم پیغمبر کی بہت خوفناک اور کریہہ تصویر پیش کی اور یورپ میں پیغمبر اسلام کے متعلق طرح طرح کی من گڑھت کہانیاں اور بے سر و پا داستانیں مشہور ہوگئیں، ان کے گرد مختلف کہانیوں، مثالوں اور کہاوتوں کا ایک سیاہ ہالہ قائم ہوگیا جس نے یورپ کو ان کی محبّت، اور ان کی عظمت کے اعتراف سے باز رکھا آج بھی اس کے نمونے ان کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو قرون وسطیٰ اور اس کے بہت بعد تک لکھی جاتی رہیں اور آج بھی بہت سے پُرجوش مغربی مصنفین اسی بات کو دہراتے اور نئے نئے زاویوں سے پیش کرتے رہتے ہیں۔

اسکے علاوہ اس کا ایک بہت بڑا سبب اور تھا اور وہ یہ کہ یورپ اس دین کو ترکوں کے واسطے سے دیکھنے کا عادی رہا۔ جب وہ اس پر غور کرتا یا اس کا تصوّر کرتا تو اس کے سامنے عثمانی ترک کھڑے ہوجاتے جو یورپ کے بر اعظم میں اسلام کے تنہا سرکاری نمائندہ سمجھے جاتے تھے، وہ آزادانہ نگاہ سے اسلام کو نہیں دیکھتا تھا بلکہ عثمانیوں کے مذہب کی حیثیت سے اس پر غور کرتا تھا جو اس پر اکثر حملہ کرتے رہتے تھے اور اس کے بہت سے حصوں پر قبضہ بھی کر لیتے تھے جو کبھی کبھی غلطیاں بھی کرتے تھے اور کبھی کبھی ان سے تشدّد و سختی کا مظاہرہ بھی ہوتا تھا، یہ ساری باتیں اسلام کے صحیح اور پاکیزہ فہم سے مانع رہیں جو آزادانہ

غور و فکر اور براہِ راست مطالعہ پر مبنی ہوتا۔

اسلام سے یورپ کے بُعد کا انسانی سوسائٹی کی تاریخ اور تہذیب ترقی کی رفتار پر بہت گہرا اور دور رس اثر پڑا، اگر یورپ یا اس کی کسی بڑی قوم نے اسلام کو اختیار کیا ہوتا اور اس دعوت کی علمبردار ہوتی تو نہ صرف یورپ بلکہ پوری دُنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، زندگی اس طرح بے معنی اور بے مقصد نہ ہوتی دین و اخلاق اس طرح بے دست و پا اور بے اثر نہ ہوتے، انسانی تہذیب کا رُخ تباہی و بربادی کی طرف نہ ہوتا اور مشرق بھی محض استحصال اور جبر و استعمار کی آماجگاہ نہ ہوتا جیسا آج ہے۔

دُنیا میں ایک ایسا عظیم خلا ہے جو صدیوں سے پُر نہیں کیا جا سکا اور وہ ایک ایسی قوم کا فقدان ہے جو اپنے ایمان و عقیدہ اور اپنے اخلاق و معاملات ہر چیز کے لحاظ سے طاقتور ہو جو صحیح دینی دعوت اور اُس آخری آسمانی پیغام کی حامل ہو جو زندگی کے مسائل کا سامنا کرتا ہے اس سے گھبراتا نہیں، قافلۂ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے اس سے پچھڑتا نہیں، ایسی قوم جو عصری ثقافت میں ممتاز، عبقریت اور تخلیقی صلاحیت کی حامل، زندگی و نشاط سے لبریز، اور مجسم جہد و عمل ہو، یہ وہ مطلوب قوم ہے جو دُنیا کا رُخ شر سے خیر کی طرف تخریب سے تعمیر کی طرف اور فساد سے اصلاح کی طرف پھیر سکتی ہے۔

ترکوں میں جن کی قیادت آلِ عثمان کر رہے تھے (سولھویں صدی عیسوی میں) اسکی صلاحیت تھی کہ عالمی قیادت کے اس خلا کو پُر کر سکیں جو طویل عرصہ سے چلا آ رہا تھا، انھوں نے مشرق میں قیادت کے اس خلا کو ضرور پُر کیا، عالمِ اسلام کی قیادت کی اور اسکو ایک نئی زندگی اور نئی قوت عطا کی لیکن بہت سے اسباب کی بنا پر مثلاً جدید علوم، جدید تنظیم اور ترقیات و ایجادات کے شعبے میں ان کی پسماندگی، مغربی قوموں کی ان پر یورش اور جنگوں کے لامتناہی سلسلوں کی وجہ سے وہ مغرب کی قیادت نہ کر سکے اور اس نشأۃ ثانیہ کی سربراہی نہ کر سکے جو یورپ میں پروان چڑھ رہی تھی اور ایک نیا عہد وجود میں آ رہا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قافلہ سے بچھڑ گئے۔ یہ خلا ان کے بعد آج بھی باقی ہے اور وہ کسی ایسی مغربی یا مشرقی قوم کا منتظر ہے جو ایمان اور علم کی قوت، روح اور مادہ کی قوت آسمانی پیغام کی ابدیت اور اس کی ازلی حقیقت، علم کی جدت اور عقل کی ترقی پذیری، جدید وسائل کے انبار اور صالح مقاصد کی دولت کو باہم جمع کر سکے وہ مقاصد جو آسمانی مذاہب عطا کرتے ہیں اور آخری آسمانی مذہب اسلام اس کا سب سے مکمل اور جامع

نمائندہ ہو، وہی قوم اس دنیا کی اصلی قائد اور رہنما ہو جو اس خلا کو پُر کر سکتی ہے، تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتی ہو اور زمانہ کو ایک نیا راستہ اور نئی سمت اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور اس جی چھوڑتی آمادۂ خودکشی دنیا کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کر سکتی ہے اور اس کو موت کے اُس غار سے بچا سکتی ہے، جس کی طرف وہ ایٹمی سرعت اور راکٹ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

اس کے لیے ایک جرأت مندانہ بغاوت کی ضرورت ہو ایک ایسے انقلاب کی ضرورت ہو جو ان تمام انقلابات سے بڑھ جائے جو تیری سرزمین پر بڑے انقلابیوں اور آزادی و ترقی کے علمبرداروں نے ماضی یا حال میں کیے تھے اسکے لیے پوری قوم کے انقلاب اور تغیر حال کی ضرورت ہو۔ ایک ایسی "جست" یا چھلانگ کی ضرورت ہو جس میں خاصا خطرہ ہو، قربانی ہو، جست ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف، ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف، ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف، یہ جست تجھ کو وہ قیادت و زعامت، وہ عزت و احترام وہ اثر و رسوخ وہ ہیبت و رعب اور وہ سکون و اطمینان اور روحانی آسودگی و خوشحالی عطا کر سکتی ہے جس کا خواب بھی تیرے ان خطر پسند دل جوانمردوں اور جنگجو رہنماؤں نے نہ دیکھا ہوگا جنھوں نے تجھ کو دو ہولناک جنگوں میں ڈھکیل دیا تھا۔

اس جست سے تو مادّی قوت، سیاسی اقتدار اور انسانیت کی صحیح رہنمائی اور صحیح نمونہ دونوں چیزوں کی جامع اور اللہ تعالیٰ کی ان ارشادات کی مصداق ہو سکتی ہے۔

وَنُرِيدُ اَن نَّمُنَّ علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثین۔ پارہ ۲۰

وجعلناهم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون۔

(۱) اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنا خاص فضل کریں ان بندوں پر جو ہماری زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں اور ہم ان کو سربراہ بنائیں اور انھیں کو زمین کا وارث بنائیں۔

(۲) اور ہم نے بنا دیا ان کو پیشرو کہ وہ رہنمائی کریں ہمارے حکم سے جبکہ انھوں نے صبر و ثبات کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔

مذہب — جو پچاس سالہ اشتراکی قید کے باوجود زندہ ہے

از ـــــــ جناب وحید الدین خاں صاحب

[مغربی جرمنی میں ایک تنظیم قائم ہے جس کا نام ہے، سوویت روس کے مطالعہ کا ادارہ
(INSTITUTE FOR THE STUDY OF THE U.S.S.R)
اس ادارہ کے ارکان وہ علماء و محققین ہیں جو پہلے اشتراکی مملکت کے شہری تھے اور اب وہاں سے ہجرت کر کے مغربی ملکوں میں آبسے ہیں۔ اس ادارہ کے تحت کتابوں کے علاوہ مختلف زبانوں میں متعدد رسائل شائع ہوتے ہیں جن میں خالص علمی انداز میں اور براہ راست روسی حوالوں کی مدد سے اشتراکی روس کے معاملات و مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ انھیں میں سے ایک رسالہ بلیٹن (BULLETIN) بھی ہے۔ اس رسالہ کی جون ۱۹۶۴ کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے (RELIGION: A THORN IN THE PARTY'S SIDE) یعنی مذہب کمیونسٹ پارٹی کے لیے سوہان روح۔ ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔]

نومبر ۱۹۶۳ء کی ۲۵، ۲۶، ۲۷ تاریخ کو ماسکو میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ایک اجتماع ہوا جس میں وزراء، مختلف پبلک اداروں کے ذمہ دار، پارٹی کے نظریاتی ماہرین اور سائنس، کلچر، تعلیم، پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے شریک ہوئے، اس اجتماع کا مقصد سوویت عوام کی "لامذہبی تعلیم و تربیت" اور مذہب کے خلاف عملی تدابیر کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ اس طرح یہ اجتماع ظاہر کرتا ہے کہ روس میں تقریباً آدھی صدی تک ایک مکمل طور پر با اختیار حکومت کی مسلسل اور ہمہ جہتی مخالفانہ جدوجہد کے باوجود مذہب ابھی ختم نہیں ہوا ہے حتیٰ کہ

نوجوان نسل جو عین لادینی اشتراکی سماج کے اندر پیدا ہوئی ہے وہ بھی مذہب کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ جیسا کہ تعلیم و تربیت کے مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس اجتماع کی خاص چیز نظریاتی کمیشن کے چیئرمین ایل۔ الیچوف (L. I. LICHEV) کی طویل رپورٹ تھی جس کا عنوان تھا ——— "سائنسی نظریۂ کائنات کی تعمیر اور لامذہبی تعلیم و تربیت" یہ رپورٹ روسی کمیونسٹ پارٹی کے نظریاتی ترجمان (KOMMUNIST) میں ۱۹۶۴ء کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی ہے، نیز دوسرے روسی جرائد میں نقل کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں الیچوف نے لامذہبی تعلیم و تربیت کو "نظریاتی محاذ پر روس کا ایک انتہائی اہم مسئلہ" قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس وقت مذہبی عقائد کے خلاف لڑائی کے سوال نے ہمیشہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔ الیچوف کے نزدیک مذہب سائنسی اور سماجی ترقی کے لیے بریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی شکل میں سوویت سماج کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

رپورٹ کے مطابق روسی چرچ نے اپنے آپ کو نئے طرز پر ڈھال کر اشتراکی ڈھانچے کے اندر باقی رہنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور وہ دن بدن مضبوط ہو رہا ہے۔ کسی موقوفہ جائداد یا ریاستی امداد کے بغیر محض اپنے متبعین کی رضا کارانہ امداد کی بدولت روسی چرچ آج ایک خوش حال تنظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ پادریوں کی ایک بڑی تعداد کی کفالت کر سکے، گرجاؤں کو اچھی حالت میں رکھ سکے اور وسیع پیمانے پر ضرورت مند اشخاص کی امداد کر سکے۔ حالانکہ روسی چرچ کے لیے چندہ وصول کرنا یا کسی خیراتی سرگرمی میں حصہ لینا قانونی طور پر ممنوع ہے۔ نیز اشاعتی پابندیوں کے باوجود وہ خطوط اور پیغامات کی نقلوں کے ذریعہ اپنی تبلیغ کا کام بھی جاری رکھتا ہے۔ قانونی بندش، گرفتاری، مقدمہ اور ہر قسم کے مظالم کے باوجود مسیحی مذہب نے روس میں اپنی موت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اسی طرح سوویت روس خاص طور پر وسطی ایشیا کی جمہوریتوں اور شمالی کاکیشیا میں اسلام از سر نو ابھر رہا ہے۔ چنانچہ روسی جریدہ (NAUKA-I-ZHIZN) نے "ملاؤں" کی مسلسل سرگرمیوں پر سخت تنقید کی ہے جو مقدس مقامات کو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ الیچوف کی مندرجہ بالا رپورٹ کہتی ہے:-

"تازکستان اور دوسرے مقامات پر لامذہبیت کے متعلق سائنٹیفک کام کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملّا سوویت قانون سے سنگین انحراف کر رہے ہیں ــــــ ۲۹ رجسٹرڈ اماموں کے علاوہ بہت سے مذہبی اشخاص غیر قانونی طور پر ریاست کے اندر مصروف کار ہیں۔ بہت سی مسجدیں جو بند سمجھی گئی تھیں فی الواقع ان کے اندر مذہبی سرگرمیاں جاری ہیں، بند مزار اور دوسرے مذہبی مقامات کی زیارت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ بعض عمارتیں "میوزیم" کے پردے میں مذہبی مرکز بنی ہوئی ہیں۔ تازکستان میں ایسی بھی مسجدیں ہیں جو بظاہر چائے خانہ اور کلب ہیں مگر ان سے مسجد کا کام لیا جاتا ہے۔ مذہبی اعمال اور مخصوص مسلمانہ رسوم مسجدوں کے باہر گھروں اور حجروں میں بھی ادا کیے جاتے ہیں۔"

رپورٹ میں مزید صراحت ہے کہ تازکستان میں بہت سی عمارتیں جو مذہبی مقاصد کیلئے استعمال ہوتی ہیں وہ ابھی حال میں باقاعدہ اجازت کے بغیر تعمیر کی گئی ہیں۔ الیجوف کے خیال میں اس طرح کی تعمیر کول خوز (KOLKHOZES) کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی جنھوں نے باربرداری، سامان عمارت اور انسانی محنت کے ذریعہ ان کے ساتھ تعاون کیا۔ دوسرے لفظوں میں مقامی ذمہ داروں کی تائید بھی ان ملاؤں کو حاصل ہے۔ رپورٹ میں اس امر پر اظہار حیرت کیا گیا ہے کہ متعدد صورتوں میں اسلامی رسوم مقامی ذمے داروں کے سامنے ان کی موجودگی میں ادا کی گئیں۔

"پچھلے ایک سال سے روسی پریس کھل کر اس کا اظہار کر رہا ہے کہ نئی نسل تیزی سے مذہب کی طرف مائل ہے۔ ایسے واقعات شائع کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روسی نوجوان نے مذہبی تبلیغ سے متاثر ہو کر اپنا کام چھوڑ دیا اور مذہبی طبقہ کے ساتھ شریک ہو گیا۔ بعض نوجوان محض اس مقصد کے تحت پالی ٹکنک اسکول میں داخل ہوئے کہ وہ چرچ تعمیر کرنے کے لیے فنی واقفیت حاصل کر سکیں۔ متعدد واقعات میں لامذہبیت کے علمبردار افراد کو مذہبی اشخاص سے مباحثہ میں شکست کھانی پڑی۔ مرکزی سیاسی ادارہ کے صدر جنرل الکسی ایپشیو (ALEKSEI EPISHEV) نے فوج کے نوجوانوں کی تربیت پر خصوصی زور دیا ہے۔ کیونکہ وہ "مذہب کی افیون سے متاثر ہو رہے ہیں۔"

مذہب روس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی سرایت کر رہا ہے چنانچہ الیچوف کی رپورٹ کے مطابق ایسے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو اپنی ڈیوٹی کے وقت تو لامذہبی بنے رہتے ہیں لیکن گھر پہونچ کر مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں، چرچ جاتے ہیں اور اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ لتھوانیا کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری نے شکایت کی ہے کہ متعدد نمایاں درجہ کے سائنس داں مذہب کے خلاف مہم میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے اور اس معاملے میں خاموش رہتے ہیں ان کا یہ رویہ مذہبی افراد کی سرگرمیوں کو تقویت دیتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ سائنس داں مذہب کے خلاف نہیں ہیں۔ خود کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے باقاعدہ ارکان مذہب کے بارے میں مصالحانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی بھی مثالیں ہیں کہ ایک کمیونسٹ باپ کی رضامندی سے اس کے بچہ کے عیسائی بنانے کی رسم ادا کی گئی اور وہ خود بھی اس رسم میں شریک رہا۔ بہت سے کارکن ایسے پائے گئے ہیں جو مذہبی تہواروں کے دن کام پر نہیں جاتے اور مذہبی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی گرمیوں کے موسم میں اس قسم کی غیر حاضری کی وجہ سے تیس ہزار کام کے دنوں کا نقصان ہوا۔

ایک روسی اخبار نے روس میں لامذہبی پروپگنڈے کے تاریک امکانات کا ان الفاظ میں اقرار کیا ہے:-

"مذہبی تصورات، تعصبات اور توہمات جو کہ مختلف سماجی طبقوں کو متاثر کرتے ہیں، وہ بہت سخت جان ثابت ہوئے ہیں۔ مذہب کے خلاف ہماری لڑائی مخصوص سماجی اور نفسیاتی معلومات سے ناواقفیت کی وجہ سے غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہے۔ اس رکاوٹ کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ مذہب کے خلاف سائنٹیفک کام کو تیز تر کر دیا جائے۔ مذہب کے خلاف کام کرنے والے کارکن اکثر اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ مذہب کا جذباتی پہلو اور رسوم کی پرستش مذہبی لوگوں پر بہت زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ اس نفسیاتی اثر کی طاقت مذہبی افراد کو عقلی استدلال سے بے نیاز کر دیتی ہے اور مذہب کے خلاف سائنسی کام کا سابقہ گویا ایک ایسی دیوار سے ہونے لگتا ہے جو اندھی اور بہری ہے اور کچھ سمجھ نہیں سکتی۔"

روسی حکام کے نزدیک مذہب کے اس احیار میں جن چیزوں کا دخل ہے اس میں وہ بیرونی عناصر بھی شامل ہیں جو مختلف طریقوں سے روسی باشندوں پر اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً ریڈیائی نشریات، سیاحوں کی آمد، مذہبی تنظیموں کے بین الاقوامی تعلقات، نیز غیر قانونی ذرائع۔

روس میں چرچ اور مذہب کی پوزیشن کریملن کی اس پالیسی سے بھی مضبوط ہوئی ہے کہ وہ ویٹیکن اور شرق اوسط (عیسائی اور اسلامی دنیا) سے دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ جیسا کہ نئے پوپ جان اور پال کے نام خرشچوف کے تار اور خرشچوف کی لڑکی اور داماد کی پوپ سے ملاقات اور روسی پریس میں پوپ جان کی پالیسیوں پر تعریفی تبصروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح عرب دنیا سے خرشچوف نے نمایاں طور پر دوستانہ تعلقات بڑھائے ہیں جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان مسلسل وفود کے تبادلے ہو رہے ہیں اور باہر کی مسلم تنظیموں کے نمائندے وسط ایشیا کی روسی جمہوریتوں میں جاتے رہتے ہیں۔

روس کے انھیں حالات کا نتیجہ ہے کہ یہ ممکن ہو سکا کہ چرچ کی عالمی کونسل کی ایگزیکیٹو کمیٹی کا اجلاس فروری ۱۹۶۴ء میں اڈیسا[1] میں ہوا جس میں دیگر کارروائیوں کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کے سامنے مذہبی آزادی کے دفاع اور مذہبی رواداری کے بارے میں تجویز رکھی جائے۔ یہ فیصلہ اس واقعہ کے پیش نظر نہایت اہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں کیا گیا جہاں مذہب کو ہمیشہ دبایا جاتا رہا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے بعد ہی ایک پریس کانفرنس میں جرمن بشپ لل جی (LILJE) نے کہا کہ روس خلاف مذہب پالیسی میں ایک طرح کا تذبذب پایا جاتا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اشتراکی لیڈر اگر فی الواقع اپنی خلافِ مذہب سرگرمیوں کو نظریاتی اور علمی بحثوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں تو وہ ذاتی طور پر روس میں چرچ کے مستقبل کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں رکھتے۔

---

[1] اڈیسا۔ بحر اسود کے کنارے ایک روسی شہر۔

پاکستان کی صدارتی جنگ اور اسلام

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

ہر واقف حال اس بات کو جانتا ہے کہ اس وقت صدر ایوب اور مس فاطمہ جناح میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ نہ اسلام کے لیے ہو رہی ہے نہ جمہوریت کے لیے۔ ان دونوں ہی کے نزدیک نہ اسلام زیر بحث ہے نہ جمہوریت مابہ النزاع۔ مابہ النزاع جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ یہاں امریکی طرز کی جمہوریت چلے یا انگریزی طرز کی؟ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے قیام سے بھی اسلام کی راہ کھلنے والی نہیں ہے کہ اس کی حمایت کوئی ایسا دینی مسئلہ بن جائے کہ اس کے لیے اضطرار کی آڑ لے کر شریعت کے ایک حرام کو جائز کیا جائے۔ جمہوریت اسلام کے لیے تو جب سازگار ہو سکتی ہے جب جمہور کے مزاج میں اسلامیت پیدا کی جائے۔ اگر جمہور کے مزاج میں اسلامیت نہ ہو تو وہ خواہ انگریزی طرز کی ہو یا امریکی طرز کی وہ بڑی آسانی کے ساتھ مشہور مسخرے چارلی چپلن کو سیدنا مسیح علیہ السلام پر ترجیح دے دیتی ہے۔ آخر متحدہ محاذ کی جمہوریت کا پہلا تجربہ تو ہو ہی چکا کہ باوجودیکہ اس کی شریک پانچ پارٹیوں میں سے تین اسلام کی مدعی تھیں لیکن انھوں نے اسلام کے احکام کے خلاف اپنا سربراہ ایک عورت کو بنایا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کی جرأت انھیں اسی وجہ سے ہوئی کہ انھیں اندازہ ہے کہ عوام کے ذہن پر اسلام کے حرام و حلال کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا اس بات کا ہو سکتا ہے کہ صدر ایوب کا مقابلہ کرنے کے لیے قائد اعظم کی بہن اٹھی ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ مس فاطمہ جناح کامیاب ہو جاتی ہیں تو ان کے وعدے کے مطابق صدارتی نظام کے بجائے یہاں پارلیمانی نظام آجائے گا۔ لیکن اسلامی نظام کدھر سے آجائے گا۔

بہرحال اس وقت ہمارے صدرین میں جو جنگ ہے اس میں اصل مسئلہ پارلیمانی نظام اور صدارتی نظام کا ہے۔ اس میں سے کسی کے حق میں بھی وحی نہیں اتری ہے کہ اس کے قیام سے اسلام کے قیام کو وابستہ کر دیا جائے۔ ان پر اگر بحث ہو سکتی ہے تو ان کی صلاحیت کار کے پہلو سے ہو سکتی ہے اور ہمارے نزدیک ان کا حسن و قبح دونوں اضافی نوعیت کا ہے۔ جس ملک میں وحدتِ فکر ہو، تعلیم عام ہو، عوام کے جذبات و رجحانات ہموار ہوں، سیاسی جماعتوں اور لیڈروں میں جمہوریت کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہو، وہاں پارلیمانی نظام کامیاب ہو جاتا ہے لیکن جہاں یہ چیزیں موجود نہ ہوں وہاں اس سے انتشار اور ابتری پھیل جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور جمہوریت انارکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صدارتی نظام میں یہ خوبی ہے کہ یہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ ملک کے استحکام کا بھی ضامن ہے اور ملک کا استحکام ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے پارلیمانی نظام تو درکنار دین کے سوا دنیا کی ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ ہم پارلیمانی نظام کی بے آبروئیوں کا نہایت تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ اور آئندہ اگر اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ ملک کی تباہی کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ یہاں عوام کے سیاسی شعور کا عالم یہ ہے کہ بہتوں کے لیے یہ فرق کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے کہ اس وقت یہاں ملت کے لیے ماں کا انتخاب ہو رہا ہے یا ریاست کے لیے صدر کا۔ انگریزی دور کا یہ ذہن ابھی ہمارا بدلا نہیں ہے کہ جو اقتدار پر ہو اس کو شیطان سمجھو اور جو اقتدار سے محروم ہو اور لوگوں سے بے سر و پا وعدے کر سکے اس کو فرشتہ قرار دو۔ ملک میں مرکز گریز طاقتیں ہی نہیں بلکہ ملک دشمن عناصر بھی ہر حصے میں مصروف سازش ہیں جو پختونستان قائم کرنے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ سیاسی کردار کی بے اعتباری کا یہ عالم ہے کہ چودھری محمد علی صاحب جیسے جیسے لوگ حصول اقتدار کی طمع میں عواقب و نتائج سے آنکھیں بند کر کے "مادرِ ملت" کے نام سے ان تمام عناصر کو صلائے عام دے دیتے ہیں جن کے درمیان ایوب دشمنی کے سوا اور کوئی بھی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی چودھری صاحب "مادرِ ملت" کے جھنڈے کے نیچے جمع کر رہے ہیں جن کی آزردگی کے باعث ون یونٹ قائم کر کے چودھری صاحب خود ہوئے ہیں۔ مذہبی بے ضمیری کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ کل تک گلی گلی میں لوگوں کو پیغمبر کا یہ قول سناتے پھر رہے تھے کہ عورت کی حکومت میں جینے سے زیر زمین دفن ہو جانا بہتر ہے وہ "مادرِ ملت" کا جھنڈا اٹھائے

اور ان کا نعرہ لگاتے پھر رہے ہیں اور بے شرمی کا یہ عالم ہے کہ اس کو اقامت دین کا جہاد قرار دے رہے ہیں۔ جس ملک میں ایسے انتشار پسند اور ناقابلِ اعتماد عناصر کارفرماں ہوں وہاں جمہوریت کی وہی شکل کامیاب ہو سکتی ہے جو ایک مضبوط مرکز کے نظم و ضبط میں ہو۔

لیکن اس وقت ہمیں مسئلے کے سیاسی پہلو سے بحث نہیں ہے۔ اس پر ضرورت ہوگی تو ہم آئندہ بحث کریں گے۔ اس وقت ہم صرف اس کے اسلامی پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ آخر مس فاطمہ جناح کی صدارت اور متحدہ محاذ کی حمایت میں اسلام کی بہبود کا پہلو کیا ہے؟ یہ حضرات بڑی قرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر اسلام کی مصلحت ہو تو عورت کو حکمران بنایا جا سکتا ہے؟ چلیے ہم نے مانا کہ بنایا جا سکتا ہے لیکن وہ اسلامی مصلحت کیا ہے جس کے لئے مس فاطمہ جناح کا انتخاب کیا گیا ہے؟ ہم ان کے ذاتی تقویٰ و تدین اور ظواہر شریعت کے احترام سے کوئی بحث نہیں کرتے اس لیے کہ ان چیزوں کو اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہے کوئی ثقہ شہادت اس بات کی موجود کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی کی کسی تقریر یا بیان میں کبھی اسلام کا بھی نام لیا ہو یا کبھی کوئی چھوٹا یا بڑا کام دینی نوعیت کا بھی کیا ہو؟ اس معاملے میں ان کی وضعداری کا تو یہ عالم ہے کہ الیکشن کے زمانے میں بھی جس میں رندانِ قدح خوار بھی زاہدانِ شب زندہ دار بن جاتے ہیں کبھی یہ غلطی نہیں کرتیں کہ بھول کر ہی اسلام کا نام لے جائیں اور اس کی شکایت ہم سے زیادہ خود ان ہی حضرات کو پہلے تھی اور دبی زبان سے اب بھی ہے لیکن اب مادرِ ملت کی وفاداری کا جوش اس زور سے ابھرا ہے کہ اس ملک میں اسلام کا قیام تنہا اب ان ہی کے دم سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔

اسلامی مصلحت کے زاویہ سے ذرا ایک نظر متحدہ محاذ کے عجائب گھر پر بھی ڈال لیجیے۔ اس میں مولانا بھاشانی ہیں، جو شروع سے ہی بے داغ سوشلزم یا کمیونزم کے علمبردار ہیں۔ ان کی شخصیت محاذ میں اس پہلو سے سب سے زیادہ موثر ہے کہ محاذ کی جتنی کچھ بھی کامیابی کی توقع ہے وہ دراصل مشرقی پاکستان ہی سے ہے۔ اس میں محمود علی قصوری صاحب ہیں جو ابتدا سے لادینی نظام کے تگڑے زبردست داعی ہیں اور اشتراکیت پسندانہ رجحانات رکھنے کی وجہ سے ہر انتشار اور ہر انتشار پسند

کے لیے ان کی آغوش کشادہ رہتی ہے۔ اس میں چودھری محمد علی صاحب ہیں جو یوں تو اسلامی نظام کے علمبردار ہیں لیکن سنتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لیے وہ اضطراب انہی نے پیدا کیا جس کے تحت اُسے مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت میں اللہ و رسول کو چھوڑنا پڑا۔ اس کے ایک رکن اعظم جنرل اعظم خاں بھی ہیں جو کل تک تو ختم نبوت کا نعرہ لگانے والوں کو پھانسیاں دیتے تھے، جن میں جماعت اسلامی کے امیر بھی شامل تھے لیکن اب اقامتِ دین کا مستقبل ان کی ذات سے بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے لوگوں نے ایک زمانے میں جتنی گالیاں ان کو دی ہیں شاید ہی اس ملک میں کسی اور کو دی ہوں لیکن اب جماعت کے شیوا بیان نامہ نگاروں کے قلم سے ان کا ذکرِ جمیل پڑھیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ اسلاف میں سے کسی مجاہدِ اعظم کا ایمان افروز تذکرہ ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کہ اب وہ اپنے رب کے پاس پہونچ چکے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سب میں دیندار اور شریف وہی تھے۔ یہ متحدہ محاذ ہے جس کو اب جماعت اسلامی اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتی ہے! اس محاذ نے پہلا اسلامی کارنامہ جو انجام دیا ہے وہ صدارت کے لیے مس فاطمہ جناح کی نامزدگی ہے۔

(میثاق ماہ رجب ۸۴ھ سے انتخاب)

مُطالعہ

آسٹرین نو مُسلم
مغربی تہذیب کے مقابلے میں

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

اسلام چوراہے پر (ISLAM AT THE CROSS ROADS) مشہور آسٹرین نو مسلم لیوپولڈ اسد کی مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلی بار اپریل ۱۹۳۴ میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اور اس قدر مقبول ہوئی کہ چھ مہینے کے اندر اس کے تین اڈیشن شائع کرنے پڑے اور جب سے اب تک اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت کتاب کا ساتواں اڈیشن (۱۹۵۵) ہے۔

اسد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے خاص طور پر عربی سیکھی تاکہ اسلام اور اس کی تاریخ کو براہ راست اس کے متند ماخذ سے سمجھ سکیں۔ نیز پانچ سال انھوں نے حجاز اور نجد میں اس مقصد سے گزارے کہ اس اصل ماحول کو سمجھیں جہاں نبی عربی نے اسلام کی تبلیغ کی تھی (صفحات ۶-۵) اس مطالعہ کے بعد ایک طرف اسلام کے اصولوں نے انھیں شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ خاص طور پر اسلام کا یہ پہلو انھیں بہت پسند آیا کہ وہ اخلاقی تعلیمات اور عملی زندگی کے پروگرام کا غیر معمولی طور پر مربوط ڈھانچہ پیش کرتا ہے۔ (صفحہ ۵) دوسری طرف انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی موجودہ زندگی اسلام کی واقعی تعلیمات سے بہت دور ہو (۳) حتیٰ کہ اسلام سے دوری نے انھیں ذلت و خواری کی انتہا تک پہونچا دیا ہو (۱۵۷) مگر اس تضاد نے انھیں اسلام سے برگشتہ نہیں کیا جیسا کہ بعض نو مسلموں کے سلسلے میں پیش آیا ہو بلکہ انھوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو ایسے موقع پر ایک عقلمند آدمی کو اختیار کرنا چاہیے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلام کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور اپنی تمام توجہ اسلام کے احیاء REGENERATION

کے لیے وقف کر دی۔ (۲)

دیباچہ کو چھوڑ کر یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے آج کل کے مقبول نظریے کے مطابق اس کو یہ رنگ نہیں دیا ہے کہ غیر جانبدارانہ گفتگو سے آغاز کر کے قاری کو ایک جانبدارانہ نتیجے تک پہونچانے کی کوشش کریں۔ دیباچہ کے آخر میں اپنی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

IT DOES NOT PRETEND TO BE A DISPASSIONATE SURVEY OF AFFAIRS; IT IS THE STATEMENT OF A CASE: THE CASE OF ISLAM VERSUS WESTERN CIVILISATION.

ISLAM AT THE CROSS ROADS, P. 6

یعنی اس کتاب میں مصنوعی طور پر غیر جانبدارانہ سروے کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا انداز ایک مقدمہ جیسا ہے۔ اسلام کا مقدمہ مغربی تہذیب کے نام۔

اس طرح کے غیر جانبدارانہ سروے کا طریقہ موجودہ زمانے میں سب سے بہتر علمی طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ مصنوعی ہے۔ اس نفسیاتی بحث سے قطع نظر کہ غیر جانبدارانہ سروے کسی انسان کے لیے کس حد تک قابل عمل ہے۔ خود متعلقہ تصنیف، لکھنے والے کے لیے کوئی ایسا میدان نہیں ہوتی جس میں وہ پہلی بار تلاش و جستجو کے لیے نکلا ہو بلکہ وقت تصنیف وہ خود ایک نتیجہ پر پہونچ چکا ہوتا ہے اور اسی کو قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔ گویا کسی کتاب کا غیر جانبدارانہ سروے محض ایک انداز ترتیب ہے نہ کہ فی الحقیقت غیر جانبدارانہ سروے۔

اسد صاحب کی کتاب کا پہلا باب اسلام کی صراط مستقیم (THE OPEN ROAD OF ISLAM) کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ سائنس صرف جزوی مطالعہ کا نام ہے۔ وہ ہم کو صرف محسوسات کے بارے میں باخبر کرتی ہے جبکہ مذہب محسوسات اور غیر محسوسات دونوں کے مکمل مطالعہ کا نام ہے۔ مذہب ایک ایسی نظر دیتا ہے جس سے آدمی پورے مجموعہ کے بارے میں رائے قائم کر سکے۔

"اس حد تک" مصنف لکھتے ہیں "تمام مذاہب یکساں ہیں" مگر اسلام اس نظریاتی تشریح سے آگے جاتا ہے۔ اسلام وہ عملی طریقہ ہے جس سے آدمی اپنی زندگی اور شعور میں نظریہ اور عمل کا اتحاد قائم کر سکے۔

(۱۴) اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہماری زندگی کو روحانیت اور مادیت کے دو خانوں میں تقسیم نہیں ہونا

چاہیے۔ بلکہ ہمارے شعور اور ہمارے عمل میں انھیں ایک واحد عنصر کی طرح یکجا ہونا چاہیے۔ ہمارا یہ عقیدہ کہ خدا ایک ہے، اس کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اتحاد کی صورت میں منعکس ہونا ضروری ہے۔ (۱۰) یہی مصنف کے نزدیک اسلام کی اخلاقی بنیاد ہے۔ (۳۲)

کتاب کا دوسرا باب، روح مغرب (THE SPRIT OF THE WEST) ہے جس میں مصنف نے اسلام اور مغربی تہذیب کا فرق دکھایا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ اسلام کی بنیاد ایک ماورائے مادہ حقیقت کے اقرار پر ہے۔ جبکہ مغربی تہذیب مادیت میں یقین رکھتی ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان بنیادی ٹکراؤ پایا جاتا ہے پھر وہ ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان لوگوں کی غلط فہمی واضح کی ہے جو مسیحیت کو مغربی تہذیب کی بنیاد سمجھتے ہیں اور اس بنا پر خیال رکھتے ہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب میں کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ مغربی تہذیب کے متعلق یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کا ذہنی رشتہ دراصل رومی تہذیب سے ملتا ہے جو خالص مفاد پرستی اور مادیت پر ایمان رکھتی تھی یہ صحیح ہے کہ رومیوں کے یہاں دیوتاؤں کی پرستش کا رواج تھا، مگر وہ یونانی مذہبیات کی بے روح نقل کے سوا اور کچھ نہیں۔ رومیوں نے حقیقی زندگی میں مذہب کا دخل کبھی تسلیم نہیں کیا، چنانچہ

> "عام مغربی، خواہ وہ جمہوری یا فاشسٹ، سرمایہ دارانہ معیشت کا حامی ہو یا اشتراکی معیشت کا، صرف ایک مذہب کو جانتا ہے، اور وہ ہے مادی ترقیات کی پرستش۔ یہ عقیدہ کہ زندگی کی اس کے سوا کوئی منزل نہیں کہ موجودہ زندگی کو خوش حال بنایا جائے۔ اس مذہب کی عبادت گاہ عظیم فیکٹریاں، سینما ہاؤس، کیمیائی تجربہ گاہیں، رقص کے مراکز، بجلی کے کارخانے ہیں اور اس کے پروہت ہیں ــــ بینکر، انجینیر، فلم اسٹار اور صنعتوں کے رہنما۔" صفحہ ۵۵ - ۶۵

ظاہر ہے کہ ایسی تہذیب کے ساتھ اسلام کا جوڑ کس طرح لگ سکتا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے صلیبی جنگوں کا سایہ (THE SHADOW OF THE CRUSADES) اس باب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ مغرب کی اسلام دشمنی عام قسم کی دشمنی نہیں ہے بلکہ وہ نہایت گہری ہے۔ اس دشمنی کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوا۔ یہ اتفاق ہے کہ یہ یورپ کی تشکیل جدید کا عہد طفولیت تھا۔ جس طرح بچپن کے نقش زندگی بھر باقی رہتے ہیں اسی طرح قوموں کا معاملہ ہے۔ جب یورپین تہذیب وجود میں آرہی تھی، عین اسی کے آغاز میں صلیبی جنگ چھڑ گئی جس نے سارے یورپ کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی پوری تاریخ پر اسلام دشمنی چھا گئی۔ یورپ بدھزم اور ہندوازم کا مطالعہ کرتا ہے تو اس میں اس کا خالص علمی اور تحقیقی انداز باقی رہتا ہے۔ مگر اسلام کا نام آتے ہی اس کا انداز بدل جاتا ہے۔

مصنف نے مزید لکھا ہے کہ موجودہ زمانے میں بعض جدید سائنسی اور فلسفیانہ رجحانات کو دیکھ کر کچھ مسلمان یہ کہنے لگے ہیں کہ یورپ مذہب سے قریب آرہا ہے اور اس لیے دوسرے لفظوں میں گویا اسلام سے قریب آرہا ہے کیونکہ اسلام مذہب کی بہترین شکل ہے۔ مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔

"کہا جاتا ہے کہ جدید سائنس نے فطرت کے محسوس ڈھانچہ کے پیچھے ایک عام تخلیقی قوت کو تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور یہ مغربی دنیا میں ایک نئے مذہبی شعور کی صبح طلوع ہونے کی نشانی ہے۔ مگر یہ خیال یورپ کے سائنسی تصورات کے بارے میں محض غلط فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ کوئی سنجیدہ سائنس داں اس امکان سے انکار نہیں کر سکتا نہ کسی نے کیا ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں کسی واحد محرک کے تحت وجود میں آئی ہو۔ مگر اصل سوال یہ ہے اور یہی ہمیشہ سے تھا کہ یہ سبب جس نے کائنات کا آغاز کیا، اس کی خصوصیات (QUALITIES) کیا تھیں۔ تمام فوق الطبیعی عقیدہ رکھنے والے مذاہب دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو کلی شعور اور بصیرت کی حامل ہے۔ یہ طاقت خود کسی قانون کی پابند نہیں۔ بلکہ وہ آزادانہ طور پر اپنے نقشہ اور مقصد کے مطابق کائنات کی تخلیق کرتی ہے اور اس کی حکمراں ہے ایک لفظ میں وہ خدا ہے۔ مگر جدید سائنس یہاں تک نہیں جاتی .... اس کا نقطۂ نظر کچھ اس قسم کا ہے کہ "ایسی کوئی طاقت ہو سکتی ہے مگر وہ مجھے نہیں معلوم اور نہ میرے پاس ایسا کوئی سائنسی ذریعہ ہے جس سے اس کو جانا جا سکے۔ مستقبل میں یہ فلسفہ کسی قسم کی تشکیکی وجودیت PANTHEISTIC AGNOSTICISM کی شکل اختیار کر سکتا ہے جس میں روح اور مادہ، مقصد اور موجودات، خالق اور تخلیق سب ایک ہو گئے ہوں۔ اب یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کا ایک عقیدہ اسلام کے تصور خدا کی طرف پیش قدمی ہے کیونکہ یہ مادیت کو خیرباد کہنا نہیں ہے بلکہ زیادہ اعلیٰ ذہنی سطح پر وہ مادیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔" صفحہ ۷۷-۸۰

چوتھے باب میں جدید تعلیم پر گفتگو ہے اور اس کا عنوان ہے ABOUT EDUCATION

مصنف لکھتے ہیں کہ جب مغربی تہذیب اور اسلام دونوں دو مختلف تصور حیات پر مبنی ہیں تو مغربی

ڈھنگ کی تعلیم مسلم نوجوانوں کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتی ہے۔ بعض مخصوص غیر معمولی ذہن ممکن ہے! اس تعلیم کے اندر چھپے ہوئے اثرات سے اپنے کو پاک رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ مگر عام نوجوان اس کے تاثرات سے بچ نہیں سکتے۔

مصنف نے مزید وضاحت کی ہے کہ اسلام بذات خود تحصیل علم کا مخالف نہیں ہے۔ بنی امیہ، بنی عباس اور اسپین کی عربی حکومت کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو علم اور تحقیق پر کتنی قوت سے ابھارا ہے۔ مگر علم کا وہ انداز جو ایک مخالف اسلام تہذیب کے زیر اثر بنا ہو، وہ اسلام کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ہماری خواہش ہے کہ ہم علم اور ترقی میں اس مقام پر پہونچیں جس مقام پر آج یورپ ہے مگر ایک چیز ایسی ہے جس کی مسلمان ہرگز خواہش نہیں کر سکتا۔ وہ ہو مغرب کی نظر سے دیکھنا، مغرب کے کان سے سننا اور مغربی افکار کے تحت سوچنا۔ اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہم اسلام کی روحانی تہذیب کا مغرب کی مادی تہذیب سے تبادلہ نہیں کر سکتے۔ یہاں مصنف نے جدید مضامین خاص طور پر تاریخ کی مثال سے واضح کیا ہے کہ کس طرح تاریخ کا موضوع مغرب کے زیر اثر درس گاہوں میں محض مغربی تاریخ بن کر رہ گیا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہم تمام علوم کے لیے مغربی ذرائع سے مدد لینے پر مجبور ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم ان سے معلومات لے لیں مگر ان کا طرز فکر نہ لیں:

> علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) کا مطالعہ مغربی ڈھنگ سے کرنے میں ہمیں کوئی جھجک نہیں ہے۔ مگر ہم ان کے فلسفہ کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتے۔" صفحہ ۹۲

مصنف کا خیال ہے کہ اسی تقسیم کے مطابق مسلم نوجوانوں کی تعلیم ہونی چاہیے:

> "اگر مجھے ایک ایسے تعلیمی بورڈ کو مشورہ دینا ہو جسے صرف اسلامی تقاضوں کے ماتحت کام کرنا ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ مغرب کی تمام ذہنی ترتیبات میں سے محض فطری علوم (NATURAL-SCIENCES) اور ریاضی کو مسلم اسکولوں میں پڑھایا جانا چاہیے۔ اور مغربی فلسفہ، لٹریچر اور تاریخ کی تعلیم کو اس فوقیت کے مقام سے ہٹا دینا چاہیے جو اس وقت نصاب کا جز و بنے ہوئے ہیں۔" صفحہ ۹۵

مغربی تہذیب اسلامی ذہن پر جو برے اثرات ڈالے گی وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو مادی فوائد کی شکل میں وہ ہمیں عطا کرے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ مغربی علوم کو ان کی تہذیب سے الگ کر کے

لیا جائے۔ یہاں مصنف نے مختلف علوم کے تجزیہ سے واضح کیا ہے کہ کس طرح وہ اسلام کے ساتھ جمع نہیں کیئے جا سکتے۔

"مغربی زندگی کی تقلید شخصی یا اجتماعی حیثیت سے اسلامی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ کتاب کا پانچواں باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے تقلید (ABOUT IMITATION)

مصنف بعض جدید تعلیم یافتہ افراد کی اس دلیل کو بالکل فضول قرار دیتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقی معنوی اہمیت نہیں ہے کہ ظاہری طور پر زندگی کس طرح گزاری جائے۔ خواہ ہم جدید مغربی لباس میں ملبوس ہوں یا اپنے باپ دادا کا لباس پہنیں، رسوم وآداب میں پرانا طرز اختیار کریں یا نیا، اس سے دین و مذہب میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"یہ واقعہ ہے کہ اسلام میں کوئی تنگ نظری نہیں ہے۔" مصنف لکھتے ہیں۔ "مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام اور مغربی تہذیب دونوں کے رخ بالکل الگ الگ ہیں۔ اب کوئی بالکل سادہ لوح ہی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ کسی تہذیب کی محض اس کے ظواہر میں تقلید کی جائے اور اس کی اسپرٹ سے کوئی تاثر قبول نہ کیا جائے۔ تہذیب محض ایک سادہ خول کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک زندہ طاقت ہوتی ہے جس لمحہ ہم اس کے ظاہر کو قبول کرتے ہیں اسی لمحہ اس کے اندر کی مستور روح ہمارے اندر اپنا عمل شروع کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ غیر محسوس طور پر ہمارا پورا نقطہ نظر تبدیل کر دیتی ہے۔"

مصنف کے نزدیک اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اس معاملہ میں اہم اور غیر اہم کی تقسیم کی جائے۔ مثال کے طور پر مغربی لباس کی مثال لے کر مصنف نے بہت خوبی سے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس قسم کی تقلید محض مغرب کے مقابلے میں احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔" مصنف لکھتے ہیں! "کہ مسلمان بیرونی آوازوں سے اپنے کان بند کر لیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنی تہذیب کا پوری طرح پابند رہتے ہوئے خارجی تہذیب سے کچھ اثرات قبول کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ یورپ نے ابتداءً عربوں کے علوم سے متاثر ہو کر اپنی جدید زندگی کا آغاز کیا۔ مگر اس نے کبھی عربی تمدن کی نقل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اپنی ذہنی آزادی کو قربان کیا۔ اس نے عربی اثرات کو خود اپنی زمین پر ایک کھاد

کے طور پر استعمال کیا۔ جیساکہ خود عربوں نے یونانی اثرات کے معاملے میں اپنے وقت میں یہی کیا تھا۔ دونوں مثالوں میں نتیجۃً ایک نئی طاقتور تہذیب وجود میں آئی جو خود اعتمادی سے بھرپور تھی اور جسے اپنے اوپر فخر تھا۔" صفحہ ۱۰۸

یہ ایک نمونہ ہے جو اپنی تاریخ میں بھی ہمارے لیے موجود ہے اور غیروں کی تاریخ میں بھی۔

چھٹا باب حدیث اور سنت پر ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے مختلف علاج تجویز کیے گئے مگر سب بے فائدہ ثابت ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا علاج صرف پیغمبر اسلام کی سنت ہے۔ جس سنت نے تیرہ سو برس پہلے اسلام کو زندگی بخشی تھی اسی سنت سے آج بھی ہم کو زندگی ملے گی۔ یہ واضح حقیقت جو اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اہل علم تسلیم کرتے رہے ہیں وہ اب ہمارے درمیان اجنبی ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ محض مغربی تہذیب کا اثر ہے۔ "یہ ایک قطعاً غیر اسلامی فکر ہے کہ قرآن کی بہت سی ہدایات زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے لیے تھیں نہ کہ بیسویں صدی کے مہذب انسانوں کے لیے۔" مصنف اس قسم کے خیالات کو نقل کرتے ہوئے کسی قدر جوش کے ساتھ کہتے ہیں:

AT ITS ROOT LIES A STRANGE

UNDER-ESTIMATION OF THE PROPHETICAL

ROLE OF MUSTAFA ———— P. 115

یعنی اس کی تہ میں محمد مصطفیٰ کے پیغمبرانہ کردار کا ایک حیرت انگیز حد تک ناقص اندازہ چھپا ہوا ہے۔ مصنف کا یہ ایک فقرہ میرے نزدیک ان کی ساری کتاب کی جان ہے۔

موجودہ زمانے میں یہ عام فیشن ہو گیا ہے کہ احادیث کی مستند حیثیت کا انکار کیا جائے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی علمی دلیل یا معقولیت ہے۔ مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ حدیث سے انکار کی بنیاد کوئی علمی دلیل نہیں بلکہ کچھ جذبات ہیں جو لوگوں کو اس سے انکار کی طرف لے جاتے ہیں۔

موضوع احادیث کی موجودگی کا حوالہ دے کر بہت سے مغربی ناقد تمام ذخیرۂ حدیث کو مشتبہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ جب ہمارے پاس ایسے قطعی علمی ذرائع موجود ہیں جن سے کسی حدیث کی صحت یا موضوعیت کو معلوم کیا جا سکے تو اس طرح کی احادیث کی موجودگی ذرہ برابر بھی نفس حدیث کے استناد کو مشتبہ نہیں کرتی۔ اس قسم کا استدلال ایسا ہی ہے جیسے العتیلۂ

کے افسانوی قصوں کے حوالے سے متعلقہ دور کے ایک تاریخی واقعہ کو غیر مستند ثابت کیا جائے۔

یہ باب مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے:۔

"تغریب (WESTERNISATION) سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر احادیث رسول اور پورا مجموعۂ سنت موجودہ زمانے میں غیر مقبول ہو گیا ہے۔ سنت اس قدر واضح طور پر مغربی تہذیب کے خلاف ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں وہ اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتے کہ سنت کو غیر ضروری ثابت کریں۔ اس کے بعد یہ بہت آسان ہو جائے گا کہ قرآن کی تعلیمات کو ایسی شکل دے دی جائے کہ وہ مغربی تہذیب کے مطابق نظر آنے لگیں۔" صفحہ ۱۳۰

ساتویں باب کا عنوان ہے سنت کی روح (THE SPRIT OF THE SUNNAH) سنت کی پیروی کیوں اسلام کا ناقابل تقسیم جزو ہے۔ کیا سنت کے طویل روایتی نظام کے باہر اسلام کی حقیقت نہیں مل سکتی۔ مصنف نے بجا طور پر اس کا جواب نفی میں دیا ہے۔ اور اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبر کی غیر مشروط اطاعت کے بغیر اسلام کے کوئی معنی نہیں۔

اس راہ میں عقلیت RATIONALISM بھی ایک خاص رکاوٹ ہے جس کی بنا پر بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان اپنے کو پیغمبر کے حوالے کر دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی سنت کو ہم اپنی عقل سے جانچیں گے اور اس کا جو جزو عقل کے معیار پر پورا اترے گا اسی کو لیں گے اور بقیہ کو چھوڑ دیں گے۔ مگر مصنف کے الفاظ میں آج یہ ثابت کرنے کے لیے کسی کانٹ (KANT) کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کی عقل اپنے امکانات کے اعتبار سے نہایت محدود ہے۔ ہمارا ذہن عین اپنی ساخت کی بنا پر سارے حقائق کا ادراک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر عقل کی نارسائی کی یہی حقیقت جو ہم سائنس کے مطالعہ میں تسلیم کرتے ہیں اسی کو مذہب کے معاملات میں کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ صفحہ ۱۴۴

یہ باب مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

"پیغمبر نے جو کچھ کیا یا کہا اس کی تعمیل اسلام کی تعمیل ہے۔ سنت کو چھوڑ دینا دراصل اسلام کو چھوڑ دینا ہے۔" صفحہ ۱۴۹

اس کے بعد خاتمہ کا باب ہے جو نتیجہ آخر (CONCLUSION) کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ اسلام اس قسم کا کوئی کلچر نہیں ہے جو محض ایک درخت کی طرح

پیدا ہوا اور پھر ایک وقت مقررہ پر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بلکہ وہ خدا کا دائمی حکم ہے اس لیے اس کو ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اسلام کے احیاء کی جد وجہد اصلاح مذہب (REFORM) کی تحریک کی نوعیت نہیں رکھتی جیسا کہ بعض مسلمان سمجھتے ہیں ہم کو نئے زمانے کے مطابق اسلام کی اصلاح نہیں کرنی ہے بلکہ خود زمانے کو اسلام کے مطابق بنانا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ اسلامی دنیا نے ایک آزاد تمدنی عامل کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ اس کا مطلب مسلمانوں کے زوال کا سیاسی پہلو نہیں ہے بلکہ ذہنی اور اجتماعی پہلو ہے۔ جو کہ ہماری موجودہ گری ہوئی حالت کی سب سے زیادہ افسوس ناک تصویر ہے۔ ہمارے اندر کوئی ہمت باقی نہیں ہے۔ ہمارے اندر یہ احساس نہیں ہے کہ ہم خارجی اثرات سے اپنی سوسائٹی کو بچائیں۔ یہی مصنف کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو ہے۔

مصنف کے نزدیک اصلاح حال کا پہلا قدم یہ ہے کہ یورپ کے مقابلہ میں معذرت خواہانہ انداز کو ختم کیا جائے جو کہ ذہنی شکست خوردگی (INTELLECTUAL DEFEATISM) کا دوسرا نام ہے۔ دوسرا قدم سنت کی پیروی کا عزم ہے۔ "خارجی تصورات کے مقابلے میں اسلام کی عاجزانہ سرنگندگی کے بجائے ہمیں ایک بار پھر اسلام کو اپنے ذہن میں یہ حیثیت دینی ہے جس سے دنیا کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔" پھر ہمیں زندگی کے موجودہ احوال کے مطابق ایک نئی فقہ وجود میں لانی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے قدیم فقہ نے اپنے زمانے میں ارسطو اور نو افلاطونی فلسفہ کے پیدا کردہ مسائل کا جواب دیا تھا اور ان حالات میں اسلامی احکام کو منطبق کیا تھا جو اس وقت سماج میں پائے جاتے تھے۔ صفحہ ۱۵۹

"اسلام کی مثال آج ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کی سی ہے۔ تمام ہاتھ جو اس کو بچانے والے ہیں ان کو بچانے کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ مگر اس جہاز کو بچانا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جبکہ قرآن کی اس پکار کو سنیں اور سمجھیں۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (تمہارے لیے رسولِ خدا کی زندگی میں بہتر نمونہ ہے) صفحہ ۱۶۰

یہ کتاب اگرچہ مغربی اثرات کے مقابلے میں اسلام کی علمی مدافعت کے طور پر لکھی گئی ہے مصنف کے الفاظ میں وہ مغرب کے خلاف اسلام کے مقدمہ کی وکالت ہے مگر اس کے مباحث عموماً بہت سادہ ہیں اور گہرا علمی تجزیہ بہت کم پایا جاتا ہے۔

قابل مطالعہ کتابیں

قرآنی علوم

تفسیر ابن کثیر (اردو) پانچ ضخیم جلدوں میں
ہدیہ مکمل سٹ ۵۵/-/-

درس قرآن:- قرآن پاک کی عام فہم تفسیر مع ترجمہ تحت اللفظ و بامحاورہ ایک ایک صفحے کے درس کی شکل میں
جلد اول (منزل اول) ۱۰/-/-
جلد دوم (منزل دوم) ۱۰/-/-
جلد سوم (منزل سوم) ۸/-/-
جلد چہارم ۸/-/-

قصص القرآن ۴ جلدوں میں
از مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی
جلد اول ۴/-/-
جلد دوم ۴/-/-
جلد سوم ۵/۸/-
جلد چہارم ۴/-/-
(مجلد میں فی جلد -/۱/ کا اضافہ)

فہم قرآن:- از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی
قیمت مجلد ۲/۴/-

وحی الٰہی:- از مولانا اکبرآبادی
قیمت ۴/-/-

قرآنی شخصیتیں:- (از مولانا دریابادی)
قرآن مجید میں جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کا مختصر تحقیقی تعارف
قیمت ۲/۲۵/-

حیوانات قرآنی از مولانا دریابادی
قرآن پاک میں مذکورہ حیوانات کا تفسیری تذکرہ ۲/-/-

جغرافیہ قرآنی قرآن میں مذکور ممالک و اقوام کا جغرافیائی تعارف
قیمت ۱/۲۵/-

بشریت انبیاء: از مولانا عبدالماجد دریابادی
قرآن مجید سے انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا قابل دید اثبات
قیمت ۲/۲۵/-

قصص و مسائل: از مولانا دریابادی
قیمت ۲/-/-

تدوین قرآن:- از مولانا مناظر احسن گیلانی
قیمت مجلد ۱/۵۰/-

قرآن اور تعمیر سیرت:- از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (ایم اے، پی، ایچ، ڈی)
مجلد ۶/-/-
غیر مجلد ۵/-/-

قرآن اور تصوف:- از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (حیدرآباد)
قیمت مجلد ۳/-/-

رہنمائے قرآن
قیمت ۱/-/-

لغات القرآن (کامل)
اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح (۶ جلدوں میں)
جلد اول ۵/-/- دوم ۵/-/-
سوم ۴/۵۰/- چہارم ۹/-/-
پنجم ۶/۵۰/- ششم ۴/۵۰/-
(مجلد عہ فی جلد اضافہ)

الفوز الکبیر (اردو)
اصول تفسیر پر شاہ ولی اللہ کے محققانہ رسالہ کا اردو ترجمہ
قیمت ۱/-/-

علوم حدیث

بخاری شریف (اردو)
(تین مجلد جلدوں میں)
قیمت ۲۵/-/-

موطا امام مالک (مترجم)
بخاری شریف سے بھی پہلا مستند مجموعہ حدیث
قیمت مجلد ۱۲/-/-

شمائل ترمذی (مع شرح) خصائل نبوی
از شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی
قیمت ۶/-/-

مشکوٰۃ شریف (اردو)
(دو ضخیم جلدوں میں)
قیمت مکمل مجلد ۱۶/-/-

ترمذی شریف (اردو)
(۲ جلدوں میں)
قیمت مجلد ۱۶/-/-

انتخاب صحاح ستہ (اردو)
(مع متن عربی)
قیمت ۵/-/-

مشارق الانوار (مترجم)
بخاری اور مسلم کی ۲۲۷۲ قولی احادیث کا گرانقدر مقبول و معروف مجموعہ
قیمت مجلد ۱۴/-/-

حصن حصین (مترجم)
(اردو اور عربی)
رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول دعاؤں کا مستند اور مقبول مجموعہ
قیمت مجلد ۸/-/-

مختصر شعب الایمان (اردو)
از امام بیہقی
قیمت ۱/-/-

مختصر خصائل نبوی:-
قیمت ۱/-/-

بستان المحدثین:-
کتب حدیث کا تعارف اور ائمہ محدثین کا تذکرہ
از شاہ عبدالعزیز صاحب
قیمت ۵/-/-

کتاب الصلوٰۃ
از مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی
نماز کی اہمیت پر بیش بہا کتاب
قیمت ۲/۵۰/-

مسند حمیدی (۲ جلد)

امام بخاریؒ کے استاذ امام حمیدیؒ کا مرتب کیا ہوا احادیث کا مجموعہ۔ جو صحیح بخاری کا خاص ماخذ ہے۔

قیمت -/-/۱۸

ترجمان السنہ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب (میرٹھی)
(مقیم مدینہ طیبہ)

جلد اول .... -/-/۱۰
جلد دوم .... -/-/۹
جلد سوم .... -/۸/۱۰
(مجلد میں فی جلد -/-/۲ کا اضافہ)

کتابت حدیث

مؤلفہ
مولانا سید منت اللہ شاہ رحمانی

قیمت مجلد -/۲۵/۱

تدوین حدیث

از مولانا
سید مناظر احسن گیلانیؒ

تدوین حدیث کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ
جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ احادیث کا جو ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقہ پر پہونچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں

قیمت مجلد
-/۶/۵۰

تاریخ و سیرت

رحمۃ للعالمینؐ (کامل ۳ جلد)

(از قاضی سلیمان منصور پوریؒ)

قیمت -/-/۲

اسلام (آغاز و ارتقاء)

مرتبہ حضرت مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی

قیمت ..... -/-/۳۰

رحمت عالمؐ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے

قیمت -/۷۵/۱

اصح السیر :-

مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ کی نہایت مستند و معتبر سیرت نبویؐ

قیمت -/-/۱۰

مقالات سیرت

از ڈاکٹر
محمد آصف قدوائی ایم اے پی ایچ ڈی

یہ سیرت نبویؐ پر آٹھ گرانقدر مقالوں کا مجموعہ ہے
جن کو
مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنے مقدمہ میں دل کھول کر داد تحسین پیش کی ہے!

قیمت مجلد
-/۴/۵۰

عہد نبویؐ کے میدان جنگ

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب
جس میں
غزوات نبویؐ پر فن حرب (جنگی سائنس) کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔
متعدد جنگی میدانوں کے نقشے بھی شامل کتاب ہیں!

قیمت -/۵۰/۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات

یعنی شاہان عالم، عرب کے حکمرانوں و قبائلی سرداروں سے آپؐ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات

از: سید محبوب رضوی

قیمت -/۲۵/۲

صدیق اکبرؓ :-

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
صدر شعبۂ دینیات
(مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

قیمت -/-/۸

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

"حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط" کے بعد اسی مرتب کی دوسری قابل قدر پیش کش: اسی طرز پر

قیمت مجلد -/-/۵

کلمات اکابر

از مولانا محمد اسحٰق بنارسی

قیمت -/۵۰/۱

حضرت ابوبکرؓ و فاروق اعظمؓ

(از ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

قیمت مجلد -/-/۸
دونوں ایک جلد میں -/-/۶

تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطیؒ

مترجمہ اقبال الدین احمد
خلفائے راشدینؓ سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کے دور کی مکمل تاریخ

قیمت -/-/۱۲

امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی

(از مولانا گیلانیؒ)

قیمت مجلد ـــــ -/-/۱۲

امام ابوحنیفہ اور ان کی تدوین قانون اسلامی

(از ڈاکٹر حمید اللہ) قیمت -/۶۲/-

سیرۃ النعمان :-

قیمت مجلد ـــــ -/-/۴
غیر مجلد ـــــ -/-/۳

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

از مولانا ابوالحسن علی ندوی

قیمت ـــــ ۴/۵۰

تعبیر کی غلطی :-

(جماعت اسلامی کا جائزہ)

از وحید الدین خاں صاحب

قیمت ـــــ -/-/۶

علمائے صادق پور

از مولانا سید محمد میاں صاحب

قیمت ـــــ -/-/۲